رجسٹرڈ نمبر اے [illegible] جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

# معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

---

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

# دار المصنفین کی تاریخی کتابیں

**تاریخ صقلیہ جلد اول** مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اسکی تاریخ مرتب کیگئی ہے، جن میں سے پہلی جلد اب شائع ہوگئی ہے، جو سیاسی سرگذشت پر مشتمل ہے، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب جلاوطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہے، ضخامت مجموعی ۴۰۴ صفحے کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت: للعہ، جلد دوم زیر طبع ہے، مرتبہ سید ریاست علی ندوی،

**تاریخ فقہ اسلامی**، مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جسمیں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، حجم ۴۰۰ صفحے، قیمت للعہ، مترجمہ مولانا عبد السلام ندوی،

**رقعات عالمگیر**، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اور رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں اور ان سے علم و ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۷۹۳ صفحات، چھپائی لکھائی کاغذ بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب، قیمت: للعہ، مرتبہ سید نجیب اشرف ایم اے ندوی،

**مقدمۂ رقعات عالمگیر**، اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں بالخصوص خود عالمگیر کے انشا اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط اور رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی ہے، لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ ضخامت ۷۰۴ صفحے، قیمت: عہ، مصنفہ سید نجیب اشرف ایم اے، ندوی،

**الفاروق** یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمر کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل، اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر، مولانا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں ایڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ ایڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۳۱۲ صفحے، قیمت: للعہ،

**خلفائے راشدین**، سیر الصحابہ کا حصۂ اول، چاروں خلفاء کے ذاتی فضائل اور مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا آئینہ، حجم ۴۰۰ صفحے، قیمت: عہ، از مولانا حاجی معین الدین ندوی،

(دار المصنفین کی کتابوں کی مفصل فہرست دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ سے طلب کیجئے)

مسعود علی ندوی، مینیجر دار المصنفین، اعظم گڈھ

# دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۳۸ ویں جلد

از

جولائی تا دسمبر ۱۹۳۶ء

مُرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

# فہرست مضمون نگاران معارف

## جلد ۳۸

### جولائی تا دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)


| شمار | اسمائے گرامی | صفحہ |
|---|---|---|
| ۱ | مولوی محمد اسمٰعیل گاچیلہ صاحب | ۳۷۶ |
| ۲ | مولانا محمد بدرالدین صاحب علوی، استاد عربی مسلم یونیورسٹی، | ۳۵۲ |
| ۳ | جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، | ۴۲۶ |
| ۴ | جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، | ۱۲۴ |
| ۵ | مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین، | ۱۵۴، ۱۵۵ |
| ۶ | سید سلیمان ندوی، | ۶۲، ۸۲، ۸۵، ۱۴۶، ۱۶۲، ۱۹۵، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲، ۴۰۵، ۴۶۰ |
| ۷ | جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، ایم اے، رفیق دار المصنفین، | ۵-۹۲، ۲۱۴، ۳۰۵، ۳۹۴ |
| ۸ | جناب قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی | ۱۳۲ |
| ۹ | مولوی عبداللہ صاحب چغتائی، | ۲۰۶ |
| ۱۰ | جناب عبدالقیوم صاحب ایم اے ریسرچ اسٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی | ۴۳۹ |
| ۱۱ | مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے ال ال بی رفیق دار المصنفین، | ۶۶، ۷۴، ۷۸، ۱۳۵، ۱۴۳، ۲۲۱، ۲۹۰، ۲۹۳، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۸۶، ۴۰۸، ۴۴۸، ۴۵۳، ۴۵۶ |
| ۱۲ | جناب پروفیسر غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے حیدرآباد دکن، | ۲۷، ۱۱۲، ۱۸۰، ۲۵۹، ۳۳۹، ۴۱۲ |
| ۱۳ | جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم اے لاہور، | ۵۰، ۱۱۲ |

| شمار | اسمائے گرامی | صفحہ | شمار | اسمائے گرامی | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۴ | شاہ معین الدین احمد ندوی رفیق دارالمصنفین | ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۸۵، ۳۰۰، ۳۱۰، ۳۲۵، ۳۹۶، ۴۶۲، ۴۷۶ | ۲ | آسد: جناب سید عثمانی صاحب ایم اے ملتانی | ۳۶۲ |
| | | | ۳ | وامق: جناب ارمان وامق صاحب | ۳۰۴ |
| ۱۵ | جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے | ۴۲ | ۴ | علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ | ۲۲۵ |
| ۱۶ | جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمن صاحب ایم اے | ۱۹۹، ۲۶۳ | ۵ | مولانا عبد السلام ندوی | ۳۰۳ |
| ۱۷ | جناب ہوش صاحب بلگرامی | ۳۶۵ | ۶ | فراق: جناب پروفیسر فراق الہ آبادی | ۲۲۷ |
| ۱۸ | مولوی محمد یوسف صاحب رفیق دارالمصنفین | ۴۲۹ | ۷ | کیفی: مولوی محمد حسین صاحب کیفی | ۳۹۳ |
| | **شعراء** | | ۸ | ماہر: جناب ماہر القادری صاحب | ۳۹۱ |
| ۱ | اثر: جناب سید سمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ال ال بی | ۳۰۲ | ۹ | منیر: جناب پروفیسر کبیر منیر صاحب | ۲۲۶ |


# فہرست مضامین

## جلد ۳۸ جولائی تا دسمبر ۱۹۳۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)


| شمار | مضمون | صفحہ | شمار | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| | **شذرات** | ۲، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲ | ۲ | اسلام میں حیوانات کیساتھ سلوک | ۸۵ |
| | **مقالات** | | ۳ | اسلامی علم جغرافیہ کے نظریے | ۵۰ |
| ۱ | اسلام سوڈان میں | ۲۹۸ | ۴ | اورنگزیب اور اسکا عہد | ۹۲ |

| شمار | مضمون | صفحہ | شمار | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۵ | بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات | ۴۳ | | **تلخیص وتبصرہ** | |
| ۶ | تابعین کے علمی اور مذہبی کارنامے | ۳۵،۲۴۵ | ۱ | اسلامک آرٹ پر نوٹس مشہودات | ۶۰ |
| ۷ | تصحیح مقالہ دیوان کی بہادر زنی پر تنقید | ۱۴۴ | ۲ | امریکہ میں خودکشی کی رفتار | ۲۹۳ |
| ۸ | جہانگیر کا علمی ذوق | ۵ | ۳ | امریکہ میں سرطان کے علاج کی تدبیر | ۳۸۶ |
| ۹ | دیوان شمس تبریز اور مولانا روم | ۱۱۹،۲۷، ۲۵۹،۱۸۰ | ۴ | روس کا آئندہ دستور حکومت | ۲۵۰ |
| ۱۰ | جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی حالت | ۴۱۲،۳۳۵، ۳۶۹ | ۵ | رومن کیتھولک چرچ اور اسلام | ۳۸۰ |
| | | | ۶ | کائنات بغیر خدا کے | ۴۴۰ |
| ۱۱ | سفر گجرات کی چند یادگاریں | ۱۶۵ | ۷ | مدت حیات کی توسیع | ۴۵۳ |
| ۱۲ | شکایت | ۱۴۲ | ۸ | ملک کی خوشحالی پر آفتاب کے داغوں کا اثر | ۲۹۶ |
| ۱۳ | عباسی دربار کے اثرات عربی ادب وثقافت پر | ۴۳۹ | ۹ | یورپ کے جدید نظام میں عورت کی حیثیت | ۲۱۴ |
| ۱۴ | عربوں کا علم کائنات | ۱۱۲ | ۱۰ | یورپ کے لئے ایک جدید سیاسی فلسفہ کی ضرورت | ۱۳۵ |
| ۱۵ | کتب خانہ حمیدیہ بھوپال | ۴۰۵ | | | |
| ۱۶ | کلام خواجہ سنائی غزنوی | ۴۲۶ | | | |
| ۱۷ | کلام لطف | ۳۵۲ | | **اخبار علمیہ** | ۱،۱۴۳،۷۴، ۲۹۸،۲۲۱، ۴۵۶،۳۸۸ |
| ۱۸ | مذاہب اربعہ میں فطرت کا رنگ | ۴۶۵ | | | |
| ۱۹ | منظر الانسان کا مصنف | ۲۸۶ | | **ادبیات** | |
| ۲۰ | نقشے | ۱۹۹،۳۰۲ | ۱ | عقیدت دل | ۳۰۲ |

| شمار | مضمون | صفحہ |
| --- | --- | --- |
| ۲ | دعا | ۳۹۲ |
| ۳ | رنگِ تغزل ، | ۳۰۴ |
| ۴ | روحِ زندگی ، | ۲۲۶ |
| ۵ | سخن ابر ، | ۳۹۲ |
| ۶ | شغلِ تکفیر | ۲۲۵ |
| ۷ | غزل | ۳۰۳ |
| ۸ | کیفِ تغزل ، | ۳۹۳ |
| ۹ | نوائے فراق ، | ۲۲۷ |
| | **باب التقریظ والانتقاد** | |
| ۱ | "اہل ہند کی زندگی اور حالات" | ۳۹۴ |

| شمار | مضمون | صفحہ |
| --- | --- | --- |
| ۲ | "تتمہ صوان الحکمۃ" | ۱۴۷ |
| ۳ | چند نئے رسائل اور اخبارات' | ۳۰۸ |
| ۴ | "دی ریل سیو اج" | ۳۰۵ |
| ۵ | "نقش و نگار" ، | ۴۶۴ |
| ۶ | ہندوستانی زبان کے رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر | ۲۲۸ |
| ۷ | ہندوستانی کے چند نئے رسالے | ۵۳ ! |
| | **مطبوعات جدیدہ** | ۱۵۵،۴۸<br>۳۱۷،۲۳۷<br>۴۶۷،۳۹۷ |


---

جلد ۳۸ | ماہ ربیع الثانی مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء | عدد ۱

# مضامین


| | | |
|---|---|---|
| شذرات، | سید سلیمان ندوی، | ۲ - ۴ |
| جہانگیر کا علمی ذوق، | جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین، | ۵ - ۲۶ |
| دیوان شمس تبریز اور مولانا روم، | جناب غلام دستگیر صاحب رشید، ایم اے، حیدر آباد دکن، | ۲۷ - ۴۲ |
| بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات، | پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے، | ۴۳ - ۵۶ |
| اسلامی علم جغرافیہ کے نظریے، | جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم اے، لاہور، | ۵۷ - ۶۵ |
| اسلامک آرٹ پر یورپین مطبوعات، | "ع ز" | ۶۶ - ۷۳ |
| اخبار علمیہ، | " | ۷۴ - ۷۷ |
| مطبوعات، | " | ۷۸ - ۸۰ |

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# شذرات

اخبارون سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ہندؤون نے جن مین ان کے اہل قلم اور اہل سیاست دونون شامل ہین، ایک نئی مجلس کی بنیاد اس غرض سے ڈالی ہے کہ ہندی اس ملک کی مشترک زبان قرار دیجائے، پچھلے مہینہ اس کا جلسہ بہت دھوم دھام سے ناگپور مین ہوا اور یہ طے پایا کہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان "ہندی یعنی ہندوستانی" ہے،

---

آج تک اُس زبان کے جس کو اب غلطی سے اردو کہا جاتا ہے، دو نام تھے، ایک ہندی اور دوسرا ہندوستانی، پہلا نام مدت ہوئی کہ ناگری خط مین لکھی جانے والی بھاشا کا مشہور کیا گیا، اور اس کو یہ شہرت دی گئی کہ امتیاز کے لئے دوسری زبان کا نام اردو رکھنا پڑا، اور کبھی کبھی اس کو ہندوستانی بھی کہا جانے لگا، اور خیال تھا کہ آہستہ آہستہ یہ نام پھیل کر اردو کے غلط نام کو مٹا دیگا، مگر ہندو مدبر یہ جانتے ہین کہ نام مین کتنی طاقت ہوتی ہے، اردو ہندوستانی بنکر ملک کی عام زبان ہونے کی سینکڑون دلیلون کی ایک دلیل ہو جاتی، اس لئے ناگپور مین "ہندی یعنی ہندوستانی" کی عجیب و غریب تشریح سے ایک ہی حملہ مین دونون پر قبضہ جما لیا گیا،

---

ہم نے ہندی کے حامیون کی اس چال کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا، اور آج سے چند سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مین ایک مقالہ کے ضمن مین یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم اپنی اس زبان کو اردو کے بجائے ہندوستانی کے نام سے یاد کرین، پھر معارف مین اس کی تحریک برابر جاری رکھی اور بعض صوبون نے

اس تحریک پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تھا، گو بعض ناعاقبت اندیش مسلمانون نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن غور سے دیکھئے کہ ہندو اہل نظر ہماری اس تحریک پر کتنے چوکنے ہوئے، ان کو اسکے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنی بھاشا کے لئے ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لقب بھی فوراً اختیار کرین،

مولوی عبد الحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو نے جو اس کانفرنس مین شریک تھے، اس کانفرنس کی روداد پر اخبارون مین بہت اچھا تبصرہ لکھا ہے، اور حقیقت بات وہی ہے جو پروفیسر محیب (جامعہ ملیہ دہلی) نے خط بنام گاندھی جی مین لکھی ہے، کہ ہندوستان کی عام فہم بننے والی زبان کا معیار رواج ہو نہ کہ ہندی لغت، یہی بات ہم نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایک یادگاری مجموعۂ مضامین مین لکھی تھی

ہندی کے حامی اس بات کے درپے ہین کہ چند سو سال پہلے ہندی کے چند شاعرون نے جس زبان مین شاعری کی اسی کو ملک کی علمی ادبی اور عام زبان قرار دین، حالانکہ انصاف یہ ہے کہ آج پشاور سے کلکتہ تک جو زبان عام طور سے بولی چالی اور سمجھی جاتی ہے، وہی ملک کی عام زبان قرار دیجائے، مگر ہندی کے حامی ایک بات طے کر چکے ہین، اب دیکھنا ہے کہ ہندوستانی (اردو) کے حامی کیا طے کرتے ہین

ایک نکتہ ہندوستان کے مسلمانون کے غور کے قابل ہے، اس ملک کے ہندوون نے خواہ وہ اپنے سیاسی مسلکون مین کسی قدر مختلف ہون، ایک بات قطعی طور سے طے کر لی ہے، اور وہ یہ کہ ان کا قومی نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان مین ہندو تہذیب و تمدن، کلچر اور ادب بلکہ حکومت تک کو دوبارہ قائم کیا جائے، اور "ہندوستان" کو بجا طور پر "ہندو استھان" بنایا جائے، اس مقصد پر آریہ سماجی اور سناتن دھرمی مہاسبھائی اور کانگریسی، جی حضوری اور آزاد، ملازم سرکار اور غیر ملازم سبھی متفق ہین، اور قوم کا ہر فرقہ اور ہر کارکن اپنے اپنے راستہ سے اسی منزل مقصود کی طرف برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے، سوال یہ ہے کہ اس کے مقابلہ مین مسلمانون کا قومی نصب العین کیا ہے؟ اور وہ اس کے لئے کیا کر رہے ہین

---

اگر برا نہ مانا جائے تو ہم بتائین، علماء نے یہ طے کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا مشغلہ جاری رکھینگے، اور عام تعلیم یافتہ سب سے پہلے نوکری، اور ان کے ممتاز افراد کونسلون کی ممبری، اور ہو سکے تو کسی نہ کسی طرح سے وزارت کے حصول کی کوشش مین لگے رہین گے، اس سے آگے بڑھ کر نہ ان کا کوئی قومی نصب العین ہے اور نہ کوئی مطمح نظر ہے،

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

---

انہی کونسلون کی پیچ در پیچ سیاستون نے ہمارے اس اسلامی صوبہ کا کیا حال کر رکھا ہے، جس پر ہندوستان کے تمام مسلمانون کا سارا بھروسہ ہے، یعنی پنجاب، ایک فیصدی اسلامی زیادتی کے بھی بیسیون متفرق و مختلف سیاسی فرقون مین بٹ کر بیکار ہو جانے مین کوئی شک نہین رہا، اور اس پر بھی مقصد متعین نہین، اور نصب العین ایک نہین،

---

ایسی صورت مین مسٹر جناح کی کوشش سے ملک مین جو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس نے اپنا جو منشور عمل (مینی فسٹو) شائع کیا ہے، اور مختلف الخیال مسلمانون کو چند دفعات پر جو متفق کیا ہے، وہ بہت کچھ حوصلہ افزا، اور مسلمانون کی پراگندگی کو ایک شیرازہ مین باندھنے والا ہے، گو ظاہر ہے کہ وزارت کے طلبگار اور حامی اس کا ساتھ نہ دینگے، کیونکہ اس منشور عمل کی کسی دفعہ مین یہ نہین بتایا گیا ہے کہ وزارت کس طرح مل سکیگی،

---

# مقالات

## جہانگیر کا علمی ذوق

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین

جہانگیر دعاؤں سے پیدا ہوا، حوصلوں اور تمناؤں میں پلا، اور ناز و نیاز کے ساتھ بڑھا، ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم و کمال کے گہوارہ میں پایا، جب چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہوا، تو علم پرور باپ نے اسکے رسم مکتب کی تقریب انجام دی، اور ملک الشعرا فیضی اور مولینا میر کلاں ہراتی کو اسکی تعلیم کیلئے مامور کیا، قطب الدین خان اتکہ، اور عبد الرحیم خان خاناں اس کے اتالیق مقرر ہوئے، ایسے استادوں اور اتالیقوں کے فیض تعلیم کا جو خوشگوار نتیجہ ہونا چاہئے تھا، وہ ہوا، وہ علم و سخن کے آسمان پر ماہتاب بنکر چمکا،

عبد الرحیم خانخاناں سے اس نے ترکی زبان سیکھی، وہ خود لکھتا ہے کہ "باوجودیکہ میں نے ہندوستان میں پرورش پائی ہے لیکن ترکی زبان کے بولنے اور لکھنے سے عاری نہیں ہوں" تزک بابری کے آخر میں کچھ اجزا ترکی زبان میں لکھکر اضافہ کئے ہیں

فارسی زبان کا وہ ایک بے مثل انشا پرداز تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا علمی شاہکار خود اسکی تزک ہے، جو سادگی، صفائی، بے تکلفی، بے ساختگی، اور قادر الکلامی کے لحاظ سے بے عدیل ہے، اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کو ایسے بے تکلف، برجستہ اور دلآویز طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ بڑے بڑے انشا پرداز نہیں کر سکتے، وہ جب کسی جنگ کی ہنگامہ آرائیوں کی تصویر کھینچتا ہے، تو ہم میدان کارزار میں کھڑے نظر آتے ہیں، جب کسی جشن کی چہل پہل یا شبستان عیش کا نقشہ کھینچتا ہے تو

آنکھوں کے سامنے اسکی ساری رنگینیاں اور سرمستیاں پھر جاتی ہیں، جب وہ کسی علمی مسئلہ پر نکتہ سنجی کرتا ہے، تو مسئلہ کے ہر پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے، جب وہ کسی مقام کا ذکر کرتا ہے، تو ایک محقق جغرافیہ دان کی طرح اس کے متعلق سارے معلومات فراہم کرتا ہے جب وہ ایک شہر کی تاریخ، اور وہاں کے لوگوں کے رسوم و عادات کو تحریر کرتا ہے تو وہ ایک مورخ کی شان میں نظر آتا ہے، وہ جب پھولوں، پھلوں، پرندوں اور جانوروں کی جزوی تفصیلات کو بیان کرتا ہے، تو نہ صرف زبان کا لطف قائم رکھتا ہے بلکہ نباتات اور حیوانات کے ماہر ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے، یہاں چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

۱۰۲۱ء میں عثمان خان افغانی نے بنگالہ میں بغاوت کا علم بلند کیا، اس کے استیصال کے لئے جہانگیر نے شاہی لشکر بھیجا، اس جنگ کی جو قلمی تصویر اس نے کھینچی ہے، وہ یہ ہے:

"در کنار نالہ کہ زمین آن تمام چہلہ و دلدل بود، جائے جنگ قرار داد، روز یکشنبہ ۹ محرم شجاعت خان ساعت جنگ اختیار نمودہ افواج قاہرہ را مقرر ساخت کہ ہر یک بجا و مقام خود رفتہ آمادہ جنگ باشد، عثمان دران روز قرار جنگ با خود نداد و بود، چون شنید کہ لشکر ہائے بادشاہی متوجہ گشتہ آمدہ اند ناچار او ہم سوار شدہ بر کنار نالہ آمد، و سوار و پیادہ خود را در برابر افواج منصورہ باز داشت، چون ہنگامہ جنگ گرم گشت و فوج بہ فوج رو بروئے خود متوجہ گردید، درین مرتبہ اول آن جاہل خیرہ سر فیل مست جنگی خود را پیش انداختہ بر فوج ہراول می تازد، بعد از زد و خورد بسیار از سرداران ہراول سید اعظم بارہہ و شیخ اچھے بدرجہ شہادت می رسند سردار برانغار افتخار خان ہم در ستیز و آویز تقصیر نکردہ جان خود را نثار می نماید، و جمعے کہ با او بودند، آنقدر تلاش می کنند، کہ پارہ پارہ می شوند ہمچنان گروہ جرانغار کشور خان داد مردی و مردانگی دادہ خود را فدائے کار صاحب می سازد، با آنکہ تیرہ بختان نیز بسیار زخمی و کشتہ شدہ بودند، آن در بر حساب لشکریان ما از روئے

دانستگی و رهیدگی بخاطر می آورد و تحمل خودی سازد که سرداران هراول و برانغار و جوانغار کشته شده اند،
همین قول مانده، اکثر کشته شدن و زخمی گشتن جمعیت خود بر وانمود و در همان گرمی بر قول می تازد و درین
جانب پسر و برادران و خویشان شجاعت خان و دیگر بنده ها از راه بردن گمراهان گرفته بر مثال شیران
و پلنگان به پنجه و دندان تلاش می کردند، چنانچه بعضے درجهٔ شهادت یافته، و جمعی که زنده ماند
زخمهاے منکر برداشتند، درین وقت فیل مستی گجپت نام که فیل اول او بوده بر شجاعت خان
می دواند شجاعت خان دست به برچه برده بر فیل میزند انطور فیل مستی را از برچه چه پروا است، دست به شمشیر برد
و دو شمشیر پی در پی می زند. ازان هم چه محابا بعد ازان جمدهر کشید و دو جمدهر می رساند، بآن هم
برنمی گردد، و شجاعت خان را با اسپ زیر می کند، بمجرد از اسپ جدا شدن جهانگیر شاه گفته
بر می جهد و جلودار او شمشیر دو دستی بر دستهاے فیل رسانیده، چون فیل بزانو در می آید، اتفاقاً
جلودار فیلبان را از بالاے فیل بزیر می کشد، و همان جمدهر که در دست داشت، درین بیدرنگی
به نوعے بر خرطوم و پیشانی فیل می زند، که فیل از الم آن فریاد زنان بر می گردد، چون زخمها
بسیار برداشت به فوج خود رسیده می افتد و اسپ شجاعت خان سالم بر می خیزد و در حینیکه سوار
می شد، آن مخذولان فیل بر علمدار او می دوانند، علم او را با اسپ زیر می کنند، و از آنجا شجاعت خان نعرهٔ
مردانه برکشید علمدار را جری می سازد و می گوید که مردانه باش من زنده ام و در پاے علم درین وقت تنگ
هر کس از بنده هاے درگاه حاضر بودند، دست به تیر و جمدهر و شمشیر برده بر فیل می دوند، و
شجاعت خان هم خود را رسانیده، به علمدار نهیب می دهد، که برخیزد اسپ دیگر بجهت علمدار
حاضر ساخته، او را سوار می سازد و علمدار علم بر برافراخته بر جائے خود می ایستد در اثناے این
گیر و دار تفنگی بر پیشانی آن مقهور می رسد که زنندهٔ آنرا هر چند تفحص کردند، ظاهر نه شد به مجرد
رسیدن این تفنگ ازان گرمی باز آمده می ماند، که ازین زخم جان بری نیست تا دوپهر هم

باوجود چنین زخمی منکر مردم خود را بہ جنگ ترغیب می نمود، و معرکہ قتال و جدال گرم بود، بعد ازاں غنیم رو گردانید، و افواج قاہرہ سر در پے آنہا می نہند، و زدہ زدہ آن مخذولان را در محلے کہ دائرہ کردہ بودند، در می آورند، آن مخذولان بہ تیر و تفنگ مردم را نگاہ داشتہ نمی گذارند کہ مردم بادشاہی بجا و مقام آنہا در آیند، چون ولی برادر عثمان و ممریز پسر او و دیگر خویشان و نزدیکان او بر زخم عثمان مطلع می شوند، بخاطر می گذرانند کہ ازین زخم خود او را خلاصی میسر نیست، اگر ما ہمچنین شکستہ و ریختہ بر قلعہ خود در دیم یک کس زندہ نخواہد رسید، صلاح در نیست کہ امشب کہ در ہمین جا کہ دائرہ کردہ ایم بمانیم، و آخر شب فرصت جستہ، خود را بہ قلعہ خود رسانیم، و دو پہر از شب گذشتہ عثمان بجہنم واصل می گردد..... [1]

وہ عیش و نشاط کی بزم کی تصویر بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ کھینچتا ہے، تخت نشینی کے بعد پہلے نوروز کے جشن کا مرقع اس طرح سج کر تیار کرتا ہے،

"شب سہ شنبہ یازدہم ذی قعدہ ۱۰۱۴ھ ہزار و چہاردہ صبح کہ محل فیضان نور رست حضرت نیر اعظم از برج حوت بخانہ شرف و خوش حالی خود کہ برج حمل باشد، انتقال فرمود چون اولین نوروز از جلوس ہمایون بود، فرمودم کہ ایوانہائے دولت خانہ خاص و عام بدستور زمان والد بزرگوارم در اقمشہ نفیسہ گرفتہ، آئینے در غایت زیبائی زینت ببستند و از روز اول نوروز تا نوزدہم، درجۂ حمل کہ روز شرف است خلائق داد عیش و کامرانی داد، اہل ساز و نغمہ از ہر طائفہ و ہر جماعت جمع بودند، لولیان رقاص و دلبران ہند کہ بر کرشمہ دل از فرشتہ می ربودند، ہنگامۂ مجلس را گرم داشتند، فرمودم کہ ہر کس کیفیات و مغیرات انچہ می خواستہ باشند، بخورد، منع و مانعی نباشد"

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۳-۴، نولکشور پریس،

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما،

مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما[1]

سن جلوس کے بارہویں سال میں شعبان کی چودھویں تاریخ کو نورجہان نے ایک مجلس جشن ترتیب دی، اس کا حال جہانگیر اسطرح لکھتا ہے،:-

"آخر ہائے روز پنجشنبہ بست و ششم موافق چہاردہم شہر شعبان کہ شب برات بود در یکے از منازل و عمارات محل نور جہاں بیگم کہ درمیان تالابہائے کلاں واقع است مجلس جشن نمودم، وامرا و مقربان را درین مجلس کہ ترتیب دادہ بیگم بود طلب داشتہ حکم کردم کہ بردم پیالہ و اقسام کیفیات بمقتضائے خواہش ہرکس بدہند بسیارے پیالہ اختیار نمودند، فرمودم کہ ہرکس کہ پیالہ بخورد بہ مثل منصب و حالت خود نشیند، و اقسام کبابہا و میوہا بطریق گزک مقرر شد کہ درپیش ہرکس بنہند عجب مجلسے منعقد گشت، در آغاز شام براطراف تال و عمارات فانوسہا و چراغا روشن ساختہ، چراغہانے بہم دست داد کہ تا این رسم را معمول ساختہ اند، شاید در ہیچ جا مثل این چراغانے نشدہ باشد، جمیع چراغہا و فانوسہا عکس در آب انداختہ بنوعے بنظر درمی آمد، کہ گویا تمام صحن این تالاب یک میدان آتش است، بسیار شگفتہ مجلسے گذشت و پیالہ خواراں زیادہ از حوصلہ طاقت پیالہا تناول نمودند"

| | |
|---|---|
| دل افروز بزمے شد آراستہ | بخوبی بدانسان کہ دل خواستہ، |
| فگندند در پیش این سبز کاخ | بساطے چو میدان ہمت فراخ، |
| زبس نکہت بزم می رفت دور، | فلک نافہ مشک بود از بخور، |

---

[1] تزک جہانگیری ص۲۲۳،

شدہ جلوہ گر از نیان باغ، رُخ افروختہ ہر یکے چون چراغ

وہ دقیق فلسفیانہ اور مذہبی مسائل کو اس سادگی اختصار اور حسن و خوبی سے ذہن نشین کرتا ہے، کہ دوسرے اہل قلم شاید متعدد صفحات کے سیاہ و سپید کرنے کے بعد بھی ویسی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، وہ ہندو پنڈتون کو بتانا چاہتا ہے، کہ حق تعالیٰ کی ذات مقدس "جسم و چون و چگونگی سے منزہ" ہے، چنانچہ لکھتا ہے،

"روزے از پنڈتاں کہ عبارت از دانایان ہندوست پرسیدم کہ اگر منتہاے دین شما بر ظہور آمدن ذات مقدس حق تعالیٰ است در دہ پیکر مختلف بطریق حلول آن خود نزد ارباب عقل مردود است واین مفسدہ لازم دارد، کہ واجب تعالیٰ کہ مجرد از جمیع تعینات ست صاحب طول و عرض و عمق بودہ باشد، و اگر مراد ظہور نور الٰہی است دریں اجسام آن خود در ہمہ موجودات مساوی است، وبایں دہ پیکر مختص نیست و اگر مراد اثبات صفتے از صفات الٰہی ست، دریں صورت ہم تخصیص درست نہ زیرا کہ در ہر دین و آئین صاحبان معجزات و کرامات ہستند کہ از دیگر مردان زمان خود بدانش و فراست ممتاز بودہ اند، بعد از گفت و شنود بسیار و رد و بدل بے شمار بخدائی خداے منزہ از جسم و چون و چگوں معترف گشتند و گفتند کہ چون اندیشہ ما در ادراک ذات مجرد ناقص است، بے وسیلہ صورت را بہ معرفت او نمی بریم وایں دہ پیکر را وسیلہ شناخت و معرفت خود ساختہ ایم پس گفتم ایں ایں پیکر ہاے شما را وسیلہ مقصود بہ معبود تو انند بود"[۱]

وہ جب پھولون کا ذکر کرنے لگتا ہے، تو نباتات کے طالب العلم اپنی واقفیت میں نئے معلومات کا بیش قیمت اضافہ کر سکتے ہیں، آگرہ کے شاہی باغ گل افشان کے پھولوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے،

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۱۹۱، نولکشور پریس، ۲ ایضاً ص ۱۵،

اوّل گل چنپہ گلی ست در نہایت خوشبوئے و لطافت بہیات گل زعفران لیکن رنگ چنپہ زرد مائل بسفیدی ست، درخت آن در غایت موزونی ست وکلان و پر برگ و شاخ و سایہ دار در ایام گل یک درخت باغے را معطر دارد، وازان گذشتہ گل کیوڑہ است کہ ہیئت و اندام غیر مکرر است، بوئے او در تندی و تیزی بدرجۂ ایست، کہ از بوئے مشک ہیچ کمی ندارد دیگر رائے بیل کہ در بو از عالم یاسمن سفید است، غایتا برگہائیش دو سہ طبقہ بر روئے ہم واقع شدہ، دیگر گل مولسری است، کہ درخت آن نیز بسیار خوش اندام و موزون و سایہ دار است، و بوئے گل آن در نہایت ملایمت دیگر گل سیوتی کہ از عالم گل کیوڑہ است، غایتا کیوڑہ خار دار است، وسیوتی خار نہ دارد، رنگ آن بزردی مائل است وکیوڑہ سفید رنگ ست ازیں گلہا و از گل چنبیلی کہ یاسمن سفید ولایت ست، روغنہائے خوشبو می سازند[1]

جانوروں کی تصویر جب وہ کھینچتا ہے، تو وہ اتنی صاف اور واضح ہوتی ہے، کہ علم الحیوانات کے ماہرین اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۱۰۲۱ھ میں مقرب خان کھمبایت سے ایک عجیب و غریب جانور ساتھ لایا، اوس کا بیان جہانگیر اس طرح دیتا ہے، جو انشاپردازی، اور لطافت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے،

"یکے از جانوران در جثہ از طاؤس مادہ کلاں تر، واز نر فی الجملہ خورد تر گاہے کہ در مستی جلوہ نماید، غنچہ خود را و دیگر پرہا را طاؤس آسا پریشاں می سازد، و برقص در می آید، سر و گردن و زیر حلقوم او ہر ساعت برنگے ظاہر می گردد، وقتیکہ در مستی ست سرخ سرخ است، گویا کہ تمام را بہ مرجان مرصع ساختہ اند، وبعد زمانے ہمیں جا ہا سفید می شود، و بہ طریق پنبہ نظر در می آید، بوقلمون آسا ہر زمان برنگے دیگر دیدہ می شود"

[1] تزک جہانگیر ص ۱۰۹

دو پارچہ گوشتی کہ بر سر دارد، بہ تاج **خروس** مشابہ است غریب این است کہ در ہنگام مستی پارچۂ گوشت مذکور بطریق خرطوم از بالائے سر او تا یک وجب می آویزد و باز کہ آنرا بالا می کشد، چوں شاخ کرگدن بر سر او مقدار دو انگشت نمایاں می گردد، اطراف چشم او ہمیشہ فیروزہ گون ست[۱]

جہانگیر جب کسی جگہ کے کیف پرور اور خمار آگین مناظر سے متاثر ہوتا تھا، تو اپنی کیفیات و جذبات کو اسی انداز سے تحریر میں لاتا تھا، کشمیر کو دیکھ کر مست ہو جاتا ہے، اور پھر لکھتا ہے،

"کشمیر باغے است ہمیشہ بہار یا قلعہ ایست آہنیں حصار بادشاہاں را گلشنے است عشرت افزا و درویشاں را خلوتکدۂ دلکشا چمنہائے خوش و آبشارہائے دلکش از شرح و بیان افزون آبہائے رواں و چشمہ سارہائے از حساب و شمار بیروں، چندانکہ نظر کار کند سبزہ است و آب، واں گل سُرخ و بنفشہ و نرگس خودرو صحرا صحرا انواع گلہا و اقسام ریاحین ازاں بیشتر است کہ بشمار درآید، در بہار جاں نگار کوہ و دشت از اقسام شگوفہ مالا مال در و دیوار و صحن و بام خانہا از مشعل لالہ بزم افروز و گلہائے مسطح وسہ برگہا ئے بہروج راچہ گوید؛

شدہ جلوہ گر ناز نینان باغ، ٭ رخ آراستہ ہر یکے چون چراغ

شدہ مشک بو غنچہ در زیر پوست ٭ چون تعویذ مشکیں ببازوے دوست

غزل خوانی بلبلِ صبح خیز ٭ تمنا ے مے خوارگان کردہ تیز

بہر چشمہ منقار بط آب گیر ٭ چو مقراضِ زریں بقطعِ حریر

بساطِ گل و سبزہ گلشن شدہ ٭ چراغِ گل از باد روشن شدہ

---

[۱] تزک جہانگیری بحوالہ مقالات شبلی تنقیدی جلد چہارم ص ۱۰۴ - ۱۰۵،

بنفشہ سر زلف را خم زدہ گرہ در دل غنچہ محکم زدہ[1]

جب وہ سوگوار اور مغموم ہوتا ہے، تو اسی دردناک پیرایہ میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے، جیسے خسرو کی ماں خسرو کی باغیانہ اور ناشایستہ حرکتوں سے عاجز آکر افیون کھا لیتی ہے، اسکی موت پر جہانگیر جس طرح ماتم کرتا ہے، وہ ملاحظہ ہو:-

"از خوبی ہاو نیکذاتی ہائے او چہ نویسم عقلے بہ کمال داشت، و اخلاص او بہ من در درجہ بود کہ ہزار پسر و برادر را قربان یک موئے من می کرد، بکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و اورا دلالت باخلاص و محبت من می کرد، چون دید کہ ہیچ فائدہ نداد..... از غیرتے کہ لازمہ طبیعت راجپوتنی است. خاطر بر مرگ خود قرار داد...... روز بست و ششم ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ افیون بسیار در عین شوریدگی دماغ خوردہ در اندک زمانے در گذشت...... از فوت او بنا بر تعلقے کہ داشتم، ایامے بر من گذشت. کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نہ داشتم چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایت کلفت و اندوہ از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گذشت، چوں این قصہ بہ والد بزرگوارم رسید دلاسا نامہ در غایت شفقت و مرحمت بدیں مرید فدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر بر داشتہ بودند، ہماں طور بستہ بجہت من فرستادند، ایں عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی الجملہ قرار و آرامے بخشید"[2]

جہانگیر کی بیدار الکلامی صرف نثر ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ اسکی نکتہ سنج اور سخن شناس طبیعت میں شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق تھا، بقول مولانا شبلی "سلسلۂ تیموریہ میں یون تو ہر فرمانروا سخن فہم و ادا شناس گذرا ہے لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا، اور ازل سے

[1] تزک جہانگیری ص ۳۰۳، [2] ص ۲۷

در دمند دل لیکر آیا تھا، اس کا اثر اگرچہ اوس نے آئین و نظام سلطنت میں چنداں نمایاں نہونے دیا، یہاں تک کہ تزک میں نور جہان کا جہان جہاں ذکر آیا، مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لے کر نکلتا ہے، تاہم عشق اس کا خمیر تھا، اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اسلئے شعر و شاعری کا نکتہ داں اس سے بڑھکر کون ہو سکتا تھا، (شعر العجم حصہ سوم ص۱۹۵)

وہ خود شاعر تھا، چنانچہ مندرجۂ ذیل اس کی ایک غزل ہے، جو سلاست اور رنگینیِ بیان کے لحاظ سے خوب ہے،

من چوں کنم کہ تیرِ غمت بر جگر رسد — تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد

مستانہ می خرامی و مست تو عالمی — اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد

در وصل دست ستم و در ہجر بے قرار — داد از چنیں غمے کہ مرا سر بسر رسد

مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہ وصال — فریاد از آن زماں کہ مرا ایں خبر رسد

وقتِ نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر،
امید آنکہ شعلۂ نور اثر رسد[۱]

مصنف مخزن الغرائب نے جہانگیر کے جو چند اشعار نقل کئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

ما نامہ بہ برگِ گل نوشتیم، — شاید کہ صبا باو رساند،

## رباعی

ہر کس بضمیر خود صفا خواہد داد، — آئینہ خویش را جلا خواہد داد

ہر چیز کہ شکستہ بود دستش گیر — بشنو کہ ہمیں کاسہ صدا خواہد داد،

## رباعی

اے آنکہ غمِ زمانہ یاکت خوردہ — اندوہ دل وسوسہ ناکت خوردہ

مانند قطرہائے باراں بزمین، جا گرم نکردہ کہ خاکت خوردہ،

(مخزن الغرائب قلمی نسخہ مملوکہ دار المصنفین ورق ۸۵)

وہ اکثر اساتذہ کے مقابلہ میں شعر کہتا، ایک بار امیر الامراء کا یہ شعر اسکے سامنے پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق، یک زندہ کردن تو بصد خوں برابراست

جہانگیر نے فوراً کہا،

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یکنفس یک دل شکستن تو بصد خوں برابراست

ملا احمد ٹھٹھی نے بھی اس پر ایک شعر کہا، جو جہانگیر کو بہت پسند آیا، وہ شعر یہ تھا،

اے محتسب ز گریۂ پیر مغاں بترس یک خم شکستن تو بصد خون برابراست[1]

ایک دفعہ عبد الرحیم خان خاناں نے مولینا جامی کی اس غزل پر غزل لکھی، جس کا ایک مصرع یہ ہے،

بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید،

جہانگیر کو یہ مصرع پسند آیا، اس نے فی البدیہہ مطلع کہا،

ساغرمے بر رخ گلزار می باید کشید ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید[2]

ماوراء النہر کے درویش صفت بزرگ خواجہ ہاشم سے جہانگیر خاص عقیدت رکھتا تھا ایک بار خواجہ مذکور کے یہاں اوس نے ایک نسخہ تزک جہانگیری، اور اسی کے ساتھ اپنی کہی ہوئی منظوم ذیل رباعی بھیجی،

اے آنکہ مرا مہر تو بیش از بیش است از دولت یاد بود تو درویش است

چندانکہ ز مژدہ ات دلم شاد شود شادیم ز آنکہ لطفت از حد بیش است

[1] تزک جہانگیری ص ۱۱۲ [2] اقبال نامۂ جہانگیری و تزک جہانگیری ص ۲۳۵،

اسی کے ساتھ جہانگیر نے دربار میں فرمائش کی، کہ اسی مضمون کی، اور رباعیاں کہہ کر طبع آزمائی کی جائے، حکیم مسیح الزمان نے ایک رُباعی کہی، جو جہانگیر کو بہت پسند آئی، وہ رباعی یہ تھی،

داریم اگرچہ شغلِ شاہی در پیش، ہر لحظہ کنیم یاد درویشان بیش
گر شاد شود ز ما دلِ یک درویش آنرا شمریم حاصلِ شاہی خویش،

جہانگیر نے خوش ہو کر حکیم مذکور کو ایک ہزار مہر انعام میں دیا[1]،

سنہ جلوس شاہی میں جہانگیر موضع سمونگر شکار کے لئے گیا، اسی شکارگاہ میں ایک رات اس نے یہ شعر کہا،

بود بر آسمان تا مہر را نور، مبادا عکس او از چتر شہ دور،

اور قصہ خوانوں کو تاکید کی کہ سلام وصلوٰۃ بھیجتے وقت یہ شعر بھی پڑھا جائے[2]،

سنہ ۱۱ جلوس میں سید عبد اللہ خان بارہہ شاہزادہ خرم کی یہ عرضداشت لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ عادل خان، عنبر اور دکن کے تمام سرکشوں نے اطاعت اختیار کر لی ہے، جہانگیر یہ مژدہ سنکر نہایت خوش ہوا، اور شادیانے کے نقارے بجوائے، سید عبد اللہ خان کو سیف خان کا خطاب دیا، شہزادہ خرم کے لئے ایک لعل بے بہا بھجوایا، اور عادل خان کے نام فرمان جاری کیا، جسمیں یہ طبعزاد شعر مرقوم کیا،

شدی از التماس شاہ خرم، بفرزندی ما مشہور عالم[3]،

اسکے دوسرے سال عادل خان نے جہانگیر کی ایک تصویر کی درخواست کی، جہانگیر نے ایک لعل گران بہا و لعل خاصہ کے ساتھ اسکو اپنی تصویر عنایت کی، اور اس پر یہ رباعی دست خاص سے لکھ دی،

---

[1] تزک جہانگیری ۱۵۱ [2] ایضاً ص۱۰۱ [3] ایضاً ص۱۹۲

اے سوے تو دائم نظرِ رحمتِ ما　　آسودہ نشیں بسایۂ دولتِ ما

سوئے تو شبیہ خویش کر دیم رواں　　تا معنی ما بہ بینی از صورتِ ما[1]

سنہ ۱۴ جلوس میں جہانگیر کلانور میں مقیم تھا کہ خان عالم جو شاہ عباس کے پاس ایران میں ایلچی بنا کر بھیجا گیا تھا، واپس آیا، جہانگیر اسکے ساتھ بہت ہی لطف و عنایت کے ساتھ پیش آتا تھا، جب اوس کے نزدیک آنے کی خبر ہوئی، تو اوس نے اُسے مندرجۂ ذیل مطلع لکھ کر عطرِ جہانگیری کے ساتھ بھیجا،

بسویت فرستادہ ام بوے خویش　　کہ آرم ترا زود تر سوے خویش[2]

جہانگیر کے شاعرانہ ذوق کی ایک دلیل یہ بھی ہے، کہ وہ اپنے سکوں پر بھی اسکا مظاہرہ چاہتا تھا، چنانچہ سو تولے، پچاس تولے، بیس تولے اور دس تولے کی مہروں پر یہ بیت لکھی ہوئی تھی،

بخط نور بر زر کلکِ تقدیر　　رقم زد شاہ نور الدین جہانگیر

مصرعوں کے درمیان میں جگہ چھوڑ کر کلمہ اور دوسری طرف یہ بیت جس سے تاریخ بھی نکلتی ہے، منقش تھی،

شد چو خورزیں سکہ نورانی جہان　　آفتابِ مملکت تاریخِ آن،

ایک دوسرے سکہ پر یہ شعر تھا،

روے زر را ساخت نورانی برنگِ مہر و ماہ　　شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

جب نورجہاں کا اقتدار بڑھا تو سکہ پر یہ شعر ثبت کیا،

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور　　بنام نورجہان بادشاہ بیگم زر

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۴۶، [2] ص ۲۷۵، [3] ص ۳۷۶

جہانگیر کی سخن فہم اور ذوق شناس طبیعت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی تھی، کہ اسکے سامنے شاعری میں کسی قسم کی بدمذاقی کی جائے، ایک دفعہ ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا،

اے تاجِ دولت برسرت از ابتدا تا انتہا،

جہانگیر نے کہا تم عروض بھی جانتے ہو،؟ شاعر نے کہا حضور نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا، ورنہ تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کرکے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "لت برسرت" اور یہ سخت بے ادبی ہے،

مولینا شبلی تذکرۂ سرخوش سے شعر العجم حصہ سوم میں ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں، کہ اس زمانہ میں تقی تخلص کا ایک شاعر تھا، جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی، تقی نے نور جہاں بیگم کے توسل سے جہانگیر کے دربار میں شاعری کی تقریب سے رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن نور جہاں کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، تقی نے یہ شعر پڑھا،

تقی بگریہ سرے دار و اے نصیحت گر کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

جہانگیر نے کہا دیکھا دی اپنے پیشہ کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نور جہان بیگم نے تقریب کی، تقی نے مطلع پڑھا،

من می روم در برق زنان شعلۂ آہم اے ہم نفسان دور شوید از سر راہم

جہانگیر نے ہنسکر کہا وہ اثر کہاں جاسکتا ہے،[1]

یہاں پر بے موقع نہ ہوگا کہ اگر ہم ان اشعار کا ذکر کریں، جن کو جہانگیر نے خاص طور پر پسند کیا،

[1] تذکرۂ سرخوش، ذکر تقی، و شعر العجم حصہ سوم، ص ۹۔

اوران پر اپنی رائے ظاہر کی ہے تاکہ ناظرین کو اس کا صحیح مذاق معلوم ہو، مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ جہانگیر کا ذوقِ شاعری اسی قدر صحیح تھا، جس قدر ایک بڑے نقادِ فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے بڑھکر اسکے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا"،

سنہ ۱۳ جلوس میں مانڈو (فتح پور) کے ایک تال کے قریب فروکش ہوا، تو وہاں ایک ستون پر ایک رباعی لکھی ہوئی دیکھی، اسکے بارے میں لکھتا ہے،

"درمیان تال نشیمنے از سنگ واقع است بریکے از ستونہا این رباعی شخصے ثبت نمودہ بود بنظر درآمد و مرا ازجا درآورد، الحق از شعرہائے خوب است"، رباعی

یاران موافق ہمہ از دست شدند — در دستِ اجل یگان یگان پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر — یک لحظہ زما بیشترک مست شدند

اسکے بعد فوراً ہی لکھتا ہے،

"دریں وقت رباعی دیگر ہم ازیں عالم شنیدہ شد، چون بسیار خوب گفتہ آن را نیز نوشتم"

رباعی

افسوس کہ اہلِ خرد و ہوش شدند — از خاطرِ ہمدمان فراموش شدند،
آنا کہ بصد زبان سخن می گفتند، — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند[1]

ایک بار سلطان قوام کے بیٹے حسینی کی ایک رباعی اسکے سامنے پڑھی گئی، اسکو پسند آگئی، جہاں نے تزک میں بھی نقل کی ہے، وہ رباعی یہ ہے،

گردے کہ ترا از طرفِ داماں ریزد — آب از رخِ سرمۂ سلیماں ریزد،
گرخاک درت با متحاں بفشارند — از وے عرقِ جبینِ شاہاں ریزد،

[1] تزک جہانگیری ص ۲۶۰، نولکشور پریس

اس رباعی کو نقل کرکے وہ لکھتا ہے:۔

"معتمد خان دریں وقت رباعی خواند، مرا بغایت خوش آمد، و در بیاض خود نوشتم،"

رباعی

زہرم بفراق خود چشانی کہ چہ شد خوں ریزی و آستیں فشانی کہ چہ شد

اے غافل ازانکہ تیغ ہجر تو چہ کرد خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد[1]

یہ رباعی بابا طالب اصفہانی کی تھی،

سلطان سنجر کے ملک الشعراء معزی کا ایک قصیدہ جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھا تھا، اسکے سامنے پڑھا گیا، جسکا مطلع یہ تھا،

اے آسماں مسخر حکم روان تو، کیوان پیر بندۂ بخت جوان تو،

اس مطلع کو سن کر وہ بہت محظوظ ہوا، اور اس قصیدہ کی تعریف تزک میں کرتا ہے، کہ "بغایت سلیس و ہموار گفتہ"،

سعیدائے زرگر باشی نے اس قصیدہ کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھکر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جہانگیر نے پسند کیا، اسکی تعریف کرتے ہوئے کچھ اشعار تزک میں نقل کئے ہیں[2]

ایک بار ایک ہندو شاعر نے جہانگیر کے سامنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی، جس کا حاصل یہ تھا، کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا، تو کبھی رات نہ ہوتی، کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا، تو اس کا بیٹا اسکے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپ کے والد کو خدا نے ایسا بیٹا دیا، کہ لوگوں نے انکے انتقال کا غم نہ کیا، آفتاب کو رشک ہے کہ آپ کے طالع کی روشنی اور عدالت کے نور سلطنت میں کہیں رات نہیں، جہانگیر اس اچھوتے خیال کو سنکر بہت محظوظ ہوا، اور ایک ہاتھی انعام میں

[1] تزک جہانگیری ص ۲۰۹، نولکشور پریس، [2] ایضاً ص ۲۴۲،

میں درج کیا ہے،

آیں تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ، بہ جلدوی ایں مدح فیلے بادہرحمت کردم[1]

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا، جو حسب ذیل ہے:-

گر پیر داشتی جہاں افروز — شب نگشتی ہمیشہ بودی روز
زانکہ چوں او نہفتہ افسرِ زر — بہ نمودی کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بعد آں چناں پدرے — جانشیں گشت ایں چنیں پسرے،
کز شنفتارِ گشتنِ آں شاہ — کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ[2]

جہانگیر کو طالب آملی کے مندرجۂ ذیل اشعار بہت مرغوب تھے،

ز غارتِ چمنت بر بہار منتہا است — کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند
لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہاں بر چہرہ زخمی بود و بہ شد
عشق در اوّل و آخر ہمہ ذوق است و سماع — ایں شرابے است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است
گر من بجائے جوہر آئینہ بودمے — بوردنما ترا بتو کے می نمودمے،
دو لب دارم یکے در می پرستے — یکے در عذر خواہی ہائے مستے

جہانگیر کے اس انتخاب پر مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ "خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا"[3]

شعرا و علماء کی سرپرستی، شہزادگی کے زمانہ سے شعرا اسکے دربار میں ملازم رہتے تھے، تختِ سلطنت پر بیٹھا تو دربار شعرا سے بھرا ہوا تھا، مگر اس نے مردم شناسی سے کام لے کر کم سن طالب آملی کو اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایا، طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو مازندران کا ایک شہر ہے، سولہ برس کی عمر میں اس نے

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۰۰، [2] شعر العجم حصہ سوم ص [illegible]،

ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف، اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، تیموری حکمرانوں کی فیاضیاں سن کر ہندوستان آیا، اور جہانگیر کے دربار میں ۲۰ برس کی عمر میں ملک الشعراء کے عہدہ پر ممتاز ہوا، اور آخر تک جہانگیر کی شاہانہ سرپرستی میں نہایت عزت و احترام سے زندگی بسر کی، صرف ایک موقع ایسا پیش آیا، کہ کسی بات پر جہانگیر ناراض ہو گیا، اور طالب چند روز تک شرفِ حضور سے محروم رہا، اس واقعہ کو وہ نہایت لطیف پیرایہ میں ایک قصیدہ میں ادا کرتا ہے[1]۔

نظیری نیشاپوری بھی اس کے دربار سے بسلسلۂ ملازمت منسلک تھا، سنہ ۵ جلوسِ شاہی میں اس کا شہرہ سنکر جہانگیر نے دربار میں طلب کیا، نظیری نے انوری کے اس قصیدہ پر،

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را

ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا، جہانگیر نے اس کے صلہ میں ہزار روپیہ، گھوڑا، اور خلعت عطا کیا، اور اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا[2] جہانگیر نے ایک دفعہ اس سے ایک عمارت کے کتبہ کی فرمایش کی، اس نے ایک غزل لکھ کر پیش کی، جسکا مطلع یہ تھا،

اے خاکِ درت صندلِ سرگشتہ سراں را — بادِ مژہ، جاروبِ رہت تاجوراں را

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگہ زمین انعام میں دی[3]،

عرفی بھی جہانگیر کی سرپرستی کا رہینِ منت رہا، جہانگیر نے اپنے ایامِ شاہزادگی میں قاصد بھیجکر اس کو دربار میں بلایا، اور قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی، تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادہ سلیم کا جانداد تھا، وہ اپنی زندگی کی ۳۶ ویں بہاریں گذار رہا تھا، کہ حاسدوں نے اسکو زہر دیدیا، بعضوں نے لکھا ہے کہ زہر دینے کی وجہ شہزادہ سلیم کیساتھ عشق کا اظہار تھا،

---

[1] قصیدہ شعر العجم حصہ سوم ص ۱۷۰ میں دیکھو، [2] تزک جہانگیری ص ۹۲، [3] سرو آزاد بحوالہ شعر العجم حصہ سوم ص ۱۴۰،

ملا حیاتی گیلانی بھی جہانگیر کے دربار سے منسلک تھے، گیلان کے رہنے والے تھے، عراق و خراسان میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد ہندوستان پہنچے حکیم ابوالفتح گیلانی کی وساطت سے اکبری دربار میں متعارف ہوئے اکبر کے بعد جہانگیر کی ملازمت میں آئے، وہ ان کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا آخر عمر تک وہ جہانگیر کے جود و کرم سے فیضیاب ہوتے رہے، بہت ہی پرگو شاعر تھے، سات ہزار اشعار ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، خسرو و شیریں کی بحر میں قصہ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جہانگیر نے خوش ہو کر اس صلہ میں انھیں سونے میں تلوا کر سونا انعام دیا، مصنف میخانہ لکھتا ہے،

"مثنوی در بحر خسرو و شیریں مبنی بر قصہ سلیمان و بلقیس بنام ایں بادشاہ ستارہ سپاہ برشتۂ نظم درآورد، چون بسمع اشرف اقدس جہاں پناہ رسید حیاتی را بصلۂ آں زرکشید تا حیاتی درحیات بود از بندگی ایں بادشاہ انجم سپاہ محروم نہ گشت، ہمہ جا در سفر و حضر خدمت آں حضرت بسری برد"[۱]

ان کے علاوہ اور جن شعراء نے جہانگیر کے جود و سخا کی زلہ ربائی کی وہ بابا طالب اصفہانی، ملا محمد صوفی، مانذرانی سعیدائے گیلانی، میر معصوم کاشی، فسونی کاشی، ملا حیدر خصالی[۲] اور شیدا تھے جہانگیر کی قدردانیوں کے سبب دربار میں علماء بکثرت تھے، یہاں پر بے جا نہ ہوگا، اگر ان میں سے ہم بعض کا تذکرہ کریں،

مولینا مرزا شکر اللہ شیرازی، شیراز، قزوین، عراق اور عرب سے علوم متداولہ حاصل کر کے ہندوستان آئے، نسخ تعلیق اور علم سیاق میں مہارت تام رکھتے تھے، پہلے عبدالرحیم خانخانان

---

[۱] میخانہ مولفہ ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی، مرتبہ محمد شفیع ایم، اے، ص ۵۳۶، [۲] اقبال نامۂ جہانگیری معتمد خان بخشی، ص ۳۰۰، کلکتہ،

کی فیاضیوں کے خوشہ چیں ہوئے، پھر جہانگیر کی ملازمت میں آئے، جہانگیر نے انھیں شہزادہ خرم کی ماتحتی میں عہدۂ دیوانی پر مامور کیا، اپنے عہدہ میں بہت کامیاب رہے، پھر اودے پور کی مہم میں کچھ خدمت جلیلہ انجام دی، اس لئے جہانگیر نے ۱۰۲۳ھ میں انھیں افضل خاں کے خطاب سے مشرف کیا، اور اجمیر کا ناظم بنا کر بھیجا[۵۱]

مولینا تقیا ی شوستری شیراز سے تعلیم کی تکمیل کرکے ہندوستان آئے، ان کے بارے میں مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے،

"مولینا تقیای شوستری طالب علمے بے مثال و قرین و منشی و شاعری سخن آفرین است در اقسام منظومات غیوری تخلص می فرماید"

جہانگیر نے انھیں صدارت کے منصب سے سرفراز کیا[۵۲]

جہانگیر کے عہد کے دوسرے علماء کے نام جو مصنف اقبال نامۂ جہانگیری نے بتائے ہیں، وہ یہ ہیں:

ملا روزبہان شیرازی، میر ابو القاسم گیلانی، امی آمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر ٹھٹی، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نور اللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا عبد المطلب سلطانپوری، ملا عبد الرحمن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فراغی گجراتی، ملا حسین گجراتی، خواجہ عثمان حصاری اور ملا محمد جونپوری[۵۳]

جہانگیر ہر مذہب و ملت کے علماء سے بہت بے تکلفی کے ساتھ ملتا تھا، اور ان کے متعلق جو رائے ظاہر کرتا تھا، وہ بڑی محققانہ ہوتی تھی، شیخ عبد الحق دہلوی سے ملا، تو لکھتا ہے:-

"مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بہ وضع توکل و تجرید بسر می برد، مرد گرامی ست صحبتش بے ذوق نیست، بہ انواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودم"

انکی تصنیف تذکرۂ اولیائے ہند کے بارے میں رائے ظاہر کرتا ہے:-

---

[۵۱] مآثر رحیمی حصہ سوم ص۳۰۰، [۵۲] ایضاً ص۱۴۰۲، [۵۳] اقبالنامۂ جہانگیری ص۳۰۷،

"کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند بہ نظر درآمدہ خیلے زحمت کشیدہ"[1]

میر عضد الدولہ نے جب فرہنگ جہانگیری پیش کی، تو اسکے متعلق جہانگیر لکھتا ہے

الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار شعرار قدما مستشہد آوردہ، درین فن کتابے مثل ایں نمی باشد"[2]

مولینا شبلی جہانگیر کی اس رائے کی نسبت لکھتے ہیں، کہ "فارسی کا ایک محقق اس کتاب کی نسبت اس سے بڑھکر کیا رائے دیسکتا ہے، فارسی لغت میں جسقدر کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں، کسی میں قدما کے اشعار سے سند لانے کا التزام نہ تھا، اور فرہنگ جہانگیری کا یہی امتیازی وصف ہے"[3]

وہ ہندو پنڈتوں اور درویشوں سے اسی فراخدلی، اور عقیدتمندی سے ملتا جسطرح علمائے اسلام سے پیش آتا تھا ۱۲ھ جلوس میں جب اوجین گیا، تو اسے معلوم ہوا کہ ایک سنیاسی مرتاض جدروپ نامی دنیا سے کنارہ کش ہو کر ایک دشوار گذار بھٹ میں رہتا ہے، جس کا طول ساڑھے پانچ گرہ اور عرض ساڑھے تین گرہ تھا، یہ اسقدر تنگ تھا کہ اس میں مشکل سے ایک شیر خوار طفل سما سکتا تھا، جہانگیر کو اس سے ملنے کا شوق پیدا ہوا، وہاں تک سواری پہنچ نہ سکتی تھی، اسکے دو تین میل پا پیادہ چلکر وہاں پہنچا، اور چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا، اس ملاقات کی نسبت لکھتا ہے:

"الحق کہ وجودش بغایت مغتنم است، در مجلس او محظوظ و مستفید می توان شد، علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد، خوب ورزیدہ تا شش گھڑی با او صحبت داشتم، سخنان خوب مذکور ساخت، چنانچہ خیلے در من اثر کرد"

اس ملاقات سے وہ سیر نہیں ہوا، پھر گیا، چنانچہ لکھتا ہے:۔

"باز خاطر را بملاقات گسائیں جدروپ رغبت افزود، بے تکلفانہ بکلبۂ او شتافتہ صحبت

---

[1] تزک جہانگیری ص۲۲۴، [2] ایضاً ص ۴۰۰، [3] مقالات شبلی جلد چہارم ص۱۱۲

داشتہ شد، سخناں بلند درمیان آمد حق جل وعلیٰ غریب توفیقے کرامت فرمودہ فہم عالی فطرت

بلند ومدرکہ تند با دانش خداداد جمع و دل آزاد ساختہ پشت پا بر عالم وما فیہا زدہ در گوشۂ

تجرید مستغنی و بے نیاز نشستہ"

اوجین سے رخصت ہوتے وقت اس کے پاس پھر ملاقات کو گیا، الوداعی ملاقات اس پر شاق

گذری، لکھتا ہے،

"باز بملاقات گسائیں رفتہ از وداع شدم، بے تکلف جدائی از صحبتِ او بر خاطر

حقیقت گزین گرانی نمود"[۱]

**جہانگیر اور کتبخانہ و مدارس**

جہانگیر ایک شاندار کتب خانہ کا مالک تھا، مکتوب خان اس کا مہتمم تھا، جب وہ سفر میں جاتا تو بھی ایک کتبخانہ ساتھ لے جاتا تھا، چنانچہ تزک میں ہے کہ جب وہ گجرات پہنچا، تو

وہاں کے مشائخ کو اپنے کتبخانہ سے تفسیر حسینی، تفسیر کشفی، اور روضۃ الاحباب نذر کیا،

اس نے مدارس کی تعمیر کا یہ اہتمام رکھا تھا، کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث مرجاتا، تو

اس کے مال و متاع سے مدارس اور خانقاہیں بنوا تا تھا[۲]، تاریخ جان جہاں میں ہے کہ اس نے ان

تمام مدارس کو از سر نو ترتیب دیا، جو گذشتہ تیس سال سے پرندوں اور چوپایوں کے مسکن بنے ہوئے تھے[۳]

۱؎ تزک جہانگیری ص ۲۰۱، ۲؎ منتخب اللباب خافی خان، ۳؎ تاریخ جان جہان بحوالہ پروموشن آف محمڈن لرننگ ص ۱۰۱

# دیوان شمس تبریز اور مولینا روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے، استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن،

(۷)

دیوان میں حضرت شمس کی قونیہ کی واپسی پر جگہ جگہ مسرت و خوشی کا اظہار پرجوش طریقہ پر کیا گیا ہے،

مسکین دل و آوارہ آن گم شدہ یکبار ۔۔۔ چون بشنود این چارہ خوش رقص کنان آمد

بہار آمد بہار آمد بہار خوش عذار آمد ۔۔۔ خوش و سرسبز شد عالم اوان لالہ زار آمد

صنوبر گفت راہ سخت گسان شد بفضل حق ۔۔۔ کہ ہر برگے کہ سر بر زد چو تیغ آبدار آمد

ز شمس الدین تبریزی رسد بادم نوروزی ۔۔۔ کہ ہر قطرہ ازان جرعہ چو در شاہوار آمد

بہار آمد بہار آمد بہار مشکبار آمد ۔۔۔ نگار آمد نگار آمد نگار بردبار آمد

سماع آمد سماع آمد سماع بے صداع آمد ۔۔۔ وصال آمد وصال آمد وصال پایدار آمد

صلایا ایہا العشاق کان مہر و نگار آمد ۔۔۔ میان بندید عشرت را کہ یار اندر کنار آمد

مہ دی رفت و بہمن رفت ساقی نوبہار آمد ۔۔۔ زمین سرسبز و خرم شد اوان لالہ زار آمد

الا اے شمس تبریزی توئی سبزی ہر بستان ۔۔۔ شقایقہا و ریحانہا ز خوبت خوش عذار آمد

حضرت شمس کی واپسی کے بعد ایک عرصہ تک علم و عمل اور ذوق و حال کی مجلس نہایت گرم رہی

"مدتے بسیار برین سیاق از وفاق بے نفاق روز و شب در ذوق جمعیت می بودند۔"

"شب و روز بصحبت یکدگر مستغرق می بودند"

(سپہ سالار ص ۹)

اتفاقاً پھر بعض اصحاب کو حضرت شمس کی طرف سے خلش ہوئی، ان میں علاء الدین چلپی مولٰنا کے فرزند متوسط بھی تھے، یہ لوگ حضرت شمس کے استخفاف پر آمادہ ہوئے، اور موجب انفعال حرکات ان سے سرزد ہوئے، حضرت شمس کمال حلم سے خاموش رہے، لیکن ایک دن سلطان ولد کو اشارۃً اس حال کی طرف توجہ دلائی، اور اسی دوران میں غائب ہو گئے،

"دران مدت ناگاہ غیبت فرمود حضرت خداوندگار رحلی الصباح چون در مدرسہ آمد، و خانہ را از ایشان خالی یافت، چون ابر بہ شید در روز و شب در فراق آنحضرت غزلیات بیان می آورد،" (سپہ سالار)

دمشق کی طرف حضرت شمس کی دوبارہ واپسی، دیوان میں اس کی شہادت، دیوان میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

شہ شمس تبریزی اگر چون باز آمد از سفر — یک چند بود اندر شتربہ چو عنقا بے نشان

آخر کار دردِ ہجر کی شدت سے بیتاب ہو کر حضرت شمس کی تلاش میں مولینا دمشق تشریف لے گئے، کئی اصحاب بھی ہمرکابِ سعادت تھے،

"حضرت خداوندگار عظم اللہ ذکرہ جہت حکمت و مصلحت بطلب ایشان باتمامت عزیزان و مقربان بمحروسۂ دمشق رفتند،" (سپہ سالار ص ۶۹)

مولینا کا سفر دمشق، دیوان میں اس واقعہ کا اظہار، دیوان میں اس سفر کے متعلق یہ شعر ہے،

از حد چو شید در دم در عشق سفر کردم — یارب چہ سعادتہا کز این سفرم آمد

تاریخ اور دیوان کے اس ربط سے ہمارے اس دعوی کی مزید تصدیق اور تائید ہوتی ہے کہ دیوان شمس تبریز مولینائے روم کے ابیات کا مجموعہ اور انہی کے جذبات کی ترجمانی ہے،

غزل را از زبانِ شاہ گفتم — کہ شاہم جز کہ جویا را نخواہد،

چند مزید قطعی شہادتیں

اب تک داخلی ثبوت میں جو براہین ہم نے پیش کیے ہیں، ان کے اثبات کیلئے تاریخ و تذکرہ سے مقابلہ کرنا پڑا، لیکن ذیل میں ہم ایسے دلائل پیش کرتے ہیں، جو اپنے آپ اس امر کے قطعی ثبوت ہیں، کہ دیوان شمس تبریز مولانائے روم کے افکار کا مجموعہ ہے،

ہم نے گذشتہ بحث میں یہ بیان کیا ہے، کہ مولینا اپنے اشعار میں اپنا نام یا تخلص باندھنے کی رسم عام کے پابند نہیں ہیں، اکثر غزلیات میں تو حضرت شمس کا نام آیا ہے، لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ اسکی نوعیت صاحب کلام شاعر کے تخلص کی بالکل نہیں، بلکہ وہ ہر جگہ اسم ممدوح کی حیثیت رکھتا ہے، اسکے برعکس جیسے مثنوی میں بھی مولینا کی عادت ہے، دیوان میں بھی کہیں کہیں کسی موقع پر اپنا تخلص و نسب (رومی یا ملائے رومی) یا لقب مخفف (جلال) یا خطاب (مولینا) لکھدیا ہے، جو اس امر کی قطعی شہادت ہے کہ دیوان مولینا کا کلام ہے، کیونکہ اگرچہ ان کا نام چند مواقع پر آیا ہے لیکن اسکی حیثیت ممدوح کی سی نہیں جیسے باوجود کثرتِ ذکر کے حضرت شمس کے اسم کی حیثیت ہے، بلکہ یہ نام اس طرح استعمال ہوا ہے جیسے کسی شاعر کا نام یا تخلص اسکے کلام میں آتا ہے،

مولینا دیوان میں اپنی طرف بلفظ مولینا اشارہ کرتے ہوئے اپنی محفل سماع کا ذکر اسطرح فرماتے ہیں:

سماعی می رود در مجلس ما — کہ زد قش می کند ہفت آسمان ملے
شراب و شاہد و شمع است مجلس، — نوائے ارغنون و نالۂ نے،
درِ میخانۂ باقی کشادیم، — صلا در دہ آیا ساقی مگو کے،
دریں دریائے توحید تو شدم گم — نہ بے وے می توان بودن نہ با وی
چو مولینا برقص آید ز مستی، — برقص آید موجودات با وے

معاً اپنے آپ کو شاعرانہ طور پر غیر فرض کر کے اور اس کا اعتراف فرماتے ہیں، کہ یہ سب کچھ ان کو حضرت ہی کے طفیل سے حاصل ہے۔

نہ مولیناست ایں بحر در افشان حقیقت شمس تبریزی ست باشے

حضرت شمس کا نام بار بار دیوان میں کیوں آتا ہے، اس حقیقت کو بے نقاب فرماتے ہیں،

نام شمس الدین تبریزی ہمی گوہر دے تا بگیر د شعر و نظمت رونق و رعنائیے

اس مضمون کے دو شعر اور ہیں،:-

برخوان تو حدیث شمس تبریز ا خوش باش ازین وآن بہ پرہیز

مفخر تبریز جان شمس حق اے یارما رونق گفتار مائی اے زینت اشعار

دیوان کو دیکھئے تو یہ ان دونوں صفات کا حامل ہے، جو ایک ان دو اشعار میں بیان کئے گئے ہیں، دیوان میں جذبات محبت کی جو شدت ہے، حضرت شمس ہی کی وجہ سے ہے، جوش عقیدت کے جو مضامین باندھے گئے ہیں، وہ دیوان کی رونق و رعنائی میں اضافہ کرتے ہیں،

ایک خاص ثبوت، ایک نصیحت آمیز غزل کے چند اشعار یہ ہیں:-

ای ز اقلیم عدم آمدہ در ملک وجود ہیچ دانی کہ ترا آمدن از بہر چہ بود

بندۂ بادشہی شاہ فرستاد ترا تا تو خود را بشناسی و بدانی معبود

اس ناصحانہ کلام کے مقطع میں ارشاد ہوتا ہے،

این نصیحت کہ شنیدی سخن مولیناست گفت شمس الحق تبریز بدنسیان فرمود

اپنا حال ایک غزل اپنے متعلق لکھی ہے جس کا مطلع ہے،

وقت سحر گہ از درم ملائی رومی میرسد، قم گفت اے دیوانگان ملای رومی میرسد

گفتم کہ تو دیوانہ گفتا توہم دیوانہ شو از خویشتن دیوانہ شو ملای رومی میرسد

مقطع میں بھی حضرت شمس سے خطاب ہے،

ای باد صبح آخر بگو با شمس تبریزی خوش طبل علم بر عرش بر ملای رومی میرسد،

اپنے آپ کو مطرب شمس کی حیثیت سے ان کی مدح مین ایک غزل لکھنے کا حکم دیتے ہین،

ای مطرب شمس دین بگواین غزل از برائے او ۔۔۔ تا دل و جان و دیدہ را بر سر نای و دف کند

شمس تبریز اور مولینا کا ربط۔ دیوان میں مولینا نے اپنے اور شمس تبریز کے ربط کا بکثرت مختلف پیرایہ مین اظہار فرمایا ہے، ایک موقع پر فرماتے ہیں،

شمس تبریز است مولانائے روم، ۔۔۔ جملہ عالم عاشقان را سود باد،

رومی روز عید تبریست چہ دست یافت ۔۔۔ از تخت ملک زنگی شب را فرو کشید

شما ایمان نگاہ دارید محکم ای مسلمانان ۔۔۔ کہ مولانائے رومی شود مسلمان چو کافر شد

مولینا نے سلطان ولد کو بھی حضرت شمس کی عقیدت و ارادت کے سپرد کر دیا، جو ان کے محبوب ترین فرزند تھے، فرماتے ہین،

چو مولینا ولد را داد بخشش، ۔۔۔ ازین پس ہیچ دنیا را نخواہد،

مولینا اکثر غلبۂ حال کے وقت اشعار اور غزلیات لکھتے تھے، ان میں انکے جوش عشق کا تو اظہار پوری طرح ہوتا ہے لیکن حسن بیان، اور شعر کے ظاہری محاسن کی انھیں کچھ پروا نہین، اسپر خود ہی اظہار خیال فرماتے ہین،

شمس تبریز بجز عشق ز من ہیچ مجوئے ۔۔۔ زان کہ سے داد سخن جو کہ سخندان باشد

ایک شعر میں مولینا رومی اپنا آپ اقرار فرماتے ہین، کہ مولینا رومی کون ہین، جس سے اس لفظ کے متعلق شک وشبہہ دور ہو جاتا ہے،

مولانۂ رومی منم سلطت کن شیطان منم ۔۔۔ تازہ کن ایمان منم دم ز اللہ ہوز نم

ہم پیرم و برناستم پیر استم برناستم ۔۔۔ پنہا منم پیدا منم عن میر مولاناستم

بوئے خمش را در کوزہ فقاع کرد؟ ۔۔۔ شد ہزاران ترک رومی بندۂ ہندو تخم

ایک غزل میں حضرت شمس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار بڑے جوش سے فرماتے ہیں۔

گر بزنی بجرم جز راہِ عشق نسپرم　　رومی خستہ خاطرم دستِ منست و دامنت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولینا کس کے دامن کے متعلق فرما رہے ہیں یعنی "دامنت" میں کس سے خطاب ہے، جواب دوسرے شعر میں ہے،

شمس جلالِ من توئی صبحِ وصالِ من توئی　　واقفِ حالِ من توئی دستِ منست و دامنت

مولینا کا تخلص| مولینا کا کوئی تخلص خاص طور پر معین نہ تھا، کہیں مولینا کہیں رومی استعمال کرتے ہیں، کہیں اپنے لقب جلال الدین کا پہلا جزو لفظ جلال استعمال کرتے ہیں، سپہ سالار میں ایک شعر نقل کیا گیا ہے[۱]

چگونہ بر نپرو جان چو از جناب جلال،　　خطابِ لطف چو شکر بجاں رسد کہ تعال

دیوان میں بھی اس کا استعمال بعض مواقع پر کیا ہے،

گر تو شوی تابع مولینا جلال　　اظہر شمس است یقیں رہبرم

بگفت مرو آنجا کہ ناگہاں چو جلال　　میانِ فتنہ بے عدو منتہات نہند

اس غزل کی قطعیت پر ایک دلیل مزید یہ ہے، کہ مناقب العارفین میں شعر کیساتھ ساتھ اس امر کی تصریح ہو کہ مولینا نے اسے کس محل پر فرمایا[۲]،

ایک خاص دلیل،| واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ حضرت شمس کی خاطر مولینا سخت امتحان اور آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے، بیٹے علاء الدین، اور دیگر عزیزوں سے تعلق منقطع کر لیا، انکی طرف دیوان میں اشارہ فرماتے ہیں،

خاموش کہ بہر شمس تبریز،　　در کوزۂ نار امتحانم،

---

[۱] سپہ سالار ص ۵۵، [۲] سپہ سالار ص ۶۰، ۹۱ مناقب العارفین میں بھی یہ حال تفصیل سے درج ہے،

**مولینا کا ایک خاص اقرار** اس بحث سے جو ہمارا مدعا ہے، مولانا نے اسے خود فرمایا ہے،

غزل را از زبان شاہ گفتم،    کہ شاہم جز کہ جو یارا نخواہد،

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "شاہ" سے مراد کون ہے، دیوان ہی میں مولانا اس کا جواب دیتے ہیں کیونکہ مولانا اس لفظ سے بکثرت حضرت شمس تبریز کو مخاطب فرماتے ہیں۔

از شاہ عالم شمس دیں پیغام آمد نازنیں    کز جان بروا نگہ نشیں در مقعد صدق صمد

جان جہان فخر دیں تبریز شاہ شمس دیں    زان قرب عین الیقیں برجان و دل تحکم زند

یہ قطعی شواہد تھے جن سے یقین کامل ہوتا ہے، کہ دیوان شمس تبریز مولانا ہی کا نتیجۂ فکر ہے،

ان کے علاوہ کئی اور مختلف نوعیت کے شواہد ہیں، جو اثبات مدعا میں معاون ہیں،

**مولینا کے معاصرین و مریدین اور ان کا تذکرہ دیوان میں، حضرت صلاح الدین زرکوب کی تعریف** حضرت مولانا صلاح الدین مولینا کے برادران راہ اور خاص رفقاے بزم میں ہیں، یہ بھی حضرت کے فیض یافتہ تھے حضرت شمس اور مولینا کی خلوت میں، انھی کو رفاقت کا شرف حاصل ہوا تھا، حضرت شمس کی جدائی کے بعد مولینا نے انھی کی صحبت میں سکون پایا،

"چہ از غیبت مولینا شمس الدین تسکین و آرام بحضرت شان یافتہ"

دیوان میں اس صورت حال پر ایک غزل ہے،

آفتاب تافت بروں از حجاب کبریا    شعلۂ آن نور بنگر طلعت شمس الضحیٰ

اے خداوند شمس دیں یکدم بلطف و مرحمت    با من سرگشتہ و مجنون و شیدائی درآ

لیکن پھر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں،

آن ضیا نور یست روشن از حسام الدین ما    با صلاح الدین کہ ذاتش نور بخش اولیا

ان سے تعلق نہ صرف روحانی تھا، بلکہ وہ مولانا کے رشتہ دار بھی تھے، اسلئے کہ مولینا نے سلطان ولد کا نکاح انکی صاحبزادی کیساتھ کردیا تھا، سپہ سالار کا بیان ہے،

"حضرت خداوندگار را با شیخ تعلقی و موانستی تمام بود"

مولینا کی نظر میں ان کی عزت و عظمت بھی بہت تھی،

"پیش از خلافت چلپی حسام الدین رجوع ہمہ مریدان بحضرت او بود"

سلطان[۱] ولد نے بھی ان تعلقات اخلاص و محبت کا ذکر اپنی مثنوی میں کیا ہے، ایک دن مولینا شمس کے فراق میں بازار کی طرف نکلے، راستہ میں شیخ صلاح الدین کی دوکان پر سے گذر ہوا، وہ زرکوبی میں مشہور تھے، مولینا پر اس آواز سے حالت وجد طاری ہوئی، انھوں نے یہ حال دیکھکر اپنا شغل جاری رکھا، اور نقصان زر کی فکر نہ کی، مولانا ہم آغوش ہو کر جوش اور مستی میں یہ شعر پڑھنے لگے

یکے گنجے پدید آمد ازیں دوکان زرکوبی ۔۔۔ زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہی خوبی

کلیات[۲] میں بھی یہ شعر موجود ہے،

یکے گنجے پدید آمد ازین دوکان زرکوبی ۔۔۔ زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہی خوبی

(کلیات شمس تبریز ردیف ی)

ان کی موت کا مولینا کو بیحد رنج ہوا، چنانچہ سپہ سالار لکھتے ہیں کہ

"حضرت خداوندگار عظم اللہ ذکرہ در فوت ظاہر ایشان رقت بسیار فرمود، بعزت و تعظیم ہر چہ باتمامت اعاظم و اکابر قونیہ تشیع جنازہ کردند، و این غزل را در ثواب جمال ایشان انشاء فرمودند"

---

[۱] مثنوی سلطان ولد نسخہ قلمی در بیان مناقب صلاح الدین زرکوب [۲] سپہ سالار ذکر صلاح الدین زرکوب فیہ ما فیہ مطبع معارف۔ [۳] کلیات شمس تبریز ص ۹۹، ردیف ی،

اے ز ہجران تو فراقت آسماں بگریستہ دل میان خون نشستہ عقل و جاں بگریستہ

یہ غزل کا ملاً دیوان شمس تبریز میں موجود ہے، ہم چند اشعار مثالاً درج کرتے ہیں،

اے ز ہجرانت زمین و آسمان بگریستہ دل میان خون نشستہ عقل و جاں بگریستہ

شہ صلاح الدین رفتی اے ہمائے گرم رو ہم کسے باید کہ داند بر کساں بگریستہ

بر صلاح الدین چہ داند ہر کسے بگریستن از کمان جستے چو تیرے ول کمان بگریستہ

رسالۂ سپہ سالار میں ایک اور غزل حضرت زرکوب کی تعریف میں ہے،

مطربا اسرار ما را باز گو، قصہ ہائے جانفزا را باز گو،

ما دہان بربستہ ایم امروز از و، تو حدیث دل کشا را باز گو،

مخزن انا فتحنا بر کشا، سر جان مصطفیٰ را باز گو،

چون صلاح الدین صلاح جان ماست آن صلاح جانہا را باز گو،

دیوان میں بھی یہ غزل موجود ہے،

صلاح الدین کی تعریف میں یہ اشعار قطعی طور پر مولینا کے ہیں، اور دیوان شمس تبریز میں پائے جاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوان شمس تبریز مولینا ہی کا کلام ہے، تذکرہ نویسوں نے حضرت زرکوب کی جو تعریف و توصیف کی ہے، اس غزل میں اس کا ذکر کیا ہے، اگر حضرت شمس کے اشعار ان کی تعریف میں ہوتے۔ تو اس کا بھی ضرور ذکر کیا جاتا، کیونکہ سپہ سالار میں حضرت شمس اور زرکوب کے ربط و تعلق کا ذکر موجود ہے، اصل میں یہ مدحیہ اشعار اس تعلق کا آئینہ ہیں، جو حضرت زرکوب اور مولانائے معنوی میں تھے،

ان اشعار کے علاوہ کلیات میں حضرت زرکوب کے مناقب میں کئی اور اشعار ہیں، جو اس خیال کی تائید و توثیق کرتے ہیں،

شمع دو جہان صلاح دین است کاندر دو جہان غریب و تنہاست

چون صلاح الدین بوجد اندر بیامد نزد ما شکر گفتم کان رفیق با صفامت آمدست

فرماتے ہیں کہ صلاح الدین کی صحبت سے فساد باطن رفع ہوجائے گا،

چون رسیدی تو بشہ صلاح الدین، گر فسادی شوی صلاح آئی

از شہ صلاح الدین چون پدید شود حق بین دل رو بصلاح آرد جان شعلہ بر یابد

دوش در خواب بدیدم صلاح الدین را گستردہ سایہ دولت چو ہمائے برسد

جان حق است شہ صلاح الدین کو ز اسرار کردگار بود،

لطفہائے راکہ با ما شہ صلاح الدین کند خضر جان گر باز بیند دم بدم تحسین کند،

حضرت حسام الدین چلپی کی تعریف، حضرت صلاح الدین زرکوب کے بعد مولینا کے رفیق خصوصی حضرت حسام الدین چلپی ہوئے، بغایت صدق شعار اور ادب شناس واقع ہوئے تھے طبع کریم اور سیرت حلیم پائی تھی، گفتگو میں جامعیت تھی، اور علم حال سے اصحاب قال کی مشکلات حل فرماتے تھے، مولینا سے مودت واخوت، عقیدت، اور ارادت کے خاص تعلقات تھے، سپہ سالار کا بیان ہے،

"بعد از شیخ صلاح الدین رحمۃ اللہ علیہ در حالِ جناب حضرت خداوندگار دہ سال تمام و بعد ازان نیز شیخ و قائم مقام و خلیفہ و امام تمامت اصحاب حضرتش بود، و تمامت اصحاب ملازم ایشان بودند و بملازمت او تقرب بحضرت خداوندگاری جستند"[1]

حضرت مولینا کے صفات کے مظہر تھے، مثنوی معنوی انہی کی تحریک پر لکھی گئی تھی، مولینا نے مثنوی میں سوائے دفتر اول کے ہر دفتر کے آغاز میں خصوصیت اور تصریح کیساتھ ان سے خطاب کیا ہے، اور متعدد مقامات پر نہایت جوش اور ذوق کے ساتھ ان کی تعریف و توصیف کی ہے، ان سے نہایت محبت و خلوص کا اظہار کیا ہے، جیسے کوئی مرید عقیدت مند اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے

[1] سپہ سالار ص ۱۴۳،

یہی حال زندگی کے تعلقات میں بھی تھا،

"حضرت خداوندگار سلوک بدیشاں بوجہی فرمود کہ خلق گمان بردی کہ مرید ایشان است"

"وبحقیقت نظر تمام حضرت خداوندگار ما بود، وتمامت مثنویات بالتماس ایشان مؤلف گشتہ است ........ دربیان مثنویات حقایقے کہ مکتوب است اشارت بسلوک چلپی دارد"

...... دیباچہ تمامت مثنویات مزین است بالقاب شریف او[1]

مثنوی[2] سے نمونہ کے طور پر چند مدحیہ اشعار ہم درج کرتے ہیں،

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران ... گفتہ آید در حدیث دیگران،

اس شعر میں اشارہ شمس تبریز کی طرف ہے، لیکن شعر حسام الدین کے اس اصرار کا جواب ہے، کہ کلام میں شمس تبریز کے حالات وضاحت سے بیان کئے جائیں،

دفتر دوم کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

مدتے این مثنوی تاخیر شد ... مہلتے بایست تا خون شیر شد

چون ضیاء الحق حسام الدین عنان ... بازگردانید ز اوج آسمان

چون بمعراج حقایق رفتہ بود، ... بے بہارش غنچہا ناشگفتہ بود،

دفتر سوم میں ہے۔

اے ضیاء الحق حسام الدین بیار ... این سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

چوتھے دفتر میں یوں خطاب فرماتے ہیں،

ہمچنان مقصود من زین مثنوی ... اے ضیاء الحق حسام الدین توئی

دفتر پنجم میں فرماتے ہیں،

---

[1] سپہ سالار ص۱۲۳، [2] مثنوی مولانا روم کامل مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۲۹۱ھ۔

شہ حسام الدین کہ نور انجم است — طالب آغاز سفر پنجم است،

گر نبودی خلق محجوب و کثیف، — در نبودی حلقہا تنگ وضعیف،

در مدیحت داد معنی دادمی، — غیر این منطق نہ لب کشادمی

دفتر ششم میں انہی کی توصیف بیان کی ہے،

حیات دل حسام الدین بسے — میل من جوشد بقسم سادسے،

اسی طرح دیوان میں بھی ان کی تعریف و توصیف کے نغمے موجود ہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ دیوان شمس تبریز صاحب مثنوی ہی کا کلام ہے، واقعات زندگی مثنوی اور دیوان اس بارے میں ہم آہنگ ہیں، تاریخ اور تذکرہ شاہد ہے کہ مولینا کے سوا کوئی اور شخص ایسا نہیں جس کے ساتھ حضرت حسام الدین کے تعلقات اس نوعیت کے رہے ہوں،

آن ضیا نور دیت روشن از حسام الدین ما — باصلاح الدین کہ از آتش نور بخش اولیا

اے شہ حسام الدین ما اے معدن نور و ضیا — اے با تو جانہا آشنا مستاں سلامت میکنند

اے حسام الدین جان کن مدح آن سلطان عشق — گرچہ منکر در ہوائے عشق او دم میزند

اے شہ حسام الدین حسن میگوئی با جاناں کہ من — جان را غلاف معرفت بہر حسامت میکنم

حسام الدین صلاح الدین صالح — خمش کردم خموشی غم گسار است

عطار وسنائی کی تعریف، فارسی کے صوفی شعرا میں حکیم سنائی، اور حضرت عطار رح کو اولیت کا شرف حاصل ہے سنائی اور عطار کے کلام اور معنوی پیام دونوں کے اثرات مولانا پر ہوئے، تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں، کہ جب حضرت بہاء الدین بلخ سے قونیہ تشریف لے جارہے تھے، تو نیشاپور میں حضرت عطار ان سے شرف نیاز حاصل کرنے کیلئے حاضر خدمت ہوئے، مولانا رومی کو اپنی کتاب اسرار نامہ تحفۃً عنایت کی، اور مولینا کی آتش افروزی عشق کے متعلق پیشنگوئی فرمائی،

"در اثنائے آں سفر بہ نیشاپور رسید، شیخ فرید الدین عطار بدیدن مولانا بہاء الدین آمد آں وقت مولینا جلال الدین کودک بود، شیخ عطار کتاب اسرار نامہ را ہدیہ بہ مولنا جلال الدین داد و مولینا بہاء الدین گفت روزے باشد کہ ایں پسر آتش در سوختگان عالم بر زند"

مولینا نے مثنوی میں حضرت عطار کا ذکر تعظیم و احترام کیساتھ کیا ہے، اور ان کے اشعار کو بعض بعض مقامات پر اپنے اشعار میں ضم کیا ہے یہی رنگ دیوان میں بھی ہے، عطار و سنائی کی تعریف و توصیف فرمائی ہے، انکے مرتبہ و عظمت جلال اور مرتبت کی داد کھلے دل سے دی ہے،

گر عطار گشت مولینا ۔۔۔ شربت از دست شمس بود نوش

ہفت شہر عشق را عطار گشت ۔۔۔ ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم،

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ۔۔۔ ما از پئے سنائی و عطار آمدیم،

معشوق و عاشق ہر سہ یکے بود ۔۔۔ یکبار چوں سنائی سردار آمدیم،

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں،

آں تنا جو کش سنائی شرح کرد ۔۔۔ یافت فردیت و عطار آن فرید

دست در دامن خورشید حقیقت زدہ ایم ۔۔۔ چنگ دل نیز در آں طبلۂ عطار زدیم،

در آں طبلۂ شکر پر کرد عطار ۔۔۔ بگرد طبلۂ عطار گردیم،[۵۱]

یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے، کہ دیوان جس میں یہ اشعار پائے جاتے ہیں، عطار اور سنائی کے کلام سے متاثر ہونے والے شاعر مولینائے روم کا کلام ہے، نہ کہ حضرت شمس کا،

سپہ سالار کی تعریف، سپہ سالار اور تذکرہ سپہ سالار کے متعلق ہم پچھلے باب میں تصریح کر چکے ہیں، سپہ سالار مولانا کے خاص مریدوں سے تھے، تقریبًا چالیس سال تک خلوت و جلوت میں مولینا کے ساتھ رہے

[۵۱] کلیات شمس تبریز ص ۲۹۵، و دیوان شمس تبریز ص ۲۴۳، و ص ۴۴۴،

مولانا سے ارادت و عقیدت انھیں بے حد ہے، تذکرۂ سپہ سالار جو مولینا کے حالات میں معتبر ترین تذکرہ ہے، اسکی کافی دلیل ہے،

وہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں،:-

"خلاصۂ عمر خود را بہ ملازمت حضرت او مستغرق داشتم،.... لاجرم از محبت عشق او ہزار بار سوختم، و از خودیِ خود محو گشتم" (سپہ سالار ص۴)

دیوان میں مولانا نے ان کی بھی تعریف فرمائی ہے،

چو خورشید ست یار من نمی گردد بجز تنہا سپہ سالار مہ باشد کہ استارہ حشم دارد

یہ بھی ہمارے دعوے کا اک داخلی ثبوت ہے،

**سلطان ولد سے خطاب،** سلطان ولد مولینا کے محبوب ترین فرزند ہیں، حضرت شمس تبریزی کی آپ پر خاص عنایت تھی، انھیں سے مرید ہوے، ربط ارادت نہایت قوی تھا،

مولینا دیوان میں کبھی کبھی حضرت سلطان ولد سے بھی خطاب فرماتے ہیں، حجاب خودی کے متعلق سلطان ولد کو نصیحت فرماتے ہیں،:-

اے ولد پندار بند است و حجاب اندر زرش چو ازیں بند در گزشتی جز وصال یار نیست

ولدی گوئی در عشقش غزلہا، چنانکہ گفت عطار و سنائی،

ایک اور ہدایت فرماتے ہیں،

مشو مولا سے ہر ناشستہ روئے کہ تا ایں عشق مولانا نمانے،

**حضرت شہاب الدین سہروردی کا ذکر،** مولانا نسباً صدیقی ہیں، سلسلۂ نسب میں حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، آپ کے علم اور حقیقت شناسی اور شہرت کا دور دور شہرہ تھا، معاصر صوفیہ دور دور سے دریافت مسائل میں ان سے رجوع کرتے، مولینا کے معاصر

بھی تھے، مولانا ان کی وفات کے بعد بھی سو صد تک بقید حیات رہے، مولینا نے دیوان میں ان کی نامو ری کا بطور مثال تذکرہ فرمایا ہے،

شہاب آتش ما زندہ باد ۔۔۔ چو القاب شہاب سہروردی

(کلیات شمس تبریز ص ۸۴۰)

اوحد الدین کرمانی کا ذکر: تذکرہ نویس لکھتے ہیں، کہ جس زمانہ میں مولینا کا قیام دمشق میں تھا، مولینا شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ اوحد الدین کرمانی اور شیخ صدر الدین قونوی کے ہم صحبت رہے ہیں، ان بزرگان امت میں ہر ایک اپنی آپ نظیر تھا، مولینا سے اوران اولیاے کبار سے حقایق اور اسرار دین پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ سپہ سالار نے بھی اسکی تصریح کی ہے،

"ثقات کہ خداوندگار ما در محروسۂ دمشق بود، چند مدّت با ملک العارفین موحد مدقق کامل مکمل صاحب الحال و القال شیخ محی الدین ابن عربی وسید المشائخ والمحققین الشیخ السعد الدین حموی واز سید المشائخ شیخ عثمان الرومی وموحد مدقق عارف کامل نقیر ربانی شیخ اوحد الدین الکرمانی و ملک المشائخ والمحدثین شیخ صدر الدین قونوی صحبت فرمودہ اند، و حقایقے کہ تقریر آن طولی دارد، بہمدیگر بیان کردہ، رضوان اللہ علیہم اجمعین،

(سپہ سالار ص ۱۴)

مولانا نے دیوان میں بھی اوحد الدین کرمانی کے فیض روحانی کا تذکرہ فرمایا ہے، جو غالباً اسی صحبت کا اثر ہے،

ایک مکالمہ کے طور پر فرماتے ہیں،

پیر چو نبض من سوختہ را تجربہ کرد، ۔۔۔ گفت ہیہات کہ آن زہر [illegible]

مطلب و مقصد عشاق دریں دشت یقیں  نہ علوم و نہ عقول و نہ زیافت نہ سود
این بگفت و نفس زرف بمن درنگریست  نظراو ہمہ ہستی ز دل من بربود
گفت اکنون بردو بادہ خور و شاد بزی  دور باش از رہ سالوسی وازدلق کبود
کہ دریں رہ ہمگان ، از دل خود بیخبر اند  مومن و مشرک و ترسا و مجوسی و جہود
گفتم اے شیخ ز حالت خبری دہ تحقیق  کہ دریں دم نفست بر من مسکیں بخشود
ایں چنیں حال مرا پیش نیامد ہرگز  چہ بیامد تو بخشانے و کن فیض وجود
پیر حال من آشفتہ چو در حیرت دید  بجواب آئینہ جان مرا پاک نزدود ،
نرم گفتا کہ مرا اوحد کرمانی دان  کہ بارشاد من آید در غیبت بشہود

ایک غزل میں جو افتاشۂ عالم پر کہی گئی فرماتے ہیں :۔

گر او حد دہد و ہر خویش باغی  ناگاہ روان شوی چو او حاد ،

(باقی)

---

# سوانح مولینا روم

اسلام کے مشہور صوفی متکلم مولینا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحمری ، فضائل و مناقب انکے تصوف کے اسرار علم کلام کے رموز اور مثنوی شریف اور اسکے منتخب مضامین پر تبصرہ ، قیمت عہر ، ضخامت ۳۴۴ صفحے ،

# فیہ ما فیہ

یعنی ملفوظات مولنا روم جو ایک نایاب کتاب تھی ، مولینا عبد الماجد بی اے دریابادی نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے اس کو مرتب کیا ، اور معارف پریس اعظم گڈھ میں چھپا ہی ، ضخامت ۲۴۲ صفحے ، لکھائی چھپائی نہایت عمدہ ہی ،

قیمت :۔ عہ

منیجر

# بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات

از

پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے، سابق وزیر تعلیمات، ریاست جوناگڈھ

مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں نہ صرف بے شمار کتب خانے مشرق و مغرب میں جمع کرکے عام و خاص کے لئے علوم و فنون کے خزانوں کا منہ کھول دیا، بلکہ سب سے پہلے فہرست نگاری کو فن کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا، اگر ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کا موجد مشہور ہے، تو ابن الندیم کو فن فہرست نگاری کا معلم اول کہنا چاہئے، اسکی کتاب الفہرست جسمیں ۳۷۷ھ تک علوم و فنون کی وہ تمام کتابیں جو زبان عربی میں ممالک عرب و عجم میں تصنیف ہوئیں، مع طبقات مصنفین ان کے مناقب و مثالب اور مختصر تبصرہ ان تمام علوم و فنون پر جو اسوقت تک ایجاد ہوئے، ایک شاندار علمی کارنامہ ہے جس کے متعلق مشہور مستشرق براؤن کہتا ہے:-

"زبان عربی کی کسی کتاب کے مطالعہ سے میرے دل میں اسکے مصنف کے تبحر علمی کی عظمت اس قدر قائم نہیں ہوئی، جتنی اس کتاب سے اور اسی اندازہ سے حسرت بھی کہ علوم کے کثیر التعداد اور بیش بہا ماخذ جو مصنف کے زمانہ تک دستیاب تھے، آج اون کا بہت کچھ حصہ برباد اور فنا ہو چکا ہے،"

(لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول، صفحہ ۳۸۳)

یہ ہماری زیادہ تر ہولناک سیل تاتار کا نتیجہ ہے، جو ان انمول جواہرات کو پانی کی

طرح بہائے گئی،

ابن الندیم نے جو نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، اسکی پیروی زمانۂ مابعد میں کتبخانون کی جدُا جدُا فہرست مرتب کرتے وقت ہوتی رہی، اور اسی کیساتھ مخطوطات کے سرورق پر توضیحات بھی درج ہوئے،

ہندوستان کے اسلامی عہد میں نہ صرف بادشاہوں اور امراء کے بیشمار کتب خانے ان کے ذوقِ علمی کی یادگار تھے، بلکہ ہر قصبہ اور قریہ میں متوسط الحال بھی اپنی بساط کےموافق کتابوں کا ذخیرہ جمع کرتے تھے، لیکن زمانہ کے انقلاب سے ان کتب خانوں کے لاکھوں مخطوطات آج ممالکِ یورپ کی مشہور لائبریریون کی زینت ہیں، اب ان کی فہرستوں کا پتہ بھی وہیں چلانا چاہئے،

چونکہ گل رفت وگلستان شد خراب بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب،

میسور اور اودھ کی اسلامی سلطنتون کو اگرچہ گردشِ دوراں نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے لیکن انکے کتبخانون کا ذکرِ خیر باقی رہ گیا ٹیپو سلطان کے شاہی کتب خانے کے دو ہزار مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست اسٹیورٹ نے ۱۸۰۹ء میں کیمبرج سے شائع کی، پھر اسپرنگر نے سلطنت اودھ کے آخری تاجدار کے کتب خانہ کی عربی فارسی اور اردو کتابوں کی فہرست ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شائع کی،

احاطۂ بمبئی میں اگرچہ عہدِ اسلامی جاہ وجلال، دولت وثروت اور علم وہنر کے لحاظ سے نہایت شاندار گذرا ہے، اور ایک زمانہ میں گجرات کا دار الحکومت احمد آباد اور شاہانِ دکن کے پایۂ تخت بیجا پور اور احمد نگر علم وہنر کے مرکز تھے، جہان بادشاہون امراء اور فضلا کے کتبخانوں میں ہزارون کی تعداد میں مخطوطات محفوظ تھے لیکن افسوس دستبردِ زمانہ سے ان کا شیرازہ بکھر گیا ۱۸۵۲ء میں بیجا پور کا شاہی کتبخانہ جو آثار محل میں محفوظ تھا، لندن منتقل ہو گیا، مگر اس مشہور شہر کے دوسرے کتبخانے تباہ وبرباد ہیں، یہی حال احمد آباد اور احمد نگر کے کتبخانوں کا ہے،

پچیس سال کا عرصہ گذرا، جب بڑودہ میں میری آنکھوں کے سامنے ایک افسوسناک واقعہ

پیش آیا جس کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا، ایک یوروپین سیاح قدیم نادر اشیاء کی تلاش میں بڑودہ آیا، ایک شریف زادہ جس کے بزرگوں نے مخطوطات کا ایک ذخیرہ جمع کیا تھا، معاش کی تنگی سے عاجز آکر اسکو چار سو روپیہ پر اس یوروپین کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہوگیا، سیاح وہ مخطوطات میرے پاس لایا، اور کہنے لگا کہ انکی ایک فہرست بنا دو، میں نے اس کی فرمایش پوری کردی، اس ذخیرہ میں اگرچہ ایسے مخطوطات نہ تھے، جو شائع نہ ہوچکے ہوں لیکن فارسی کی بعض درسی کتابیں نہایت خوشخط اور باتصویر تھیں، ایک دن وہ سیاح میرے پاس ایک البم لیکر آیا، اور کہنے لگا، دیکھو ان مخطوطات کی تصویروں کو کس طرح قینچی سے کتر کر میں نے یکجا جمع کردیا ہے، میں نے کہا تم نے بڑا ظلم کیا، کہنے لگا وہ مخطوطات جہاں تھے، عنقریب اکو کیڑے کھا جاتے، پھر ان میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو شائع نہ ہوچکی ہو، اسلئے میں نے ان کی تصاویر کا یہ البم تیار کیا ہے جمیں چار سو روپیہ خرچ ہوئے ہیں، ان کے عوض اب مجھے پیرس میں چار سو پونڈ سے کہیں زیادہ رقم وصول ہوگی، میرا بوجھ ہلکا ہوجائے گا مگر تھیلی بھاری،"

گورنمنٹ بمبئی نے اگرچہ مخطوطات کے تحفظ کا انتظام کیا ہے، لیکن ان کے دورِ حکومت میں جب قوم نے پرزور طریقہ سے اپنی آواز بلند کی، اسکی مراد برآئی، چنانچہ سنسکرت کی ۲۲ ہزار مخطوطات گورنمنٹ کی اعانت سے فراہم ہوکر پونہ کے بھنڈارکر انسٹیٹیوٹ میں محفوظ ہیں لیکن افسوس ہو کہ ہمارے سلف صالحین کی علمی یادگاریں اسی کس میرسی کی حالت میں تباہ وبرباد ہو رہی ہیں،

غنیمت ہے کہ سابق دکن کالج کے نامور پروفیسر خان بہادر شیخ عبد القادر صاحب ایم اے کو اس کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ممدوح نے ۱۹۱۶ء میں مخطوطات کی فراہمی اور تحفظ کے لئے ایک عرضداشت گورنمنٹ میں پیش کی، جو منظور ہوئی، اس طور سے شیخ صاحب نے مختلف مقامات سے ادب، تاریخ، فلسفہ، ریاضیات، الہیات، اور دیگر فنون کے ۴۱۱ مخطوطات جن میں بعض نادر اور نایاب اور اکثر غیر مطبوع ہیں

تین ماہ کے اندر جمع کر دیئے، یہ ذخیرہ گورنمنٹ نے بمبئی یونیورسٹی کے سپرد کیا، جس نے اپنے نسخوں کو بھی شامل کر کے کل ۲۴۴ مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست شیخ صاحب سے انگریزی میں تیار کرا کے گذشتہ سال کے آخر میں بمبئی سے شائع کی،

ڈاکٹر ریو، ایتھے اور براؤن کی مشہور توضیحی فہرستیں دیکھنے کے بعد عام طور سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے، کہ فاضلانہ رنگ میں مستشرقین ہی فہرست نگاری کا حق ادا کر سکتے ہیں، لیکن شیخ صاحب موصوف نے چراغ و بوریا والی قدیم مکتبی تعلیم کے ساتھ بمبئی یونیورسٹی کی صرف ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے، اور جو ہندوستان سے باہر جانا کیا معنی، مدراس اور لاہور بھی نہیں گئے ہیں، ایسی وسعت معلومات، تحقیق اور دقت نظر سے فہرست مرتب کرتے ہیں، کہ ہم ایسے پرانی لکیر کے فقیروں کو بھی حیرت ہوتی اگر لسان الغیب کا یہ شعر یاد نہ آتا، ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید  دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد،

آج علمائے یورپ کی علمی تحقیقاتوں کو کون غلط ثابت کرے، جب کہ بقول علامہ شبلی مرحوم حالت یہ ہے،

یورپ ار گپ زند آن نیز مسلّم باشد،

لیکن یہ شیخ صاحب کے آہنی قلم کی جنبش ہے، جس نے اس طلسم کو توڑا، اور ڈاکٹر ریو، ایتھے، براؤن وغیرہم مستشرقین کی غلطیوں کو درست کر کے تحقیق کی داد دی، ذیل میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں، :-

ا- اشجار و اثمار، (فہرست صلا)

یہ ایک نایاب نسخہ ہے، جو اتبک کہیں شائع نہیں ہوا، اس کا مصنف علی شاہ محمد بن قاسم الخوارزمی ہے، براؤن نے کتاب کے ایک مصرعہ "شش و ہفتاد و صد و بعد ہزار" سے سنہ تالیف ۱۱۷۶ھ

قیاس کیا اسی سنہ کو نکلسن نے براؤن کے مخطوطات کی فہرست کیمبرج سے ۱۹۳۲ء میں شائع کرتے وقت درج کیا ہے، لیکن شیخ صاحب نے جب نسخہ کو غور سے پڑھکر مصنف کے حالات زندگی جو جستہ جستہ تحریر تھے، جمع کرکے ہم واقعات کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ۶۰۳ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں یہ کتاب تصنیف ہوئی یعنی اس وقت بخارا کے قتل عام کو جو ۶۱۶ھ میں آبا قاآن کے حکم سے عمل میں آیا، پندرہ سال گذر چکے تھے، جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے،

شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ اشجار و اثمار کا ذکر کشف الظنون میں موجود ہے، چونکہ کشف الظنون ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۷ء میں تالیف ہوئی، اس لئے یہی ایک شہادت براؤن کی تردید میں کافی تھی، لیکن شیخ صاحب کی ایسی طلب طبیعت کو صرف ایک شہادت سے کیا تسکین ہوتی، انھوں نے فہرست کے چار صفحوں میں شہادتیں جمع کرکے ایسے دلچسپ انتخابات نقل کئے ہیں جن سے ضمناً دوسرے واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے، مثلاً انوری کی وہ مشہور طوفان باد والی پیشین گوئی جو غلط ثابت ہوئی، اور جو شاعر کی تحقیر و ذلت کا باعث ہوئی، اسکو مؤلف اشجار و اثمار نے قرانات کے حساب سے چنگیز خان کی ولادت کا سال قرار دے کر طوفان خون سے تعبیر کیا ہے،

۲- نامۂ خیالات (فہرست ص ۳۳)

ڈاکٹر ایتھے اور آئیونو (روسی فاضل جو آج کل بمبئی میں فرقۂ اسمٰعیلیہ کے متعلق مصروف تحقیق ہے) دونوں نے امیر خسرو دہلوی کو اس کتاب کا مصنف قرار دیا ہے، اور لکھتے ہیں کہ اس کا دوسرا نام انشاے امیر خسرو ہے، جو اعجاز خسروی کے بعد لکھی گئی، لیکن شیخ صاحب نے کتاب کی داخلی شہادتوں سے ثابت کیا ہے، کہ مصنف نے ان خطوط میں جہاں رومی، نظامی، سنائی، عطار کے اشعار نقل کئے ہیں، وہاں حافظ، کاتبی، شاہی، ہلالی، اور طالب، کلیم کے اشعار بھی درج کئے ہیں، حالانکہ آخر الذکر چھ شعرا امیر خسرو سے بہت بعد گذرے ہیں، پھر ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ذکر بھی نامۂ خیالات میں موجود ہے، حالانکہ ابوالفضل کا انتقال

امیر خسرو سے ۲۰۶ برس بعد ہوا ہے، اسلئے نامۂ خیالات امیر خسرو کی تصنیف ہرگز نہیں ہے،

کتاب کا آغاز اس طور سے ہوتا ہے:۔

"عنوان نامۂ خیالات از مثنوی صاحب کمالات صوری و معنوی امیر خسرو دہلوی بہانا ست"

ایتھونو اپنی فہرست میں کتاب کا نام بجائے نامۂ خیالات کے عنوان نامۂ خیالات لکھتا ہے، یہ ہے مستشرقین کی سخن فہمی!!

۳- مظہر العجائب (فہرست صفحہ )

ڈاکٹر ریو، ایتھے، براؤن، اور ایتھونو بالاتفاق کہتے ہیں، کہ یہ کتاب شیخ فرید الدین عطار کی سن کہولت کی تصنیف ہے، لیکن ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے مشہور پروفیسر محمود شیرانی نے رسالۂ اردو اورنگ آباد کے جنوری نمبر میں ایک فاضلانہ مضمون لکھکر کتاب کی اندرونی داخلی شہادتوں سے ثابت کر دیا کہ شیخ عطار کی طرف اس کتاب کو منسوب کرنا ایک افترائے عظیم ہے، شیخ صاحب نے اسی مضمون کی تمہید کو انگریزی کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے

اصل یہ ہے کہ سولھویں صدی کے آغاز میں جب شاہ اسمٰعیل صفوی نے اثنا عشریت کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا، تو در پردہ یہ بھی کارروائی کی گئی، کہ مشہور شعراء اور فضلاء کی طرف ایسی تصانیف منسوب کر دی گئیں جن سے ان کا مذہب تشیع کا حامی اور خلفائے ثلثہ کے سب و شتم کا قائل ہونا ثابت کیا جا سکے، چنانچہ ایک ہی صدی کے اندر یہ حالت ہو گئی، کہ عہد جہانگیر میں قاضی نور اللہ شوستری نے اپنی کتاب مجالس المومنین میں اکثر مشہور سلاطین علماء و فضلاء اور شعراء کو شیعہ اثنا عشریہ لکھدیا، اور بعض کتابیں جنمیں غلو کیساتھ تشیع کی تعلیم تھی، ان کی جانب منسوب کر دیں، مثلاً سر العالمین، امام غزالی کی طرف، اور مظہر العجائب، شیخ عطار کی طرف وغیرہ وغیرہ، حیرت ہے کہ وہ عطار جسکو عارف رومؒ سے

"عطار روح بود و سنائی دو چشم ما

کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ عطار جس کا توحید و عرفاں میں ڈوبا ہوا سچا مسلک تنگ نظر ظاہر بین فرقہ پرستوں سے یوں خطاب کرتا ہے :-

تو علیؓ دانی و بوبکرؓ اے پسر / و ز خدا و عقل و جانی بے خبر

یا چو ایشاں جاں فشاندن پیشہ گیر / یا خموش و ترک ایں اندیشہ گیر

(کاش ہمارے لکھنؤ کے شیعہ اور سنی بھائی اس پر غور کرتے!)

وہ عطار جو عشق حقیقی کے درد سے بیتاب یوں دعا کرتا ہے :-

کفر کافر را و دیں دیندار را / ذرۂ دردت دل عطار را

وہی عطار مظہر العجائب میں آسمان سخن سے اتر کر عامیانہ تبرا بازی کی خندق میں گر پڑے مستشرقین اس نکتہ کو کیا سمجھتے لیکن مرزا عبد الوہاب قزوینی جو پروفیسر براؤن کے دست راست سے انھوں نے بھی حق پوشی کرگئے، اگرچہ دبی زبان سے اسقدر تو لکھنے پر مجبور ہوگئے :-

"اشعار ایں کتاب بانسبت بسائر اشعار عطار تفاوت واضح وار دو در سستی و سستی و قدرے رکاکت، وہرکس منطق الطیر والٰہی نامہ و خسرو گل، و دیوان عطار را مطالعہ کردہ باشد براے او قدرے مشکل است اعتقاد کند، کہ صاحب مظہر العجائب با آنہا یکے بودہ است"

(دیباچہ تذکرۃ الاولیا مرتبہ نکلسن)

۴۔ قصیدہ مصنع (فہرست ص ۱۵)

قوامی کے مشہور قصیدہ مصنع میں حسب ذیل شعر

چیست آن دور در اصل او نزدیک / چیست آن فرد و فعل او بسیار،

خام او ہر چہ عقل را پختہ، / مست او ہر چہ عقل را ہوشیار،

پروفیسر براؤن سے حل نہ ہوسکا، اسی طرح صنعت مجرد بھی جو اس قصیدہ کے شعر نمبر ۶ میں

پائی جاتی ہے ممدوح کی سمجھ میں نہیں آئی، شیخ صاحب نے دونوں کو حل کیا ہے، مذکورہ بالا شعر سے عشق نکلتی ہے اور صنعت مجرد سے یہ مراد کہ حروف تہجی کے کسی ایک حرف کو لیکر یہ التزام رہے کہ وہ حرف شعر میں نہ آنے پائے، چنانچہ قوامی کے قصیدہ مصنع کے شعر نمبر ۲، میں حرف الف کو خارج کیا ہے،

پروفیسر براؤن جہاں کچھ نہیں سمجھتے، عالی ظرفی سے اپنے قصور فہم کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن ڈاکٹر ایتھے فارسی دانی کے اظہار میں بُری طرح ٹھوکر کھاتے ہیں، انڈیا آفس کی فہرست میں جہان ہفت اقلیم امین رازی کا تذکرہ کیا ہے، ملاحظہ ہو،

قاضی زادہ کرہرود موسوم بہ قاضی جہان کو حضرت علی مرتضیٰ کی شان میں گستاخی کے باعث شاہ طہماسپ صفوی قید کرتا ہے، اصل عبارت یہ ہے کہ "قاضی جہان نسبت بہ شاہ اولیا استخفاف ورزیدہ" ڈاکٹر ایتھے شاہ اولیا کو شاہ طہماسپ سمجھتے ہیں، پھر لکھتے ہیں، :- کہ قاضی جہان بادشاہ کی شان میں گستاخی کے باعث قید ہوا، حالانکہ اہل علم پر پوشیدہ نہیں ہے، کہ شاہ اولیا سے مراد حضرت علی مرتضیٰ ہیں، شاہ طہماسپ کے عہد میں اکثر سنی شعرا، اور علمار کو جنھوں نے حضرات شیخین کی تعریف میں غلو سے کام لیکر حضرت علی مرتضیٰ کا ذکر بے ادبی سے کیا سزا دیگئی ہے،

اسی طرح تبریز کے قاضی امیر عبد القادر کے قتل کی تاریخ ڈاکٹر ایتھے نے

"آہ شہید میر عبد القادر"

سے سنہ ۹۸۷ھ نکالی، پھر لکھتا ہے، یہ تاریخ غلط ہے، کیونکہ قاضی مذکور کا قتل ۹۸۹ھ میں واقع ہوا، شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ آہ میں الف ممدودہ کے ۲ اور میر کو امیر پڑھنا چاہئے، تب ۲ کی کمی پوری ہو جاتی ہے، اور آہ شہید امیر عبد القادر سے ۹۸۹ھ نکل آتے ہیں، شیخ صاحب کی یہ اصلاح درست ہے لیکن اپنی فہرست کے صفحہ ۶، میں مولینا امیدی کی تاریخ شہادت میں جو اصلاح دی ہے وہ صحیح نہیں ہے امیدی کے شاگرد نامی نے مصرعۂ ذیل :-

آہ از خونِ ناحق من آہ،

سے مستند کی تاریخ قتل نکالی تھی، ڈاکٹر اِتھے لکھتے ہیں، کہ اس مصرع سے ۹۲۵ھ نکلتے ہیں، حالانکہ سیدی کا قتل ۹۲۹ھ میں واقع ہوا، اسلئے مصرعہ میں غلطی ہے، شیخ صاحب نے مصرعۂ بالا کو یوں بدل دیا، اور استخراج کی طرح الف ممدودہ کا ایک شمار کرکے

آہ زخونِ ناحق من آہ آہ

سے ۹۳۰ نکالے ہیں، لیکن شیخ صاحب کو یہ علم نہ تھا، کہ حال میں صفویوں کی قدیم تاریخ کا ایک نادر نسخہ احسن التواریخ مصنفہ حسن روملو (ولادت ۹۳۷ھ) مسٹر سیڈن نے گائیکواڑ سیریز میں شائع کیا ہے (جسکے پروف میں نے دیکھے ہیں) اس کتاب کے ص ۱۷۷ میں ۹۲۹ھ کے واقعات کے تحت میں مولانا سیدی طہرانی کا ذکر ہے، اور نامی کی پوری تاریخ اس طور سے درج ہے،

نادر العصر اسیدی مرحوم      چو بناحق شہید شد ناگاہ

شب بخواب من آمد و میگفت      کاے ز حالِ درونِ من آگاہ

بہر تاریخ قتلِ من بنویس      آہ از خونِ ناحقِ من آہ

آخری مصرعہ سے ۹۲۰ نکلتے ہیں، ایا کا تعمیہ مصرعۂ ماقبل سے اس طور سے ۹۲۹ھ ہوتے ہیں

شیخ صاحب نے اپنی فہرست کے چالیس صفحوں میں ہفت اقلیم کے ایک حصہ کا ملخص انگریزی میں درج کیا ہے، اور اگر یونیورسٹی کی طرف سے یہ بندش نہ ہوتی، کہ فہرست ایتھے وغیرہ مستشرقین کے اتباع میں تیار کیجائے، تو وہ دوسرے نایاب نسخوں کا جو اب تک شائع نہیں ہوئے، منتخب ترجمہ داخل فہرست کرتے، پھر بھی انھوں نے فردوسی کے متعلق مفید معلومات درج کئے ہیں، محمود شبستری کی گلشن راز اور عرفی کے کلیات کی مختلف شرحوں کا حوالہ دیا ہے، اور پارسیوں کے قصۂ سنجان اور روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے، صائب کا کلیات جس پر سنہ کتابت ۵ ذی حجہ ۱۰۸۱ھ درج ہے، اس کے اس صفحہ کا فوٹو دیا ہے جس پر خود صائب

کے قلم سے تین غزلیں حاشیہ پر "راقمہ" کے تحت میں درج ہیں، (دیکھو فہرست ص ۱۲۵) اسی طرح فہرست کے صفحہ ۱۰۱ میں دیوان ظہوری کے ایک صفحہ کا فوٹو دیا ہے، جس پر ظہوری کے قلم سے ایک غزل درج ہے، اس دیوان کی یہ خصوصیت ہے، کہ اسکی نظر ثانی خود ظہوری نے کی، اور اپنے قلم سے چند غزلیں بھی لکھدیں، اس نسخہ میں بہت سی رباعیاں بھی ہیں، جو مطبوعہ دیوان ظہوری میں حذف ہیں،

دیوان ابن یمین (دیکھو فہرست ص ۵۴)

علمائے مشرق و مغرب بالاتفاق کہتے ہیں، کہ ابن یمین کی زندگی ہی میں ان کا دیوان سربداران کے ہنگامہ ۷۴۲ھ میں ضائع ہو گیا، یہ افسوسناک واقعہ صحیح ہے، لیکن ادب کے شائقین کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی، کہ شیخ صاحب کو دوسرا دیوان جسے خود ابن یمین نے ہنگامۂ مذکورۂ بالا کے دس برس بعد جمع کیا تھا، بیجاپور سے ہاتھ آگیا، اس کے ثبوت میں آپ نے رسالہ احوال ابن یمین مولفہ رشید یاسمی مطبوعہ طہران ۱۳۱۸ھ سے ابن یمین کی حسب ذیل عبارت جو اسکے دیوان کے دیباچہ میں درج تھی نقل کی ہے،

دیریست کہ اندیشۂ آن دارم باز     گر دور فلک نہ دارد از کارم باز

کاشعار پراگندہ چو ہفت اورنگم     ماتندہ پروین بنظام آرم باز،

"القصہ بطولہا بیتے چند ازان کہ پیشتر گفتہ شدہ بود، از جرائد افاضل نامدار و سفائن اماثل روزگار التقاط کردہ شد، و آنچہ بعد ازان اتفاق افتاد، بران الحاق کردہ آمد، و دیوان دیگر چنان کہ آید نہ چنان کہ باید در سلک کتاب منتظم گشت۔۔۔۔ وجری ذالک غرۂ شوال بسنۃ ثلث و خمسین وسبعمائۃ واحد بویہ"،

۱۸۵۲ء میں ڈورن نے سینٹ پیٹرس برگ کے کتب خانہ کے مخطوطات کی فہرست ص ۲۵۵ میں لکھا تھا، کہ اس نسخہ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن یمین نے خود یہ دیوان ۷۵۶ھ میں ترتیب دیا، لیکن ڈاکٹر ایتھے نے دعوی کیا کہ یہ غلط ہے، پھر کتب خانہ بانکی پور کے فہرست نگار مولوی عبد المقتدر نے ڈاکٹر

ایتھے کی تائید کی، اور لکھا کہ غالباً ابن یمین کے کسی دوست نے اسکو جمع کیا ہوگا، یہ اسلئے کہ ڈاکٹر ریو اور ایتھے کے نزدیک ابن یمین کی وفات جیسا کہ اکثر تذکروں میں درج ہے، ۷۴۵ھ لکھی ہے، شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ سب سے قدیم ماخذ فصیحی کا مجمل ہے، جسے براؤن نے نقل کیا ہے، اس میں ابن یمین کی وفات ۸ جمادی الثانی ۷۶۹ھ درج ہے، اسی تاریخ کو اعتماد السلطنۃ نے اپنی منتظم ناصری میں نقل کیا ہے، شیخ صاحب نے اور ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے، لکھتے ہیں کہ شعر العجم جلد دوم ص۲۴۱ میں آزاد کی ید بیضا سے حسب ذیل تین شعر نقل ہوئے ہیں،

سرمہ اے دیدہ ہر دم اشک غماز مرا ۱ تا نسازد فاش پیش مردمان راز مرا

ز خود بیگانہ بودن در رہ عشق ۲ بہ آن معشوق طرح آشنائی ست

عشق تا در دلی آمد نہ در آمد نہ نمود ۳ بادہ پر شور نشد تا کہ بہ مستان نہ رسید

یہ تینوں اشعار اس نسخہ میں موجود ہیں، تیسرا شعر اس طور سے درج ہے، اور یہی صحیح ہے،

عشق تا در دل آدم نہ در آمد نہ نمود بادہ پر شور نشد تا کہ بہ مستان نہ رسید

ہشت بہشت (فہرست ص۹۵)

ترکان آل عثمان کی یہ سب سے قدیم تاریخ ہے، جس کا مصنف حکیم الدین ادریس ابن حسام الدین علی بدلیسی ہے ۹۱۲ھ میں سلطان بایزید ثانی کے حکم سے اس نے یہ تاریخ نثر فارسی میں تاریخ گزیدہ اور وصاف کے طرز پر لکھی، جس میں سنہ ۶۹۹ھ سے ۹۰۸ھ تک کے حالات قلم بند ہیں، آٹھ سلاطین کا اسمیں ذکر ہے، اس مناسبت سے ہشت بہشت نام رکھا، دوسرا نام کتاب الصفات الثمانیہ فی اخبار القیاصرۃ العثمانیہ ہے، یہ تاریخ آٹھ کتیبیا دفتر میں منقسم ہے، ہر کتیبہ میں ایک سلطان کا تذکرہ عثمان بیگ غازی (۶۹۹ھ تا ۷۲۶ھ) سے شروع ہو کر سلطان بایزید ثانی (۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ) پر ختم

ہوتی ہے، ترکان آل عثمان کی تاریخ کے اس قدیم ماخذ کے صرف تین کامل نسخے یورپ میں موجود ہیں، شیخ صاحب کو کتبۂ معظم ملا ہے، جس میں صرف ۲۹۰ ورق ہیں، اور ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں، حالانکہ یہ ایک بہت ضخیم تاریخ ہے، اسکی ضخامت کا حساب عجیب طور پر ہے، عموماً قدیم نسخوں میں اوراق و صفحات کا شمار درج ہوتا ہے، یا ہر ورق میں صفحہ آیندہ کا پہلا لفظ لکھ دیتے ہیں، لیکن ہشت بہشت میں بیت سے شمار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اسمیں اسی ہزار بیت ہیں، شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت لفظ بدلیسی میں کلیمنٹ ہوارٹ لکھتا ہے، کہ ہشت بہشت میں اسی ہزار اشعار (ورس) ہیں حالانکہ یہ نثر کی کتاب ہے، مولینا روم کی کتاب فیہ ما فیہ جسے مولینا عبد الماجد نے شائع کیا، اسکے متعلق بھی نکلسن نے لکھ دیا تھا، کہ اس میں تین ہزار ورس ہیں، حالانکہ وہ نثر ہے،

انگریزی میں اگرچہ ورس نظم اور نثر دونوں کے لئے مستعمل ہے، (دیکھو نیو اسٹینڈرڈ ڈکشنری جلد چہارم ص ۲۶۷۵) اسی لئے قرآن مجید اور انجیل کے آیات کو ورس لکھتے ہیں، حالانکہ وہ نثر میں ہیں، لیکن بیت کا ترجمہ ورس کرنا خامی از اشتباہ نہیں، مستشرقین کو چاہئے تھا کہ ہشت بہشت اور فیہ ما فیہ کے بیت کیلئے لائن لکھتے نہ ورس،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین عثمانیہ کے قلمرو میں قدیم نسخوں میں سطروں کا شمار کرکے ان کو بیت لکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہشت بہشت میں اسی ہزار بیت ہیں، اب اگر ہر صفحہ میں مثلاً بیس سطریں لکھیں تو کامل نسخہ چار ہزار صفحات کا ہوتا ہے، اسی طرح فیہ ما فیہ میں تین ہزار بیت ہیں، جسکے ڈیڑھ سو صفحات ہوئے،

ہشت بہشت کا ناتمام نسخہ شیخ صاحب کو بیجاپور سے ملا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف عادل شاہ بانی سلطنت بیجاپور جو سلطان مراد (وفات ۸۵۴ھ) کی اولاد میں سمجھا جاتا تھا، (دیکھو فرشتہ مقالہ سوم روضہ دوم) اور جس نے ۸۹۵ھ سے ۹۱۶ھ تک حکومت کی، اس کے زمانہ میں یہ نسخہ ہندوستان آیا، کیونکہ ہشت بہشت کا سال اختتام ۹۱۲ھ ہے، شیخ صاحب کو ساتوان کتبہ ملا ہے جس میں سلطان

محمد ثانی (وفات [illegible]ھ) کا تذکرہ ہے، یعنی یوسف عادل شاہ کے بڑے بھائی کا،

شیخ صاحب کو بعض ایسے نایاب نسخے بھی مل گئے ہیں، جو نہ ابتک شائع ہوئے ہیں، اور نہ یورپ کے مشہور کتبخانوں کی فہرستوں میں ان کا ذکر ہے، ان میں منشآتِ شاہنواز خان خصوصیت کیساتھ قابلِ ذکر ہے، (دیکھو فہرست ص۱۱)

اس نسخہ کے سرورق پر "مجموعۂ خطوط" لکھا تھا، اور دیباچہ کے ابتدائی چند اوراق گم، لیکن شیخ صاحب نے خطوط کو غور سے پڑھکر تاریخی واقعات، اسماء اور مقامات سے پتہ چلایا کہ مآثر الامرا کے مشہور مصنف نواب عبدالرزاق شمس الدولہ شاہنواز خان وزیر نظام الملک آصفجاہ و ناصر جنگ کے خطوط کا یہ مجموعہ ہے،

غلام علی آزاد نے دیباچۂ مآثر الامرا میں جہاں شاہنواز خان کی سوانحِ حیات لکھے ہیں، لکھا ہے:-

"شخصی بے بدل بود و انشا، او در خطوط نویسی طرز خاصے دارد حیف کہ منشآتِ او جمع نشدا
گر مدون می یافت چشم ناظران را کحل الجواہر می کشید"

لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ بعد کو کسی نے یہ مختصر مجموعۂ خطوط جمع کیا ہے، جیسا کہ اس نسخہ کے آغاز میں تحریر ہے،

"اگرچہ تحریراتش بسیار زیادہ ازین مجموعہ مختصر بودہ، امابالفعل ہرچہ فراہم شد ثبت افتاد"

شاہنواز خان دولت آصفیہ حیدرآباد کے وزیر تھے، برار کے دیوان بھی رہے، ولادت ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۱۷۱ھ ساٹھ برس کی عمر میں بمقام اورنگ آباد شہید ہوئے،

مجموعہ کے اکثر خطوط تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، اور اس عہد کی پر پیچ ملکی سیاست پر جب انگریز فرانسیسی پیشوا اور نظام آپس میں لڑتے تھے، روشنی ڈالتے ہیں، یہ اس قابل ہیں، کہ ان کے شائع کرنے کی جلد کوئی سبیل نکالی جائے، ایک صورت یہ ہے کہ شاہِ دکن اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی سلور جوبلی عنقریب ہونے والی ہے، اگر ہمارے محترم بزرگ مولینا نواب صدر یار جنگ بہادر کوشش فرمائیں

تو امید قوی ہے، کہ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے جشن سیمیں کی ایک یادگار گب موریل سیریز کے طور پر قائم ہو جائے، اور نایاب اور نادر الوجود مخطوطات کے شائع کرنے کا انتظام خواہ جوبلی فنڈ کی ایک رقم سے یا نیا فنڈ قائم کرنے سے ہو سکے، اور اسی کے ساتھ ایک فہرست اُن نادر اور نایاب مخطوطات کی جو ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہوں، اور اب تک کہیں شائع نہ ہوئے ہوں تیار کی جائے، اس کام کے لئے شیخ صاحب نہایت موزوں ہیں،

## مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں ہندوستان کی جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہو جاتا ہے، مولنا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ انکا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب وملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت: ۱۲؍

## ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتے، مولوی ابو الحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تلاش وتحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا، اور جسکو اہل نظر نے بے حد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، کتاب مصنف کے ذوق تحقیق کی آئینہ دار ہے، اور مفید اور پر از معلومات ہے، ضخامت ۱۳۲ صفحات، قیمت ۱۲؍

"منیجر"

از

جناب صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

معارف جلد ۲۵ میں "مسلمان جغرافیہ دان" کے عنوان سے ماہ مئی ۱۹۳۰ء سے ایک سلسلۂ مضمون شائع ہونا شروع ہوا تھا جو فرانسیسی مستشرق کارادووو (Carrade Vaux) کی کتاب مفکرے اسلام (Penseurs de l'Islam) جلد دوم سے ماخوذ تھا لیکن افسوس کہ بعض وجوہ سے اسکے صرف چند نمبر چھپ سکے تھے، اب ہمارے دوست پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے اس سلسلہ کی مزید کڑیاں بھی فرانسیسی زبان سے ترجمہ کرکے عنایت کی ہیں جو ذیل میں پیش ہیں

"سب اڈیٹر"

عرب جغرافیہ نگار ہوتے تھا مع اخبار اور بیا اوقات اہل مشاہدہ ہونیکی حیثیت کہ اپنی سادہ بیانی میں ممتاز ہیں تاہم وہ چند جغرافی نظریے رکھتے ہیں جنھیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں،

**زمین کی گولائی،** ان کے نظریہ کا پہلا اصول زمین کی گولائی ہے، اس عقیدہ کی ابتدا فیثا غورس سے ہوئی، اور چوتھی صدی قبل مسیح کے وسط میں یہ نظریہ تقریباً سب لوگوں میں پھیل گیا، قدما نے اسکے ثبوت میں بہت سے دلائل پیش کئے ہیں، جو آجکل بالکل عجیب معلوم ہوتے ہیں، وہ طریق استدلال استخراجی ہے، مثلاً زمین نہ تو مسطح ہو سکتی ہے اور نہ کھوکھلی، نہ مکعب ہے اور نہ مخروط اسلئے یہ گول ہے یہ استدلال پوسی ڈونی اس (Posidonius) کا ہے، اور بطلیموس اسی کا تتبع کرتا ہے، اس کے علاوہ

بطلیموس، کلومید (Cleomede) اور ثیون (Theon) کی طرح ایک قرین قیاس دلیل بھی پیش کرتا ہے؛ وہ یہ ہے کہ ہم ماورائے افق اشیا مثلاً پہاڑ، جہاز کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن یہ بات زمین کے محدب ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ کہ مدور ہونے پر، ارسطو اس سے زیادہ قرین صحت دلیل پیش کرتا ہے، اگرچہ وہ مقبول عام نہ ہوئی، وہ یہ کہ کسوف میں زمین کا سایہ سطح ماہ پر ہمیشہ گول ہوتا ہے،

عربوں میں سے ابو الفدا زمین کے مدور ہونے کی حسبِ ذیل دلیل پیش کرتا ہے، مشرق میں ستارے جلدی طلوع اور غروب ہوتے ہیں، جب کوئی شخص شمال کی جانب بڑھے، تو قطب اور شمالی ستارے طلوع ہوتے ہیں، اور اسی طرح اگر کوئی جنوب کی طرف بڑھے، تو جنوبی قطب اور ستارے نظر آنے لگتے ہیں اور جتنا زیادہ سفر کیا جائے اتنی ہی زیادہ یہ بات واضح ہوتی ہے، یہ عرب جغرافیہ نگار لکھتا ہے، کہ پہاڑوں اور نچائیوں کا وجود زمین کی گولائی میں حارج نہیں ہوتا، یہ چیزیں زمین کی وسعت کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں،،۔

"ہیئت داں ثابت کر چکے ہیں، کہ آدھ فرسنگ اونچا پہاڑ کرۂ ارض کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتا ہے، جو جَو کے دانے کے پنچیسویں حصے کو ایک ذراع قطر والے کرہ سے ہو سکتی ہے"

قدما اور خاص کر ثیون کا بھی یہی بیان ہے، قدما اور عرب دونوں کا یہ خیال ہے کہ زمین کرات سماوی کے مقابلے میں صرف ایک نقطہ ہے، یہ بیانات ان احساسات کا آئینہ ہیں، جو مختلف کرات کے باہمی تفاوت بعد و حجم کو معلوم کرنے سے پیدا ہوتے ہیں، اسی مسئلۂ تفاوت کا پورا پورا حل بعد میں حساب جزئیات (Differential calculus) سے کیا گیا ہے، ابو الفدا کا وہ بیان جس میں وہ تین آدمیوں کے واپسی پر ایک جگہ ملنے کا ذکر کرتا ہے، بلاشبہ ایک نیا خیال ہے، ان تینوں آدمیوں میں سے دو کرۂ ارض کے سفر کیلئے روانہ ہوتے ہیں، ایک مشرق کی جانب اور دوسرا مغرب کی جانب اور تیسرا شخص اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، جو شخص مغرب کی جانب روانہ ہوتا ہے، وہ اپنے مکمل دورے میں

ایک دن بچا لیتا ہے، مثلاً وہ اپنے خیال میں جائے روانگی پر جمعرات کو پہنچا ہے، تو دراصل وہ جمعہ کا روز تھا،
سنہ ۱۵۲۲ء میں اس امر کی تجربۃً تحقیق کی گئی جب سبسٹین ڈل کینو (Sebastian del Cano) میگلن (Magellan) کا ساتھی تین سال کے سفر کے بعد مغرب کی جانب سے روانہ ہو کر مشرق کی جانب سے اسپین واپس آیا۔ قدما کی طرح عرب بھی یہی سمجھتے تھے کہ زمین کے گرد خواہ وہ آباد ہو یا غیر آباد، ایک سمندر محیط ہے، ان کا بلاشک یہ خیال تھا کہ یہ سمندر ایک بڑا گول دریا ہے، وہ اسکو بحر محیط کہہ کر پکارتے تھے، یعنی جو سمندر احاطہ کئے ہوئے ہو، یہ ایک قدیم خیال ہے، اور ان لوگوں کے عقیدے کے زیادہ مطابق و مناسب ہے، جو زمین کو ایک تیرتا ہوا قرص سمجھتے ہیں، بہ نسبت اس عقیدے کے جو اسکو ایک کرہ سمجھتے ہیں، ہومر سمندر کو ایک دریا سے تشبیہ دیتا ہے، جو زمین کے گرد احاطہ کئے ہوئے ہے، اصل میں یہ ایک ایسا خیال ہے جسکی بنیاد افسانوں پر ہے، اور جو ترقی یافتہ علم کے زمانہ تک قائم رہا ہے،

**کرۂ ارض کی تقسیم،** قدما نے کرۂ ارض کو خط سرطان، خط جدی اور دائرۂ قطبی کے ذریعہ پانچ منطقوں میں تقسیم کیا تھا جس طرح اب بھی کیا جاتا ہے، پوسی ڈونی اس ان منطقوں کے اختراع کو پرمی نائڈ (Parmenide) کی طرف منسوب کرتا ہے،

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جغرافیہ نگار اس تقسیم کی طرف زیادہ مائل نہ تھے، بلکہ وہ اقالیم کی تقسیم کو استعمال میں لاتے تھے، اقالیم کی تقسیم اراتستینس (Eratosthenes) کی کی ہوئی ہے، ان اقالیم کو عرض بلد کے ذریعہ ظاہر نہ کیا جاتا تھا، بلکہ سال کے بڑے سے بڑے دن کے طول کے ذریعہ، چنانچہ مارو (Maroe) (مصر) میں سب سے بڑا دن تیرہ گھنٹے کا ہوتا ہے، سین (Syene) میں ساڑھے تیرہ گھنٹے کا، اور اسکندریہ میں چودہ کا، اسلئے اقالیم کی وسعت غیر متعین ہے،

**طول بلد و عرض بلد،** ابو الفدا بھی اقالیم کے حدود قائم کرتا ہے، ہر اقلیم کے کنارے اور وسطی علاقہ پر سب سے بڑے دن کے طول کو، اور ساتھ ہی اسکے متعلقہ عرض بلد کو بھی ظاہر کرتا ہے، لیکن اس نے اپنی کتاب کو

اقالیم کے لحاظ سے تقسیم نہیں کیا، یعقوبی نے بھی اس سے بڑھکر کچھ نہ کیا، ادریسی اسکے خلاف چلا، اور متعدد جغرافیہ نگار اسی نظام کے پابند رہے، عربوں نے اقالیم کے خیال کو بطلیموس سے لیا، جس نے اروسٹھنیز کی تقسیم میں کسی قدر تغیر کر لیا، (کرونومیٹر) کی ایجاد سے پہلے طول بلد کا صحیح اندازہ لگانا نہایت دشوار امر تھا، طول بلد کو معلوم کرنے کا قدیم طریقہ یہ تھا، کہ دو بعید الفاصلہ مقاموں مثلاً روڈس اور اسکندریہ میں کسوف قمر و ماہ یا کسوف نجم (ستارہ) کے مشاہدہ کرنے اور اس واقعہ کے دونوں جگہ ظہور پذیر ہونے کے وقت کو لکھ لیتے، جو فرق ان دونوں وقتوں میں ہوتا، وہ دونوں مقاموں کے نصف النہار کا فرق سمجھا جاتا، اروسٹھنیز کی کتاب میں یہی طریقہ پایا جاتا ہے، ہپارکس ([illegible]) اور بطلیموس نے بھی یہی طریقہ استعمال کیا ہے، موخر الذکر نے بھی مقدم الذکر کے وقت کے متعلق مشاہدات کی مدد سے طول بلد نکالا ہے، اس کے بعد لوگ اگر کسی جگہ کے مقام کو قائم کرنا چاہتے، تو اس جگہ اور کسی دوسری جگہ سے جس کا طول البلد پہلے سے معلوم ہوتا، درمیانی راستوں کے فاصلہ کا اندازہ لگا کر قائم کرتے، دراصل قدما نے براہ راست بہت کم طول بلد معلوم کئے، سڑکوں (راستوں) کے فاصلوں کا تخمینہ بہت مشکوک ہوتا، بطلیموس نے عرض بلد اور طول بلد میں بڑی بھاری غلطیاں کی ہیں، قدماء کا ابتدائی خط نصف النہار کے انتخاب میں اختلاف ہے، ہپارکس نے اپنے وطن روڈس کے خط نصف النہار کو ابتدائی مانا ہے، بطلیموس نے اس خط نصف النہار کو ابتدائی انتخاب کیا ہے، جو دنیا کے مغرب میں جزائر خالدات سے گذرتا ہے،

عربوں نے اس معاملہ میں کوئی نمایاں علمی ترقی نہیں کی، وہ اسی قدیم طریقے کو جو مشاہدہ کسوف پر مبنی تھا، مانتے تھے، طول بلد کو انھوں نے بطلیموس کی کتاب جغرافیہ اور ایک دوسری کتاب سے لیا ہے، جو جغرافیہ بطلیموس کی نقل معلوم ہوتی ہے، اور جس کا نام رونما در ربع مسکون ہے، ان کے ایسے نقشوں میں جن کا ہمیں علم ہے، خطوط نصف النہار موجود نہیں، تاہم ہم دیکھتے ہیں، کہ بڑے بڑے مسلمان جغرافیہ نگار

صحیح طول بلد کے دینے کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں، گمان ہے کہ یہ خطوط اس مسطح مدور پر ضرور ہونگے جو ادریسی نے روجر شاہ صقلیہ کیلئے تیار کیا تھا، ادریسی اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے:-

"بادشاہ قطعی طور پر یہ دریافت کرنا چاہتا تھا، کہ مختلف جگہوں کا طول بلد اور عرض بلد، اور ان کا فاصلہ کیا ہے، اس کے لئے اس نے ایک تختی سی تیار کی تھی، جن میں اوس نے مقیاس کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ایسے خطوط ظاہر کئے تھے، جو مختلف کتابوں میں درج تھے، اور جن پر لوگوں کا اتفاق تھا، اور جو مختلف مصنفین کی آرار کا مقابلہ کر چکنے پر درست ثابت ہوئے تھے"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامات کو مسطح مدور پر ان کے درمیانی فاصلوں کا اندازہ کرکے لکھتے تھے، اس کے بعد ان کی جاے وقوع کے لحاظ سے جو نقشہ پر ظاہر کی گئی تھی، اون کا طول بلد نکالا جاتا تھا،

البیرونی کی کتاب قانون میں بڑے بڑے شہروں کے طول بلد کا نقشہ دیا ہوا ہے، وہ ان کی تصحیح کرنے پر فخر کرتا ہے، لیکن اس کے بیان کے مطابق یہ اصلاحات اس کے اپنے مشاہدات کا نتیجہ تھیں، وہ پرانے کاغذات کے مندرجہ اعداد میں باہمی مناسبت و ترتیب پیدا کرنے پر قانع نظر نہیں آتا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"میں نے مختلف جگہوں کے طول بلد اور عرض بلد، بڑی محنت اور جانفشانی سے اپنے مشاہدات کے ماتحت جانچ کرکے لکھے ہیں، میں نے پرانی کتابوں کا محض تتبع نہیں کیا، بلکہ ان جگہوں کا باہمی فاصلہ دریافت کرکے خود تحقیق کی ہے، کیونکہ قدیم کتابوں میں بعض غلطیاں موجود ہیں، بعض مصنفین طول بلد کو آغاز جزائر خالدات سے کرتے ہیں، اور بعض سمندر کے مغربی ساحل اقصیٰ سے اسی طرح بعض ایسے ہیں، جو مشرق سے شروع کرتے ہیں، اس موخر الذکر طریق کا نتیجہ سوائے اسکے

اور کچھ نہیں کہ وہ مغربی ساحل سے شروع کرنے والوں کے نتائج کا محض تتمہ ہوتا ہے،

ابو الفداء نے بیرونی کے نقشہ سے بہت استفادہ کیا ہے، تاہم وہ اس غلطی سے بچ نہ سکا، جسکو البیرونی نے واضح کیا تھا، یعنی وہ کبھی طول بلد کے جزائر خالدات کے خط نصف النہار کے اعتبار سے نکالتا ہے، اور کبھی افریقہ کے انتہائی مغربی ساحل سے، ابو الفداء نے چند جگہوں کا عرض بلد ایک آلہ کے ذریعہ دریافت کیا تھا جس کو وہ قیاس کے نام سے پکارتا ہے، رینو اس لفظ کا ترجمہ استغراء کرتا ہے لیکن میرے نزدیک اس کے معنی مسطر یا پرکار کے زیادہ موزوں ہیں، (ادریسی کے مذکورۂ بالا بیان میں لفظ مقیاس سے مقابلہ کرو) اس نے ایک پرانے نقشہ پر پرکار یا مسطر کے ذریعہ خطوط طول البلد کھینچے، وہ لکھتا ہے کہ اس نے ان تمام مقامات کی تحقیق کی ہے، جو اس کے وطن حماۃ کے طول بلد پر واقع تھے، اس نے فرلیں ( Farez ) نامی ایک شخص کی تصنیف کتاب الاطوال (یعنی کتاب طول بلد اور عرض بلد) سے استفادہ کیا تھا، اور ہسپانیہ کے مشہور معروف جغرافیہ نگار ابن سعید مغربی کی تصنیف کو بھی دیکھا تھا، (سنہ ۶۱۰ھ تا ۶۷۳ھ)

**دائرۂ نصف النہار کی پیمایش** عرب علماء نے ایک نہایت لطیف علمی مشاہدہ کیا تھا، وہ دائرۂ نصف النہار کی پیمایش تھی، وہ چاہتے تھے کہ بطلیموس کی پیمایش کی تحقیق یا تصحیح کریں،

قدیم زمانہ میں کرۂ ارض کے محیط دائرہ کی پانچ مختلف پیمائشیں کی گئی تھیں، پہلی ارسطو کی، (جو غالباً یوڈوکس ( Eudoxe ) کی ہوگی،) وہ زمین کے دائرہ کو ۴۰۰۰۰۰ فرلانگ بتاتا ہے، دوسری ارشمیدس کی جو آرینیر ( Arenaire ) میں درج ہے اور ایک مصنف کے قول کے مطابق جس کا نام ارشمیدس نے لکھا، ۳۰۰۰۰۰ فرلانگ ہے، تیسری اروٹیتیس کی ۲۵۲۰۰۰ فرلانگ تقریباً ۷۰۰ فرلانگ فی ڈگری، چوتھی پیمایش پوسیڈونیس کی ۲۴۰۰۰۰ فرلانگ اور پانچویں بطلیموس کی جو اسکو اپنے جغرافیہ میں ۱۸۰۰۰۰ فرلانگ بتاتا ہے،

ان اعداد کی قدر و قیمت اسی حالت میں ہو سکتی ہے، جب کہ ہمیں فرلانگ کی پوری پوری پیمایش

کا پتہ ہو، لیکن یہ بہت مشکل بات ہے تاہم یہ لازمی امر ہے، کہ ہم ارسطو اور ارشمیدس کی بیان کردہ پیمائش میں یونانی فرلانگ کا حساب کریں، جو ۲۴۰ فٹ یا ۱۸۵ میٹر کے برابر ہوتا ہے، چنانچہ یہ پیمائش ۴۰۰۰۰ یا ۵۵۵۰۰ کیلومیٹر کے برابر ہوتی ہے، ارٹوستینس کے مطابق ایک فرلانگ ۳۰۰ مصری شاہی کیوبٹ (ذراع) کے برابر یا ۱۵۰ میٹر کے برابر، اس سے زمین کا دائرہ ۳۹۶۰۰ کیلومیٹر ہوا، بطلیموس کے مطابق فرلانگ مصری ۴۰۰ شاہی کیوبٹ یا ۲۱۰ میٹر ہوا، اور یوسی ڈونی کا ناپ ارٹوستینس کے ناپ سے ملتا ہے، چنانچہ ان دونوں کا اندازہ یکساں ہے، یعنی ۴۰۰۰۰ کیلومیٹر،

ہم دیکھتے ہیں، کہ آخری تین پیمائشیں اور بالخصوص ارٹوستینس کی پیمائش ہمارے موجودہ چالیس ہزار کیلومیٹر کے اندازے کے بہت قریب ہے، یہ پیمائش محض اتفاقی نہ تھی، بلکہ اس ذہانت کا نتیجہ تھی، جس کی مدد سے اس نے قدیم آلات مشاہدہ کا استعمال کیا، وہ طریق مشاہدہ یہ تھا، کہ ایک ہی خط نصف النہار میں دو مختلف مقاموں پر دھوپ گھڑی کے راس السرطان اور راس الجدی کے سایہ کو دیکھا جاتا، اک سایہ سے ان دونوں جگہوں کے زاویہ، اس کا پتہ چل جاتا، یعنی قوس کی پیمائش معلوم ہو جاتی، خلیفہ مامون نے کرۂ ارض کے دائرے کی پیمائش کے لئے علمار کے ایک گروہ کو جمع کیا، اور انھیں حکم دیا، کہ خط نصف النہار کے درجہ کی پیمائش کریں، یہ لوگ جو طریق کار عمل میں لائے، وہ قدیم طریق سے مختلف تھا،

یہ تمام علما ایک وسیع میدان میں جمع ہوئے، اور اسکے بعد اپنے آپ کو دو گروہوں میں تقسیم کر لیا، ایک نے شمال کی طرف قطب کا رُخ کیا، یہاں تک کہ وہ ایک درجے کی بلندی پر آگئے، دوسرا گروہ جنوب کی طرف چلا حتیٰ کہ شمالی قطب ایک درجہ نیچے ہو گیا، اس کے بعد اونھوں نے طے کردہ فاصلے کی پیمائش کی، اور پھر واپس آکر ایک جگہ جمع ہوئے، اور اپنی پیمائشوں کا مقابلہ کیا، ایک نے ۵۶ ۲/۳ میل کی مسافت طے کی تھی، اور دوسرے نے ۵۶ میل کی، پہلے اونھوں نے ان دونوں فاصلوں کا اوسط نکالا، اس کے بعد مستقل طور پر بڑی پیمائش یعنی ۵۶ ۲/۳ کو لے لیا، زیر بحث میل کی لمبائی چار ہزار ذراع

تھی. ہر ذراع ۲۰ تھی، پس سارے دائرہ کا اندازہ ۳۲۵، ۴ کیلومیٹر ہوا،

چونکہ اس طریق پیمایش کا ذکر بہ تکرار آتا ہے۔ اسلئے معلوم ہوتا ہے، کہ اس عمل کو بار بار دہرایا گیا ہوگا، مسعودی بھی وادی سنجار میں ایک پیمایش کا ذکر کرتا ہے، جو کوفہ اور مدینۃ السلام کے درمیان تھی اور دوسری طلیرہ اور رقہ کے درمیان، ابن یونس ایک اور پیمایش کا ذکر کرتا ہے جو فرات کی ریگستانی وادی میں طلیرہ اور رامیہ کے درمیان کی گئی، دائرے کے ایک درجے کی مسافت کو ۶۶½ میل مقرر کر لینے کی وجہ محض نظری تھی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یاقوت دوسرے ثقہ مصنفوں کے قول کی بنا پر بیان کرتا ہے کہ یہ فاصلہ ۲۵ فرسنگ تھا اور فرسنگ کو تین میل سمجھتا ہے، اور تیس ایک درجہ کا فاصلہ ۲۵ لیگ خیال کرتا ہے، ایک لیگ ۱۲۰۰۰ ذراع کا ہوتا ہے،

البیرونی نے اپنی کتاب میں جو استعمال اصطرلاب پر ہے، دائرۂ نصف النہار کے قوس کی پیمایش کا ایک نہایت عمدہ طریقہ بتایا ہے، یہ طریقہ اس نے خود دریافت کیا تھا، وہ یہ ہے کہ ایک شخص صاف چٹیل میدان میں یا سمندر کے کنارے کسی ٹیلے پر کھڑا ہو جائے، اور وہاں اصطرلاب کے ذریعے غروب آفتاب کے مقام کو مدنظر رکھے، جہاں سورج غروب ہو وہاں سے متوازی خط کے ساتھ زاویہ انخفاض ([illegible]) angle of depression، کا اندازہ کرے، پھر ٹیلے کی بلندی دریافت کر کے نصف قطر دریافت کرے اور پھر نصف قطر کو ۲ سے ضرب دیکر دائرہ کی پیمایش نکل آئے گی،

**سمت قبلہ کی دریافت،** مسلمانوں میں تسخیر عالم کا شوق اور حج کعبہ کی تقدیس و عظمت دو زبردست محرکات ہوئے ہیں، جن کے باعث ان میں علم جغرافیہ نے خاص مقبولیت حاصل کر لی تھی، علاوہ بریں اس علم کے قبول عام کی ایک اور بھی وجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان نماز قبلہ رو ہو کر پڑھتے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبلہ کی سمت کیسے دریافت کی جائے، شہروں میں تو وہاں کے اصحاب علم و فضل، جغرافیہ نگار، اور ہیئت دان اس امر کا فیصلہ کر سکتے ہیں، ساتھ ہی مسجد کی محرابیں اس سمت خاص کا پتہ دیتی ہیں لیکن جب ایک مسافر جنگل یا صحرا میں تنہا جا رہا ہو، اور قبلہ کی سمت دریافت کرنی ہو، تو اسکے لئے چارۂ کار کیا ہوگا؟ اسکے لئے امام غز

اپنی تصنیف احیاء العلوم میں تین چیزیں پیش کرتے ہیں، اول کیفیات ارضی، دوسرے علم کائنات جو اول تیسرے ستارے، زمین کے حالات کا اندازہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ کسی بلند پہاڑ کی چوٹی کو دیکھ جائے کہ فلاں حدود کے اندر یہ چوٹی کعبے کے کس طرف واقع ہے، اور اس کے مطابق قبلہ کی طرف رخ کیا جائے، دوسرے جنوبی و شمالی ہواؤں کا رخ دیکھکر صحیح سمت دریافت کرلیجائے، تیسرے ستاروں کو دیکھ کر معلوم کرلیا جائے کہ قبلہ کس طرف ہے، اور اگر دن کا وقت ہو تو سفر سے پہلے اپنے علاقے میں سورج کے طلوع و غروب کے مقام ذہن نشین کرلیئے جائیں، اور اسی نسبت سے یہ اندازہ کرلیا جائے، کہ قبلہ کس طرف کو ہے، یعنی بائیں جانب ہے یا دائیں جانب یا کسی اور جانب، یہ چیز مکے کے شمال میں رہنے والوں کے لئے ہے، اسی قسم کے مشاہدات ہر نماز کے وقت دہرانے پڑتے ہیں، اب ایک بات اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ سورج کی گردش کا رخ موسم کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے، چنانچہ اس تغیر کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے،

غروب آفتاب کے بعد قطب ستارے سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتا، یہ اندازہ کرکے کہ قطب ستارے کا رخ کیا ہے، قبلہ کی سمت دریافت کرلیجاتی ہے،

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ مشاہدات صرف اسی حالت میں ضروری ہیں، جب کہ مسافت محدود ہو، ورنہ دور دراز سفر میں تو مختلف شہروں میں سے گذرنے کے باعث ہر جگہ مسجدیں نظر آتی ہونگی گو یہ ان مشاہدات کی کوئی علمی حیثیت نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ عوام میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی، کہ مشاہدہ کیا شے ہے، اور ستاروں اور مختلف مقامات کے جغرافی حالات میں کیا تعلق ہے؟

# تلخیص و تبصرہ

## اسلامک آرٹ پر پولش مطبوعات

اس عنوان سے پولینڈ کے ایک محقق ٹاڈیو زمان کوسکی (Tadeusz Mankowski) کا ایک فاضلانہ مقالہ رسالہ آرس اسلامیکا جلد سوم حصۂ اول میں شائع ہوا ہے، جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

پولینڈ میں اسلامک آرٹ کے اثرات کوئی بہت طویل مدت سے نہیں جاری ہیں، کبھی یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ ان اثرات کی ابتدا، پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کی جنگوں سے ہوئی، اور میدان جنگ سے جو مال غنیمت پولینڈ میں آتا تھا، اُسی کو دیکھ کر مشرقی آرٹ کا ذوق اور ملکی مصنوعات میں اس آرٹ کی تقلید کا شوق پیدا ہوا، لیکن پرانے دفتری کاغذات کے مطالعہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے، کہ اس باب میں جنگوں سے بہت زیادہ وہ باہمی تجارتی تعلقات اثر انداز ہوئے، جو صلح کے زمانوں میں دونوں ملکتون کے درمیان قائم رہتے تھے، ان تجارتی تعلقات کا سلسلہ قرونِ وسطیٰ تک پہنچتا ہے، اسی زمانہ سے مشرقی مصنوعات پولینڈ میں آنے لگیں جن میں زیادہ تر قیمتی کپڑے، تلواریں، اور وہ تمام سامان تجملات تھے، جو گھوڑے سے متعلق ہیں،

جن دفتروں میں یہ کاغذات محفوظ ہیں، ان کی تعداد بہت ہے، لیکن معلومات کے لحاظ سے ان کاغذات کا سب سے وافر ذخیرہ لواؤ ( [illegible] ) میں ہے، جس سے پولینڈ پر اسلامی

آرٹ کے اثر سے متعلق نہایت اہم تفصیلات حاصل ہوتی ہیں، ترک ایرانی، یونانی، اور آرمینی تاجر جو مشرق سے آیا کرتے تھے، اپنے قضیوں میں جو ملکی باشندوں سے یا خود آپس ہی میں پیش آجاتے تھے، لواؤ کی قانونی عدالتوں سے چارہ جوئی کرتے تھے، چنانچہ لواؤ کے عدالتی دفتروں میں چودھویں صدی کے آخر سے ایسے کاغذات ملتے ہیں، جن سے نہ صرف ان تجارتی راستوں پر روشنی پڑتی ہے، جن سے مال تجارت کریمیں کی جنیوی نوآبادی کافہ سے لواؤ اور پولینڈ کے دوسرے علاقوں سے ہوتا ہوا مغرب بھیجا جاتا تھا، بلکہ ان صنعتوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، جن کی مختلف چیزیں اس راستہ سے مشرق سے آیا کرتی تھیں، اسی طرح فلانڈرس (Flanders) سے کپڑے اور بحر بالٹک کے ساحلی ملکوں سے کاہ ربا کی بنی ہوئی چیزیں لواؤ سے ہو کر مشرق کو جایا کرتی تھیں،

لواؤ اور کمینیک پوڈولسکی (Kamieniec Podolski) کے پرانے کاغذات سے اس تجارت کے مفصل حالات معلوم ہوتے ہیں، باسفورس اور جزیرہ نمائے بلقان میں ترکوں کے قیام پذیر ہونے کے بعد بھی یہ تجارت بالکل بند نہ ہوئی، بلکہ صرف چند دنوں کے لئے موقوف ہوگئی، بہیم جنگوں کے باوجود پولینڈ اور اسلامی ملکوں کے تجارتی اور صنعتی تعلقات بڑھتے ہی گئے، ان تعلقات کو تقویت دینے میں آرمینیوں نے خاص حصہ لیا، جنھوں نے پولینڈ کے جنوبی مشرقی شہروں میں متعدد نوآبادیاں قائم کرلی تھیں، آرمینیوں کے عدالتی کاغذات سے پولینڈ کے ان سرحدی شہروں کی صناعیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، جہاں مشرق اور مغرب ملتے ہیں، ان کاغذات سے ایشیا سے کوچک اور ایران کے دور دراز شہروں کی صنعتی زندگی کا بھی پتہ لگتا ہے، جہاں سے تاجر اپنا مال لیکر لواؤ اور کمینیک پوڈولسکی کے میلوں میں آیا کرتے تھے،

ان عدالتی قلمی دستاویزات کے علاوہ جو مطبوعات ہیں، وہ بھی اسی قدر اہم ہیں، لیکن ان سب میں ایسے معلومات نہیں ہیں، جو آرٹ کے مورخ کے لئے اہمیت رکھتے ہوں، علاوہ بریں یہ مطبوعات

سولہویں صدی سے قبل نہیں ملتیں، اس صدی کا وہ سفرنامہ دیکھنے کے قابل ہے، جو مارسین برونیوسکی (Marcin Broniewski) نے تاتار کے دو سفروں کے حالات میں لکھا تھا، اس میں کریمیا، اور پولینڈ کے درمیان تجارتی راستوں کے حالات ملتے ہیں، جن سے مشرقی سامان خصوصاً زر بفت وغیرہ پولینڈ لایا جاتا تھا،

سترہویں صدی کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم سیفر موراٹو وکز (Sefer Muratowicz) کا سفرنامۂ ایران ہے، جہاں وہ ۱۶۰۲ء میں شاہ زگمنٹ سوم (Zygmunt III) کی طرف بھیجا گیا تھا، یہ سفرنامہ ۱۷۷۷ء میں وارسا میں طبع ہو کر شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۰ء میں نکلا، اس سفرنامہ میں موراٹو وکز نے ایران اور خصوصاً اصفہان اور کاشان کے حالات بیان کئے ہیں، جہاں اس کا قیام زیادہ تر رہا، کاشان میں شاہ عباس اول کے پارچہ بافی کے کارخانوں کے جو معلومات اس نے تحریر کئے ہیں، وہ بہت اہم ہیں، انہی کارخانوں میں موراٹو وکز نے شاہ پولینڈ کے لئے قالین بنوائے تھے، اور ان کو بنتے ہوئے خود بھی دیکھا تھا، یہ قالین ابھی تک موجود ہیں، اور ان سے ایران کی اس صنعت کی تاریخ معلوم کرنے میں بہت کچھ مدد ملتی ہے،

سیمین (Simeon) آرمینی کا سفرنامہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں، یہ آرمینی زبان میں ایک قلمی نسخہ سے شائع کر دیا گیا ہے، جو لواؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے، سیمین ۱۶۰۵ء میں لواؤ سے روانہ ہوا، اور ۱۶۱۵ء تک ایشیائے کوچک، فلسطین اور مصر میں چار بار سفر کیا، اس نے بعض شہروں کے فن تعمیر سے متعلق جو مفصل حالات تحریر کئے ہیں، وہ آرٹ کے مورخ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں،

فادر ٹاڈیوز کروسنسکی (Father Tadeusz Krusinski) نے بھی جو ایک

جیسوئٹ مشنری تھا، اور لواؤ میں پیدا ہوا تھا، اپنا سفرنامہ لکھا ہے، لیکن اوس نے خصوصیت کے ساتھ ایران کے حالات بیان کئے ہیں، جہاں اس کا قیام ۱۷۱۱ء سے ۱۷۲۸ء تک تھا، اس نے ایران سے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں، لیکن آرٹ کے مورخ کے لئے اسکی سب سے زیادہ اہم کتاب "آخری جنگ ایران کا المیہ" (Tragedy of the last Persian war) ہے، جو متعدد زبانوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں شاہ عباس اوّل کے عہد کے پارچہ بافی کے تمام شاہی کارخانوں کے مفصل حالات درج ہیں، نیز ان تمام مقامات کی تصریح ہے، جہاں یہ کارخانے قائم تھے، ایرانی قالین زربفت اور دوسرے قیمتی کپڑوں کی تجارت کے حالات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں، اور چونکہ تمام معلومات مصنف نے ذاتی تحقیق کی بنا پر فراہم کئے ہیں، اسلئے یہ کتاب غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے،

نیکورو دوکز (Mr Koroneraz ch) کی تجارتی کوٹھی کے کاغذات سے بھی جو ۱۷۵۳ء سے [illegible] تک کے کاروبار سے متعلق ہیں، کافی مواد ملتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ زربفت اور دوسرے قیمتی کپڑے اور تلواریں استنبول سے پولینڈ لاکر لواؤ میں فروخت کیجاتی تھیں، اس کوٹھی کے مالک دو آرمینی باپ بیٹے تھے، جو لواؤ میں آباد ہو گئے تھے، لیکن وہ باری باری استنبول میں بھی رہتے تھے، جس قلمی نسخہ میں مال تجارت کی فہرست اور بیجک وغیرہ درج ہیں، وہ لواؤ میں کاونٹ نیڈیوزاکی (Dziedus zycki) کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے، مال کی فہرستوں کے علاوہ کہیں کہیں زربفت وغیرہ کے متعلق بیانات اور انکے مختلف نام بھی ملتے ہیں، نیز استنبول کے ان کارخانوں کا ذکر بھی آتا ہے، جہاں یہ کپڑے بنے جاتے تھے، ان کاغذات سے اس زمانہ کی پارچہ بافی کی صنعت اور خصوصاً ان مشرقی چادروں کی بابت معلومات حاصل ہوتے ہیں، جو ایک کثیر تعداد میں ترکی دارالسلطنت سے پولینڈ میں لائی جاتی تھیں، اس کوٹھی کے کاغذات کے علاوہ، دوسرے تجارتی بہی کھاتوں، سامان جہیز کی فہرستوں، اور امرائے پولینڈ کے متروکات

کے تقسیم ناموں سے بھی مشرقی قالینوں، چادروں، مختلف قیمتی کپڑوں، اور مرصع تلواروں کے بہت کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، یہ پولینڈ، ترکی اور ایران کی تجارت کی خاص چیزیں تھیں، اور سترھوین اور اٹھارھویں صدی میں پولینڈ میں ان کا رواج کثرت سے تھا،

انہی معلومات نیز مشرقی طرز کی چیزوں کے متعدد پولش ذخیروں پر پولینڈ کے ان معدودے چند مورخین نے جنھوں نے ان مسائل پر توجہ کی ہے، اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ہے، انھوں نے سب سے زیادہ کوشش کلچر اور آرٹ کے اُن تعلقات کو دریافت کرنے میں صرف کی ہے، جو کسی زمانہ میں پولینڈ اور اسکی جنوبی مشرقی سرحد سے متصل ترکی علاقوں، اور پھر بعد میں ایران کے ساتھ قائم تھے، حال تک پولینڈ کے علماء آرٹ اسلامک آرٹ کی تحقیق میں صرف اوسی حد تک حصہ لیتے تھے، جس حد تک اوس کا تعلق پولینڈ سے تھا

اسلامک آرٹ کی تحقیق اوّل اوّل ولاڈسلا لوزنسکی (Wladyslaw Lozinski) نے شروع کی، جس نے اپنی کتاب لواؤ کے امرا اور عوام سولھویں اور سترھویں صدی میں،" (Patriciate and Commonality of the Citizen in Lwow during the XVI and XVII Century) میں یہ دکھایا ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان آرٹ کے تبادلہ میں لواؤ نے کس قدر حصہ لیا، اور بتایا ہے، کہ لواؤ ہی نے اسلامک آرٹ کو پولینڈ کے تمام وسیع علاقوں میں پھیلایا، اپنی دوسری کتاب "لواؤ میں سونے اور چاندی کی چیزیں" (Gold and Silver in Lwow) میں لوزنسکی دکھاتا ہے، کہ لواؤ میں زرگری کی صنعت پر اسلامک آرٹ کا کسقدر زیادہ اثر پڑا، یہ اثر آرمینی زرگروں کا رہین منت تھا، لوزنسکی اسپر اپنی ایک اور کتاب "لواؤ میں صنعت زرگری کا آرمینی خاتمہ" (Armenian Epilogue to the Goldsmith's Art in Lwow) میں بھی بحث کرتا ہے۔

کے عنوان سے شائع ہوئی کسی حد تک براہ راست اسلامک آرٹ سے بحث کی گئی ہے اور ان چادروں کا ذکر ہے جو اٹھارہویں صدی میں پولینڈ بھیجنے کے لئے استنبول میں تیار کیجاتی تھیں، نیز اس اثر کو بیان کیا ہے جو مشرقی چادروں نے پولش چادروں کی صنعت پر ڈالا،

۳- تیسری رپورٹ "لواؤ کی دستکاری" (Lwow Manufacture) کے عنوان سے ۱۹۳۴ء میں لواؤ کی سوسائٹی آف سائنس کے سامنے پیش کی گئی۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ سترہویں صدی میں لواؤ نے تلوار اور گھوڑے کے ساز و سامان کی صنعت میں کس قدر حصہ لیا، اور اس صنعت پر اسلامک آرٹ کا کہاں تک اثر پڑا،

۴- پولش اکاڈمی آف سائنس کے سامنے جو رپورٹ ۱۹۳۴ء میں پیش کی گئی۔ اس میں بتایا گیا ہے، کہ سترہویں صدی میں منقش اور زرتار کپڑوں کی صنعت پر اسلامک آرٹ کا کتنا اثر پڑا،

۵- آخری تصنیف "لواؤ میں اہل آرمینیا کا آرٹ" (Art of the Armenians in Lwow) ہے، جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، اس میں دکھایا گیا ہے، کہ پولینڈ میں اسلامی آرٹ کے پھیلانے میں آرمینیوں نے کتنا حصہ لیا،

مذکورۂ بالا رپورٹوں کو یکجا کرکے، اور ان میں چند مزید ابواب کا اضافہ کرکے ایک مستقل کتاب شائع کر دی گئی ہے، جس کا عنوان ہے "سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں پولینڈ کا اسلامک آرٹ"، (Islamic Art in Poland during the XVII and XVIII Centuries) پولینڈ میں اسلامک آرٹ کے اثر پر جتنی تحقیق کی جا سکتی تھی، وہ سب اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہے،

ان تمام کتابوں میں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اسلامک آرٹ سے صرف اسی حد تک بحث کی گئی ہے، جس حد تک اس کا اثر پولینڈ پر پڑا، لیکن ان کے علاوہ پولینڈ میں ایسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں

جن کا موضوع بجائے خود اسلامک آرٹ ہی ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے:- مسلمان ولیون کی تصویریں اور ایران کی مصوری پر رومن کیتھولک اثرات (Pictures of Moslem Saints and the Iconographic Roman Catholic Influences [illegible]) اس کتاب میں دکھایا گیا ہے، کہ ایرانی مذہبی آرٹ کے رجحانات کیا تھے، رومن کیتھولک آرٹ کا اُس پر کسقدر اثر پڑا، مصوری میں یوروپین نمونوں سے ایرانیوں نے کہاں تک اخذ کیا، اور سولہویں صدی کے بعد سے ایران اور پولینڈ کے باہمی تعلقات نے ایرانی آرٹ پر کتنا اثر ڈالا،

ایرانی آرٹ سے متعلق ایک پولش مصنف اسٹیفن کومونیکی (Stefan Komor[illegible]) کی کتاب فرانسیسی زبان میں بھی شائع ہوئی ہے، جو اپنے معلومات کے لحاظ سے بہت اہم ہے، اس میں پندرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک کے ان مخطوطات کی تصویریں بھی نقل کی گئی ہیں، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں،

محققین پولینڈ نے نہ صرف ان اثرات کی تحقیق کی ہے، جو اسلامک آرٹ سے پولینڈ کی صنعتوں پر پڑے ہیں، بلکہ خود اسلامک آرٹ سے متعلق بھی خواہ وہ ترکی، ایران، یا کسی دوسرے اسلامی ملک کا ہو بہتیرے اہم مسائل اپنی تلاش و تحقیق سے حل کر دیئے ہیں،

"ع ز"

# اخبارِ علمیہ

## قدیم رومن کتب خانے

سیزر کے قتل اور خانہ جنگیوں کے بعد جب شہنشاہ اکٹیوین (Octavian) تخت نشین ہوا تو سلطنت روما کو نصف صدی امن اور خوشحالی کی نصیب ہوئی، یہی زمانہ لاطینی لٹریچر کا عہد زریں خیال کیا جاتا ہے، کتابوں کا شوق اسقدر بڑھا کہ کتب خانہ گھروں کا ایک ضروری جزو بن گیا، ان کتب خانوں کا رُخ عموماً مشرق کی طرف ہوتا تھا، تاکہ صبح کی روشنی پہنچ سکے اور کتابیں آفتاب کی تمازت سے محفوظ رہیں، گھروں میں کتب خانہ کے لئے جو کمرہ مخصوص ہوتا، وہ عموماً چھوٹا ہوتا تھا، اتنا چھوٹا کہ کہیں کہیں آدمی ہاتھ پھیلا کر دونوں طرف کی دیواریں چھو سکتا تھا، لوگ کتابیں نکال کر دوسرے کمرہ میں لیجا کر پڑھتے تھے، جہاں کوچیں پڑی رہتی تھیں، کتب خانہ میں صرف کتابیں رہتی تھیں، بیٹھنے کا کوئی سامان نہ ہوتا، کمروں میں پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے کا رواج عام تھا،

پبلک لائبریری زیادہ کشادہ ہوتی تھی، اس میں مشہور آدمیوں کی تصویریں آویزاں ہوتیں، بعد میں لوگ اپنے ذاتی کتب خانوں کو بھی اسی طرح آراستہ کرنے لگے، علوم و فنون کی رومن دیویوں کے مجسمے بھی عموماً نصب ہوتے تھے،

کتب خانوں سے تعلق رکھنے والوں کا ایک طبقہ ہی الگ تھا، اس میں آزاد، آزاد شدہ غلام اور غلام تینوں قسم کے لوگ شامل تھے، ان کے سپرد مختلف خدمتیں تھیں، کچھ لوگوں کے متعلق خطوط لکھنا سکریٹری کا

کام انجام دینا، اور حساب کتاب رکھنا تھا، کچھ کتابیں لکھتے یا ان کی نقلیں کرتے تھے، بعضوں کے سپرد یہ کام تھا کہ الماریوں سے کتابیں نکال کر لوگوں کو دیں، اور ان کو صاف ستھرا رکھیں، یہ لوگ جلد بندی بھی کرتے تھے،

کتابوں کے لکھنے کے لئے جو کاغذ استعمال ہوتا تھا، وہ ایک قسم کی مصری نے کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جسکو پیپائرس (Papyrus) کہتے تھے، اسی سے انگریزی لفظ پیپر (کاغذ) نکلا ہے لیکن خود اس چھال کا لاطینی نام لائبر (Liber) ہے، جو ماخذ ہے کتابوں سے متعلق بہت سے لفظوں کا، جب مصری نے کی کاشت کے بند ہو جانے سے مصر سے اس کاغذ کی درآمد رک گئی، تو پرگامم (Pergamum) کے لوگوں نے جو سلطنت روما کی ایک مدمقابل مملکت تھی، بھیڑ اور بکریوں کی کھالوں سے کاغذ بنانا شروع کیا، یہ کاغذ روما میں بہت مقبول ہوا، اسے رومن پرگامینا (Pergamena) کہتے تھے، یہ نام مسخ ہو کر آج بھی پارچمنٹ (Parchment) کی شکل میں موجود ہے،

کتابیں سرخ اور سیاہ دونوں قسم کی روشنائی سے لکھی جاتی تھیں، رومن قلمدانوں میں سیاہ اور سرخ روشنائی کے لئے علحدہ علحدہ دواتیں ہوتی تھیں، انکے نمونے برٹش میوزیم میں موجود ہیں، قلم نے کے ہوتے تھے،

اہل روما کی خوشحالی کے ساتھ پبلک اور پرائیوٹ کتبخانے بھی وسعت اور تعداد میں بڑھتے گئے اور کتابوں کی مانگ نے ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جس نے کتب فروشی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا، کتب فروشوں کی دوکانیں اکثر روما کے مرکزی حصہ میں واقع تھیں، دوکاندار کتابوں کے اشتہارات اپنی دوکانوں کے در و دیوار پر چسپاں کر دیتے تھے، نئو اڈیشنوں کے خریدار بہت کثرت سے آتے تھے، قیمتیں بھی کچھ بہت گراں نہ تھیں،

## جراحی کی کرامتیں

یورپ اور امریکہ میں فن جراحی (سرجری) کو جو حیرت انگیز ترقی دی جارہی ہے، وہ اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ چہرہ کی خلقی بدصورتی بھی آپریشن کے ذریعہ دور کر دی جاتی ہے، اور بدصورت سے بھونڈی

آدمی بھی ہسپتال سے نکلنے کے بعد اچھا خاصا شکیل معلوم ہونے لگتا ہے، اس فن نے اب سے صدیوں قبل بھی
بہت کچھ ترقی کر لی تھی، چنانچہ بارہ سو برس ہوئے جب شہنشاہ جسٹینین ثانی (Justinian II)
کی ناک میدان جنگ میں جاتی رہی، تو اس کے جراحوں نے اسے از سر نو درست کر دیا تھا، اور چہرہ کی
بدنمائی بالکل رفع ہوگئی تھی، سولھویں صدی میں بھی ایک مشہور اطالوی ڈاکٹر تاگلیا کوزی
(Tagliacozzi) نے بعض ایسی حیرت انگیز ایجادیں کی تھیں، جو آج تک
مستعمل ہیں، کٹی ہوئی ناک کو درست کرنے کے لئے یہ ڈاکٹر ایک خاص طریقہ سے مریض کا ہاتھ اس کی
ناک پر باندھ دیتا تھا، کچھ دنوں کے بعد گوشت اور جلد ہاتھ سے منتقل ہو کر ناک پر آجاتی تھی، لیکن
اس فن میں جو ترقی آج رونما ہے، وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی، یورپ اور امریکہ میں ایسے
ہسپتال کثرت سے کھل رہے ہیں، جن میں خلقی بدصورتی یا وہ بدنمائی جو کسی حادثہ کی وجہ سے پیدا
ہوگئی ہو، دور کر دی جاتی ہے، چہرہ کی جھریاں یا عمر کی پختگی کے آثار جو چہرہ سے ظاہر ہوتے ہیں،
مٹا دیئے جاتے ہیں، وہ عورتیں جو اپنی عمر سے زیادہ نوعمر بننا چاہتی ہیں، ان ہسپتالوں میں کثرت
سے جاتی ہیں، مگر اس فن کے ماہر ڈاکٹروں کی تعداد ابھی بہت کم ہے، امریکہ کے ڈاکٹر میکسول مالٹز
(Maxwell Maltz) نے اس سال میں ایک کتاب "نئے چہرے، نئے مستقبل"
(New Faces — New Future) کے عنوان سے لکھی ہے، جس میں بتایا ہے کہ انگلستان
میں ایسے ماہر ڈاکٹروں کی تعداد بارہ سے چودہ تک ہے، فرانس میں بھی اسی قدر، جرمنی میں
دس یا بارہ، اٹلی میں چار، اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں چالیس سے پچاس تک، عطائیوں کے آپریشن
سے چہرہ بجائے درست ہونے کے اور زیادہ خراب ہو جاتا ہے، سب سے زیادہ عجیب بات جو ڈاکٹر موصوف
نے لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ آپریشن سے نہ صرف چہرہ کی بدنمائی دور ہو جاتی ہے، بلکہ پوری زندگی کا رخ
ہی بدل جاتا ہے، اونھوں نے یہ نظریہ غلط ثابت کر دکھایا ہے، کہ انسان کے چہرہ سے اس

کی سیرت صحیح طور پر معلوم کی جاسکتی ہے، اون کے نزدیک چہرہ کے نقشہ اور سیرت کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں،

## درازیِ عمر کا مسئلہ

کورنل یونیورسٹی امریکہ کے تین ڈاکٹر مینارڈ، میکے اور آسڈل (Maynard. Mecay and Asdell) پانچ سال سے درازیِ عمر کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، انھوں نے اپنے تجربات کے لئے سفید چوہوں کو منتخب کیا ہے، جو عموماً انسانوں ہی کی سی غذا کھاتے ہیں، سفید چوہا دس، دن میں اپنا مدتِ حیات سے اسی قدر صرف کر دیتا ہے، جسقدر انسان ایک سال میں صرف کرتا ہے، لہذا جب کہ انسان پر تمام عمر میں صرف ایک بار تجربہ کیا جاسکتا ہے، اُسی مدت میں چوہوں کی چند نسلوں کا یکے بعد دیگرے مطالعہ ہو سکتا ہے، ان ڈاکٹروں نے اپنے پنج سالہ تجربہ کی بنا پر حال میں بیان کیا ہے، کہ چوہوں کو ایسی غذا دینے سے جس سے شروع میں اُن کی نشو و نما تیزی کے ساتھ نہ ہو سکے، ان کی مدتِ حیات زیادہ ہو جاتی ہے، اس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہین، کہ مناسب غذا سے انسانی عمر میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے، لیکن ابھی یقین کے ساتھ وہ اس خیال کا اظہار نہیں کرتے، اور چھ سال کے مزید تجربہ پر اس فیصلہ کو ملتوی کرتے ہین،

لیکن ان ڈاکٹروں کی رائے کے بالکل خلاف کولمبیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ہنری شرمن (Henry Sherman) کے تجربات ہیں جو چوہوں پر تجربہ کرنے میں امریکہ میں سب سے زیادہ ممتاز ہین، وہ اپنے معملوں میں ہمیشہ ہزار ڈیڑھ ہزار زندہ چوہے رکھتے ہیں، انھیں اپنے تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سادہ اور معمولی غذا اون کے استعمال سے نشو و نما تیزی سے ہوتی ہے، اور چوہے زیادہ دنوں تک زندہ رہتے ہیں، توقع کیجاتی ہے کہ آیندہ چند سالوں میں امریکہ کے مختلف الخیال ڈاکٹر اس مسئلہ پر کوئی متفق علیہ فیصلہ صادر کر سکیں گے،

"ع ز"

# مطبوعاتِ جدیدہ

**محمدؐ دی پرافٹ** (Muhammad the Prophet) از جناب فیض کریم خانصاحب درانی بی اے، ایڈیٹر لائٹ و تھورنیوسے روڈ، لاہور چھوٹی تقطیع، ضخامت ۱۲۰ صفحے قیمت ۱۰ عار

اس مختصر سی کتاب میں فاضل مصنف نے آنحضرت صلعم کی حیاتِ اقدس پر پیغمبرِ عالم کی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے، اور بہت خوبی کیساتھ دکھایا ہے، کہ آپ صرف عرب ہی نہیں، بلکہ سارے عالم کی اصلاح کیلئے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ کی بعثت سے قبل نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا عقیدہ و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا تھی، دینِ حق کی جو تعلیم مختلف پیغمبروں نے وقتاً فوقتاً مختلف قوموں کو دی تھی، وہ فراموش کی جاچکی تھی، علاوہ بریں آپ سے پیشتر ہر پیغمبر کی تعلیم کسی خاص ملک یا قوم کیلئے مخصوص تھی، دنیا ایک ایسے ہادی کی منتظر تھی جسکا پیام تمام قوموں کی یکساں طور پر رہنمائی کرسکے، آپ کی تشریف آوری کا مقصد اسی ضرورت کو پورا کرنا تھا، اور آپنے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اس کام کو بدرجۂ کمال انجام فرماکر تمام تشنگانِ اصلاح کو ہمیشہ کے لئے سیراب کردیا۔

مصنف نے ان واقعات کو جس اسلوب سے پیش کیا ہے، وہ مستحقِ ستائش ہے، لیکن موصوف نے بعض ایسے خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں، جن سے شاید ہی کسی کو اتفاق ہو، مثلاً اہلِ عرب کی بت پرستی کوئی ایسی اہم چیز نہ تھی جس کے لئے کسی پیغمبر کی بعثت ضروری ہوتی، (صفحہ ۱۶) کیونکہ بت پرستی محض ایک بے ضرر حماقت ہے، (ص ۲۳) ہم نہیں سمجھ سکتے کہ بت پرستی سے بڑھ کر جو شرک کی عملی صورت ہے، اور کونسی ضلالت ہے جسے دور کرنے کیلئے کسی پیغمبر کی ضرورت ہوسکتی ہے، اسی طرح مصنف کا یہ خیال بھی حیرت انگیز ہے، کہ اگر کسی قوم کی اخلاقی حالت درست ہے تو یومِ آخرت پر عقیدہ نہ رکھنے میں چنداں مضائقہ نہیں، (ص ۲۱) یہ خیالات غالباً اسی جدت طرازی کا ثبوت ہیں،

جس کا دعویٰ مصنف نے دیباچہ میں کیا ہے، موصوف کے نزدیک آنحضرت صلعم کے سوانحِ حیات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب ایک ہی طرز پر لکھی گئی ہیں جنہیں صرف تفصیلات کی کمی اور زیادتی کا فرق ہے، نتیجہ یہ ہے کہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی بے معنی تفصیلات میں کھو کر رہ گئی ہے، یہ بھی فرمایا ہے کہ ابنِ ہشام کے بعد سے آج تک مسلمانوں نے اس باب خاص میں کوئی ترقی نہیں کی، اور سب سے بڑھکر یہ دعویٰ ہے کہ قرآن مجید اور نبی کریم صلعم نے ہماری فلاح کا جو طریقہ بتایا ہے، اسے کوئی دوسرا مصنف آجتک بیان نہ کر سکا، اور بہ استثنار ایک اور اہلِ قلم کے مصنف ہی تنہا وہ شخص ہے جس نے سالوں اس موضوع پر غور و فکر کیا ہے، اور اس طریقہ کو بیان کر سکتا ہے، (دیباچہ)

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے،

## دی میسج آف اسلام، The Message of Islam (پیغامِ اسلام)

انگریزی، از جناب فضل کریم خانصاحب درانی، ایڈیٹر ٹرتھ، لاہور، چھوٹی تقطیع ضخامت ۸۰ صفحے قیمت

یہ رسالہ تین مقالات کا مجموعہ ہے، جنمیں سے پہلا پیغام اسلام مصنف نے انجمن مذاہب کے اجلاس میں جو ۲۲ مئی ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، بطور خطبہ کے پڑھا تھا، ان میں موصوف نے اسلام کی خوبیاں دلکش طریقہ سے بیان کر کے اچھوتوں کو قبولِ اسلام کی دعوت دی ہے، اور دکھایا ہے کہ توحید کا عقیدہ انسان کو کس قدر بلند درجہ پر پہنچا دیتا ہے، پھر اسلام کی یہ خصوصیت بھی واضح کر دی ہے کہ وہ نہ صرف خالق اور مخلوق کے تعلقات کو استوار کرتا ہے، بلکہ انسانوں کے باہمی تعلقات کی نگہداشت بھی کرتا ہے، اسکے بعد اسلامی مساوات اور اسلام کی عالمگیر اخوت کا موازنہ ہندو، سکھ، بودھ اور عیسائی مذاہب کی تنگ نظری سے کر کے اچھوتوں کو متنبہ کیا ہے کہ انکی آزادی اور فلاح صرف اسلام ہی کے ذریعہ ممکن ہے، آخر میں ہندوستان کی آزادی پر بحث کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ اس کا واحد اور آسان طریقہ یہی ہے، کہ ہندو قوم جس میں سکھ بھی شامل ہیں، اسلام کی حلقہ بگوش ہو جائے، یہ رسالہ اس قابل ہے، کہ غیر مسلموں میں اس کی اشاعت کثرت سے کی جائے،

**اسلام اینڈ کرسچینٹی** (Islam and Christianity) از جناب محمد امیر عالم صاحب اورنٹیل پرنٹرس اینڈ پبلشرس، کلکتہ، چھوٹی تقطیع، ضخامت ۲۵۰ صفحے، قیمت عہ

یہ کتاب مسیحی تبلیغ کے جواب میں لکھی گئی ہے، مصنف نے مروجہ مسیحیت کے بنیادی عقائد کا تجزیہ کرکے ان کی کمزوری کو پوری طرح واضح کردیا ہے، اور دکھایا ہے کہ انہی عقاید کی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں دین عیسوی کے پیرووں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے، پھر اسلامی عقائد کو بیان کرکے ثابت کیا ہے کہ یہی ایک مذہب ایسا ہے، جو عقل کی روشنی میں ترقی کرسکتا ہے، اور جس میں تہذیب و تمدن کا ساتھ دینے کی صلاحیت بدرجۂ غایت موجود ہے، جو لوگ عیسائیوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں انکے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا،

**رفارمس ان حیدرآباد** (Administrative Reforms in Hyderabad) از جناب فتح اللہ خانصاحب نیو حیدرآباد پریس، اسٹیشن روڈ، سکندرآباد دکن، ضخامت (۱۹۰) صفحے، قیمت ۱؎ سے ر

یہ ایک مختصر تاریخ ہے، اُن تمام اصلاحات کی جو ریاست حیدرآباد کے پہلے فرمانروا نظام الملک آصف جاہ کے وقت سے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ کے عہد تک حکومت کے مختلف شعبوں میں جاری کی گئی ہیں، اسے پڑھکر بیک نظر معلوم ہوجاتا ہے، کہ آصف جاہ نے حکومت میں کہاں تک امن قائم کیا، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کتنی کوششیں کیں، انگریزوں کو کیونکر کامیابی ہوئی، انگریزوں سے اتحاد کرنے میں حکومت کو کسقدر فائدہ یا نقصان پہنچا، سر سالار جنگ نے کیا اصلاحات جاری کیں، میر محبوب علی خاں مرحوم کا "قانونچۂ مبارک" کیا تھا، جس سے رعایا کو ایک باضابطہ دستور حاصل ہوا، اور پھر موجودہ عہد میں وہ کونسی اصلاحات نافذ ہوئی ہیں، جن سے حکومت کے ہر شعبہ میں نمایاں ترقی نظر آرہی ہے، کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن ضروری باتیں چھوٹنے نہیں پائیں، اور حکومت حیدرآباد سے متعلق کسی دوسری کتاب میں اتنے معلومات شاید یکجا نہ مل سکیں،

"ع ز"

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۰                                        اگست ۱۹۳۶ء

# معارف

مجلس المصنفین دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

---

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۳۸ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۶ء | عدد ۲

## مضامین


| عنوان | مضمون نگار | صفحات |
|---|---|---|
| شذرات | سید سلیمان ندوی، | ۸۲-۸۴ |
| اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک، | " | ۸۵-۹۱ |
| اورنگزیب اور اس کا عہد، | جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین، | ۹۲-۱۱۱ |
| عربوں کا علم کائنات، | جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور، | ۱۱۲-۱۱۸ |
| دیوان شمس تبریز اور مولنائے روم، | جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ نظام کالج حیدرآباد دکن، | ۱۱۹-۱۳۱ |
| شکایت، | جناب قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی | ۱۳۲-۱۳۳ |
| تصحیح مقالہ "عربوں کی جہاز رانی پر استدراک" | جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن | ۱۳۴ |
| یورپ کیلئے ایک جدید سیاسی فلسفہ کی ضرورت | "ع ز" | ۱۳۵-۱۴۲ |
| اخبار علمیہ، | " | ۱۴۳-۱۴۶ |
| تتمہ صوان الحکمۃ | "س" | ۱۴۷-۱۵۲ |
| ہندوستانی کے چند نئے رسالے، | "ر" | ۱۵۳-۱۵۴ |
| مطبوعات جدیدہ، | " | ۱۵۵-۱۶۰ |

سر فضل حسین کا ماتم ملک کے گوشہ گوشہ میں برپا ہے، مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو مگر ان کی قابلیت، تدبیر، بیخوفی، دلیری، ہر دلعزیزی اور قومی بہی خواہی سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، وہ ان حکومت پسندوں میں نہ تھے جو اپنی شخصی ترقی کو صرف اپنی خاندانی ترقی کا زینہ بناتے ہیں، بلکہ ان میں تھے جو حکومت کا ساتھ دیکر اپنی سمجھ کے مطابق قوم اور ملک کی بھلائی کرتے ہیں، مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ جس محفل میں ہوتے تھے اس پر چھا جاتے تھے، وہ فطری لیڈر تھے اور دوسرے ان کے ساتھ چلنے پر مجبور تھے، وہ سرکاری کونسل کے ممبر ہو کر گویا یہ کہنا چاہئے وہ صرف ممبر نہیں رہے تھے، بلکہ اپنی دانائی، عزم، حسن تدبیر اور دلائل کی قوت کی بنا پر پوری کونسل کی عنانِ سیاست کے تنہا مالک تھے،

---

مرحوم مرض دق کے بیمار تھے، پھر بھی مجلسِ حکومت کی رکنیت سے علٰحدہ ہو کر انھوں نے آرام نہیں کیا، بلکہ سیاسیاتِ پنجاب کی الجھی ہوئی گتھی کو اپنی شبانہ روز کی محنت سے سلجھانے میں مصروف ہو گئے، اور یہ ان کا کمال سمجھنا چاہئے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ سیاسی پارٹی بنانے میں کامیاب ہو گئے اور خود اعتمادی یہ تھی کہ ہر مخالف کوشش کو بے حقیقت سمجھ کر اپنے کام میں بے خوف لگے رہے، گو ہم کو یہ معلوم ہے کہ اس متحدہ پارٹی کی پراگندہ اوراق کتاب کا شیرازہ کس نے باندھا، تاہم مرحوم کی مہارتِ فن کی داد دینی پڑتی ہے کہ خود شیرازہ بند کو بھی یہی محسوس ہوتا تھا کہ ان منتشر اوراق کا شیرازہ خود ان کی ذات ہے، پروردگارِ عالم ان پر رحمت فرمائے، اور اپنے فضل و کرم سے آخرت کی عزت سے بھی ان کو سرفراز کرے،

سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر کی وفات سے یہ ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کا بین الاقوامی اسلامی رسالہ المنار بند ہو جائے مگر ان کے عزیزوں اور دوستوں کی کوشش سے یہ خطرہ دور ہو گیا، المنار اب پھر نکلنا شروع ہو گیا ہے، انکی تفسیر کے سلسلہ کو شام کے مشہور سلفی عالم شیخ بہجت عطار نے اور رسالہ کی اڈیٹری کے فرض کو سید مرحوم کے بھتیجے سید محی الدین رضا نے اپنے ذمہ لیا ہے، اور محرم ۱۳۵۵ھ کے حساب سے اس کی اشاعت شروع کر دی ہے، امید ہے کہ رسالہ اپنی عالمگیر اسلامی حیثیت کو قائم، اور مرحوم کے روحانی فیض کو جاری رکھے گا،

---

اعظم گڈہ میں بمقام سرائے میر عربی کا ایک جدید طرز کا مدرسہ مولانا شبلی مرحوم کے بنائے ہوئے خاکہ کے مطابق مدرسۃ الاصلاح کے نام سے پچیس چھبیس برس سے قائم ہے، اس کے ناظم مولانا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولانا حمید الدین صاحب نے مراجعتِ وطن کے بعد اپنی بقیہ زندگی اسی مدرسہ کی علمی و تعلیمی رہبری میں صرف فرمائی، اسی کی خاطر انھوں نے ہزار روپیے ماہوار کی نوکری چھوڑی، گھر بار چھوڑا، مدرسہ ہی میں بود و باش اختیار کی، اور وہاں کے طلبہ و مدرسین کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اور اپنی ساری متاعِ علمی مدرسہ کے چند ہونہار طلبہ کے سپرد کر دی،

---

اس مدرسہ کا مقصد یہ ہے کہ عربی صرف و نحو کی دقتوں کو کم کر کے عربی علوم کی تعلیم دیجائے، قرآن پاک کو اس تعلیم کا محور بنایا جائے، دوسرے علوم کو قرآن پاک کا خادم سمجھکر سکھایا جائے، اور فلسفہ و منطق کی دور از کار کتابوں کو بہت کم کر دیا جائے، مدرسہ کا کاروانِ عمل شروع سے آج تک اسی راہ پر چل رہا ہے، اور اچھے نتیجے پیدا کر رہا ہے، اس میں کام کرنے والے چند مدرس نہایت ایثار پیشہ، بے غرض اور مخلص علما ہیں، جن میں کچھ ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ، اور کچھ خود اسی مدرسہ سے نکلے ہوئے ہیں، مدح و ستایش نہیں واقعہ ہے کہ ان مدرسین نے مہینوں قوت لایموت پر گذر کر کے اور سالہا سال تنخواہ نہ پا کر اس اخلاص اور ایثار کے ساتھ

کام کیا ہے، اور اب تک کر رہے ہیں کہ ہمارے موجودہ قومیات میں اس کی مثال مشکل سے ملیگی،

---

اس پاس میں "علماے زمانہ" کی کمی نہیں، انھوں نے اس کے مقابل دوسرا مدرسہ قائم کیا، اور اپنے مدرسہ کے چلانے کے لئے یا اپنے زعم میں نیک نیتی سے وقتاً فوقتاً مدرستہ الاصلاح کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو اس کی امداد سے روکنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن ع دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی ترست ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی، اور مدرستہ الاصلاح کا کام بڑھتا ہی رہا، چنانچہ کئی ماہ سے مدرستہ الاصلاح کے چند علماء نے مل کر مولنا حمید الدین مرحوم کی یادگار اور ان کی تصنیفاتِ قرآنی کی اشاعت کے لئے دائرہ حمیدیہ قائم کیا ہے، اور اس کی طرف سے الاصلاح نام ایک رسالہ جاری ہوا ہے، جو ماہ بماہ کامیابی کیساتھ نکل رہا ہے،

---

یہ جدید ترقی مخالفوں کے سامانِ ہیزم کشی کے لئے آگ ثابت ہوئی، انھوں نے اسکی تباہی کے لئے اپنے آخری بے پناہ حربہ (کافر گری) کو استعمال کیا، اور تھانہ بھون، سہارنپور، دہلی، بمبئی اور دیوبند وغیرہ کے چند علماء کو مولنا شبلی اور مولنا حمید الدین کی چند بے محل عبارتیں دکھلا کر دونوں کی تکفیر کا فتوی لے آئے، جس پر اہل علم کرام کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں، پھر دہلی، میرٹھ، وبجہ ایوں وغیرہ سے ایک درجن ایسے علماء بلا کر لے آئے جو اپنے مخالفوں کو بہتر سے بہتر مذہبی اور اخلاقی گالیاں دے سکیں، چنانچہ مدرسہ کے قریب کی ایک زمین میں جلسہ جما کر تین روز تک یہ ہم ان دو مرحومین کو اور ان کے تعلق سے مدرسہ کو بدتر سے بدتر کلمات ناشایستہ سے یاد فرماتے رہے،

---

یہ واقعہ اپنی نوع کا عجیب بھی ہو تاہم ہم اپنے برادران و عزیزانِ مدرستہ الاصلاح کو مبارکباد دیتے ہیں کہ مخالفون کے اس کل مظاہرہ میں انھوں نے صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور ان کے پانوں تہذیب و متانت اور وقار و تمکنت کے جادہ سے الگ نہیں ہوئے، دوسری بشارت اس میں یہ ہے کہ دشمنوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ لیا اور انھیں معلوم ہوگیا کہ ان کے بازوؤں میں زور اور ہمارے سینوں میں مضبوطی کتنی ہے، اب وہ بھی آرام سے رہینگے اور ہم بھی آرام پائینگے،

---

# مقالات

## اسلام میں حیوانات کیساتھ سلوک

اسلام میں جانور کو کھانے کے لئے ذبح کرنا جائز ہے، اور ساتھ ہی یہ کہ مسلمان کسی جانور کو مقدس سمجھ کر اسکی تعظیم و تحریم نہیں کرتے، نہ وہ کسی جانور کو اپنی ماتا کہتے ہیں، اسلئے بعض فرقوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ اسلام میں کسی جانور کیساتھ نیک سلوک کرنا ثواب کا کام نہیں،

ذیل کا مضمون اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے شائع کیا جاتا ہے، یہ درحقیقت سیرۃ نبویؐ کی چھٹی جلد کے چند صفحے ہیں،

"س"

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لیکر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اس نے حیوانات کیساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے مظالم کرتے تھے، وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے، اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھاجاؤ اور اسکو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھکر کھڑے ہوجاتے تھے، اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوستو احباب کی دعوت میں نذر ہوجاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا، تو اسکی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے،

اور اسکو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے، اور وہ اسی حالت میں سوکھکر مرجاتا، ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے، اسلام آیا تو اوس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا،

عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت صلعم نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا، اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے[1]، ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا، اور مرغی کیساتھ اس لڑکے کو لیکر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو، کیونکہ رسول اللہ صلعم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کے نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا، تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے؟ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، رسول اللہ صلعم نے ان کو ملعون قرار دیا ہے[2]، اس سے بھی زیادہ بیرحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان، اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ صلعم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی، تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے[3]، یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی[4]، بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[5]، ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور

---

[1] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراہیۃ اکل المصبورہ ص ۲۵۵، [2] بخاری کتاب الذبائح والصید، باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [3] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فہو میت، [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [5] مستدرک حاکم جلد ۲، ص ۱۰۲،

کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا، تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کریگا، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ!
اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اسکو ذبح کرے، اور کھائے یہ نہیں، کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے[1]
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا، اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا
مارنا جائز نہیں، سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص گنجشک کو بلا ضرورت ماریگا، وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں
فریاد کریگی، کہ فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا[2] جو جانور کوئی نقصان
نہیں پہنچاتے، یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، ان کا مارنا بھی جائز نہیں، چنانچہ آپ نے خاص
طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں، ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی
نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا، کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے
اسلئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو، تو اچھے طریقے سے مارو، اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح
کرو، تم میں ہر شخص چھری کو تیز کر لے، اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[4]

ایک حدیث میں ہے، کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس
پر رحم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے، کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو
خدا تم پر رحم کریگا[5]

یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے
کی ممانعت فرمائی[6] کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر، پتھر، یا غلیل چلانے کی

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۵۰، [2] نسائی کتاب الضحایا ص ۱۹۰، [3] مشکوٰۃ کتاب الصید
والذبائح صفحہ ۳۶۲، [4] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ
[5] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۶، [6] نسائی صفحہ ۱۷۴

بھی ممانعت فرمائی، اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا، نہ دشمن شکست کھا سکتا، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے، اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[1] مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں،

جانوروں کے ساتھ جو بیرحمیاں کی جاتی تھیں، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا، کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے، اس لئے رسول اللہ صلعم نے اہل عرب کو بتایا کہ جسطرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے، چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپنے فرمایا کہ اُس پر صرف اسلئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا، اور اسکو کھانا پانی کچھ نہ دیا، اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی[2] بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں اس لئے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گنہگار ہیں، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کیساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر خدا ان کو معاف کر دے تو سمجھو اس نے تمھارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے[3]

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے، تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انھوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا، اس پر خدا نے ان کو وحی کے ذریعہ سے تنبیہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا[4] یعنی قصاص کی مستحق صرف یہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا، ایک حدیث میں ہے، کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ صلعم قضائے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اسکے بچوں کو پکڑ کر کس نے اسکو بیقرار کیا ہے؟

---

[1] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقہ، [2] بخاری کتاب الانبیا صفحہ ۴۹۵، [3] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۱، [4] بخاری جلد اول کتاب بدء الخلق ص ۴۶۷،

اُسکے بچون کو چھوڑ دو، صحابۂ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا، کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا، تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کیلئے سزاوار ہے[۱]۔

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کیساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کیساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے، اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کیلئے پانی کے جو حوض بنائے ہیں، ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں، اگر میں ان کو پانی پلادون، تو کیا مجھکو اس پر ثواب ملے گا، ؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[۲]۔

ایک حدیث میں ہے، کہ ایک شخص راستے میں جا رہا تھا، کہ اسکو سخت پیاس لگ گئی اتفاق سے اسکو ایک کنواں مل گیا، اور اُس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا، کنوئیں سے نکلا، تو دیکھا کہ کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے، اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اوس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کرکے اس پر ترس کھایا، اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا، اور اسکو پلایا، خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا، اور خدا نے اسکو بخش دیا، صحابۂ کرام نے اس واقعہ کو سُنا تو بولے کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے، ؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کیساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے[۳]،

اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں کے تمام احسانات کو عام کر دیا، اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے، اور اسکو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے، تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے[۴]،

---

[۱] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو [۲] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء، [۳] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم، [۴] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ،

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانورون کیساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے یعنی

۱۔ جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس سے وہی کام لینا چاہیئے چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہون، صرف کھیتی باڑی کے لئے پیدا کیا گیا ہون[۱]، نیز فرمایا کہ اپنے جانورون کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے ان کو تمھارا فرمانبردار صرف اسلئے بنایا ہے، کہ وہ تمکو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہان تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے، تمھارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتین اسی پر پوری کرو[۲] اگرچہ رسول اللہ صلعم نے بعض موقعون پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانورون کی پشت پر بے سبب بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیئے،

۲۔ جانورون کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہیئے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سر سبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو، تو اونٹوں کو زمین کی سر سبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو اسکو تیزی کیساتھ چلاؤ[۳] تاکہ قحط کی وجہ سے اسکو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے، اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا، ان بے زبان جانورون کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو اون کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو، اور اون کو کھاؤ، تو اون کو اچھی حالت میں رکھکر کھاؤ،

---

[۱] بخاری ابواب الحرث و المزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ، [۲] ابو داؤد کتاب الجہاد فی الوقوف علی الدابۃ، [۳] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق،

ایک بار آپ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لئے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلعم کو دیکھ کر بلبلایا، اور آب دیدہ ہو گیا، آپ اس کے پاس گئے، اور اسکی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا کہ یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا کہ میرا، یا رسول اللہ، فرمایا اس جانور کے بارے میں جس کا خدا نے تمکو مالک بنایا ہے، خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اسکو بھوکا رکھتے ہو، اور اس پر جبر کرتے ہو[1]

۳- جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی مخالفت فرمائی، اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا[2]

۴- جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا[3] کہ اوس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں،

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم، [2] ابو داؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب، [3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم،

---

# وقت کی ایک اہم تالیف

## "اورنگزیب اور اُس کا عہد"[1]

مولفہ جناب ظہیر الدین صاحب فاروقی بی اے (علیگ) بیرسٹرایٹ لا بیرسٹر،

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رفیق دار المصنفین

"قرآن کے نظام سیاست نے ان ہندوؤن کی زندگی کو جو راسخ العقیدہ مسلمان حکمران کے زیر حکومت تھے، ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا، اس نظام سیاست کا بہترین نمونہ اورنگزیب تھا، جس نے اپنی عدیم المثال اخلاقی سیرت اور مذہبی سرگرمی سے اس سیاست کو منطقیانہ تتمہ پر پہنچانا فرض سمجھا، اس نے ہندوؤن کے علوم و فنون کو منتشر کر دیا، ہندوؤن کی عبادتگاہون کو منہدم کر دیا، ہندوؤن کے میلون اور تہوارون کو روک دیا، ہندوؤن پر مالی بار کا اضافہ کیا گیا، انھیں ہر لحاظ سے نیچا دکھایا گیا، ان کو حکومت کی ملازمتون سے محروم کر دیا گیا، پس اورنگزیب کے ماتحت جو ہندو تھے وہ اپنے علوم و فنون سے بے خبر ہو کر، مذہبی روایات سے بیگانہ ہو کر معاشرتی انبساط اور عام مسرتون سے ناآشنا ہو کر زندگی بسر کر سکتے تھے، دولت اور خود اعتمادی سے بھی جو مواقع اور آزادی کے نتائج تھے وہ محروم تھے، غرضیکہ ان کی زندگی مستقل معاشرتی اور سیاسی مذلت ہو کر رہ گئی تھی"، (اورنگزیب از جادو ناتھ سرکار جلد ۵ ص ۴۹۳،)

"اورنگزیب ایک کامیاب سپہ سالار، وزیر، مذہبی پیشوا، مکتب کا مدرس ہو سکتا تھا، لیکن قدرت کی ستم ظریفی نے اسے ایک تخت پر لا کر بٹھا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی ناکام ہو گئی اور اس کی شہرت پامال ہو گئی، . . . . . . وہ ایک درویش ہو سکتا تھا، گرچہ درویش کے اعلیٰ صفات سے بھی محروم تھا

[1] ملنے کا پتہ:- ڈی بی تارپورے والا، ہارنبی روڈ بمبئی،

لیکن وہ حکمران کی حیثیت سے ایسا بدترین ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا ہے"

(اسٹڈیز ان مغل انڈیا جادو ناتھ سرکار ص۶۰)

یہ الفاظ اورنگزیب کے اس سیرت نگار کے ہیں جو محض اس کی سیرت نگاری کی بدولت دنیا میں ہر قسم کے جاہ و ثروت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے، عموماً ایک سیرت نگار ایک ایسی شخصیت کی سیرت نگاری کو موضوع قرار دیتا ہے جو عظیم الشان وارث ہوتی ہے لیکن یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ فاضل سیرت نگار نے بیس برس کی طویل مدت ایک ایسے حکمران کی سیرت نگاری میں گنوائی جو ایسا بدترین ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ برا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بیس برس کی کدوکاوش اور پانچ جلدوں کی خامہ فرسائی کے بعد ایک سوانح نگار کا اپنے ہیرو کو نالائق، نااہل اور ناکام دکھانا سوانح نویسی کی ایک عجیب و غریب مثال ہے،

مگر ایک حقیقت شناس مورخ کو یہ زیبا نہیں کہ وہ تاریخ کی کسی شخصیت کو برا محض اس لئے کہے کہ وہ اس کے قومی نقطۂ نظر سے برا ثابت ہوا، یہ تاریخ نویسی کے صفاتِ عالیہ کا نہیں بلکہ ایک فرض فراموش مورخ کی جذبات پروری کا مظاہرہ ہوگا، ایک صحیح مورخ کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ عصبیت و جذبات سے آزاد ہو کر تاریخی شخصیتوں کو ان کے حالات، مشکلات اور زمانہ کے اقتضا کے مطابق دیکھنے کی کوشش کرے، پھر وہ جو نتائج مترتب کرے ان میں تاریخیت اور واقعیت ہو نہ کہ قومیت اور عصبیت کی تنگ نظری۔

اورنگزیب کے زمانہ کا صحیح مطالعہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا ہے، جب تک کہ تیموری خاندان کے تمام ماقبل حکمرانوں کی حکمت عملی کو پیش نظر نہ رکھا جائے، کیونکہ اورنگزیب کے زمانہ کی تمام پیچیدگیاں ایک سیاسی ارتقار کا نتیجہ تھیں جو اس کے اسلاف کی بعض غیر مآل اندیشانہ روش کے باعث ظہور پذیر ہوئیں، اور اسے ایک ناقابلِ انکار حقیقت سمجھنا چاہئے کہ عالمگیری عہد کے تمام انتشار و اختلال کا سبب اکبر تھا

ہندو اکبر کے اس احسان کو فراموش نہین کرسکتے کہ اس نے ان کو مسلمانون کے ساتھ نہ صرف مساویانہ طور پر صف آرا کیا، بلکہ مسلمانون کی ہیبت، سطوت، جبروت اور عزت و وقار کو ان کے دلون سے محو کر دیا، عام ہندو جو حاکم قوم کے تمام افراد کو فوق البشر سمجھ کر سر تسلیم خم کرنا اپنا شیوہ سمجھتے تھے اب نہ صرف ہمسری اور ہمچشمی کا دعویٰ کرنے لگے بلکہ عام طور پر ان سے کھنچنے لگے، انکا مذہبی تفوق، عقلی امتیاز اور قومی وقار جاتا رہا، انھی عناصر نے اورنگ زیب کو پیدا کیا جس نے اپنی حکمران قوم کے گم شدہ وقار اور روایات کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی، اتفاق سے اسی زمانہ مین سیوا جی ابھرا جس کی بڑھتی ہوئی قوت سے ہندو قومیت ایک جدید قالب مین آگئی، مگر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ اپنی قزاقی، غارتگری اور رہزنی کے باوجود مذہب و سیاست کا نیک عدیل ہیرو قرار پایا مگر اورنگزیب اپنی قوم کی تجدید تشکیل کی مصلحانہ کوششون کی خاطر اتنا برا قرار پایا کہ اس سے زیادہ برا تصور کرنا خود تصور کی اہانت ہے،

ہندو اورنگزیب کی مخالفت محض اس لئے کرتے ہین کہ اس نے ان کی بڑھتی ہوئی قوتون کو آگے بڑھنے نہین دیا، اس نے ان کے محبوب دارا کو تہ تیغ کیا جس کی وسیع المشربی سے انہین ہندو راج قائم کرنے کی امید بندھ چلی تھی، مگر ایک غیر متعصب مورخ کیونکر اس بات کو قطع نظر کرسکتا ہے کہ اورنگزیب ایک اسلامی حکومت کا مسلمان حکمران ہو، لیکن اسلامی مذہب کا پاسبان، اسلامی شعار کا نگہبان اور اسلامی وقار کا محافظ نہو، اس لئے اگر تمام فرقہ وارانہ ذہنیت سے آزاد ہو کر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اورنگزیب ایک مسلمان بادشاہ تھا جس نے اسلامی حکومت کے کھوئے ہوئے وقار کو قائم کرنے کی کوشش مین تمام ذرائع استعمال کئے تو پھر اس پر کوئی الزام نہین رہجاتا،

مگر اس کو کیا کیجئے، غیر مسلم فرقہ وارانہ ذہنیت نے اورنگزیب کو ہمیشہ بدترین روشنی مین دیکھنے کی کوشش کی ہے، شروع شروع یہ کام انگریزون نے شروع کیا، اس کے بعد ان کی جگہ ہندو بنگالیون

اور مرہٹون نے لی، ان مین سب سے نمایان جگہ سر جدو ناتھ سرکار نے حاصل کی، انھون نے عالمگیر پر پانچ جلدین لکھ کر اس کی مدلل ہجو و مذمت کا ذخیرہ فراہم کر دیا، اس قسم کی غلط فہمیون اور گمراہیون کو دور کرنے کے لئے اردو کے اہل قلم نے برابر کوشش کی، مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے "عالمگیر پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا، پھر دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے ایک ممتاز رفیق نے (جو اب اسماعیلیہ کالج بمبئی مین پروفیسر ہین) عالمگیریات پر دس سال کی تحقیق و تدقیق کے بعد "رقعات عالمگیر" اور "مقدمہ رقعات عالمگیر" لکھ کر اردو دان طبقہ کے سامنے پیش کیا، پروفیسر موصوف کی تحقیقات ابھی تک جاری ہین، جو کئی جلدون مین ظاہر ہونگی، پہلی جلد مین صرف عالمگیر کی شاہزادگی کے حالات و واقعات ہین لیکن جس نے اس کی شہزادگی کے حالات کو اچھی طرح سمجھ لیا، پھر اس کو پچاس سالہ حکومت کے واقعات پر کچھ بھی استعجاب نہ ہوگا،

لیکن ضرورت تھی کہ اس قسم کے تاریخی لٹریچر ان انگریزی دان غیر مسلمون کے سامنے بھی ہون جو اردو زبان سے ناآشنا ہین، الحمد للہ کہ جناب ظہیر الدین صاحب فاروقی بی۔ اے (علیگ) بیرسٹر ایٹ لا نے اس کمی کو بہت حسن و خوبی کے ساتھ پورا کر دیا، ان کی زیر نظر کتاب "اورنگزیب اور اس کا عہد" برسون کی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے، فاضل مؤلف نے فارسی، عربی، اردو، ہندی، مرہٹی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبان کی ان تمام کتابون اور رسالون سے استفادہ کیا ہے، جو عالمگیر اور اس کے عہد کے متعلق کچھ بھی معلومات فراہم کرتے ہین، اس تلاش و جستجو کے بعد جو کتاب تیار ہوئی ہو وہ ظاہر ہے کہ کس قدر مفید اور کارآمد ہوگی، کتاب چوبیس ابواب پر مشتمل ہے، لائق مؤلف نے ہر باب مین باریک بینی اور دقت نظر سے کام لے کر اورنگزیب کی ذات سے متعلق جو غلط فہمیان عام طور پر پھیلی ہوئی ہین، ان کو کامیابی سے دور کیا ہے، طرز تحریر مین جذبات و کیفیات کی لہرین موجزن نہین بلکہ واقعات کی موشگافی حقائق کی روشنی مین کی گئی ہے،

پہلا باب بہت ہی مبصرانہ اور مورخانہ انداز میں لکھا گیا ہے، ابتدا میں مسلمان حکمرانوں کی جانشینی کے اصول پر مختصر طریقہ سے تبصرہ کرتے ہوئے مؤلف نے بتایا ہے کہ کس طرح ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی تخت نشینی خون آشام رہی ہے، شاہجہان کے بعد پھر وہی تاریخ دہرائی جانے والی تھی، دارا حصول سلطنت کے لئے تمام ذرائع استعمال کرتا ہے، وہ نہ صرف ملکی مہمات، جزوی معاملات اور خانگی تعلقات میں اورنگزیب کی تذلیل اور تضحیک کر کے باپ کی نظروں سے گرانا چاہتا ہے، بلکہ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر اپنے مذہبی اعتقادات اور تصورات کو بھی انہیں کے خیالات کے مطابق رنگ آمیزی کرتا ہے،

مؤلف نے دارا کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ وہ کس طرح ہندوؤں کا سیاسی آلۂ کار بننے والا تھا، اکبر کے زمانہ میں اسلام کی سیاسی اور مذہبی ہیئت اجتماعیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا، ہندو اپنی قومیت کی تشکیل اور تکوین کے گھمنڈ میں مسلمانوں کے مدمقابل ہو کر ان کے سیاسی مرکزوں اور مذہبی اداروں پر ضرب کاری لگا رہے تھے، جہانگیر کی نرمی اور لینت نے انہیں اور سوا شہ دیدی، شاہجہان کے عہد میں دارا کو دیکھ کر وہ خوش تھے کہ ایک دوسرا اکبر پیدا ہو رہا ہے، جو ان کے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں بہترین معاون ثابت ہوگا،

فاضل مؤلف ان واقعات پر محققانہ روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ سترہویں صدی کے اواخر کے ردعمل کے تمام جراثیم اکبر کے اس طرز عمل میں پائے جاتے ہیں جو اس نے مسلمانوں کی طرف سے اختیار کیا، . . . . اکبر کی رواداری مسلمانوں کے لئے نہ تھی، بلکہ اسے ان کے جذبات کو صدمہ پہنچانے میں لطف ملتا تھا، اس کے الحاد سے مسلمانوں میں شورشیں اور بغاوتیں ظہور پذیر ہونے لگیں لیکن اس نے اپنے آہنی پنجوں سے انہیں فرو کیا، مسلمانوں کے جذبات کی اشتعال انگیزی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اکبر ابھی بستر مرگ ہی پر تھا کہ جہانگیر سے جس کی تخت نشینی بالکل متیقن نہیں تھی، بارہہ کے سادات نے حلف لیا کہ وہ ہر ممکن کوشش سے اسلام کی عزت و ناموس کا تحفظ کریگا . . . . . . .

شاہجہان کے عہد میں یہ پر ناز تخم دارا کے مشکوک اور مشتبہ معتقدات کی شکل میں پھر ابھر آیا، دارا نے ان تمام ذرائع کو استعمال کیا جو اس کے دادا نے کیا تھا، اس صورت حال میں راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اورنگ زیب کا نجات دہندہ کی حیثیت سے خیر مقدم کیا، وہ جانتے تھے کہ دارا اکبر کے نقش قدم پر چلیگا، لیں اورنگ زیب کو اپنے ماحول کا پیدا وار سمجھنا چاہئے۔ اور اس کی حکومت کے تمام واقعات کو انفرادی طریقہ سے نہیں بلکہ اسباب کے تسلسل کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے، اورنگ زیب کا عہد شروع سے آخر تک اکبر اور دارا کے غیر مال اندیشانہ رویہ کے ردعمل سے بھرا ہؤا (ص ۵۶)

انہی تاثرات کے ساتھ جانشینی کی جنگ ہوئی، اورنگ زیب جانتا تھا کہ اگر میدان جنگ اس کے ہاتھوں نہیں رہا تو اس کا حشر وہی ہوگا جو ہمایون، اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے حریفوں کا ہوا، مسلمان خوفزدہ تھے کہ اگر دارا فتحیاب ہوا تو معلوم نہیں اس کے مذہبی اعتقادات ان کو کس قعر ذلت میں گرائیں گے، حقیقت میں یہ جنگ وہ تھی جس کے نتیجہ پر دو منفرد حریفوں کی قسمت کا نہیں بلکہ دو قوموں کی سیاسی زندگی اور ملکی وقار کا فیصلہ تھا، لیکن اورنگ زیب فاتح ہوا اور دارا مفتوح اور مقتول، ہندوؤں کے تمام منصوبے خواب پریشان ہو کر رہ گئے،"

یہیں سے ہندو اورنگ زیب سے بدظن ہوتے ہیں، اس کے تمام افعال و اعمال کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس پر ہر قسم کے الزامات کو وضع کرنا جائز قرار دیتے ہیں، اس انتقامی جذبہ میں وہ نہ صرف اس کی بلکہ اس کے مذہب کی بھی بدترین تصویر کھینچتے ہیں، فاروقی صاحب نے تیسرے باب میں اسلام کا اصلی مرقع پیش کرکے اورنگ زیب کا رویہ ہندوؤں کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے، اورنگ زیب پر الزام ہے کہ وہ ہندوؤں کی پرستش گاہوں کو منہدم کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا، مگر فاضل مؤلف نے مختلف فرامین کے ذریعہ سے ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب ہندو معابد کے تحفظ کے لئے برابر کوشاں رہا، ان فرامین کی روشنی میں جو دلائل

براہین چوتھے باب مین درج ہین، ان سے بہت سی غلط فہمیان دور ہو جاتی ہین، ایک فرمان جو اورنگزیب نے بنارس کے حاکم کے نام جاری کیا ہے وہ ملاحظہ ہو،

"ابو الحسن کو جو ہمارے احسانات اور مراعات کا مستحق ہے شاہی عنایات پر اعتماد کرنا چاہئے اور اس کو معلوم ہو کہ ہم اپنی طبیعت کی عمیق مہربانیون اور فطری فیاضیون کے سبب اپنی تمام انتھک قوتین اور مخلصانہ ارادے عوام کی بہبودی اور ہر درجہ کے اعلیٰ اور ادنیٰ لوگون کے حالات کی ترقی مین مصروف رکھتے ہین، اس لئے اپنی شریعت کے مطابق ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پرانے مناور مسمار نہین کیے جائینگے، لیکن نئے مناور بنانے کی اجازت نہ ہوگی، ہمارے اس انصاف کے زمانہ مین ہمارے اعلیٰ اور مقدس ترین دربار کو اطلاعات موصول ہوئی ہین کہ بعض اشخاص نے بغض اور عناد سے مغلوب ہو کر بنارس کے ہندوون اور پرانے منادر کے بعض برہمن محافظون پر مظالم کئے ہین اور وہ آیندہ ارادہ رکھتے ہین کہ ان برہمنون کو ان کے عہدون سے نکال دین، اس ارادہ سے اس قوم مین بے چینی پھیلی ہوئی ہے، اس لئے ہمارا شاہی حکم ہے کہ اس فرمان کے پہنچنے کے بعد تم کو آیندہ ہدایت دینی چاہئے کہ کوئی شخص غیر قانونی طریقہ پر برہمنون اور دوسرے ہندو باشندون کے ساتھ بیجا مداخلت یا ان کو تنگ نہ کرے، تاکہ وہ پہلے کی طرح اپنے پیشون پر قائم رہین، اور سکون کیساتھ عبادت مین مشغول رہ کر ہماری خداداد سلطنت کے قیام کے لئے جو برابر رہیگی دعائین کرین، اسکو ایک ضروری بات سمجھو، تاریخ ۱۵ رجادی الثانی ۱۰۶۹ھ"

نئے مندرون کی تعمیر کے امتناعی حکم کے نفاذ کی توجیہہ مؤلف نے اس طرح کی ہے کہ

"آزادی اور رواداری دونون ہم معنی نہین، رواداری مین احتجاج اور ناراضی کا کچھ عنصر شامل ہے، مندرون اور گرجاؤن کی بلامزاحمت تعمیر آزادی ہے، ان کا انہدام تعدی ہے، لیکن پرانے مندرون کی مرمت کی اجازت اور نئے کی تعمیر کی ممانعت مشروط رواداری ہے، ہمین اقرار ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفاء راشدین اور پھر بیسیوں مسلمان حکمرانوں نے نئے مندروں کے بنانے کی اجازت دی، لیکن فقہاء متاخرین اس کامل آزادی کے نہیں بلکہ مشروط رواداری کے حامی تھے۔"[1]

اورنگ زیب پر الزام ہے کہ اس نے بنارس کے کرتی باسیورا، بنی مادھوا اور وشوانا تھ نامی تین مندروں کو مسمار کرکے ان کی جگہ مسجدیں بنوائیں، پہلے مندر کی جگہ پر جو مسجد بنی وہ عالمگیر کے نام سے منسوب ہوئی، پھر مؤخر الذکر دو مندروں کے کھنڈروں پر جو مسجدیں تیار ہوئیں ان کا نام علی الترتیب "پنچ گنگا" اور "گیان باپی" ہے، لیکن اس سلسلہ میں مؤلف مذکور کی تحقیقات بصیرت افروز ہیں، مذکورۂ بالا پہلی مسجد ۱۰۷۷ھ میں تعمیر ہوئی جیسا کہ اس کے کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے تمام ہمعصر تاریخوں میں سوائے کاشی وشوانا تھ مندر کے انہدام کے جو ۱۰۷۹ھ میں ہوا کسی اور مندر کی تخریب کا ذکر نہیں آتا، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اورنگزیب نے کرتی باسیورا کے مندر کو کیوں اور کب ڈھایا، اگر اورنگ زیب نے محض تعصب کی بناء پر مندروں کو مسمار کیا تو ایک کو ۱۰۷۷ھ میں اور دوسرے کو ۱۰۷۹ھ میں کیوں برباد کیا؟ بنی مادھو نامی مندر کے سلسلہ میں بھی کوئی تحریری شہادت نہیں کہ یہ مندر اورنگزیب کے حکم سے گرایا گیا، گنج ارشدی بنارس کے ایک بزرگ کے ملفوظات ہیں، اس کتاب میں ۱۵ رجمادی الاول ۱۰۷۹ھ کی تاریخ میں درج ہے کہ "کفار نے ایک مسجد کو شہید کیا جو زیر تعمیر تھی، اور معماروں کو زخمی کیا، جب یہ خبر شاہ یسین کو ملی تو وہ منڈیاؤں سے بنارس آئے اور مسلمانوں کو جمع کرکے "بتخانہ کلاں" کو مسمار کر دیا" یہ واقعہ آگے چل کر بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ملفوظات کے مرتب اخیر میں لکھتے ہیں کہ "نوربافوں اور مسلمانوں نے قریب پانچسو مناور مسمار کئے، وہ بنی مادھو کے مندر کو بھی برباد کرنا چاہتے تھے، لیکن گلیاں مسدود تھیں اس لئے وہاں پہنچ نہ سکے" "بتخانۂ کلاں" سے مراد وشوانا تھ مندر ہے کیونکہ اگر یہ مندر

---

[1] ملخصاً۔ رسول اللہ صلعم سے اس باب میں کوئی شئی نفیاً یا اثباتاً ثابت نہیں، صرف حضرت عمرؓ کے معاہدات میں جنکی بڑی قانونی حیثیت ہے گنجائش ہے

اورنگ زیب کے ہاتھوں مسمار کیا جاتا تو گنج ارشدی کا مرتب خوش ہو کر اس واقعہ کا ضرور اندراج کرتا، اس کے علاوہ گیانی باپی کی مسجد کے کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد ۱۰۴۸ھ میں تعمیر ہوئی، "ایوان شریعت" اس کا تاریخی نام ہے، پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ وشوانا تھ مندر کو مسمار کر کے جو ۱۰۸۰ھ تک قائم تھا، گیان باپی کی مسجد تعمیر ہوئی، سجان رائے بنارس کے احوال میں کہیں ذکر نہیں کرتا ہے، کہ اورنگزیب نے کسی ایک مندر کو بھی مسمار کیا، کہا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے مندروں کے مسمار کرنے کے لئے ایک عمومی حکم جاری کر رکھا تھا، لیکن یہ حکم اگر واقعی جاری ہوا تو مغلیہ سلطنت کے پایہ تخت دہلی، آگرہ، پھر متھرا اور دکن میں جہاں اورنگزیب نے جنگ و جدل میں اپنی بیشتر زندگی گذاری، ہزاروں مندر کیونکر محفوظ رہتے،

اس کے بعد مؤلف نے جزیہ پر بحث کی ہے، پہلے نفس جزیہ کے اصول پر مفید بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ اورنگزیب نے یہ ٹیکس محض مالی نقطۂ نظر سے عائد کیا، منوکی اور پھر دوسرے غیر ذمہ دار مورخوں کا خیال ہے کہ جزیہ ہندوؤں کو قبولِ اسلام کی ترغیب دلانے کی خاطر عائد کیا گیا، لیکن "جزیہ ہرگز اس خیال سے عائد نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ ہندو جو حکومت کے ملازم تھے، اس ٹیکس سے بری تھے، یہ برأت اس اصول کو واضح کرتی ہے، کہ یہ ٹیکس ان کے لئے نہ تھا، جو حکومت کے ملکی اور فوجی محکموں میں رہ کر اپنے فرائض ادا کر کے سلطنت کی خدمت کرتے تھے، ایشور داس کہتا ہے کہ "بادشاہ سلامت نے ایک حکم جاری کیا، کہ سلطنت کے ملازمین کے علاوہ غیر مسلم مندرجہ ذیل شرح سے جزیہ ادا کریں، امرار جن کی آمدنی ۲۵۰۰ ہو ۱۳ روپیہ، طبقۂ متوسط جن کی آمدنی ۲۵۰ ہو ۶ روپیہ ۸ آنے، غربا جو اپنی ضروریات پوری کر کے ۵۲ روپیہ یا اس سے زیادہ پس انداز کرتے ہوں، ۳ روپیہ ۸ آنے ادا کریں"... جزیہ کبھی ظلم و ستم کے ساتھ وصول نہیں کیا گیا، غربا جب اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات سے فارغ ہو کر مذکورۂ بالا رقم پس انداز کرتے تو ان سے جزیہ لیا جاتا، طبقۂ متوسط کو اجازت تھی کہ وہ دو قسط

مین اور غربا چار قسطا مین رقم کی ادائی کرین، وہ روپیہ کے علاوہ دوسری شکل مین بھی اس کی ادائی کرسکتے تھے، اور اگر کوئی چھ مہینے تک بیمار رہتا تو اس سے جزیہ نہ لیا جاتا، یا اگر ایک سال تک حکام کی غفلت کے علاوہ کسی اور باعث سے یہ وصول نہ ہوتا تو دوسرے سال معاف ہوجاتا" (ص ۱۵۲)

کتاب کے چھٹے باب مین ہندوون کے میلون، تہوارون، درسگاہون اور معاشرتی زندگی کے متعلق اور پھر ان کے سلسلہ مین عالمگیری احکام کی حقیقت کا دلچسپ مطالعہ ہے، اورنگزیب پر الزام ہے کہ اس نے تعصب مذہبی مین ہندوون کے میلے ٹھیلے بند کرادیئے، مگر یہ الزام خافی خان کی بعض عبارتون کے غلط استدلال سے عائد کیا گیا ہے، لائق مؤلف نے خافی خان کے دو متوازی اقتباسات نقل کرکے بتایا ہے کہ اورنگزیب نے مذہبی میلوں کو نہین بلکہ ان میلون کے غیر شرعی محاصل کو بند کیا، طوالت کے خیال سے ہم ان اقتباسات کو نظر انداز کردیتے ہین، ناظرین کتاب زیر نظر کے ص ۹۷ - ۱۰۰ ملاحظہ فرمائین، اس کے بعد سجان رائے اور ہیملٹن کی شہادتین پیش کی گئی ہین جن سے اس عہد مین تہوارون اور میلون کا کثرت سے منعقد ہونا پایۂ ثبوت تک پہنچتا ہے، سجان رائے کے حوالہ سے بعض تہوارون کے بھی کوائف بیان کئے گئے ہین، جن مین ہر قسم کی رنگینیون اور سرمستیون کا مظاہرہ ہوتا تھا، اسی طرح اورنگ زیب کے اس الزام کو کہ اس نے ہندوؤن کے تمام مدرسون کو بند کردیا یہ دکھلا کر رد کیا ہے کہ عالمگیر نے انہی مدارس کو بند کرایا، جن مین ہندو مسلمان بچون کو اپنے مذہبی علوم سکھلاتے تھے، پھر ساتوین باب مین اس کذب و افترا کو کہ اورنگزیب اسلام کی تبلیغ مین تشدد اور ظلم کرتا تھا، حقائق کی روشنی مین دکھایا ہے،

آٹھوین باب مین لائق مصنف نے طویل فہرستون کے ذریعہ سے دکھایا ہے کہ اورنگزیب اور پھر اس کے اسلاف کے زمانہ مین جو تمام نکتہ چینیون اور مسلمانون کی بیجا طرفداریون سے ماورار سمجھے جاتے ہین، ہندو عہدیدار کتنے تھے، یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ ہفت ہزاری منصب والے

ہندو اکبری عہد میں صرف ایک اور جہانگیر و شاہجہان کے زمانہ مین ایک بھی نہین لیکن اورنگزیب کی حکومت مین دو تھے، شش ہزاری ہندو اکبر کے زمانہ مین ایک بھی نہین، لیکن اورنگزیب کے عہد مین ۱۰ تھے، کیول رام مصنف تذکرۃ الامراکی دی ہوئی فہرستون سے پتہ چلتا ہے کہ عالمگیر کے عہد مین پنجہزاری ہندو منصب دار پانچ، چار ہزاری پانچ، ۳½ ہزاری چار، تین ہزاری، تیرہ، ۲½ ہزاری پانچ، دو ہزاری سولہ، ۱½ ہزاری ستائیس، اور ایک ہزاری پندرہ تھے، ان مختلف فہرستون اور صحیح واقعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب ہندوون کوان کی لیاقت اور قابلیت کے لحاظ سے ہمیشہ بڑھاتا رہا، ہندوون کو اپنی سرکار مین ملازم رکھنے کے سلسلہ مین اس کا خیال تھا کہ "مذہب کو دنیاوی امور کے بیچ مین لانا بے معنی ہے، اور اس قسم کے معاملات مین مذہبی عصبیت کو راہ نہ دینا چاہیئے" (ص ۲۰۲)

اورنگزیب کی فرد قرارداد جرم مین ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی مذہبی راسخ العقیدگی کے جوش مین راجپوتون کی ہمدردی کھو دی، راجپوت تیموری حکومت کے دست راست تھے، ان کا الگ ہونا تھا کہ مغلیہ سلطنت مین تزلزل ہونے لگا، راجپوتون کی ناراضی کی وجہ جسونت سنگھ کے لڑکون کے ساتھ برا سلوک قرار دیجاتی ہے، لائق مؤلف نے جسونت سنگھ کے کیرکٹر اور پھر اس کے لڑکون کی جانشینی کے تمام جزوی واقعات پر بحث کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ راجپوتون کے منافقانہ اور غیر مآل اندیشانہ حرکات سے اورنگزیب کو کس قدر اذیت پہنچی، پھر بھی بلند حوصلہ اورنگ زیب نے بقیہ راجپوت قوم سے ویسا ہی سلوک قائم رکھا جیسا کہ ایک مدبر حکمران کو چاہیئے تھا، اگر اورنگزیب نے غدار اور منافق جسونت سنگھ کے لڑکون کو راجہ کا خطاب عطا نہین کیا تو یہی تنہا مثال ہے، لیکن انہی راجپوتون مین جب راجہ بھگوت سنگھ بندیلہ مرا اور اس نے کوئی وارث نہین چھوڑا تو اورنگزیب نے اس خاندان کے افراد کے مشورے سے راجہ اوت سنگھ کو تخت نشین کیا، جگت سنگھ ہاڈا لاولد مرا تو

اورنگ زیب نے اس کی حکومت کی باگ اس کے چچا زاد بھائی کشور سنگھ کو دی، جام نگر کا راجہ نرل مرا تو اس کا لڑکا ستر سل گدی پر بیٹھا، نرل کا بھائی کچھ کے راجہ کی مدد سے ستر سل کو قید کرکے خود تخت کا مالک بن بیٹھا، لیکن اورنگزیب نے قطب الدین خان کے نام فوراً فرمان جاری کیا کہ باغیوں کو سزا دیجائے اور ستر سل کو اپنی موروثی سلطنت پر قابض کیا جائے، اورنگزیب نے صفدر خان کے منصب کو محض اس لئے کم کردیا کہ نجا در بھدوریہ کو اس کے دشمنوں کے خلاف مدد دی، انہی تعلقات کا نتیجہ تھا کہ دکن کی مہموں میں راجپوت اورنگ زیب کے ساتھ بکثرت شریک رہے، اورنگزیب کے بعد بھی راجپوت مغلوں کے قوت بازو بنے رہے، اس کی اولاد میں جو جانشینی کی جنگ ہوئی اس میں راجپوت برابر کے شریک تھے، اودے پور کے رانا اودے سنگھ نے بہادر شاہ سے فرمانبرداری اور اطاعت گذاری کا وعدہ کیا، مہاراجہ اجیت سنگھ والی جودھ پور دست بستہ بہادر شاہ کے دربار میں حاضر ہوا، مابعد عہدوں میں بھی راجپوت دولت مغلیہ سے وابستہ رہے، اجیت سنگھ اور جے سنگھ تمام کے تمام تیموری دربار میں برابر نمایاں رہے، اکثر راجپوتوں نے مرہٹوں کے خلاف مغلوں سے امداد حاصل کی، ۱۷۳۵ء میں خان دوران جب دہلی سے مرہٹوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے روانہ ہوا تو جے سنگھ (جے پور) ابھے سنگھ (جودھ پور) اور راؤ درجان سال (کوٹہ) اس کی امداد کے لئے فوج لے کر آگے بڑھے،

ان واقعات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ اورنگزیب کی حکمت عملی سے راجپوت تیموریوں سے اس طرح برگشتہ ہوئے کہ ان کی برگشتگی سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی، اس سلسلہ میں مؤلف اپنی وقتِ نظر سے جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ قابل غور ہے، وہ لکھتے ہیں کہ، اورنگزیب کی وفات کے بعد تخت طاؤس طاقتور اور مدبر بادشاہوں سے محروم ہوگیا، بہادر شاہ کے جانشینوں میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ ماتحت ریاستوں کی خانہ جنگیوں اور ریشہ دوانیوں کا سدباب کرسکیں، جنگ

راجپوتون کا محبوب پیشہ تھا، تخت دہلی کی طوائف الملوکی مین ملک گیری کیسے ممکن تھی، راجپوتون کو اپنی جنگجوئی اور نبرد آزمائی کے جوہر دکھانے کا موقع جاتا رہا، لیکن ان کی جنگجویانہ فطرت کے لئے کچھ مشغلہ چاہئے تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ انھون نے اپنی تلوارون کو اپنے ہی عزیز و اقارب کی گردنون پر تیز کرنا شروع کیا، حسب معمول وہ تیموری شہنشاہون سے امداد کے طالب ہوتے رہے لیکن وہان بھلا ان کی شنوائی کہان ہوسکتی تھی، حالات نے انہین مجبور کیا کہ وہ اب صرف اپنے گھرون کو محفوظ رکھنے مین مشغول رہین، لہذا تیموری حکومت کی سیاست سے ان کی دلچسپی کم ہوتی گئی، یہ تیموری سلطنت کیلئے مضر ہوا، لیکن راجپوتون کے لئے اور بھی ہلاکت آفرین ثابت ہوا، راجپوت جو تین صدیون تک ہرجگہ ممتاز اور مقتدر تھے، اب اپنے کو ایک مردہ قوم محسوس کرنے لگے، یہان تک کہ وہ بالکل پس پشت پڑگئے (ص۳۰۵) یہ نتیجہ حقیقت اور واقعیت سے خالی نہین،

دسوان اور گیارھوان باب سکھون اور شیعون پر ہے، پھر چار باب مین گولکنڈہ اور بیجاپور کے واقعات پر فاضلانہ تبصرہ ہے، شروع مین گولکنڈہ کے ابتدائی حالات ہین جن مین اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے خلاف یہان کے حکمرانون کی شوریدہ سری اور شورہ پشتی اور سرکشی پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر شاہزادہ اور شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ مین جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ان پر مباحث ہین آخر مین مولف نے گولکنڈہ کی تسخیر کے اسباب جو بتائے ہین وہ سننے کے قابل ہین، وہ لکھتے ہین کہ

"اکتوبر ۱۶۸۵ء کی صلح اور مارچ ۱۶۸۶ء مین مادنا کے قتل کے بعد اورنگ زیب کو امید تھی کہ ابوالحسن عقل سلیم سے کام لے کر اب مرہٹون کی دوستی اور استعانت سے گریز کریگا، لیکن یہ امید عبث تھی، ہم دیکھتے ہین کہ صلح کے فوراً ہی بعد ابوالحسن نے ایک کثیر رقم سمبھاجی کو بھیجی، گولکنڈہ کے ہوا خواہ ہر ممکن صورت سے ابوالحسن کو ناخوشگوار نتائج سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے حتی کہ مغل کے شاہی وکیل نے اس خبر کو اورنگزیب سے پوشیدہ رکھا، لیکن اورنگ زیب کو بیرونی ذرائع سے آخر پتہ چل ہی گیا، ابوالحسن بہانہ

کرتا تھا کہ اس کے پاس اب روپیے نہیں ہیں، اور عوام کی ہمدردی کو منعطف کرنے کی خاطر اس نے شاہی قاصد سے روپیہ کے بدلے بیگمات کے جسم پر سے زیورات اتار دینے کی درخواست کی، لیکن سنبھاجی کے پاس روپیہ بھیجنے کے لئے کافی روپیے تھے،

حیدرآباد کی فتح کے سلسلہ میں خافی خان نے اورنگ زیب کی بیجاپور سے گلبرگہ اور پھر یہاں سے گولکنڈہ کی روانگی کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ اس اچانک حملہ کے اسباب کو نظرانداز کرگیا ہے، اس سے لازماً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اورنگ زیب جارحانہ طور پر صلح کے معاہدون سے دست بردار ہوگیا، لیکن شاہی قاصد سعادت خان کے تذکرے میں مصنف مذکور اتفاقی طور پر اس اچانک حملے کا سبب بتا گیا ہے، یعنی مرہٹون کے ساتھ ابوالحسن کی سازش جو قطب شاہی سلطنت کے استیصال کی حقیقی وجہ ہے،

"اورنگ زیب گولکنڈہ کی طرف بڑھا جا رہا وہ ۱۶۸۷ء کی اخیر جنوری میں پہنچا، گولکنڈہ کا محاصرہ طویل ہوگیا، کیونکہ مغل افسرون میں نفاق پھیلا ہوا تھا، گو ان کی وابستگی شاہی بہبودیون سے تھی لیکن اورنگ زیب کے شیعہ امرار ایک شیعہ سلطنت کے استیصال پر بے حد مغموم تھے، ان کے جذبات فطری تھے، اور انھون نے اس مصیبت کے سدباب کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن گولکنڈہ کے ایام پورے ہوچکے تھے، اورنگ زیب اپنے ارادون میں پختہ اور مستقل تھا، ابوالحسن نے رحم کی درخواست کی، لیکن اورنگ زیب اپنے عزم سے کیون باز آنے لگا، اس نے ابوالحسن کو لکھا کہ، تمھارے جرائم ناقابل بیان ہیں، تم نے اپنا نظام سلطنت ایک کافر (یعنی مادنا) کے سپرد کیا اور پھر اسے سادات، مشائخ اور علمار پر مظالم کرنے میں مدد پہنچائی، شب و روز تم میخواری میں مست رہتے ہو، ہر قسم کی بدمعاشیان تمھارے یہان پھیلی ہوئی ہین، تم کفر و اسلام اور ظلم و انصاف میں مطلق امتیاز نہیں رکھتے ہو، تم کفار پر یعنی مرہٹون کے امداد پہنچانے پر اب تک مصر ہو۔ . . . تمھارے پاس متعدد فرامین پہنچے، لیکن تم نے سبھون کو نظرانداز کردیا، پھر تم نے حال ہی میں ایک لاکھ ہون (چار لاکھ روپیے) بدطینت سنبھا کے پاس بھیجا، اپنی ان نازیبا حرکتون

سے غافل ہو کر تم دونوں جہان کی بہبودیوں کے خواہاں ہو تو یہ محض سراب اور دھوکا ہے۔"

ان حالات میں اگر اورنگزیب نے گولکنڈہ کو تسخیر کیا تو کیا برا کیا؟

اسی طرح عالمگیر نے بیجاپور کو فتح کر کے کیوں اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا، اس کا جواب مؤلف کے الفاظ میں یہ ہے:-

"بیجاپور کی اصلی عظمت محمد عادل شاہ متوفی ۱۶۵۶ء کے بعد سے جاتی رہی، علی عادل شاہ دوم نے شروع میں انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا، لیکن آگے چل کر وہ زن و شراب کے مضرت رسان اثر میں آکر برباد ہو گیا، اس کی وفات (۱۶۷۲ء) تک بیجاپور کا اجتماعی وجود قائم تھا، لیکن اس کے بعد طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا، امراء اپنے اقتدار کے لئے برسر پیکار رہنے لگے اور اپنی غیر مناسب خود غرضانہ مطلب برآری کے لئے عادل شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے تیار رہتے، ظلم و رشوت ستانی کا دور شروع ہوا، انصاف کا فقدان ہو گیا، بیجاپور کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ کسی کو بھی خواہ وہ ایک شہزادہ ہو یا ادنیٰ کسان، ایک دن بھی اطمینان سے کھانا یا رات کو سونا نصیب نہ ہوا۔"

اس شورانگیز حکومت کے علاوہ سلطنت کی بیرونی حکمت عملی نہایت مضر ثابت ہو رہی تھی، مرہٹے بیجاپور کے حدود سلطنت کو آزادی سے غصب کر رہے تھے، لیکن ان کو روکنے کی کوئی صورت عمل میں نہیں لائی جا رہی تھی، برخلاف اس کے ان کی خدمات ہمیشہ حاصل کی جاتیں، حالانکہ وہ غداری کرنے کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے، اہل بیجاپور مغلوں سے معاہدے کرتے اور مرہٹوں کو امداد پہنچانے کا وعدہ کرتے تھے، لیکن ان کے وعدوں میں اصلیت مطلق نہ ہوتی تھی، انھوں نے اورنگزیب کو دھوکا دینے کی کوشش کی، لیکن خود دھوکے میں آگئے۔"

"اہل بیجاپور کے لئے صرف دو چارۂ کار تھے، یا تو وہ علانیہ اور آزادی کے ساتھ سیواجی سے مل کر مجموعی فوجوں سے مغل حکومت کو دھمکی دیتے یا پھر خلوص دل سے مغلوں کے ساتھ ہو کر مرہٹوں کو انکے

مقبوضات سے بے دخل کرنے کی کوشش کرتے، لیکن انھون نے ایک مہلک رویہ اختیار کیا، ظاہراً مغلون سے ملے رہے، لیکن باطناً مرہٹون کو امداد پہنچاتے رہے، مغل سلطنت خطرے مین تھی، مرہٹون کی قوت بڑھ رہی تھی، جب بیجاپور کے امرا نے مغل بادشاہ کے نصائح سے کوئی فائدہ نہین اٹھایا تو سزا ہوش ربا سرعت کے ساتھ نازل ہوئی اور نوجوان سکندر کو اپنے خود غرض اور بدچلن مشیرون اور درباریون کی حماقتون کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔" (ص ۳۲۴)

عالمگیر پر یہ اعتراض ہے کہ اگر وہ گولکنڈہ اور بیجاپور کو فتح نہ کرتا تو دکن کی یہ ریاستین مرہٹون کو دبائے ہوئے رہتین، مگر حقائق کی روشنی مین یہ اعتراض کس قدر بے بنیاد ہے، سچ تو یہ ہے کہ جیسا کہ مؤلف نے بھی لکھا ہے کہ حیدرآباد اور بیجاپور کے انتشار و اختلال، ان کی خانہ جنگیون اور امراء کی ریشہ دوانیون کا بس یہی نتیجہ ہوتا کہ دونون ریاستون پر مرہٹون کا علم لہراتا ہوتا، مغلون کے ساتھ مل کر ایک مشترک دشمن کو شکست دینے کے بجائے سلاطین دکن نے مرہٹون کی مدد کی، ایسی حالت مین اورنگ زیب ان کے استیصال کے لئے کیون آمادہ نہ ہوتا؟

ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ہونہار اور لائق مصنف نے لکھا ہے کہ" اس بدقسمتی کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ وہی چیز جو تمام حکومتون اور فرمانرواؤن کے لیے طرۂ امتیاز اور تمغاے افتخار ہو، وہی کارروائیان جو سلاطین اور کشورکشاؤن کے حالات مین کارنامے کہے جائین، غریب اورنگزیب کے لئے ذلت و بدنامی، رسوائی و شرمساری کا موجب ہون، رومیون نے قدیم دنیا کے تینون براعظمون کے بیشتر حصہ کو اپنے گھوڑون کی ٹاپون سے کچل دیا، لیکن یہ ان کی عظمت و شوکت کا سبب بن گیا سکندر اعظم نے مقدونیہ سے لیکر پنجاب تک تمام متمدن ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، لیکن یہی بربریت اس کی بڑائی کا ذریعہ ہے، دور کیون جائیے خود مغلون کے سب سے زیادہ نیکدل، غیر متعصب وسیع المشرب بادشاہ اکبر نے بہار و بنگال، مالوہ و گجرات اور راجپوتانہ کو ہضم کرکے تربدہ پار کی

مسلم ریاستوں پر حملہ کیا اور خاندیس، برار اور احمد نگر وغیرہ پر قبضہ کیا، اس غاصبانہ قبضہ کا صلہ کیا تھا؟ کوئی مخالفانہ تنقید، کوئی غیر منصفانہ فیصلہ نہیں، بلکہ اسے اعظم کا خطاب دیا گیا، جہانگیر و شاہجہان نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں سے تمام عمر لڑتے رہے ہیں تو مورخوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی، لیکن جب اسی نامکمل و ناتمام کام کو اورنگزیب مجبوراً پورا کرتا ہے تو اُسے ظالم، غاصب، غیر سیاست دان اور متعصب کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔" (مقدمۂ رقعات عالمگیر نوشتہ سید نجیب اشرف ندوی ام اے دار المصنفین اعظم گڈھ)

سترہواں اور اٹھارہواں باب مرہٹوں پر ہے، ان دو ابواب میں تاریخی حقائق سے ثابت کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب اور مرہٹوں میں سے کون غالب اور کون مغلوب رہا، اس سلسلہ میں جو چیز زیادہ دلچسپ نظر آتی ہے وہ سیواجی کے متعلق مؤلف موصوف کی رائے ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "اس دن سے جب کہ سیواجی نے ایک سترہ برس کے لڑکے کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا، اور اپنے مرنے کے آخری روز تک جب کہ وہ ایک وسیع مملکت اور مستحکم قلعوں کا بلاشرکت غیرے مالک تھا، اس نے اپنے دوست اور دشمن کے تصورات کو یکساں طور پر ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا، وہ طاقتور ہمسایوں سے گھرا ہوا تھا، لیکن اس نے پہلے احتیاط اور ہوشمندی سے ایسا کام لیا کہ انہیں اس کی ذات سے مطلق خطرہ کا احساس پیدا نہیں ہوا، لیکن جب وہ ناقابل تسخیر قلعوں کا مالک بن بیٹھا تو پھر اپنی بڑھتی ہوئی قوت کی بنا پر اپنی اہمیت دکھانے لگا، چالاکی اور ڈپلومیسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، پھر اہم مواقع کی پیچیدگیوں سے کبھی پراگندہ خاطر نہیں ہوتا تھا، وہ اپنی ہر ضرورت کے لئے ایسے شاندار ذرائع پیدا کر سکتا تھا کہ غنیم بھی اس کی مداحی میں رطب اللسان ہو جاتے تھے، جب کبھی وہ کوئی تدبیر سوچتا تو اپنی حیرت انگیز چالاکی سے اس کو عملی جامہ اس خوبی سے پہنا دیتا تھا کہ اغیار کی تمام پیشقدمی یونہی مذبذب پڑی رہتی تھی، وہ بجلی کی طرح آتا اور گذر جاتا تھا، اس کی آمد و رفت میں اتنی حیرت انگیز

سرعت ہوتی کہ لوگ قبل اس کے کہ اس کی آمد کے اثرات سے سنبھلیں وہ غارتگری کا صرف منظر پیچھے چھوڑکر بیسیوں میل آگے بڑھ جاتا، اس کو اپنے دشمنوں کے کمزور پہلو سے واقفیت حاصل کرنے میں مہارتِ تامہ تھی، وہ اپنے غنیموں کی طبیعتوں اور دلچسپیوں سے اس طرح کی واقفیت بھی رکھتا تھا کہ اس کے ذریعہ سے انہیں پسپا کرنے میں اسے کچھ بھی دقت محسوس نہ ہوتی تھی، اسکو لڑائی میں نمایشی اجزار کی عملیت کا کافی احساس تھا، اس لئے اس کا شایستہ خان پر حملہ کسی اہم مقصد کی تکمیل کے لئے نہیں بلکہ محض ہیبت طاری کرنے کے لئے تھا، وہ ایک TOWERING شخصیت کا آدمی تھا، ایک ابلق گھوڑے پر بیٹھکر اپنے ہاتھ میں ایک لمبی تلوار لے کر نہ صرف اپنی اطاعت تسلیم کراتا، بلکہ لوگوں سے غیر متزلزل وفاداری اور کمال نیاز حاصل کرتا، دلیری اور جوانمردی میں اس کے مدمقابل بہت کم لوگ تھے، اس کا غیر متزلزل استقلال، ناقابلِ شکست ہمت، اسکی اعلیٰ امتیازی قوت، اس کی ذہنی سرگرمی کی فوقیت اور تدابیر کی تکمیل میں ناقابلِ یقین کارنامے ہم سے خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتے ''

اس کی ذات کی بدولت مرہٹوں نے تمناؤں اور امیدوں کی پرورش کی، اور اپنے خواب و خیال کے اجزا تیار کئے، اس نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک جدید عہد پیدا کیا، اور اپنی قوم کی قسمت بدل دی، سیواجی کی زندگی واقعۃً ایک رزم نظم تھی ''(ص ۳۶۷)،

ممکن ہے کہ مؤلف کی اس رائے سے بعض اہل نظر متفق نہ ہوں، لیکن ایک مؤرخ کا فرض ہے کہ وہ تاریخ کی ایک شخصیت کے روشن پہلو کو نظر انداز نہ کرے خواہ اس کی زندگی ناخوشگوار واقعات سے کیوں نہ مملو ہو،

اسگلے چار بابوں میں ملکی نظام اور سیاسی و معاشرتی حالات کا دلچسپ، مفید اور پر از معلومات مطالعہ ہے تیئیسواں باب اورنگ زیب کے ذاتی حالات پر ہے، جس میں اس کی ایامِ شاہزادگی، تعلیم و تربیت، مناہل زندگی، سیرت کا انفرادیت، ہمت، استقلال، احساسِ فرائض، انصاف، افتادِ طبیعت اور عمالِ حکومت

کے ساتھ اس کے برتاؤ پر تبصرہ ہے، ان تمام باتون پر ناقدانہ نظر ڈال کر فاضل موصوف جن نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ دیرینہ کامیابیوں اور ناکامیوں کی صداے بازگشت مفقود ہو گئی ہے، اور ایک نئی دنیا ظہور مین آگئی ہے، لیکن اورنگ زیب کی یاد مسلمانون کے دلوں میں اب تک قائم ہے، اور ایک جلیل القدر انسان کی حیثیت سے وہ غیر فانی ہے؛

اقبال نے خوب کہا ہے،

کور ذوقاں داستانہا ساختند　　وسعتِ ادراکِ اوناشناختند

درصفِ شاہنشاہاں یکتاستے　　فقرِ او از ترکشش پیداستے

تتمہ میں مؤلف نے اورنگزیب کے عہد کے تمام واقعات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے تیموری سلطنت کے زوال کے اصلی اور حقیقی اسباب پر روشنی ڈالی ہے، جن بلیغ سطرون پر کتاب ختم کی گئی ہے، وہ قابلِ مطالعہ ہیں؛

"مغل اب باقی نہیں رہے، ان کے پرچم دہلی کے لال قلعہ کے برجوں پر اب نہین لہرائین گے تختِ طاؤس کی درخشانی سے دیوانِ عام کا شاندار کمرہ حسین نظر نہیں آئیگا، اس کی مرصع دیوارون مین جن سے اب صرف خالی الذہن منظر بین سیاحوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں، بادشاہوں کی صدائیں نہیں گونجینگی؛ دنیا عظیم الشان مغلوں کی شان وشکوہ اور جاہ وجلال کو نہیں دیکھیگی، لیکن آیندہ نسلین جب ان کے تمدنی اثرات، ان کے قوانین کی یکسانی، ان کی بدولت علم وادب کی ترقی، ان کے عہد کی اقتصادی بے نیازی پر غور کریگی تو معلوم ہوگا کہ ان کے قبل ہندوستان کے غربا کے تحفظ، تجارت وزراعت کے فروغ، امن وامان کے قرار، اور عوام کے آرام وآسایش کی خاطر ایسی منظم اور سرگرم کوششین نہیں کی گئین مغل حکومت کے آثار صرف دفترِ پارینہ میں محفوظ نہیں، بلکہ موجودہ عہد کے فرہنگ میں واضح طور پر پائے جاتے ہین، ہمارے مالی اور عدالتی محکموں میں ایسے بکثرت اصطلاحات مروج ہیں، جو پرانے نظام کے اثرات کی یاد تازہ کرتے ہیں، اگرچہ باقیات الصالحات خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن گذشتہ عہد کی فراوانی اور تنوع کی تعبیر کوئی از سرنو

کیونکر کرسکتا ہے، ہم نے اپنی آنکھوں پر زور دیا کہ ہم مغلوں کے جہاز کو مع اس کے سردار اور جہاز رانوں کے بحری موجوں سے گذرتے ہوئے دیکھیں اور اپنے ناظرین کو اس کا منظر دکھائیں، لیکن یہ کام ہمارے بس سے باہر ثابت ہوا، ساحل پر جب وقت کا جہاز اپنے تباہ شدہ اجزا چھوڑ جاتا ہے، تو ہم ٹوٹے پھوٹے تختوں اور لکڑیوں کو جمع کرلیتے ہیں، جن پر بحثیں کی جاسکتی ہیں، مگر ان میں زیادہ تر قیاس آرائیاں ہوتی ہیں لیکن وہ عظیم جہاز جو عمق میں غرق ہوگیا کیا تھا اس کو ہم پھر کبھی نہیں دیکھیں گے"۔

آخر میں ایک بار پھر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مؤلف نے جس وسعت نظر، تلاش وجستجو اور تفحص و تجسس سے کام لے کر ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کیا ہے، وہ ہر لحاظ سے مدح وستایش کے قابل ہے، سچ تو یہ ہے کہ اورنگزیب کی ذات پر جادو ناٹو سرکار کی زہر چکانیوں کے بعد ظہیرالدین فاروقی صاحب کی یہ کتاب تریاق کا کام کرے گی، اس لئے ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اہل ذوق اور طلبہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

---

## مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے مآخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات وسوانح پر خود ان خطوط ورقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے،

لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت: للعہ

"منیجر"

# عربوں کا علمِ کائنات

از

جناب صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

(۲)

عربی علم ادب میں عرب جغرافیہ نگاروں کے ساتھ ساتھ ماہرینِ علم کائنات ہوئے ہیں، جنھیں حقیقت میں تشریحی جغرافیہ کا ماہر کہنا بجا ہوگا، یہ لوگ ایسے مخزن العلوم تھے، کہ وہ نہ صرف زمین کی حالت اور اس کے ممالک کا ذکر کرتے ہیں، بلکہ تمام کائنات اور اسکی مختلف المنوع حالتوں کو بھی بیان کرتے ہیں، وہ علم کلام، فلسفہ اور فطرت کے ماہر بھی ہیں، اور جغرافیہ نگار بھی، انھیں ہر شے سے انس ہے، اور وہ اس کی جستجو میں رہتے ہیں، اور بالآخر حاصل کر لیتے ہیں، ان کی تصانیف کیا ہیں، مجموعۂ عجائب ہیں، شاید اس سے یہ خیال پیدا ہو کہ ان کتابوں کی علمی حیثیت بہت کمزور ہے نہیں یہ بات ان پر ہمیشہ صادق نہیں آتی، انکی تصانیف میں ان تمام افسانوں اور حکایات کے ساتھ ساتھ ایسا مفید علمی مواد بھی ہے، جو ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ یہ عجائب ایسے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں، جنکی یا تو مشاہدے کی تکمیل نہ ہو سکی ہو، یا ان کے بیان کرنے میں کچھ فرق پڑ گیا ہو، علاوہ بریں یہ تمام کتابیں عام دلچسپیوں کا مجموعہ ہیں،

قزوینی، علم کائنات پر لکھنے والوں میں سب سے مشہور قزوینی اور دمشقی ہیں، قزوینی واسط اور حلہ کا قاضی تھا، اوس نے ۶۸۲ھ میں وفات پائی، اس کی کتاب کو وسٹنفلڈ نے شائع کیا ہے، اس کے

دو بڑے حصے ہیں، ایک میں اس نے کائنات کے عجائب کا ذکر کیا ہے، اور اس میں مشہور ستاروں
آسمان کے نگران فرشتوں کا ذکر اور ان میں سے بعض کا حال تفصیل سے لکھا ہے، علاوہ بریں اس
حصے میں دنوں مہینوں اور دوسری مشہور چیزوں کا ذکر ہے، اس کے بعد وہ حصہ ہے، جسے صحیح مفہوم
میں علم الارض کہنا چاہئے، اس میں سمندروں کا بیان بھی شامل ہے، سمندروں کے ذکر کیساتھ جزائر
اور وہاں کے حیوانات کے حالات بھی درج کئے ہیں، سمندروں کے بعد پہاڑوں کا بیان ہے جسے وہ
ترتیب ابجد کے لحاظ سے لیتا ہے، پھر دریاؤں چشموں اور دیگر ذرائع آب کا حال اسی ترتیب سے
لکھا ہے، کتاب کے اس جغرافی حصے کے بعد معدنیات کا بیان ہے، جس میں ارسطو کا ذکر بار بار آیا ہے،
بعد ازیں نباتات کو لیا ہے جکی تفصیل بہت وسیع ہے، پھر علم تشریح الاعضاء کی باری آتی ہے جس
میں انسان کے جسم کے ہر عضو پر علیحدہ علیحدہ مقالہ تحریر کیا ہے، ازاں بعد نفس انسانی اور اس کی مختلف
کیفیات و واردات کی توضیح فلسفیانہ رنگ میں کی ہے، آخر میں حیوانات کا بیان ہے، اور اسی پر
پہلے حصے کا خاتمہ ہو جاتا ہے،

دوسرا حصہ بھی پہلے حصہ کی طرح ضخیم ہے، اس میں مختلف ممالک کا حال آب و ہوا کے اعتبار
سے ترتیب ابجد میں موجود ہے بحیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے وقت میں نہایت قابل قدر ہے، اور اس عہد
میں جب کہ یہ لکھی گئی، مغرب کی کوئی کتاب اس موضوع پر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، پڑھنے میں نہایت
دلچسپ ہے، اس نے مشرق میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے، اسکے تراجم، فارسی عثمانی، اور ترکی زبانوں میں
ہو گئے ہیں، جو بہت مشہور ہیں،

دمشقی، | اس موضوع پر دمشقی کی کتاب اگرچہ کم اہمیت رکھتی ہے، تاہم دلچسپ ضرور ہے، اس کتاب
کو مہرن نے شائع کیا ہے، اس کی ابتدا میں علم الارض کے متعلق عام خیالات کا اظہار ہے، پھر معدنیات
اور قدیم مندروں، دریاؤں، چشموں، پہاڑوں اور سمندروں کا ذکر ہے، اسکے بعد مختلف ممالک کا حال درج

کیا ہے، معدنیات کا حصہ بالخصوص قابلِ قدر ہے،

دمشقی ربوہ کا امام تھا، جو دمشق کے گرد و نواح میں ایک گاؤن ہے، اس کی وفات ۱۳۲۷ء میں کوہِ تابور کے قریب صفاد میں ہوئی، قمری سال کے حساب سے اسکی عمر ۷۰ سال کی تھی،[1]

**ریت اور پہاڑون کی تولید و تکوین،** اس کتاب کے دونوں حصوں کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، جن میں اس نے ریت اور پہاڑون کی تولید و تکوین پر بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے، :-

"علمائے اس بارے میں لکھا ہے، کہ سطحِ ارض پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے ہونے کی وجہ وہ زلزلے ہیں، جو وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں، ان زلزلوں کا باعث یہ ہوتا ہے، کہ زمین کے نیچے جو ہوا ہوتی ہے، جب متموج میں آتی ہے، تو زمین کے بعض حصون کو بلند اور بعض کو پست کر دیتی ہے، اس کی شہادت میں ایک واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے، جو ۷۲۳ھ میں وقوع پذیر ہوا، اس سال دمشق میں بارش کم ہوئی، اور چشمے سوکھنے لگے، یہان تک گرمی کے موسم میں خدائے عزوجل نے زلزلہ بھیجا، جس سے چشمے جاری ہوگئے، اور نہروں میں تگنا اور چوگنا پانی بہنے لگا، اور اس بات کا ثبوت کہ تیز ہوا جب زمین پر چلتی ہے، تو اس سے روئے زمین پر بعض حصون کی خاک اڑا اڑا کر ان کو تبدیل کر دیتی ہے، یہ ہے کہ ۷۱۹ھ ہجری میں ہوا کے زور سے جبل عقرع پر سے زیتون کا ایک مضبوط درخت اس تودۂ خاک کے ساتھ جہاں وہ اُگا تھا، نکل کر دور فاصلے پر جا ٹھہرا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اسکی جڑین ایک عرصۂ دراز سے اس جگہ مستحکم ہو چکی ہیں، اور پہاڑ پر کبھی کوئی درخت موجود نہ تھا،"

چند سطرون کے بعد دمشقی پھر ایک جگہ ایک مغارہ کا ذکر کرتا ہے، :-

"اور عجائب میں سے شام کے علاقہ میں ایک مغارہ ہے، جس میں سے پانی کی ایک ندی

[1] معارف :- یہ صحیح نہیں۔ دمشقی کی تاریخ ولادت ۳ر شوال ۶۵۴ھ اور وفات ۷ر ذی الحجہ ۷۲۷ھ ہے،

بہتی ہے، اس میں عورت داخل نہیں ہوسکتی جب مرد اندر جاتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کے اندر چار ہزار فٹ تک پھیلا ہوا ہے، اور اسکے سر چہار جانب اور اوپر سے پانی نکل رہا ہے، اور جہاں پانی گر رہا ہے، وہاں بہت سے پتھر مختلف صورت اور رنگ کے پڑے ہیں، ان میں سے بعض کی ہئیت پھلوں کی سی بعض کی انسانی اعضاء کی سی ہے بعض حبوب کی شکل کے ہیں، ان کے صاف شفاف رنگ سُرخ سیاہ وغیرہ وغیرہ ہیں"

زلزلے۔ دمشقی کے اندازِ تحریر میں خاص سادہ پن پایا جاتا ہے، اور اس سے صحت واقعات میں فرق بھی نہیں آتا، قزوینی کا رنگ جداگانہ ہے، دیکھئے وہ زلزلوں کا حال کیسے بیان کرتا ہے، اسکی عبارت میں زمین کی اندرونی حرارت اور بخارات کے تموّج اور شدّت کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ یہ بخارات زمین کے اندر کثرت سے جمع ہوتے رہتے ہیں، جب اوپر کی زمین سخت ہو اور وہ آسانی سے باہر نہ آسکتے ہوں، تو اُن کے اُبھرنے سے زمین میں لرزش پیدا ہوتی ہے، اور اس ارتعاش کا نتیجہ زلزلہ ہوتا ہے، اس کی یہ وجہ ہوتی ہے، کہ حرارت کے باعث گرم اجسام مرتعش ہوجاتے ہیں،

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان بخارات میں جو نمی ہوتی ہے، وہ حرارت کے باعث اجسام کے مختلف مساموں سے خارج ہوتی ہے، اور اس سے اجسام میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے جبتک تمام بخارات خارج نہ ہوجائیں، یہ ارتعاش جاری رہتا ہے، اسکے خارج ہوجانے کے بعد اجسام سکون پذیر ہوجاتے ہیں، زلزلے میں زمین کے ارتعاش کی یہی وجہ ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمین کا وہ حصہ جہاں یہ بخارات جمع ہوگئے ہوں، پھٹ جاتا ہے، اور بخارات باہر نکل پڑتے ہیں، کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ بخارات ایسی جگہ پھوٹ پڑتے ہیں، جہاں آبادی ہو، تو اس حالت میں یہ اُس آبادی کو احاطہ کرلیتے ہیں،

بعض اوقات زمین کے اندر کچھ گڑھے ہوتے ہیں، اور جب زمین پھٹتی ہے، تو خدا کی قدرت سے دوبارہ ان گڑھوں میں جا پڑتی ہے، زلزلوں کا ایک باعث یہ بھی سمجھا جاتا ہے، کہ پہاڑون کے کچھ حصے زمین پر گرتے ہین، اور اُسوقت اس زور کا دھماکا ہوتا ہے جس سے گرد و نواح میں میلوں تک کی زمین کانپ اٹھتی ہے، باقی اللہ بہتر جاننے والا ہے، (واللہ اعلم)

چٹانون کی تکوین، اس موضوع کا بقیہ حصہ بھی بہت دلچسپ ہے، اس میں پہاڑون کے پھٹنے، دوبارہ بننے کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے، اور ساتھ ہی ہموار وادیوں کی قدرتی ساخت پر اظہار خیالات کیا ہے، پھر دکھایا ہے کہ ہموار وادیاں کیسے پہاڑون، براعظمون اور سمندرون میں تبدیل ہوجاتی ہیں، اور اسی طرح اُس کے برعکس کیسے عمل ہوتا ہے، اسی سلسلہ میں چٹانوں کی تکوین کے متعلق کہتا ہے:-

کہاجاتا ہے کہ آب و گل کی آمیزش کے بعد جب اس پر دیر تک سورج کی گرمی پڑتی رہتی ہے، تو وہ پتھر بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آگ کی حرارت سے اینٹیں بنالیتے ہین، خشت بھی ایک قسم کا پتھر ہے، اگرچہ اس میں اتنی پختگی نہیں آتی، جسقدر حرارت کا اثر زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ پتھر کے قریب تر ہوتی جائے گی، چنانچہ اسی عمل کے ماتحت چٹانین معرض وجو میں آتی ہیں، اب رہا یہ سوال کہ ان میں نشیب و فراز کیسے پیدا ہوجاتا ہے، تو اسکی وجہ یہی زلزلہ ہے جس سے زمین کے بعض حصے دب جاتے ہیں، اور بعض اُبھر آتے ہین، اسی سلسلہ میں یہ بلند حصہ زمین سورج کی پیہم حرارت سے سخت ہوکر پتھر کی صورت اختیار کرلیتا ہے، اس نشیب و فراز کی ایک وجہ شدید ہوا کا عمل بھی ہوسکتا ہے، جو زمین کے مختلف طبقوں کو ایک جگہ سے اٹھاکر دوسری جگہ پھینک آتی ہے، اور جگہ کو ناہموار کردیتی ہے، اسکے بعد زمین کے بلند طبقے سخت ہوکر چٹانوں میں تبدیل ہوجاتے ہین،

اعتدال لیل ونہار: اس موقع پر قزوینی اعتدال لیل ونہار، اور اُس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"بطلیوس کا خیال ہے کہ ہر ... ۳۰۰ سال کے بعد ستارے منطقۃ البروج کو طے کر لیتے ہیں جب اس نظام میں فرق آ جائے، تو ستارے بھی اپنا رُخ بدل دیتے ہیں، اور ان کی شعاعیں ایک دوسرے ہی انداز سے زمین پر پڑتی ہیں، دن اور رات کی طوالت میں فرق آ جاتا ہے، اور موسم میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے، آبادیاں ویرانے اور ویرانے آبادیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں"

ستاروں کا اثر ہیئت ارض پر: قزوینی کا یہ بھی خیال ہے کہ ستارے سطح ارض کی ہیئت کو متغیر کر سکتے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

پہاڑوں کی سطح اس واسطے صاف اور ہموار ہو جاتی ہے کہ سورج، چاند، اور ستاروں کی شعاعیں پیہم ان پر پڑتی رہتی ہیں، ان شعاعوں کے اثر سے پہاڑوں کی نمی بخارات کی صورت میں خارج ہوتی رہتی ہے، اور پہاڑ خشک ہو جاتے ہیں، ان کی چوٹیاں اوپر سے پھٹ جاتی ہیں، اور پتھروں اور ریتوں میں ظاہر ہوتی ہیں، پانی ان پتھروں اور ریت کو بہا کر اور دامن کوہ میں لا کر وادیوں اور دریاؤں کی تہ میں ڈال دیتا ہے، پانی کا بہاؤ ان چیزوں کو وہاں سے بہا کر جھیلوں میں ڈال آتا ہے، وہاں جا کر یہ چیزیں تہ میں بیٹھ جاتی ہیں، یہاں تک کہ ایک طبق کے اوپر دوسرا طبق قائم ہو جاتا ہے، بالآخر ان کی صورت بھی وہی ہو جاتی ہے، جو ہوا سے بنے ہوئے ریت کے ٹیلوں کی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم پتھروں کو توڑ کر دیکھیں تو ان کے اندر مونگے، ہڈیاں پائی جاتی ہیں کیونکہ جس مٹی سے وہ بنے تھے، اُن میں یہ چیزیں موجود تھیں، پہاڑوں میں بھی جو طبقات

نظر آتے ہیں، اُنکی وجہ بھی یہی ہے"

علم ارض کے ان ماہرین کے یہاں بعض ایسی باتیں موجود ہیں، کہ وہ تاریخ علوم کیلئے بے حد مفید ہیں، شہروں اور ملکوں کے حالات لکھتے وقت وہ بعض ایسی دلچسپ تفصیلات بیان کر جاتے ہیں جو تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں،

# دیوان شمس تبریز اور مولینا روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن

(۸)

## مولانائے روم کی غزلیات کی خصوصیات

### محاسن و معائب

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم     نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

(رومی)

ایران میں شاعری کا آغاز قصیدہ گوئی سے ہوا، اسکے قدردان اہلِ دل نہیں بلکہ اہلِ زر اور صاحب امارت تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدہ گوئی ذریعۂ معاش بن گئی، اس میں جوشِ دل، صداقتِ احساس اور جذبات کی ترجمانی کو بہت کم دخل تھا،

قصیدہ کا لازمی جزو تشبیب ہے، اور یہی غزل کی بنیاد ثابت ہوئی، ادھر توجہ ہوئی، تو بعض باکمال قصیدہ گو شعراء نے غزل سرائی کی لیکن وہ عندلیب گلشن نہ ثابت ہو سکے، ان کے دلوں پر عشق کی چوٹ نہ تھی، ان کے جگر میں زخم محبت نہ تھا، انوری، خاقانی، اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی غزلیات اثرِ دل آویزی اور گرمیِ جذبات سے خالی ہیں، زمانہ کا رنگ بدلا، مغلوں کے حملے نے قصیدہ کے ان قدرداں درباروں کا خاتمہ کر دیا، قصیدہ گوئی کا بازار سرد ہو گیا، اور فطری شعراء جوشِ طبیعت کے تقاضے سے اپنے جذبات کی بے لوث ترجمانی کی طرف متوجہ ہوئے، تو اصنافِ سخن میں سے غزل "زبانِ حال" قرار پا گئی،

غزل کی خوش قسمتی ہے، کہ شیخ سعدی نے یہ نغمہ کچھ ایسی دلآویزی سے چھیڑا، کہ ہر زندہ دل اس سے مسحور ہوگیا، خسرو اور حسن دہلوی نے تو اسے بوتا جادو بنا دیا، لیکن یہ حقیقت پیش نظر ہے، کہ جن اہلِ دل اور اہلِ زبان بزرگون نے فارسی غزل کو غزل بنایا، ان میں عارف رومی کا خاص مرتبہ ہے، اور وہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، غزل کی معنوی بلندی بادۂ تصوف ہی کی منت پذیر ہے، مولانا نے غزل کو نغمۂ حقیقت بنانے میں بڑا کام کیا ہے، بیشک غزل گوئی میں حسنِ ادا، پیرایۂ بیان، جدتِ اسلوب اور رنگینیٔ کلام کے اعتبار سے مولینا سعدی، عراقی، خسرو اور حسن دہلوی کے ہم پایہ نہیں، لیکن تخیل کی بلندی، جوشِ بیان اور حقائق کی ترجمانی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ زیادہ بلند ہے، اگر ان کے کلام کے صرف بہترین حصہ پر نظر کی جائے، تو ان کی جگہ صفِ اول ہی میں ہوگی،

**جذبات نگاری اور اصلیت** شعر کا اصلی سرمایہ احساسِ قلب اور جذبۂ باطن ہے، یہی جذبات نگاری اور کلام کی اصلیت ہے،

گرمیٔ افکارِ ما از نارِ اوست    آفریدن، جاں دمیدن کارِ اوست

یہ نہ ہو تو اشعار منافق کی درجے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، شیخ سعدی سے پہلے جن شعرا نے غزلیں کہیں، تقریباً ان کا کلام "زبانِ بے دل" ہے

وہ عشق کے زخم خوردہ نہیں ہیں، انکے سینوں کے اندر آتشِ الفت کا پتہ نہیں، صرف حسنِ سخن کیلئے انھوں نے عشق کی ترجمانی شروع کی،

لیکن جب دردِ دل رکھنے والے شعرا نے غزل سرائی کی، تو وہ تاثیر اور سوزِ دل کا سرمایہ بن گئی،

صوفی شعرا میں شدتِ اخلاص اور صداقتِ احساس کے باعث اس جذبہ کی گرمی اور اس آگ کی تیزی ناقابلِ بیان ہوگئی، اسی لئے سعدی، خسرو، حسن، عراقی، اور حافظ کے کلام کا سرمایۂ ناز

"جذبات نگاری" ہے،

مولینا روم کا دل فطرۃً امین عشق واقع ہوا تھا، وہ فطری شاعر تھے، اگرچہ ایک مدت تک مولویانہ ذہنیت اور وطن کے ماحول کے باعث شعرگوئی سے پرہیز کرتے رہے، لیکن جب شمس تبریز سے ملاقات ہوئی، تو ایک ہی نظر میں مولینا نے عقل و ہوش کو خیر باد کہا، انکی حکمت اندیشہ والی "جنون عشق" سے بدل گئی، آخر کار یہ حال ہوا، ع

"دل خود کام را از عشق خوں کرد"

آزمودم عقل دوراندیش را بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را،

مولینا کی دل کی چھپی اور دبی ہوئی چنگاریاں کچھ ایسی بے پناہ آتش شوق کی صورت میں بھڑک اٹھیں، کہ بجھائے نہ بجھتی تھیں، جذبات محبت نے طوفان کی صورت اختیار کی، مولینا نے جان، دل کے تقاضے سے مجلس سماع آراستہ کی، اس میں دوسروں کی نظمیں کماحقہ ترجمانی حال کا کام نہ دے سکتی تھیں، محفل سماع کے لئے مولینا خود غزل لکھنے لگے، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اصلیت سے معمور ہے، اور سراپا جذبات دل کی سچی تصویر ہے، اسی لئے جذبات نگاری جو محاسن شاعری کا جزو اعظم ہے، مولینا کے کلام کی اولین اور اہم ترین خصوصیت ہے، ان کے اشعار بہانہ جو کے آنسو نہیں ہیں، بلکہ ان کا سینہ سوز باطن سے معمور ہے، ان کے دل پر عشق کے داغ ہیں، جو کچھ کہتے ہیں، آپ بیتی ہے، ان کی غزل دل کی زبان ہے، ان کے کلام میں ذوق سخن نے گفتار محبت کا پیرایہ اختیار کیا ہے،

صاحب مناقب العارفین نے جذبات نگاری کے متعلق مولینا کا ایک قول نقل کیا ہے،

" مجرائے سخن سہ گونہ است، یکم از نفس روان می شود، دویم از عقل، سیوم، از عشق،

ہر آنکہ سخن نفس مکدر است وبے مزہ کہ نہ گوئندہ را ذوق است نہ شنوندرا فائدہ،

دوم سخن عقل است آن مقبول عقل است، و چندین فوائد که هم شنونده را پر ذوق کند و هم گوینده را، سیوم سخن عشق است که هم گوینده را مست کند و شنونده را سرخوش گرداند و بطرب آرد۔"

جذبات نگاری، مولٰنا کا کلام سخن عشق ہے، اسلیے وہ دلی جذبات کا آئینہ ہے، ان کا کلام اور زندگی ہم آہنگ ہیں، وہ شعرا کی جماعت "یقولون مالایفعلون" سے علٰحدہ ہیں، اور اس خصوصیت میں مولٰنا فارسی کے دیگر نامور صوفی غزل گو شعرا کے شریک ہیں،

سوز دل کے متعلق فرماتے ہیں:-

عشق شد مہمان ہر دل سوختہ　　جان و دل از بہر او قربان کنم

ایک مست الست کی حیثیت سے اپنے انجام کا نقشہ کھینچتے ہیں،

ببرخیش پیرے خانہ بمیرم　　زہے مرگ و زہے برگ و سرانجام

مطلوب اور محبوب کیسا تھ وابستگی، اور وارفتگی کا بیان ہے،

ہر کہ بیند رُخ تو جانب گلشن نرود　　ہر کہ داند لب تو قصۂ ساغر نہ کند

مولٰنا بادۂ محبت سے مخمور ہیں،

مخمور توام بدست من دہ　　آن جام شراب کوثرے را

عاشق میدان طلب میں رفیق راہ کا طالب ہے،

طبیب درد بے درمان کدامست　　رفیق راہ بے پایان کدام است

شب وصال کی لاجواب تصویر ایک ہی مصرعہ میں کھینچ دی ہے،

ع گل چیدن است امشب مے خوردن است امشب

اضطراب عشق اور انتظار کے جذبات کی کسقدر کامیاب ترجمانی ہے،

قرارے نہ دارد دل وجانِ ما کنارے نہ دارد بیابانِ ما

عشق نے شاعر کے دل وجان میں گھر کر لیا ہے، اس حالت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے،

ہم دل وجاں خانہ کردی عاقبت ہر دو را دیوانہ کردی عاقبت

دلِ عاشق ہر وقت حضورِ یار کا متمنی ہے،

یک لحظہ ز کوئی دوست دوری در مذہبِ عاشقاں حرام است

عاشق بے تاب شب و روز کوچۂ یار میں چکّر لگاتا ہے، لیکن اوس کی یہ آرزو ہے، کہ کسی دن

دلدار بھی اسکی گلی میں آجائے، اور اس کوچۂ ویران کو اپنے قدم سے رشکِ بہشت بنا دے،

مخمور ومست گرداں امروز چشم مارا رشکِ بہشت گرداں امروز کوے مارا

مولانا پر مستی اور جذب طاری ہے، ایک دیوانگی کی سی حالت ہے، فرماتے ہیں،

اے عاشقاں اے عاشقاں امروز منم دیوانہ ام مست وخراب وبے خبر زان جام وزاں پیمانہ ام

بادِ عشق سے درخواست فرماتے ہیں، کہ اس طرف سے بھی ہو گذرے،

اے بادِ خوش کہ برچمنِ عشق می وزی بر من گذر کہ مژدۂ ریحانم آرزوست

عاشق شرابِ الفت سے مست وبے خود ہے، اسے سارا عالم مست نظر آتا ہے، اس

خوبی سے اسکو بیان کیا ہے کہ مستی کی ہمہ گیری کا منظر پیشِ نظر ہو جاتا ہے،

رعد مطرب، برق مشعل، ابر ساقی، آب مے باغ مست وراغ مست وغنچہ مست وخار مست

باوجود اس مستی کے عاشق بے خود کی تمنا ہے کہ

یکدست جامِ بادہ ویکدست زلفِ یار رقص چنیں میانۂ میدانم آرزوست

آئینہ میں عکسِ یار دیکھ چکے ہیں، لیکن ذوقِ دیدار کا یہ عالم ہے کہ محبوب کا جمالِ جہان آرا بے پردہ

دیکھنا چاہتے ہیں،

عکس در آئینہ اگرچہ نکوست، لیک ہماں صورتِ زیبا خوش است

جب یہ آرزو خوش بختی سے پوری ہوتی ہے، تو ذوقِ عشق ایسا ہے کہ جان نذر کر دیتے ہیں،

دیدہ از خلق بہ بستم چو جمالش دیدم منتِ بخشایشِ او گشتم و جاں بخشیدم

دیکھئے مسرتِ وصال کا اظہار کس انداز میں ہوتا ہے،

چو گل شگفتہ شوم در وصالِ گل رویم رسد نسیم بہارم چہ خوش بود بخدا،

محبوب کے حسن و جمال کا مرتبہ بیان ہوتا ہے،

ز رویت ماہ اختر می تواں کرد، ز زلفت مشک و عنبر می تواں کرد

یہ سب ایک سچے عاشق کے دلی جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہے، ان شعلوں کی علتِ غائی آتشِ عشق ہے جو کسی پانی سے نہیں بجھائی جا سکتی،

باز آمد آں مے کہ ندیدہ فلک بخواب آورد آتشے کہ نمیرد بہیچ آب،

میر شراب خانہ چو شد با دلم حریف خونم شراب گشت ز عشق و جگر کباب

حقایق کی ترجمانی، مولینا کے کلام کی اصلیت کا دوسرا پہلو حقایق کی ترجمانی ہے، مولینا نے اپنے کلام میں بے شمار انفسی اور آفاقی حقایق کی تعبیر اور تفسیر فرمائی ہے، جس سے افراد اور اقوام اپنی زندگی اور تخیل کی تعمیر اور باطنی تربیت میں نہایت گرانمایہ رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں،

ایک حقیقت بیں نظر کے لئے اس میں رمز شناسی اور رازدانی کا ایک غیر محدود ذخیرہ ہے، یہی بات مولینا کے کلام کی معنوی خصوصیت اور حقیقی قدر و قیمت ہے، شعر گوئی سے مولنا کا منشا بھی یہی تھا کہ حقایق پیرایۂ شعر میں بیان ہو جائیں، سپہ سالار کا بیان ہے،

"حضرت خداوندگار قدس سرہ میخواست کہ حقایق ہمہ مشائخ و مقصود ہمہ عالما نرا در سرچشمہ بیان فرماید، کما قال قدس اللہ سرہ؛"

خواہم کہ کفک خویش از دیگ جاں برآرم گفتار دو جہان را از یک دہاں برآرم

یہ شعر تو مولینا کا ہے، جس سے اس خصوصیت کے متعلق خود صاحب دیوان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے، یہ صفت پورے عروج و کمال پر مثنوی میں ملتی ہے، لیکن دیوان میں بھی نمایاں ہے، مثلاً "سترانا" کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں،

از کنار خویش یابم ہر زماں من بوے یار چوں نگیریم ہر شبے مر خویش را اندر کنار

عشق اور بندگی کے متعلق اظہار خیال یوں ہوتا ہے،

عشق بندہ می کند آزاد را دیگراں آزاد سازند بندہ را

ڈاکٹر اقبال کا ایک شعر ہے، جو اس مطلب و مفہوم کا حامل ہے، کہ عاشقانہ بندگی ہی میں ماسوا سے آزادی نصیب ہو سکتی ہے،

عقل گوید شاد شو آزاد شو، عشق گوید بندہ شو آزاد شو،

(رموز بے خودی)

تخلق باخلاق الٰہیہ کا راز بیان کیا ہے،

درون دل سفرے کن اگر خدا طلبی ز خوئی خود گذرے کن بخوئی خوے خدا

طلب و حصول کا ربط ظاہر کیا ہے،

روزی ز طلبگاری مطلوب بدست آید گر زاں کہ ترا در دل عشق و طلبی باشد

شادی و وصال جاں روزی رسد از جاناں آنرا کہ درون دل از عشق غمی باشد

بے رنج درین ویراں آں گنج کجا یابی کاں گنج گراں مایہ بے رنج نمی باشد

ترک کبر اور عجز عبدیت کا کیا حاصل ہے، جواب ملتا ہے،

کبر و تکبر بگذار و بگیر، در عوض کبر چنیں کبریا،

حقیقت تحقیق پر روشنی ڈالی ہے،

ہزار صورت بے چوں بامر کن موجود    شد ست و میشود اے دل تو دید اکینا

سلوک الی اللہ کا طریقہ بتایا ہے،

یک حملۂ مستانہ مردانہ بکردیم،    تا علم بدادیم و بہ معلوم رسیدیم،

با آیت کرسی بسر عرش پریدیم،    تا حی بدویدیم و بقیوم رسیدیم،

عاشق علم لدنی سے کس طرح فیضیاب ہوتا ہے؟

خمش کوتہ کن اے خاطر کہ علم اول و آخر    بیاں کردہ بود عاشق چو پیش شاہ لالا شد

غافل کو جگاتے ہیں،

چناں بستہ تو دو چشمت کہ ذرہ را بینی    میان روز نہ بینی تو شمس کبریٰ را

مثنوی میں بھی حق سے غفلت کو موت سے تعبیر فرمایا ہے،۔

مرگ حاضر غائب از حق بودن است

غرض یہ کہ مولینا کا کلام حقایق کا ایک دریا سے بے پایاں ہے،

جوش خیال اور بیان

بیا کہ من ز خم پیر زوم آور دم

مے سخن کہ جواں تر ز بادہ عنبی است    (اقبال)

مولینا کے خیالات میں جو ہنگامہ و جوش اور بیان میں جو زور اور وجد پایا جاتا ہے، اوس کی نظیر کسی اور غزل گو صوفی شاعر کے کلام میں نہیں، یہ صفت مولینا کی غزلیات میں خاص طور پر نمایاں ہے،

تخیل کی پرواز کا یہ عالم ہے کہ آن کی آن میں عالم معنی کی سیر برق رفتاری کیساتھ ہوتی ہے، قلب میں عشق کی گرمی اور جذبات کا طوفان برپا ہے، اس سے خیالات میں یہ جوش ہو، پھر زبان دل کی

ہم آہنگ ہے، جس شدت سے خیال پیدا ہوتا ہے، اسی شدت سے بیان کرتے ہیں،

غزل بانگ اسرافیل معلوم ہوتی ہو کہ محشر انگیزی پر آمادہ ہے، جوش تخیل اور بیان کے اعتبار سے مولینا کا کلام شعر کے اس معیار پر پورا پورا اترتا ہو،

نغمہ باید تند رو مانند سیل، تا برد از دل غمان را خیل خیل،

اصل بات یہ ہے کہ مقامات تصوف کا تعلق قلب اور جذبات سے ہے، مولینا کا قلب اسی عالم کی سیر میں مصروف تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو تخیل کا زور معنی آفرینی میں کمال دکھاتا ہے، تو دوسری طرف بیان مواج سمندر کے مانند لہریں لے رہا ہے، اس سے کلام میں بے حد زور اور اثر پیدا ہوگیا ہے، جو پڑھتا ہے اس طوفان انگیز سمندر کی موجوں کے ساتھ ہو کر بہنے لگتا ہے، جوش کا یہ عالم ہے کہ جس قوت سے وہ کسی خیال کو ادا کرتے ہیں، اسی قوت سے اسے قبول کرنا بھی آسان نہیں، یہ جوش کسی خاص خیال یا موقع سے مخصوص نہیں جس خیال کو ظاہر کرتے ہیں، تو ان کا طبعی جوش اس سے نمایاں ہوتا ہے، مسرت وصال کا ذکر کریں تو دل مارے خوشی کے اچھلنے لگتا ہے، غم ہجراں کا بیان ہو تو احساس اضطراب تیز ہو جاتا ہے، بقا کا رنگ اس جوش اور زور سے دکھاتے ہیں، کہ آدمی اپنے آپ کو غیر فانی محسوس کرنے لگتا ہے، فنا کا عالم دکھانے میں یہ انداز ہے کہ عالم کی ایک ویران کدہ اور فانوس خیال کے ایک مجموعہ سے زیادہ حقیقت نہیں معلوم ہوتی، جوش خیال اور بیان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں جس سے یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی،

اے نوبہار عاشقاں داری خبر از یار ما، ای ز تو آبستن چمن وے از تو خنداں باغہا

اگر افلاک نہ باشد بخدا پاک نہ باشد، دل غمناک نہ باشد چہ کنی گفت علالا

عاشق کو کس جوش سے مخاطب فرماتے ہیں:-

چوں چشم بجوش از دل سنگ، بشکن تو سبوئے جسم و جاں را،

مردِ خدا کی ہمت و غیرت کا بیان ہے،

مردِ خدا مست بود بے شراب — مردِ خدا سیر بود بے کباب

مردِ خدا بحر بود بے کراں، — مردِ خدا قطرہ بود بے سحاب

اے چنگ پردہائے سپاہانم آرزوست — وے نائے نالۂ خوش و سوزانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

آخری شعر سے مولینا کے رنگِ طبیعت اور جوشِ خیال کا خاص اندازہ ہوتا ہے،

جوشِ عزم ملاحظہ ہو،

ہر نفس آوازِ عشق می رسد از چپ و راست — ما بفلک می رویم عزمِ تماشا کراست

جوشِ عشق کی تصویر کھینچتے ہیں،

گفتم کہ چند خوانی گفتا کہ تا نخوانی — گفتا کہ چند جوشی گفتم کہ تا قیامت

مولینا کی ہمت عالی اور قوتِ تسخیر پر نظر کیجئے،

ہمتِ عالیست در سرہائے ما، — از ثرے تا عرشِ اعلیٰ می رویم

دہانِ اژدہا را بر دریدم، — جہانِ عیش را آباد کردم،

عہد حاضر کے فارسی شعراء میں ڈاکٹر اقبال اس خصوصیت اور مناسبت میں اس پرجوش عارف رومی کے ہمرنگ ہیں، اون کے تخیل میں یہی زور اور بیان میں یہی جوش ہے، خود ان ہی کا بیان ہے،

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور — تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزی

مثالاً کلام ملاحظہ ہو،

تا کجا در تہ بالِ دگراں می باشی — درہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

بشاخ زندگی مانی ز تشنہ لبی است — تلاشِ چشمۂ حیوان دلیلِ کم طلبی است

**خاص مضامین،** ہر شاعر اپنی طبیعت اور بلندی مزاج کے مطابق خاص خاص خیالات اور مضامین کا دلدادہ ہوتا ہے، یہ مضامین اس کے خصوصیات میں گنے جاتے ہیں، اور مہمات مضامین کہلاتے ہیں،

مولانا میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، اور کلام کی معنوی خصوصیات میں بے حد نمایاں ہے، وہ چند احساسات اور خیالات کے خاص طور پر دلدادہ ہیں، ان کے کلام میں ایسے مضامین مختلف پیرایہ اور اسلوب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، مثلاً عشق کی اہمیت اس کے نتائج انسان کی عظمت اور عروج انسانی کی راہ عقل و عشق کا مقابلہ، دل کی تربیت اور اس کے طریقے وغیرہ یہ چند خاص خیالات ہیں، جن کو مولانا نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں طرح بیان کیا ہے، ہم ایک تسلسل سے ان چند مضامین کو بیان کریں گے تاکہ خصوصیات کلام واضح ہو جائیں،

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر

یادگاری کہ دریں گنبد دوار بماند (حافظ)

**عشق اور اسکے تعلقات،** مولانا نے عشق، اسکے متعلقات اور اسکے مختلف پہلوؤں پر اس کثرت سے اشعار لکھے ہیں، کہ اگر ان کے دیوان کو "ترانۂ عشق" سے تعبیر کریں تو بیجا نہ ہوگا، ان کی یہ خصوصیت مثنوی میں بھی بیحد نمایاں ہے، سچ یہ ہے کہ عشق زندگی کی بنیادی حقیقت ہے، اس کا ترانہ زندگی کا سب سے عظیم الشان نغمہ ہے، عشق ہی سے قربانی پیدا ہوتی ہے، عشق کے محل مختلف ہو سکتے ہیں، کوئی کسی کے حسن عارض کا شیدا ہوتا ہے، ورڈز ورتھ کا سا مزاج رکھنے والا شاعر رنگین وادی پر اپنی جان فریفتہ کرتا ہے، کوئی کسی کی تصویر کا عاشق ہوتا ہے، لیکن کسی کا قلب اسقدر وسیع اور نظر اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ اپنی نگاہ محبت کے لئے حسن ازل کو تاکتا ہے، کیونکہ عشق کی شان اس کے مقصد کی وسعت و بلندی سے ہے، کامل طور پر وہ عشق کا لذت آشنا ہے، اسلئے اپنے عشق کو ابدیت بخشنا چاہتا ہے، اور یہ ممکن نہیں جبتک اس کا محبوب ابدی نہ ہو،

عشق زندہ در روان و در بصر، ہر دمی باشد ز غنچہ تازہ تر،

عشق آں زندہ گزیں کو باقیست از شراب جانفزایت ساقیست

(مثنوی معنوی)

عشق اور مذہب مین ربط کا یہی محل ہے، جب تک مذہب صحیح معنوں میں ہوتا ہے، یہ اتحاد قائم رہتا ہے، جب ذوق صحیح فنا ہوجاتا ہے، تو ان دونوں میں افتراق ہوجاتا ہے،

در غلامی عشق و مذہب را فراق انگبین زندگانی بد مذاق،

مولینا اسی حلقۂ عشاق میں داخل ہیں، اسلئے انھوں نے عشق پر بے حد زور دیا ہے، اس کی وکالت کا حق ادا کیا ہے، ان کے نزدیک عشق سے مراد "عشق خدائے احسن" ہے،

ہرچہ جز عشق خدائے احسن است گر شکر خوردن بود جاں کندن است

انھوں نے عشق کی اہمیت، اثرات اور نتائج کو اسی روشنی میں بیان کیا ہے، عشق کی اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں،

عشق معراج است سوئے بام سلطان از ل از رخ عاشق فرو خواں قصۂ معراج را

عشق ابدی زندگی ہے،

عشق است و عاشق است کہ باقیست تا ابد دل برجز این منہ کہ بجز مستعار نیست

عشق جز دولت و ہدایت نیست جز کشاد دل و عنایت نیست،

عشق ہی خوش نصیبی ہے،:-

گر ترا بخت یار خواہد بود عشق را با تو کار خواہد بود

عمر بے عشق لاحاصل ہے،

عمر کہ بے عشق رفت ہیچ حسابش مگیر آب حیاتست عشق در دل و جانش پذیر

دگر بیکار گرد د چرخ گردون ، جہان عاشقاں برکار باشد

ہر کہ دردنیست ازیں عشق رنگ نزد خدا نیست بجز چوب وسنگ

عشق کے بغیر دولت وجاہ سب ہیچ ہے، اور عشق سے تو دنیا کی اصل مراد کیا ہے،

منصب و ملک از دل بے عشق راست جز کفن اطلس وجز گور نیست،

آن روح را کہ عشق حقیقی شعار نیست نابودہ بہ کہ بودن او غیر عار نیست

عشق ہی قلب کو مطمئن رکھتا ہے،

ہر کہ ز عشاق گریزان شود، عاقبت الامر پریشاں شود،

خانۂ عشق کی بڑی فضیلت ہے،

فی الجملہ ہر آنکس کہ دریں خانہ رہ یافت سلطان جہان است و سلیمان زمان است

بنی آدم کی بزرگی عشق ہی کے تاج کرامت سے ہے،

کہ عشق خلوت جانست طوق کرمنا برائے ملک وصال و برائے رفع حجاب

عشق کے نتائج کیا ہوں گے، مولینا نے کئی اشعار میں مختلف طریقہ سے اس کا جواب دیا ہے،

غمزۂ عشقت بدان آرد یکے محتاج را کو بیک کہ بر نسنجد ہیچ صاحب تاج را

گلزار کند عشقت آن شورۂ خاکی را دربار کند موجت این چشم سحابے را

کیمیائے کیمیا ساز است عشق ، خاک را گنج معانی می کند

عاشق کا دل عرش سے فزوں تر ہے،

بر سر چہ ہمی ارزی میدان کہ ہمی ارزی زیں روے و دل عاشق از عرش فزون باشد

عشق کی ترقی و تکمیل استقامت میں ہے،

ہم بذوق این درد را درمان کنم ہم بعیبرزین قصہ را پایان کنم ،

(باقی)

# تبصرہ و نقد

## شکایت

"معارف مئی ۱۹۳۶ء میں تاریخ الحدیث پر جو اظہار خیال کیا گیا تھا، اسکو پڑھکر مصنف کو بجا طور سے ناخوشی ہوئی، اوتھوں نے اس ناخوشی کا اظہار ذیل کی تحریر میں کیا ہو، اس تحریر کا کوئی جواب شائع نہیں کیا جاتا، اور نہ یہ بتایا جاتا ہو، کہ اس کا اصل مصنف کون ہے، قاضی ظہور الحسن صاحب یا قاضی عبد الصمد صاحب تاکہ الفاظ کی مزید گرمی طرفین کی سرد مہری کا سبب نہ ہو، رفقائے دار المصنفین کی تصانیف کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہو، اسکا جواب "زبان خلق" دیگی، "معارف"

معارف مئی ۱۹۳۶ء میں تاریخ الحدیث پر جو تبصرہ کیا گیا ہے، اس میں یہ سعی کی گئی ہے، کہ کتاب مذکور از اول تا آخر دوسروں کی تالیفات سے ماخوذ ہے،

مصنف کی دیانت اسی سے ثابت ہے کہ اس نے اردو میں تاریخ حدیث کے متعلق جسقدر کتابیں مطالعہ کیں، ان کا بہ تفصیل دیباچہ میں ذکر کر دیا، ان کتب میں سیرۃ النبی و خطبات مدراس، یہ دو کتابیں دار المصنفین کی ہیں، دو مضمونوں میں معارف سے مدد لی گئی ہے، ان سب کا حوالہ موقع بموقع موجود ہو، لیکن تبصرہ نگار نے اپنی طرف سے لکھدیا کہ اسوۂ صحابہ وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے، صاحب موصوف کے اس علم کا ذریعہ سوائے الہام کے اور کیا ہوسکتا ہو، اگر مصنف نے اسوۂ صحابہ سے مدد لی ہوتی، تو مثل دیگر کتب کے اسکے تذکرہ سے کون امر مانع تھا، ایک دلیل انھوں نے اس کتاب سے اخذ کرنے کے متعلق یہ قائم کی ہے، کہ بعض سرخیاں ان کی کتابوں سے ملتی ہیں، یہ درست ہوگا، لیکن یہ سرخیاں اور فقرات وہ ہیں، جو یہ فقیر اسوقت اپنی تصانیف میں لکھ چکا ہے، جب کہ دار المصنفین کے وجود کا کہیں وہم و گمان بھی نہ

تھا، خاکسار کے اسلاف میں اکثر بزرگ علم اور حدیث کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں، ان کی یادداشتوں کا کثیر ذخیرہ موجود ہے، ۱۹۰۵ء سے اس فقیر نے علم حدیث و فقہ اور حالات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و بزرگان دین میں مضامین و کتب تصنیف کرنی شروع کیں، ہندوستان کے تمام کتب خانوں کو چھان ڈالا، ہندوستان سے باہر بھی کسی قدر کتب بینی کی، تو کیا اسقدر جد و جہد کے بعد بھی یہ سرخیال اور یہ فقرات لکھنے میں قدرت نہیں ہو سکتی، یا وہ کتابیں جتنے تصنیفات دار المصنفین مرتب کی گئی ہیں، ممبران دار المصنفین کے سوا کسی دوسرے کو میسر نہیں، یا کوئی ان کو پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتا، یا ممبران دار المصنفین کا تعلق براہ راست حدیث جبریل سے ہے، اسلئے ان کے فقرات و الفاظ سے توارد بھی ممکن نہیں،

سیرۃ النبی و دیگر تصانیف دار المصنفین میں اس فقیر کے مضامین سابقہ اور علامہ کی تصانیف اور مسٹر سراج الدین کی کتاب الفاروق اور مسٹر محمد علی قادیانی کی تالیفات اور سر سید کی تصانیف کے مسلسل فقرات آئے ہیں، تو کیا ممبران دار المصنفین نے یہ فقرات ان مصنفین کے سرقہ کرکے ہیں یا خود لکھے ہیں، اور اگر درحقیقت ایسا ہی ہے، جیسا کہ تبصرہ نگار صاحب کا خیال ہے، تب بھی ایک صاحب ظرف اور عالم کے قلم سے ایسا تبصرہ نکلنا قابل افسوس ہے،

تمام اسلامی عقائد و مسائل و تاریخی واقعات کے متعلق عربی میں کافی سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے، سب وہیں سے اخذ کرتے ہیں، اور جو جس مسئلہ پر کوئی تصنیف کرتا ہے، وہ مختلف کتب سے مواد فراہم کرکے جمع کرتا ہے، الہام کسی کو نہیں ہوتا، پس اس فقیر کو بھی تاریخ حدیث کے متعلق یہی شرف حاصل ہے، کہ سب سے پہلے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو کر مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کیا ہے، اور اس شرف اولیت کو جناب مولینا سید سلیمان صاحب و دیگر معتقد علما نے تسلیم فرمایا ہے، اور تبصرہ نگار صاحب نے بھی دبی زبان سے اسکا اقرار کیا ہے،

راقم :- قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی،

**معارف** :- ہمارے ذاتی افادہ کے لئے اس قسم کی چند مثالیں بھیجکر ممنون فرمائیے،

# تصحیح

## مقالہ "عربون کی جہازرانی پر استدراک"

عربوں کی جہازرانی پر استدراک کے عنوان سے معارف کے دو نمبرون (مئی و جون ۱۹۳۲ء) مین جو مقالہ شائع ہوا ہے وہ، افسوس ہے کہ راقم سطور کی عدم موجودگی میں مصحح معارف اور بعض کارکنوں کی مسامحت سے ایک سے زیادہ مقام پر غلط چھپ گیا ہے، فاضل مقالہ نگار نے ان غلطیوں کی تصحیح بھیجی ہے، جو ذیل میں شکریہ کیساتھ درج کی جاتی ہے،

سب اڈیٹر"

صفحہ ۳۳۳ سطر ۱۱ و ما بعد بجائے مطبوعہ عبارت کے یوں پڑھئے "مرکوس اپنے ہلکے پن کے باعث پانی لیجانے کیلئے مناسب ہے، اور اس میں ایک سوار دب سے کچھ کم پانی سما سکتا ہے"،

ص ۳۳۵ سطر ۱۹ صحیح یوں ہے" بوعلی گوش ایدن عربا ندن الّلی بیک آدم"،

ص ۴۰۶ سطر ۹ یوں پڑھئے "۔۔ اور ہجر کے اسباب کی خریداری کرتے ہیں"،

" " سطر ۱۳، ۱۵، صحیح یون ہے" جو بحرین میں ہے، بازار جمادی الآخرہ کے پہلے دن سے مہینے کے آخر دن تک لگا رہتا ہے، اور ایرانی لوگ اپنا سامان تجارت لے کر ۔۔۔۔"

ص ۴۰۷، سطر ۱۱، ۱۲ میں یوں اصلاح ہو، ۔ اور عطر خلق کو اہل عرب کے سوا کوئی دوسرا عمدہ نہیں بنا سکتا"

ص ۴۰۹ حاشیے کی سطر دوم یون پڑھئے، "جس کا بعد میں ایک ناقص ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہوا"

ص ۴۱۱ سطر ۹ و ۱۳ کی غلطیاں سخت ہیں، یہ عبارت اصل میں یوں ہے، "انکو چھوڑ دوگے تو تم پر ہمیشہ مسلط رہیں گے، ۔۔۔ اور اہنار کی بھی مدد نہیں کی، بلکہ غیر جانب دار رہے"،

# تلخیص و تبصرہ

## یورپ کیلئے ایک جدید سیاسی فلسفہ کی ضرورت

معارف بابتہ ماہ جون ۱۹۳۶ء میں "عقل کے خلاف جدید بغاوت" کے عنوان سے رینے فولپ ملر کے جس مضمون کی تلخیص پیش کی گئی تھی، اس پر پروفیسر موات (R. B. MOWAT) کا ایک مقالہ اپریل ۱۹۳۷ء کے ہبرٹ جرنل میں شائع ہوا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے، پروفیسر موصوف بین الاقوامیت کی کامیابی سے متعلق جو امید قائم کر رہے ہیں، اسکی حقیقت امید موہوم سے زیادہ نہیں، اٹلی اور حبش کے معاملہ میں انجمن اقوام کی طرف سے جس خود غرضانہ بے بسی کا مظاہرہ کیا گیا، وہ جدید قومیت کی ہمہ گیری کی ایک واضح اور قطعی دلیل ہے:-

ہبرٹ جرنل کے جنوری نمبر میں رینے فولپ ملر (RENE FULOPMILLER) نے دکھایا تھا کہ انیسویں صدی کی ذہنیت جب لوگ عقل پر عقیدہ رکھتے تھے موجودہ دور کی ذہنیت سے جب دیدہ و دانستہ عقل کی مخالفت کی جارہی ہے، حیرت انگیز طور پر مختلف تھی، "عقل سے بغاوت" ایک حقیقی امر ہے، تاہم ہوسکتا ہے، کہ موجودہ صورتِ حال تمام تر عقل کی مخالفت کے باعث نہ ہو، بلکہ ایک قدیم نظام کے دفعۃً درہم برہم ہوجانے اور ایک جدید نظام کی فطری تلاش و جستجو کے سبب سے پیدا ہوگئی ہو،

۱۹۱۹ء کی صلح کے بعد کے پندرہ سال یورپ کی تمام قوموں کے لئے شدید مایوسی کے سال ثابت ہوئے، تقریباً وہ تمام امیدیں جن کے بھروسہ پر لوگوں نے جنگ کی مصیبتوں اور قربانیوں کو برداشت

کیا تھا، باطل ہوگئیں، سمجھا جاتا تھا کہ تشدد کی جگہ انصاف قائم ہوگا، کمزور قومیں دنیا میں سلامتی کے ساتھ رہ سکیں گی، منظم آزادی کی نعمت ہر جگہ پھیل جائیگی، تمام آدمیوں کے لئے کام، فرصت، اور معاش کا معقول انتظام ہوجائے گا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاسی شورشوں اور کشیدگیوں کا خاتمہ ہوکر ایک طویل مدت کے لئے امن وسکون قائم ہوجائے گا

لیکن ان پندرہ سالوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ ساری مایوسی کا بنیادی سبب یہ ہے، کہ یورپین قوموں اور ۱۹۱۹ء کے اکثر مدبروں نے آنے والے دور کا غلط اندازہ کیا اور پندرہ برس سے برابر غلط اندازہ کرتے آرہے ہیں، وہ تغیر اور تبدیلی کے دور کو استقلال کا دور سمجھتے رہے، قومیں جو ۱۹۱۹ء کے بعد کے زمانہ سے استقلال کی توقع رکھتی تھیں، محض حرکت اور تبدیلی سے دوچار ہوئیں، اور ان کی ساری امیدیں حیرانی اور مایوسی سے بدل گئیں،

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے یورپ سیاسی حیثیت سے ایک صاف ستھرا اور مرتب مقام تھا، اس کا ایک سیاسی نظام تھا جو بحالت مجموعی ہمواری کیساتھ جاری تھا، یہ نظام چھ بڑی طاقتوں کے غلبہ پر منحصر تھا جو متحدہ طور پر یورپ کے لئے ایک قسم کی مجلس نظامت کی حیثیت رکھتی تھیں، یہ بڑی طاقتیں، برطانیہ عظمیٰ، فرانس، جرمنی، اٹلی، اسٹریا ہنگری، روس۔ یورپ کے ملکی نظام سے کافی طور پر مطمئن تھیں، یہ صحیح ہے کہ سرحدوں کا تعین بہمہ وجوہ بہترین نہ تھا، لیکن عملاً ملکوں کی ضرورتوں کے لئے وہ سرحدیں مناسب ثابت ہوئی تھیں، چھوٹی حکومتیں ملکی توسیعات کے حوصلے دل سے نکال چکی تھیں، اور اب صرف صلح و امن کی خواہاں تھیں، علاوہ بریں ۱۹۱۴ء سے قبل کے دور میں تمام بڑی اور چھوٹی حکومتوں میں معاشی تعلقات کا ایک نظام قائم تھا، انھیں ایک دوسرے کیساتھ تجارت کرنے میں اصولاً کوئی اعتراض نہ تھا، تجارت نسبتہً آزاد تھی، اس سے سیاسی اور معاشی آویزشیں بہت کچھ دور ہوگئی تھیں،

لیکن ۱۹۱۸ء کے بعد یورپ کی سیاسی حالت بالکل بدل گئی، اول یہ کہ جنگ عظیم سے قبل کی چھ بڑی طاقتیں باقی نہیں رہیں، آسٹریا ہنگری کی سلطنت جاتی رہی اور روس کا شمار جب تک ۱۹۳۴ء میں اس نے انجمن اقوام میں شرکت نہیں کی، دول عظمی میں نہیں ہوتا تھا، صرف آسٹریا ہنگری کی سلطنت کے غائب ہو جانے سے یورپ کا اندرونی توازن برباد ہوگیا، اور بالخصوص وسط یورپ کی سیاسی حالت خطرناک طور پر ناقابل اطمینان ہوگئی، دوسرے یہ کہ نہ صرف چھ بڑی طاقتیں باقی نہیں رہیں بلکہ جو رہ بھی گئیں ان کی بھی کوئی متحد حیثیت جیسی ۱۹۱۴ء سے قبل تھی قائم نہیں رہی، ان طاقتوں کا قدیم متحدہ نظام جو انیسویں صدی اور پھر بیسویں صدی کے اول تیرہ سالوں تک قائم تھا جنگ عظیم سے درہم برہم ہوگیا اور ۱۹۱۸ء کے بعد پھر زندہ نہ ہو سکا، تیسرے یہ کہ چھ نئی حکومتیں وجود میں آگئیں، فلینڈ، استھونیا، لتویا، لتھوانیا، پولینڈ، اور زیکوسلواکیا، ان میں سے کوئی بڑی طاقت نہیں ہے اور نہ کوئی آسٹریا ہنگری کی سلطنت کی قائم مقام ہو سکتی ہے، لیکن ان حکومتوں کے قائم ہو جانے سے سیاسیات یورپ میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، جس نے یورپ کے اندرونی توازن پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے، چوتھے یہ کہ نئی حکومتوں کے معرض وجود میں آنے اور رومانیا اور یوگوسلاویا کے رقبوں میں توسیع ہو جانے کی وجہ سے یورپ کی اندرونی سرحدوں میں چودہ ہزار میل کا اضافہ ہوگیا ہے، سرحدوں کے اضافہ کے ساتھ ہی ساتھ قومیت، تامین تجارت (PROTECTIONISM) اور درآمد کی مخالفت کے جذبات حیرت انگیز طور پر بڑھ گئے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حکومتوں کی حالت اقتصادی حیثیت سے خراب ہوتی جارہی ہے اور ایک دوسرے کے درمیان جو کشیدگی بڑھ رہی ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے حد درجہ خطرناک ہے،

حالات کی مذکورۂ بالا تبدیلی کے باوجود "جدید یورپ" سے اطمینان اور استقلال کی توقع کا نتیجہ مایوسی اور حیرانی کے سوا کیا ہو سکتا تھا، تاہم اس عالمگیر اور دردناک حیرانی کا اصلی سبب کچھ اور ہی ہے،

اس وقت یورپ ایک ایسے دور میں ہے جب ایک قدیم عقیدہ فنا ہو رہا ہے، اور ایک جدید عقیدہ اسکی جگہ پیدا ہو رہا ہے، جو عقیدہ فنا ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ جمہوریت تمام مہذب قوموں کے لئے قدرتی اور بہترین طرز حکومت ہے، اور حکومتیں لابدی طور پر اس کی جانب بڑھتی جا رہی ہیں، اسی سیاسی عقیدہ کی تعلیم انیسویں صدی میں یورپ میں جاری تھی، غیر جمہوری حکومتوں میں بھی مثلاً جرمنی اور روس، اکثر لوگوں تک کہ جمہوریت کے مخالفین کا بھی عقیدہ تھا کہ جمہوری حکومت ان کے ملکوں میں بھی بالآخر قائم ہو کر رہے گی، واقعات نے اس عام عقیدہ کی تصدیق کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مملکتوں میں جمہوری حکومت قائم ہوتی گئی، جن مملکتوں نے مقاومت بھی کی انھوں نے بھی ایسی مراعات منظور کریں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مکمل جمہوریت کے لئے صرف وقت کا انتظار ہے، انیسویں صدی کی قوموں کا فلسفۂ سیاست لوک (LOCKE) برک (BURKE) والٹیر (VOLTAIRE) اور روسو (ROUSSEAU) کی تعلیمات پر مبنی تھا، اٹھارہویں صدی یعنی "عہد عقل" کے ان مفکرین نے ثابت کر دکھایا کہ مہذب انسانوں کے لئے حکومت کی واحد معقول شکل جمہوریت ہے، اور تقریباً بلا استثنا تمام فلاسفہ، فضلا، معلمین اور اہل قلم نے ان کے خیالات کو تسلیم کر لیا تھا، لوک، برک، والٹیر اور روسو کے سیاسی خیالات یوروپین قوموں کے دل و دماغ میں سرایت کر گئے اور ہر سیاسی تحریک مثلاً جمہوریہ فرانس کا قیام، مملکت بلجیم کی تاسیس، اٹلی کا اتحاد، جرمنی کا اتحاد اور وہ تمام جنگیں جو اس صدی میں پیش آئیں، یہ سب عالمگیر جمہوریت کی ارتقائی منزلیں قرار دی گئیں، اس سے ۱۹۱۴ء سے پہلے کی قوموں کا مطمح نظر سمجھ میں آتا ہے، وہ نہ صرف ایک سیاسی عقیدہ رکھتی تھیں، بلکہ سیاسی دنیا کا ہر واقعہ اس عقیدہ کو زیادہ مضبوط کرتا جاتا تھا، تمام واقعات اپنے ارتقائی نظام میں اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتے جاتے تھے، دنیا تمام اہل نظر کے لئے قابل فہم اور معقول تھی،

لیکن ۱۹۱۹ء کے بعد سے دنیا یا کم از کم یورپ اس عقلی اصول کو کھو چکا ہے، جمہوریت کی ناگزیری اب تسلیم نہیں کی جا سکتی، بعض تہذیب یافتہ مملکتوں نے جمہوریت کو آزمایا اور پھر اسے ترک کر دیا، بعض حکومتیں اور

بہت سے لوگ اس کے مخالف ہیں، پچھلے پندرہ سالوں میں جمہوریت میں بہت نمایاں طور پر زوال واقع ہوگیا ہے، اٹلی نے اسے ترک کر دیا ہے، روس نے اپنے سیاسی عمل کو الٹ دیا ہے، جرمنی نے جمہوریت کا تجربہ کیا، لیکن بارہ سال کے بعد اس سے دست کش ہوگیا، فرانس میں بھی جمہوری نظام کی مضبوطی اب باقی نہیں رہی اور اس کا قائم رہنا یقینی نہیں آج یورپ کی سیاسیات میں کوئی باقاعدہ اور مرتب نظام دکھائی نہیں دیتا اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کدھر جارہا ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رخ عام بدنظمی کی طرف ہے،

قدیم جمہوری عقیدہ کی ناکامی کے بعد اہل یورپ اب کسی جدید عقیدہ کے متلاشی ہیں، اس وقت دنیا میں دو جدید اور متقابل عقیدوں کی تشکیل ہورہی ہے، قومیت اور بین الاقوامیت، قومیت کا عقیدہ انیسویں صدی کے جذبۂ قومی کی بظاہر ایک ترقی یافتہ شکل ہے، ورنہ حقیقۃً یہ ایک دوسری ہی چیز ہے، انیسوین صدی میں جب محکوم قومیں آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں، تحریکِ قومیت کا مقصد قومی حقوق کو تسلیم کرانا تھا، لیکن اپنے قومی حقوق کے تسلیم کرانے کے معنی یہ نہ تھے کہ دوسری قوموں کے حقوق سے اعراض کیا جائے، برخلاف اس کے قومیت کی جو تشریح مزینی (MAZZ INI) نے کی تھی اور جس سے تقریباً سب نے اتفاق کیا، اس کے رو سے قومیت کا عقیدہ حقیقۃً تمام قوموں کی عالمگیر برادری کا اصل اصول تھا،

جدید قومیت ایک دوسری ہی شے ہے، یہ آمادۂ پیکار رہتی ہے، غیر ملکی جابروں کے خلاف نہیں کیونکہ اب اکثر قومیں آزاد ہوچکی ہیں بلکہ ہمسایہ قوموں کے خلاف، اس کی بنیاد اقوام کی اخوت پر نہیں بلکہ اقوام کی خود غرضی پر ہے، توسیعِ مملکت کی "ضرورت" کو پورا کرنا خواہ دوسری قوم کو اس سے نقصان پہنچے اس کے حقوق میں داخل ہے، چنانچہ موجودہ ابتری کا سبب یہی قومیت ہے، اور اگر یہ عمومیت سے اختیار کرلی جائے تو اس ابتری کا مستقل ہوجانا لازمی ہے،

دوسری تحریک بین الاقوامیت کی ہے، یہ جدید قومیت کی تحریک کی تا متر مخالف نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد جدید قومیت کی برائیوں کو دور کرنا اور اس سے سبقت لیجانا ہے، بین الاقوامیت کے دو بنیادی اصول ہیں، ایک یہ کہ کسی قوم یا مملکت کا طرز حکومت، اندرونی سیاست اور داخلی حالات ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق تا متر اس کے خانگی معاملات سے ہے، کسی غیر ملکی طاقت کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری مملکت کے اندرونی معاملات میں دخل دے، جب تک کوئی ایسا معاہدہ موجود نہ ہو جس کے رو سے مداخلت کا حق قائم ہوتا ہو، مثلاً اگر کسی مملکت نے اپنی حدود کے اندر غلامی کے انسداد سے متعلق دوسری مملکتوں سے معاہدہ کرلیا ہے، تو ان مملکتوں کو جہاں تک غلامی کے مسئلہ کا تعلق ہے مداخلت کا حق حاصل ہو جائے گا، دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر مملکت کی غرض دوسری مملکت کی آزادی اور استقلال میں شامل ہے، کیونکہ اگر کسی مملکت کی آزادی اور استقلال کے حق سے انکار کر دیا جائے تو اصولاً دوسری مملکتوں کے یہ حقوق بھی باطل ہو جائیں گے، بین الاقوامی قانون بڑی اور چھوٹی مملکتوں کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا، اس کے نزدیک تمام مملکتیں برابر ہیں۔

موجودہ ابتری، تشویش، پریشانی، اور بحرانی کیفیت جو بار بار طاری ہوتی رہتی ہے، یہ سب انہی دونوں عقیدوں کے تصادم کا نتیجہ ہیں، انجمن اقوام کا عہد نامہ جس پر ۱۹۱۹ء میں چھبیس۲۶ حکومتوں نے دستخط کئے تھے (اور جس کے شرکاء کی تعداد اب تقریباً ساٹھ تک پہنچ گئی ہے) اس امر کا عام اور قانونی اعلان تھا کہ بین الاقوامیت کا عقیدہ عمومیت کے ساتھ تسلیم کرلیا گیا ہے، کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری دنیا بین الاقوامی ہوئی جاتی ہے، ہر حکومت اور ہر قوم نے حتی کہ انھوں نے بھی جو انجمن اقوام میں شامل نہ تھے (باستثنا سویٹ روس) بین الاقوامیت کے مذکورۂ بالا اصولوں سے متفق ہونے کا اعلان کیا، جدید قومیت کبھی کبھی حکومت کے کسی فعل کی محرک ہوئی ہو، لیکن کسی حکومت یا مدبر کی طرف سے علانیہ طور پر نہیں کہا گیا کہ ایسا ہونا بھی چاہئے،

برخلاف اس کے وہ بین الاقوامی تحریک کی حمایت کا اعلان متواتر معاہدوں کے ذریعہ کرتے رہے، جن میں سب سے زیادہ مشہور پیرس کا معاہدہ بریاند کیلاگ (BRIAND-KELLOGG PACT) ہے جو انسداد جنگ کے لئے ۱۹۲۸ء میں مرتب ہوا تھا، معاہدۂ پیرس میں سب نے شرکت کی، لیکن اس سے قبل ہی جدید قومیت کی تحریک بین الاقوامیت کی تحریک کے مقابل آچکی تھی، اس معرکہ میں پہلا قدم مسولینی نے اٹھایا جب کہ ۱۹۲۳ء میں اٹلی اور یونان کے ایک قضیہ کو اپنی خواہش کے مطابق طے کرنے کی غرض سے اس نے کورفو (CORFU) پر گولہ باری کر دی اور اس مسئلہ کو انجمن اقوام کے سامنے پیش نہیں کیا، اسی قسم کی متعدد مثالیں جن میں سے بعض کامیاب اور بعض ناکام ثابت ہوئیں، پیش کی جا سکتی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتوں نے باہمی جھگڑوں میں بین الاقوامی فیصلہ پر قومی فیصلہ کو ترجیح دیا، وقتاً فوقتاً بین الاقوامی تحریک کی قوت اور ترقی بھی ظاہر ہوتی رہی، مثلاً ۱۹۳۲ء میں جب تخفیف اسلحہ کی کانفرنس منعقد ہوئی اور پھر ۱۹۳۳ء میں جب دنیا کے معاشی مسائل کے حل کیلئے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا اجلاس ہوا، لیکن یہ کانفرنسیں بالآخر ناکام ثابت ہوئیں، جدید قومیت کا زور بڑھتا ہی گیا، اٹلی اور حبش کی نزاع ان دو تحریکوں کے تصادم کی نہایت واضح اور بین مثال ہے،

مذکورۂ بالا تصریحات کی بنا پر ۱۹۱۹ء کے بعد کے دور کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہجاتی، اس دور میں دو متقابل تحریکوں اور عقیدوں یعنی جدید قومیت اور بین الاقوامیت کا مدوجزر صاف طور پر نظر آتا ہے، یورپین پبلک کی حیرانی اور مایوسی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اس چیز کو سمجھا نہیں، اس نے یہ تو دیکھ لیا ہے کہ جمہوریت کی لابدی ترقی کا عقیدہ فنا ہو رہا ہے، لیکن ابھی تک یہ نہیں دیکھا ہے کہ دو جدید عقیدے پیدا ہو کر میدان عمل میں بڑھ رہے ہیں، اس نے ۱۹۱۹ء میں آنے والے دور کا غلط اندازہ کیا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، یہ غلطی واضح ہوتی گئی، اور حیرانی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، جس وقت لوگوں کو متعین طور پر معلوم ہو جائے گا کہ جمہوریت اور مطلق العنانی کا مسئلہ

اب جدید قومیت اور بین الاقوامیت کے مسئلہ میں ضم ہوگیا ہے، وہ دیکھ لیں گے کہ معاملات کا رخ کس طرف ہے، اور پھر وہ اپنے لئے کوئی راہ پسند کریں گے، ہوسکتا ہے کہ غور کرنے کے بعد اکثر لوگ جدید قومیت کا اصول اختیار کرلیں، لیکن یہ زیادہ قرین قیاس نہیں، بیشتر اصحاب فکر کا رجحان بین الاقوامیت کی طرف معلوم ہوتا ہے، بین الاقوامیت کی حمایت میں عیسائی مذہب کی تمام تعلیمات بھی ہیں، اکثر فلسفیوں کی، اُسے بھی اسی کی موافقت میں ہے، یورپین مدبرین کی اکثریت بھی اسی جانب ہے، عوام بھی جنھیں جدید قومیت کی خطرناک حوصلہ مندیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، غالبًا اسی کی حمایت کریں گے، جتنے ہی زیادہ لوگ بین الاقوامیت کو سمجھ کر اختیار کرتے جائیں گے اتنی ہی زیادہ یہ تحریک مضبوط ہوتی جائے گی، لیکن یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ اس کی ترقی مستقل اور غیر منقطع ہوگی، کیونکہ دوسری تحریک طاقتور ہے اور اسے جذبات و تعصبات کی قوت اور زبردست "اغراض" کی حمایت حاصل ہے، بہرحال جن لوگوں نے بین الاقوامیت کا عقیدہ سوچ سمجھ کر اختیار کرلیا ہے، وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ سچائی اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کے ہم آہنگ ہیں، اور چونکہ تمام نیک اندیش مرد اور عورتیں انہی اصولوں کی حامی ہیں، اسلئے بالآخر یہ اصول کامیاب ہوکر رہینگے،

"ع ز"

# اخبار علمیہ

## تاریخ بنگال

امرت بازار پتریکا کا نامہ نگار لکھتا ہے، کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرف سے تاریخ بنگال کی تالیف کا جو کام شروع کیا گیا تھا، وہ تیزی کیسا تھ جاری ہے، پہلی جلد کے مختلف ابواب جو ہند و عہد پر مشتمل ہوگی مختلف اشخاص کے سپرد کر دیئے گئے ہیں، اس جلد کی ادارت، پروفیسر آر، سی، مازمدار، ڈھاکہ یونیورسٹی نے قبول کی ہے، لکھنے والوں میں بعض اشخاص کے نام حسب ذیل ہیں، جو ابواب انکے سپرد کیے گئے ہیں، ان کے ناموں کے سامنے قوسین میں درج ہیں، (۱) ڈاکٹر گوہا زوالوجیکل سروے آف انڈیا، (بنگال کی مختلف نسلیں) (۲) ڈاکٹر رائے چودھری کلکتہ یونیورسٹی (قدیم تاریخی عہد) (۳) ڈاکٹر باسک، پریزیڈنسی کالج کلکتہ: (سلطنت گپت سے قوم پالا تک، قانون اور نظام حکومت) (۴) ڈاکٹر مازمدار (قوم پالا، قوم سینا، اقتصادی تاریخ، اور بنگالہ اعظمی) (۵) ڈاکٹر رائے کلکتہ یونیورسٹی، (چندر ابرمن اور دوسرے چھوٹے چھوٹے خاندان (۶) مسٹر این جی بانرجی محکمۂ آثار قدیمہ، (فنون وصنعت،) (۷) ڈاکٹر ڈے ڈھاکہ یونیورسٹی، (سنسکرت لٹریچر) (۸) ڈاکٹر چیٹرجی، کلکتہ یونیورسٹی، (ملکی لٹریچر)

دوسری جلد میں بنگال پر مسلمانوں کے پہلے حملہ سے لیکر بنگال کے آخری پٹھان فرمانروا داؤد تک کی تاریخ ہوگی، تیسری جلد عہد مغلیہ پر مشتمل ہوگی جسمیں داؤد سے لیکر جنگ پلاسی تک کے حالات ہونگے، ان دو جلدوں کی ادارت سر جادو ناتھ سرکار کے ہاتھ میں ہے مختلف ابواب مندرجۂ ذیل اشخاص کو دیئے

گئے ہیں:- (۱) ڈاکٹر قانونگو ڈھاکہ یونیورسٹی، (مسلمانون کی فتح سے عہد بلبن تک، افغانون کا عروج، قانون اور نظام حکومت،) (۲) پروفیسر شرف الدین، راج شاہی کالج (ابل حبش) (۳) سرجادو ناتھ سرکار (مغلوں کی فتح، معاشرتی اور اقتصادی تاریخ، قانون اور نظام حکومت اسیاسی تاریخ، شایستہ خان سے سراج الدولہ تک جسمیں مرہٹوں کے حملے بھی شامل ہوں گے) (۴) حکیم حبیب الرحمن، (اشاعت اسلام اور بنگال میں، سلامی تہذیب و تمدن (۵) پروفیسر سین، شانتی نکیتن (مذہب اور مذہبی حالت)، (۶) پرنسپل داس گپتا، سنسکرت کالج، ہسٹول پروفیسر دنیش بھٹاچاریا، پروفیسر ضیا ہرن چکرورتی (سنسکرت لٹریچر)، (۷) ڈاکٹر چیٹرجی، کلکتہ یونیورسٹی، (ملکی لٹریچر اور دیسی کہانیان)، (۸) ڈاکٹر انعام الحق، (ہندی اسلامی لٹریچر اور لٹریچر میں مسلمانوں کا حصہ) (۹) پروفیسر سین، کلکتہ یونیورسٹی، (بنگال میں پرتگالی) (۱۰) پروفیسر کالی کنکر دت، پٹنہ کالج (علی وردی خان) (۱۱) پروفیسر نرودھ بھوشن رائے، (سلاطین تغلق) (۱۲) پروفیسر سین کلکتہ یونیورسٹی، (ملکی لٹریچر) (۱۳) پروفیسر باسو ملک، میرٹھ کالج، (عہد مغلیہ سے قبل کا مذہب،)

اس تاریخ کے ابتدائی اخراجات کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی ایک ہزار روپئے دے چکی ہے، اسکے علاوہ مسٹر اے، ایف، رحمان وائس چانسلر، ڈھاکہ یونیورسٹی نے جیب خاص سے ایک ہزار کی رقم اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، ڈاکٹر قانون گو نے قانونگو پار لائبریری چاٹگام کی طرف سے پچاس روپیوں کا وعدہ فرمایا ہے، امید کیجاتی ہے کہ اس تاریخ کی پہلی اور تیسری جلدین جولائی ۱۹۳۲ء کے آخر تک چھپنے کے لئے پریس پہنچ جائین گی،

## دانتون کی صحت کے لئے مناسب غذا کی تجویز

دانت کے امراض کی شکایت آج تمام مہذب ملکوں میں عام ہے، لٹریری ڈائجسٹ کی تازہ اشاعت سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسوقت امریکہ میں ساٹھ ہزار دندان ساز ڈاکٹر چھ لاکھ آدمیوں کے

علاج میں مصروف ہیں، اس عام شکایت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ لوگوں نے دودھ اور دوسری
غذاؤں کو جنسے دانتوں کو قوت پہنچتی ہو، ترک کر دیا ہو، وسط جون ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی سائنس
امریکہ کے ایک جلسہ میں اس وبا کی جو دوا پیش کی گئی، اُس سے ظاہر ہوتا ہو کہ بہتیرے امراض جنکا
تعلق بظاہر دانتوں سے معلوم نہیں ہوتا، دراصل انہی کی خرابی سے پیدا ہوتے، اور بڑھتے رہتے ہیں،
چنانچہ ڈاکٹر میکال (MECALL) نے اپنا تجربہ بیان کیا، کہ انکے پاس پانچ سال کا ایک
لڑکا لایا گیا، جس کے قلب کا فعل نہایت خراب ہو چکا تھا، اور اُسکی کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی، کہ اُس کے
والدین اُسے کرسی میں اُٹھا کر لائے تھے، معائنہ کرنے پر معلوم ہوا، کہ اُس کا ایک دانت بھی مرض سے
پاک نہ تھا، لہذا سب دانت نکال ڈالے گئے، دو ہی ماہ کے بعد اُسکے قلب کی حالت بالکل درست
ہو گئی، اتنا ہی نہیں، بلکہ اس کے بعد مناسب غذا پر رکھنے سے نئے دانت ایسے عمدہ نکلے کہ اُنکے
علاج کی ضرورت ڈاکٹر موصوف کی رائے میں آیندہ غالباً کبھی پیش نہ آئیگی، یہ مناسب غذا ڈاکٹر
چارلس ڈرین (CHARLES DrAIN) اور ڈاکٹر جولین بوائڈ (JULIAN BOYD)
کی تجویز کردہ ہو، اور انہیں بھی بالکل اتفاقیہ طور پر معلوم ہو گئی، بعض ذیابیطس کے مریض بچوں کیلئے
وہ مختلف غذاؤں کا تجربہ کر رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ جو مناسب غذا ذیابیطس کی رعایت سے
تجویز کی گئی تھی، اُس سے غیر متوقعہ طور پر ان بچوں کے دانتوں کی خرابی بھی رُک گئی، یہ دیکھ کر انھوں نے اس
غذا کا تجربہ ان بچوں پر بھی کیا، جنکو ذیابیطس کی شکایت نہ تھی، تجربہ سے معلوم ہوا کہ خرابی اگر شروع ہو چکی
ہو تو اس غذا کے استعمال سے رُک جاتی ہو اور مرض بڑھنے نہیں پاتا، یہ غذا حسب ذیل اجزا پر مشتمل ہو،۔ دودھ
ایک سیر، انڈا، ایک عدد، مچھلی کا تیل ایک چمچہ، (چائے کے چمچہ سے) مکھن نصف چھٹانک سنترا ایک عدد، ترکاری
یا کوئی اور پھل تھوڑی سی مقدار میں، تین سال سے پانچ سال کی عمر والوں کیلئے گوشت کا اضافہ بھی کر دیا گیا
ہو، سات سال سے سولہ سال والوں کیلئے یہ چیزیں تجویز کی گئی ہیں یہی سولہ سال سے زیادہ تک لوگوں کے لئے

بھی ہیں، دودھ ایک سیر، انڈے دو عدد، بکری کا گوشت، مچھلی، مرغ یا کلجی، سنترا ایک عدد، ٹماٹو، مچھلی کا تیل ایک چمچہ، مکھن، چھ چمچے، سنترے کے علاوہ کوئی ایک پھل اور روٹی اور آلو کی بھی اجازت ہے، مصالحے، کافی، چائے، خشک گوشت، اور اچار سے پرہیز کرنا چاہئے، ڈاکٹر میکال کا خیال ہے کہ اگر مائیں بچوں کی ولادت سے قبل ہی مذکورۂ بالا غذا کا استعمال شروع کر دیں اور ولادت کے بعد بچوں کی پرورش اسی غذا سے کریں، تو دانتوں کے امراض ایک پشت کے اندر ہی تقریباً بالکل دور ہو جائیں گے،

## سورج گرہن

۱۹ جون ۱۹۳۶ء کا سورج گرہن بحر روم سے بحر الکاہل تک کے خطہ میں پوری طرح نمایاں تھا، لیکن سب سے زیادہ نمایاں سائبریا اور شمالی جاپان میں تھا، چنانچہ روس میں اس کے متعلق تیاریاں بہت پہلے سے ہو رہی تھیں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ عوام کو گرہن کے حالات بتائے جا رہے تھے، رصد خانوں کی طرف سے اس موضوع پر سائنٹفک مقالات آسان زبان میں شائع ہو رہے تھے، حکومت نے بھی تین کتابیں اور بہت سے رسالے شائع کرکے لوگوں کو آنے والے واقعہ کی نسبت مفید معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی، اس گرہن کا انتظار سختی سے کیا جا رہا تھا، کیونکہ پچھلا گرہن جو فروری ۱۹۳۴ء میں لگا تھا، صرف بورنیو کے گھنے جنگلوں سے دکھائی دیا تھا، جتنا بہتر موقعہ جون ۱۹۳۶ء کے گرہن کا مطالعہ کرنے کے لئے ملا اتنا اب تک کسی گرہن کے لئے میسر نہیں آیا، اسی لئے ایک سال قبل ہی ہیئت دانوں کی بین الاقوامی انجمن نے پیرس میں اجلاس کرکے اس گرہن کے مختلف حصوں کے مطالعہ کیلئے مختلف جماعتیں متعین کر دی تھیں تاکہ کوئی حصہ مطالعہ سے رہ نہ جائے اور کسی ایک حصہ کے مطالعہ میں ایک سے زیادہ جماعتیں وقت صرف نہ کریں، چنانچہ منجملہ اور ممالک کے امریکہ، جاپان، انگلستان، فرانس، بلجیم اور پولینڈ کے وفود اس وسیع خطہ میں پھیلے ہوئے تھے، جہاں گرہن پوری طرح نمایاں تھا،

پورا سورج گرہن اب آئندہ ۸ جون ۱۹۳۷ء کو واقع ہوگا، لیکن صرف بحر الکاہل سے دیکھا جا سکے گا، یکم اکتوبر ۱۹۴۰ء کو دوسرا پورا گرہن جنوبی نصف کرہ کے ایک حصہ سے نظر آئیگا، شمالی امریکہ میں پورا سورج گرہن ۳۰ جون ۱۹۵۴ء کو دکھائی دیگا، یہ گرہن کناڈا میں واقع ہوگا، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی باری ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء میں آئیگی جب پورا گرہن نیو انگلینڈ کی ریاست سے نظر آئیگا۔

"ع ز"

# باب التقریظ والانتقاد

## تتمۂ صوان الحکمۃ

مصنفہ پرنسپل محمد شفیع ایم اے، پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی، پتہ:- موتی لال بنارسی داس پنجاب سنسکرت بک ڈپو سید مٹھا، لاہور، قیمت ہر سہ جلد:- لعہ عہ ر

عربی زبان میں ہر قسم کے علوم و فنون کے ماہرین پر الگ الگ کتابیں لکھی گئی ہیں، من جملہ ان کے علوم فلسفہ و حکمت کے ماہرین کے حالات و سوانح پر بھی چند کتابیں لکھی گئی ہین، گو تصریح پتہ نہیں چلتا کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب کونسی لکھی گئی ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ عربی میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب یحییٰ نحوی کی تاریخ ہے، خواہ اس کا ترجمہ ہو، (فہرست ابن ندیم صہ ۲۹۰ وصہ ۳۰۷ مصر) اس کے بعد تاریخ اسحاق الراہب (ایضاً ص ۳۴۴) و تاریخ الاطبا اسحاق بن حنین (ایضاً صہ ۲۹۷ وصہ ۲۹۰، وصہ ۴۱۵) لکھی گئی، چونکہ اکثر اطبا، حکما ہوتے تھے، اور اکثر حکیم طبیب اس لئے ان دونوں کے حالات ایک دوسرے کے تذکرے میں ملا جلا کر لکھے جاتے تھے، ان کتابوں کا بھی یہی حال تھا، ان میں زیادہ تر یونانی حکیموں کے حالات اور سوانح تھے،

ابن ندیم بغدادی نے ۳۷۷ھ میں جو فہرست لکھی اس کا ایک باب حکما اور فلاسفہ کے حالات مین ہے، شاید یہ پہلا موقع ہے، کہ دوسرے حکما کے پہلو بہ پہلو مسلمان حکما کو بھی جگہ دی گئی، ابن ندیم کا ایک استاد مشہور حکیم ابو سلیمان محمد بن طاہر سجستانی منطقی تھا، جو بقول شہرزوری ۳۳۰ھ میں

بغداد میں موجود تھا، اس نے صوان الحکمۃ کے نام سے حکماء کے اقوال وسوانح میں، ایک کتاب لکھی تھی، اس کتاب کی تالیف کا زمانہ چوتھی صدی کا وسط قرار دینا چاہئے، پانچوین صدی میں قاضی صاعد اندلسی کی طبقات الامم کو بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھنا چاہئے،

اس زمانہ میں کتاب پر تتمہ اور تتمہ پر تتمہ لکھنے کا رواج تھا، ظہیر الدین علی بن زید بیہقی المتوفی ۵۶۵ھ نے ۵۴۹ھ سے پہلے صوان الحکمۃ پر تتمہ لکھا جس کا نام تتمہ صوان الحکمۃ ہے، اور یہی کتاب اسوقت زیر تبصرہ ہے، چھٹی صدی کے نصف میں ایک اور مصنف نے اس کا اتمام لکھا جس کا نام اتمام تتمہ صوان الحکمۃ ہے، ساتوین صدی کے آغاز میں شہرزوری نے ان سب معلومات کو نزہتہ الارواح میں کسیقدر اضافہ کیساتھ لکھ دیا، ساتویں صدی کے وسط میں جمال الدین قفطی المتوفی ۶۴۶ھ نے اخبار العلماء باخبار الحکماء کے نام سے اس فن میں ایک عمدہ کتاب لکھی، آٹھویں صدی کے وسط میں تتمہ صوان الحکمۃ کا ترجمہ فارسی میں درۃ الاخبار ولمعۃ الانوار کے نام سے ہوا، اکبر کے عہد میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) کیلئے ۱۰۱۱ھ میں شہرزوری کی کتاب کا فارسی میں ترجمہ ہوا، مترجم کا نام مقصود علی تبریزی ہے، اس ترجمہ کا خلاصہ میر سید صدر الدین بن میر محمد صادق نے بہت بعد میں کیا، تبریزی کی کتاب ہندوستان کے اندر دار المصنفین اور دفتر مال حیدر آباد کے کتبخانہ میں اور خلاصہ بانکی پور لائبریری میں ہے،

اس پورے سلسلۂ تواریخ حکماء میں سے کتاب الفہرست کو چھوڑ کر صرف ایک کتاب مختصر اخبار العلماء باخبار الحکماء قفطی یورپ اور مصر میں چھپی تھی، لیکن چند سال ہوئے کہ پنجاب یونیورسٹی کے صیغۂ علوم مشرقی کی طرف سے پروفیسر محمد شفیع صاحب نے درۃ الاخبار کو تصحیح و تحشیہ کیساتھ چھاپا تھا، اور اب انہیں نے درۃ الاخبار کی عربی اصل تتمہ صوان الحکمۃ کو چھاپ کر شائع کیا ہے، اس کتاب کے ایک نسخہ کی نقل حیدرآباد کے ایک اور فاضل بھی یورپ سے لائے تھے، اور وہ اسکی تصحیح و طبع کی فکر میں تھے، مگر یہ سعادت پروفیسر محمد شفیع کی قسمت میں تھی، انھون نے یورپ اور قسطنطنیہ کے مختلف کتب خانون کے نسخون کے

مقابلہ سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا، اور اوس پر محققانہ حواشی لکھے، اور پنجاب یونیورسٹی نے اوس کو چھاپ کر شائع کیا،

تواریخ حکما کے باب میں دو بڑی دقتیں ہیں، ایک یہ کہ ان کتابوں میں ان کے حالات نہایت ہی مختصر ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو ان کے ناموں پر اکتفا کی گئی ہے،

دوسری یہ کہ ان کی ولادت اور وفات کے سنین بہت کم ملتے ہیں،

محشی موصوف نے اپنے امکان بھران دونوں دقتوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہو، حواشی میں دوسرے ذرائع سے مترجم لکا اگر کوئی حال معلوم ہو سکا ہے تو اس کا حوالہ دیا ہے، اور اون کی زندگی اور وفات کی تاریخ وسنہ کا اگر پتہ لگ سکا ہے، تو اسکو ذکر کیا ہے، ساتھ ہی دوسرے متعلقہ اشخاص کے سوانح کی تشریح بھی کی ہو، کتاب کے مختلف نسخوں کی مختلف قراءتوں میں سے صحیح قراءت کی تعیین متن میں کی ہے، اور دوسری قراءتوں کو حاشیہ میں درج کر دیا ہے، کتاب کے شروع میں فہرست کتاب ہے، اور اخیر میں مزید تشریحی حواشی لکھے ہیں، اور ناموں اور کتابوں کا انڈکس بنا کر شامل کیا ہے، سب سے آخر میں غلطنامہ ہے،

کتاب کی تصحیح اور تحشیہ میں پروفیسر موصوف نے پوری محنت کی ہے، اور حکما کی جو تصانیف موجود ہیں، اور جن کتبخانوں میں ہیں اونکا پتہ دیا ہے، ارباب نظر جانتے ہیں، کہ اس قسم کے کاموں میں کس دیدہ وری اور دیدہ ریزی کی ضرورت ہے، مصحح محشی نے ان دونوں باتوں کا پوری طرح ثبوت دیا ہے،

کتاب میں کل ۱۱۱ حکیموں کا تذکرہ ہے، حنین بن اسحاق کے حال سے وہ شروع اور زین الدین جرجانی کے حال پر ختم ہوتی ہے، یعنی وہ چھٹی صدی ہجری کے وسط تک کے حکما کے احوال پر مشتمل ہے، مصنف نے حتی المقدور تاریخی ترتیب پیش نظر رکھی ہے، گو اسکی پوری رعایت نہیں کی ہے،

کتاب کی تصحیح اور تحشیہ میں جو محنت کی گئی ہے، اسکی بنا پر وثوق کیساتھ کہا جا سکتا ہو کہ وہ

کسی یوروپین مستشرق کی محنت سے کم نہیں ہے، حالانکہ کتابوں کے ملنے کی جو آسانیاں یورپ میں ہیں وہ ہندوستان میں کہاں اور کس کو میسر ہیں؟

بعض مقامات کی نسبت ہمکو کچھ کہنا بھی ہے:۔

صنہ پر جس علاء الدولہ فرامرز بن علی کا ذکر ہے، تاریخ بیہق کے ضمنی تذکرہ کے علاوہ جس کا حاشیہ میں حوالہ دیا گیا ہے، کامل ابن اثیر کے حوادث ۵۱۵ھ میں اس کا ذکر ہے کہ اس نے اس سال مشہد کے گرد چہار دیواری (سور) بنوائی تھی، کسی قدر اس کا مفصل حال علامہ شوستری نے مجالس (ص۴۹۲) میں لکھا ہے، اور ۵۳۶ھ اسکی تاریخ وفات بتائی ہے، محشی نے فائت حواشی میں (ص۲۲۲) اس علاء الدولہ پر جو حاشیہ لکھا ہے، وہ بے محل معلوم ہوتا ہے، کہ وہ علاء الدولہ فرامرز کا حال نہیں، بلکہ اس کے بھائی علاؤ الدولہ گرشاسپ کا ہے،

مصنف کو یعقوب کندی کے یہودی یا نصرانی ہونیکا شبہ ہوا (ص۲۵) محشی نے چہار مقالہ کا حوالہ دیا ہے، کہ اس نے مصنف نے بھی اس کو یہودی لکھا ہے، حالانکہ قاضی صاعد اور قفطی نے اسکے مسلمان ہونے اور مہدی و رشید کے زمانہ میں اس کے باپ کے امیر کوفہ ہونے، اور اسکے دادا اشعث بن قیس کے صحابی ہونے کی تصریح کی ہے، اصابہ فی تمییز الصحابہ میں ان کا پورا حال مذکور ہے،

یعقوب کندی کے ایک رسالہ کے رامپور میں ہونے کا ذکر محشی نے کیا ہے، (ص۱۶۱) حالانکہ اس کا ایک اور رسالہ، رسالۃ فی الشعاع بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں بھی موجود ہے[1]، اسکا تیسرا رسالہ تصحیح قول[2] ابسقلاوس فی المطالع بدایون میں چھپا ہے،

تعجب ہے کہ محشی نے طبقات الامم کے مصنف کو فہرست ماخذ میں (ک) اور حواشی میں (ص۱۹ و ۲۵) جا بجا ابن صاعد لکھا ہے، حالانکہ صاعد خود اس کا نام ہے، اس کے باپ کا نہیں، اس لئے ہر جگہ صاعد لکھنا چاہئے تھا،

[1] مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص۲۳۶، [2] ابن ندیم ص۳۶۱ مصر،

بعض الفاظ کی صحیح قرأت نہیں ہو سکی ہے، مثلاً ص ۱۱۱ میں ہے، "ساواک عبد خیرک" حالانکہ یہ فقرہ بعید المعنی ہے، محشی نے نسخہ غ کے مطابق یہ الفاظ متن میں رکھے ہیں، حالانکہ ک اور ب میں عبد کے بجائے صحیح طور پر عند تھا، اس کی صحیح قرأت ذل میں ہے، اور وہ یہ ہے، ماذاک عند غیرک یعنی تم یہ کہتے ہو، مگر تمھارے سوا دوسرے آدمی کے نزدیک یہ بات یوں نہیں ہے

ص ۱۲۶ میں ایک شعر ہے، جسکو متن میں اسطرح بقید اعراب لکھا گیا ہے،

لقد دفنوا منہ سقی اللہ قبرہ فتیً عیشۃً معروفۃً بعد موتہ

عیشۃً معروفۃً پڑھنے سے شعر بے معنی ہو جاتا ہے، بلکہ اس کو عیشہ معروفہ پڑھنا چاہئے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ ایسے جوان مرد کو دفن کر دیا، جسکی زندگی اوس کے مرنے کے بعد اوسکی نیکی کے کارنامے ہیں،

ص ۲۰۲ میں نریجا الذی غلط معلوم ہوتا ہے، الزیج الذی لہ ہوگا، یا نزہتہ ہو، جیسا کہ اختلاف قرأت کے حواشی ص ۲۰۲ میں ہے،

ص ۹۹ کے حاشیہ میں راغب اصفہانی کی تصانیف میں سے تفصیل النشأتین کا چھپ جانا لکھا گیا ہے، حالانکہ ان کی دوسری کتاب الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ بھی سنہ ۱۳۲۴ھ میں مصر میں چھپ گئی ہے لیکن اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے،

ابو حاتم منظفر اسفرازی کی تاریخ وفات سنہ ۵۰۶ھ (چہار مقالہ) اور ۵۱۵ھ (میزان الحکمۃ خازنی) کے درمیان متعین کی گئی ہے، مگر خود تتمۃ صوان الحکمہ میں ہے کہ اس نے جو سائنٹفک ترازو بنائی تھی اور شاہی خزانہ میں پیش کی تھی، اسکو جب سلطان سنجر کے خزانچی نے توڑ ڈالا، تو حکیم مذکور (ابو حاتم منظفر) اس غم میں مر گیا، سلطان سنجر سنہ ۵۱۱ھ میں تخت پر بیٹھا، اس بنا پر ابو حاتم منظفر کی تاریخ وفات سنہ ۵۱۱ھ اور ۵۱۵ھ کے درمیان مقرر کرنی چاہئے

ص ۴۳ میں کوشیار کی مجمل کا پورا نام چہار مقالہ کے حوالہ سے مجمل الاصول بتایا گیا، اور رامپور لائبریری میں اس کا ہونا لکھا ہے، اس کا دوسرا نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتبخانہ (حیدرآباد دکن) میں بھی ہے، اور وہاں اوس کا نام مجمل الاحکام فی اصول الاحکام ہے،

ص ۱۴۰، س ۵ میں عشرین مجلدات کا لفظ متن میں رکھا گیا ہے، حالانکہ صحیح نسخہ ہے جو حاشیہ میں بحوالہ نسب، ب لکھا گیا ہے، یعنی مجلدۃ،

تتمہ کا فارسی اڈیشن درۃ الاخبار پروفیسر شفیع صاحب پہلے لکھنؤ میں شائع کر چکے تھے، اب اوس کو اس سلسلہ کی دوسری کڑی بنا کر دوبارہ ٹائپ میں چھاپا ہے، حواشی وہی ہیں جو طبع اول میں تھے کہیں کہیں مزید تصحیح و تبدیل کی ہے، مگر تعجب ہے کہ نصیر طوسی کے حال میں تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے جو بیان "و عمرش بقول صاحب گزیدہ، سال و، ماہ و، روز بود" پہلے لکھا گیا تھا، اس میں تغیر نہیں کیا گیا ہے، مطبوعہ گزیدہ میں جہاں تک میں نے تلاش کیا یہ بیان نہیں ملا، البتہ ہفت اقلیم رازی میں ہے کہ "و مدت عمرش ہفتاد و ہفت سال و ہفت ماہ و ہفت روز بود" جو حساب سے غلط ہے، اور صحیح ۵، سال، ماہ، روز ہے،

حکماے اسلام کی تاریخ میں غالباً قدماء نے کوئی محققانہ کتاب نہیں لکھی، حالات بہت کم لکھے ہیں، سنین سے غفلت برتی ہے، تصانیف کا استقصا نہیں کیا ہے، پھر یہ جو کچھ ہے چھٹی صدی تک ہے، اسکے بعد کی چھ صدیوں میں یہ ادھورا کام بھی نہیں کیا گیا، اور اس دوسرے دور کے اشخاص بالکل زاویۂ خمول میں ہیں، ضرورت ہے کہ پرانے ماخذوں کی جدید تحقیقات سے ایک نئی کتاب اس موضوع پر لکھی جائے، اور اس بڑی کمی کو پورا کیا جائے، معلوم نہیں کس خوش قسمت کی قسمت میں یہ خدمت مقدر ہے،

کتاب کا تیسرا حصہ جو انگریزی دیباچہ و تبصرہ ہوگا زیر طبع ہے،

"س"

# ہندوستانی کے چند نئے رسالے،

سالِ رواں میں ماہ فروری سے ماہ جولائی ۱۹۳۶ء تک ہندوستانی زبان میں حسبِ ذیل نئے رسالے شائع ہوئے

**تحقیقِ حق** - لکھنؤ، مدیرہ جناب سید علی صفدر صاحب ایم اے ال ال بی، ۴۸ صفحے قیمت سالانہ ۲ بیجر، ہر پرچہ ۵ ر پتہ:- امپیریل بکڈپو نمبر ۹۱، امین الدولہ پارک، لکھنؤ،

یہ علوم فلسفہ و کلام کا ماہوار رسالہ ہے، جس میں عقلی دلائل سے ادیان و مذاہب کی تحقیق کی جاتی ہے، اس کے کارکن قدیم اسلامی فلسفہ وعلم کلام کے مباحث کو دورِ حاضر کے نئے تعلیم یافتہ طبقوں کے فہم و مذاق کے مطابق پیش کرتے ہیں، اور اس طریقہ سے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں دینِ اسلام کی برتری عقلی دلائل سے دکھاتے ہیں، اگرچہ نفسِ واقعہ کے لحاظ سے احقاقِ حق کے لئے ان متکلمانہ مباحث و نظریات کو اساسِ حق قرار دینا ایک ذوقی مسئلہ ہے، لیکن جن لوگوں کی ذہنیت کے مقابلہ میں انھیں پیش کیا جاتا ہے، ان کی تشفی کا پورا سامان ان میں بہم پہنچایا جاتا ہے، اور اس حیثیت سے ایک قابلِ قدر خدمت انجام پارہی ہے، رسالہ کے مضامین انگریزی و ہندوستانی دونوں زبانوں میں ضرورت و محل کے لحاظ سے چھاپے جاتے ہیں، "تحقیقِ مذہب" کے عنوان سے مدیر کا ایک مضمون دونوں زبانوں میں چھپ رہا ہے، جس میں عیسائی، آریہ اور ملحد وغیرہ فرقوں کے درمیان وجودِ باری تعالیٰ پر دلائل قائم کئے گئے ہیں، رسالہ کے کاغذ اور لکھائی چھپائی پر مزید توجہ کی ضرورت ہے،

**شمیم**، پٹنہ، اڈیٹر جناب تمنائی، حجم ۴۸ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت سالانہ ے ر ہر پرچہ ۴ر پتہ:- یونس منزل، اگزبیشن روڈ، پٹنہ،

یہ ادبی ماہنامہ ہے، جو پٹنہ کے ایک ہونہار نوجوان اہل قلم کے جذبۂ خدمت ادب سے نکلا ہے، ادبی مضامین اور افسانے خاصے ہوتے ہیں، نیز انگریزی کے علمی مضامین اور کتابوں کے ترجمے چھپتے ہیں، رسالہ کے دائرۂ عمل تنگ

سیاسیات داخل ہیں، ہر ماہ بین الاقوامی و ہندوستانی سیاسیات پر رائے زنی کی جاتی ہے، مضامین اور افسانوں میں سوشلزم کی حمایت کی جھلک نظر آتی ہے، اس سلسلہ میں اگر گرم فقرے بھی قلم سے ٹپک پڑیں تو اسے نوجوان ادیب کی نوجوانی کے قلم کی تیزی سمجھنا چاہئے، توقع ہے کہ یہ رسالہ صوبہ کے نوجوانوں میں ادبی مذاق پیدا کریگا، اور رفتہ رفتہ ادارت کا تجربہ بھی آجائے گا،

**حیات** - مدراس، مدیر جناب محمد عبد الحمید صاحب حمید، ۱۶ صفحے، قیمت ار، پتہ:- ہمبنی پیس ترلکیرڈی ہائی روڈ، مدراس، صوبہ مدراس سے ہندوستانی زبان کے خاصے رسالے نکل رہے ہیں

صوبہ مدراس سے ہندوستانی زبان کے خاصے رسالے نکل رہے ہیں، یہاں کے مفکروں میں اس زبان کی خدمت اور مسلمانوں کو سیاسی و تعلیمی اصلاح و ترقی کے لئے ابھارنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے، چنانچہ یہ نیا ماہنامہ "حیات" بھی انہی مقاصد کے ساتھ ماہ محرم سے جاری ہوا ہے، دار المصنفین کے سابق رفیق مولانا ابو الجلال ندوی اور چند دوسرے اہل علم اس رسالہ کے نگراں ہیں، اور پہلے نمبر میں ان کے مضامین نثر و نظم درج ہیں،

**شباب مشرق** کلکتہ اڈیٹر جناب شمس شیدائی و ڈاکٹر محمد یوسف صاحب خیال، ۳۲ صفحے، قیمت عام ہر پرچہ ۲ر پتہ:- نمبر ۲۳، سنٹرل ایونیو، روم ۸، کلکتہ،

یہ رسالہ بنگال میں ہندوستانی زبان و ادب کی خدمت اور "حق کی اشاعت" کے لئے جاری ہوا ہے، جس میں معمولی اور اوسط درجہ کے ادبی مضامین چھپتے ہیں،

**اتحاد اسلامی**، رامپور، اڈیٹر جناب دائم جلالی، ۵۲ صفحے، قیمت سالانہ عہ، ہر پرچہ ۲ر پتہ:- بازار صفدر گنج رامپور،

اس میں عام فہم مذہبی، اصلاحی مضامین تراجم اور تاریخی قصص و حکایات شایع ہوتے ہیں،

"ر"

# مطبوعات جدیدہ

**انقلابِ روس**، از جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ناشر ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ملنے کا پتہ:۔ سول ایجنٹ کتابستان الہ آباد، حجم ۲۵۰ صفحات، قیمت:۔ عار

روس کا جدید انقلاب، دنیا کی تاریخ میں صرف سیاسی اہمیت نہیں رکھتا، اسکے علمبردار ایک جدید تمدن نئی معاشرت، اور اعجوبۂ روزگار نظامِ اخلاق کی نئی طرح ڈالنے کے بھی دعویدار ہیں، چند دنوں پہلے تک روس کے صحیح حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے ذرائع ہمارے پاس مفقود تھے، اس کے متعلق تصنیفات، مضامین اور سفرنامے زیادہ تر ذاتی رجحانات کے ماتحت سیاسی اغراض کے لئے لکھے جاتے تھے، ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ حکومتِ روس کے تعلقات، دولِ یورپ سے نئے سرے سے استوار ہوئے، پروپگنڈے کا دور ختم ہوا، اور واقعات اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کئے جانے لگے لیکن اسوقت تک ہندوستانی زبان میں اس کے عصرِ جدید پر کوئی قابلِ اعتماد تصنیف موجود نہ تھی، جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے یہ ضرورت پوری کی،

موصوف نے اس کتاب میں بالشویک نظامِ حکومت، آئین و قوانین، ملکیت، صنعت و حرفت اور زراعت کے متعلق بالشویک اصول و عقائد اور ان کی عملی سرگرمیوں، روس کی موجودہ تعلیمی جد وجہد اور مذہب، نظامِ معاشرت اور اخلاق کے متعلق بالشویک عقائد، اور عملی تجربے، ان کی حمایت و مخالفت دونوں سے قطع نظر کرکے دکھائے ہیں، اس کتاب میں مصنف کی حیثیت ایسے مورخ کی ہے، جو ذاتی رجحان سے علحدہ رہ کر جو واقعہ جس طور پر پیش آیا، اوسے سادہ طریقے سے بیان کر دے اور

وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں،

پنڈت جی کی اس تصنیف میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے، ادھر پچھلے چند سالوں میں ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں انھوں نے ہندی کے نو پیدا نامانوس الفاظ بہ کثرت استعمال کیے تھے، چونکہ پنڈت جی ہندوستانی زبان کے کہنہ مشق اہل قلم تھے اسلئے معارف نے پچھلے موقعوں پر ایک سے زیادہ مرتبہ انھیں ٹوکا، اور موصوف نے بعض تحریروں میں بپاطر زمل حق بجانب دکھانے کے لئے ہماری گذارشوں کے جواب بھی دیئے، لیکن موصوف کی یہ تازہ تصنیف دیکھ کر خوشی ہوئی، کہ انھوں نے یہ کتاب اپنی اسی پرانی صاف شستہ، اور رواں زبان میں لکھی ہے، جس کے وہ قادر الکلام اہل قلم ہیں، اگرچہ ٹائپ میں چھپنے کے باوجود چھپائی کی بعض قابل افسوس غلطیاں باقی رہ گئی ہیں،

**سفرنامۂ مغرب اقصٰی**، از جناب قاضی میر ولی محمد صاحب بھوپال، حجم ۹۶ صفحات،

قیمت درج نہیں،

یہ اقصائے مغرب کا عبرت انگیز سفرنامہ ہے، اسلامی اندلس کے دور میں مغرب و اندلس باہم قلب و جگر کی حیثیت رکھتے تھے، اور مغرب میں بھی بعض بڑی جلیل القدر اسلامی سلطنتیں قائم تھیں، پھر اندلس کے اجڑنے کے بعد بہت خانمان اندلسی خاندانوں نے اسی سرزمین میں آکر پناہ لی، اور آج بھی یہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی موجود ہے، جو اگرچہ فرانس و اسپین کے پنجۂ استعمار میں گرفتار ہے، لیکن ان کے وجود سے اسلامی عہد کی یاد باقی ہے، اسلئے اسلامی تاریخ سے وابستہ دلوں میں اس سرزمین کی طرف غیر معمولی کشش پائی جاتی ہے، میر ولی محمد صاحب نے جنھیں اندلس، افریقہ، مغرب اور سسلی کی تاریخ سے عشق سا ہے، جہاں دوسرے اجڑے دیاروں کی زیارت کی، وہاں وہ کشاں کشاں صحرائے مغرب میں بھی جا پہنچے، اور یہاں کے ایک ایک تاریخی مقام کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا، اور سلاطین علما و اکابر کی قبریں تلاش کیں، اور اپنے سفرنامہ میں ان کے نشانات بتائے، اسی تلاش و جستجو میں وہ عہد اسلامی

کے مغرب کے مشہور شہر اور دورِ حاضر کی گمنام آبادی اغمات میں بھی بہ ہزار دشواری وارد ہوئے، یہاں اندلس کا مشہور عبادی تاجدار المعتمد آسودۂ خواب تھا، اس جلیل القدر فرمانروا نے اندلس کے اسلامی دور کے آخر میں اسے نئے سرے سے زندہ کیا تھا، اور اس کے نام سے یورپ کی سلطنتیں کانپ اٹھتی تھیں، لیکن افسوس کہ آج اغمات میں اسکی قبر کا بھی نام و نشاں باقی نہیں رہا، زائر نے تاریخ کے دفتر کھولے اسکی قبر کی جاے وقوع کے متعلق تاریخ کا بتایا ہوا ایک ایک نشان دیکھا، قدیم تاریخی اور موجودہ نقشوں سے سرزمین کو ملایا، لیکن اس جلیل القدر فرمانروا کی آخری خوابگاہ کا پتہ نہ چل سکا، زائر سیاحِ عالم ابن بطوطہ کی قبر کی زیارت کے شوق میں بھی روانہ ہوا، اسکی قبر ایک مسکونی مکان کے ایک بوسیدہ حجرے میں بتائی گئی، زائر نے وہاں پہنچکر دیکھا، کہ اس کی قبر کی خام زمین مسطح ہو چکی ہے، اور چند اشخاص اس پر چٹائی بچھا کر بیٹھے ہوئے ہیں،

فاضل مصنف نے مغرب کی آبادیوں کے موجودہ تمدنی حالات اور یہاں کے مسلمانوں کے تمدنی، سیاسی اور معاشرتی حالات کا نقشہ بھی تفصیل سے کھینچا ہے، جو اپنی جگہ کچھ کم عبرت آموز نہیں، یہ پورا سفرنامہ گویا ایک حساس دردمند مسلم دل کے جذبات و مشاہدات کا آئینہ دار ہے،

**الدین** (عربی) از مولانا عبد القدیر صاحب، بدایونی، پتہ نمبر مکان نمبر ۴۴، محلہ رکاب گنج عقب ڈیوڑھی، غالب گنج حیدرآباد، دکن، حجم ۲۳۱ صفحے، قیمت ۱۔ عا

یہ سُنی عقائد و ایمانیات و حنفی مسائل عبادات و مشرب صوفیۂ کرام کے متعلق کتاب و سنت کے متون و مآخذ کے اقتباسات کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے، کتاب چار ابواب کتاب العلم، کتاب الایمان کتاب الاسلام اور کتاب الاحسان میں تقسیم ہے، جن میں محنت و عرق ریزی کے ساتھ سنی، حنفی و صوفی مذہب و مشرب کے متعلق آیات و احادیث کے متون، بغیر کسی تمہید و شرح و توضیح کے ترتیب جمع کئے گئے ہیں، جن مسائل میں مؤلف موصوف کو کتبِ صحاح میں احادیث دستیاب نہ ہو سکی ہیں، ان

میں دیگر مسانید کی طرف رجوع کرکے ذوق و حال کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے،

**دو خدائی خدمتگار**، مترجمہ جناب محمود علی خانصاحب حجم ۹۹ صفحے، تقطیع چھوٹی قیمت ۱۲؍

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی،

اس میں صوبہ سرحد کے مشہور محب وطن بھائیوں جناب ڈاکٹر خانصاحب (ایم آر سی ایس لندن) اور سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خان کے مختصر سوانح حیات گاندھی جی کے سکریٹری جناب مہادیو دیسائی نے اخلاص و محبت سے لکھے ہیں، جس میں ان کے خاندانی و تعلیمی حالات سے لیکر ان کے دور حاضر تک کی سرگرمیاں دلچسپ انداز میں بیان کی ہیں، جن میں ان کے ایثار و قربانی اور وطنی تحریک کے سلسلہ میں صوبہ سرحد میں ان کے کارنامے خاص طور پر نمایاں کئے گئے ہیں، نیز ان الزامات کی تردید وزنی دلائل سے کی گئی ہے، جنکو حکومت نے وقتاً فوقتاً اپنے بیانوں میں ان بھائیوں کے سر عائد کیا تھا، رسالہ میں گاندھی جی کی ایک مختصر تقریب بھی چھپی ہے، ترجمہ سلیس اور روان ہے،

**زوال الامت**، از جناب سید جمیل صاحب حجم ۶۴ صفحے، تقطیع چھوٹی قیمت ۴؍

پتہ:۔ جناب حکیم سید عبد الجلیل صاحب، ڈاکخانہ جرول، ضلع بہرائچ، (یوپی)،

اس رسالہ میں مسلمانوں کے عہد اول میں ترقی کرنے کے اسباب دکھائے گئے ہیں، کہ وہ قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل پیرا تھے، اس سلسلہ میں قرآنی تعلیمات کو علیٰحدہ عنوانوں سے بیان کرکے ان سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی دوری دکھائی گئی ہے، اور پھر بتایا گیا ہے کہ مسلمان قرن اول کے جذبۂ ایمانی، جوش سرفروشی، اور حقیقی مساوات کا جذبہ پیدا کرنے، فرقہ دارانہ اختلافات سے علیٰحدہ ہونے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے نمونۂ اخلاق بننے، اسلامی تہذیب و شائستگی اختیار کرنے، اور صنعت اور تجارت کو ترقی دینے سے حقیقی ترقی کا عہدِ زرین واپس لوٹا سکتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کا یہ دورِ زوال دراصل دوسری قوموں کے برخلاف اپنے پچھلے شاندار ماضی ہی

کی طرف واپس جانے سے بدل سکتا ہے،

**مکتوبات امجد،** مرتبہ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی، پتہ شمس المطابع عثمان گنج، حیدر آباد، ۵۹ صفحے، قیمت :- ۸ر

یہ حکیم الشعراء حضرت امجد حیدر آبادی کے چند خطوط کا مجموعہ ہے، ان میں بھی موصوف کا وہی خاص رنگ نمایاں ہے جو ان کی تصنیفات و رباعیات میں نظر آتا ہے،

**احکام اسلام،** از مولوی کفیل احمد صاحب کرتپوری ناشر رائل ایجوکیشنل بک ڈپو جامع مسجد دہلی، حجم ۲۰۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت :- عہ ر

اس میں اسلام کے عقائد ایمانیات کے معلومات کسی قدر تفصیل سے اور عبادات کے مسائل اجمال کیسا تھ درج کئے گئے ہیں، رسالہ کا طریقۂ ادا عام فہم اور پیرایۂ بیان دلنشیں ہے،

**قوت القرآن** از جناب واحد خانم مسلم ویلورری پتہ نمبر ۲۵ جدید بیبو بازار بنگلور سٹی، ۴۹ صفحے، قیمت :- ۳ر

اس میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک، اور قرآن مجید کی تعلیمات سے دکھایا گیا ہے کہ انہی کی پیروی کر کے مسلمان "قوت" حاصل کر سکتے ہیں جس سے سربلندی حاصل ہو گی،

**اساس القرآن،** از جناب واحدہ خانم مسلم ویلورری پتہ نمبر ۲۵، جدید بیبو بازار بنگلور سٹی، حجم ۹۶ صفحے، قیمت :- ۱ار

اس میں سورۂ فاتحہ کی آیات کے معانی و مطالب بیان کئے گئے ہیں،

**دوزخ کا کھٹکا،** از مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند، ناشر منیجر دینی بک ڈپو، کوچہ ناہرخان، دہلی، حجم ۱۳۶ صفحات قیمت ۱۲ر

اس رسالہ میں منہیات شرعی سے متعلق تقریباً نو سو سے زائد حدیثیں بہ ترتیب عنوان جمع کی گئی

ہیں اکثر مقاموں پر ان کی تشریح بھی درج کی گئی ہے، حدیثوں کے متن و شرح کی عبارتوں میں امتیاز رکھا جاتا تو بہتر ہوتا، یہ مسلمانوں کی ترہیب کی ضروریات کے لئے کارآمد رسالہ ہے، جو مقبول ہو چکا ہے اور اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا گیا ہے،

**پاک زندگی**، از مولینا احمد سعید صاحب ناشر منیجر دینی بک ڈپو کوچہ ناہر خان، دہلی، ۱۰۴ صفحے، قیمت:- ۴ر

یہ مولینا احمد سعید صاحب دہلوی کے تین مضامین "فطرۃ سلیمہ" (یعنی حضرت ابراہیمؑ کے سوانح پر ایک نظر) "حیات طیبہ" (سیرت پاک کا بیان) اور "رسالہ فضائل درود" کا مجموعہ ہے،

**ہادی عالمؐ** از جناب حاجی نبی احمد کرتپوری، ناشر سکریٹری سیرت کمیٹی، بریلی،

اس رسالہ میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک بیان کی گئی ہے، رسالہ مفت تقسیم کیا گیا ہے،

**آئینۂ حق نما**، از مولوی محمد امین صاحب خوشابی، پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور، قیمت:- ۴ر

اس میں اسمائے حسنیٰ کی منظوم شرح کی گئی ہے، اور ہر اسم سے متعلق مختلف معلومات درج کیگئی ہیں،

**روح جذبات**، از جناب خادم اجمیری، پتہ منتظم محی الاوقاف معینی گدڑی شاہی انجمن جبالہ اجمیر، ۹ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت درج نہیں،

یہ جناب خادم اجمیری کے تازہ کلام کا مجموعہ ہے، جو دو عنوانوں "عقیدت" و "محبت" کے نام سے مرتب کیا گیا ہے، پہلا حصہ حمد و نعت اور بیشتر خواجگان چشت کی منقبت میں ہے، دوسرا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے، کلام میں روانی و پختگی ہے،

**تسخیر یاس**، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، ۲۲ صفحے، قیمت:- ۵ر

یہ مولوی اشرف الدین صاحب یاس ٹونکی کے ابتدائی دور شاعری کے کلام کا مجموعہ ہے، جسے نفاست کیساتھ چھاپا گیا ہے،

"ر"

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۰ ستمبر ۱۹۳۶ء

# معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

---

قیمت: پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۳۸ | ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء | عدد ۳

## مضامین


| | | |
|---|---|---|
| شذرات، | سید سلیمان ندوی، | ۱۶۲-۱۶۴ |
| سفر گجرات کی چند یادگاریں، | " | ۱۶۵-۱۷۹ |
| دیوان شمس تبریز اور مولانائے روم، | جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے، | ۱۸۰-۱۹۸ |
| نقشے، | جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمن صاحب ایم اے | ۱۹۹-۲۱۳ |
| یورپ کے جدید نظام میں عورت کی حیثیت، | "س ع" | ۲۱۴-۲۲۰ |
| اخبار علمیہ، | "ع ز" | ۲۲۱-۲۲۴ |
| شغل تکفیر، | علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ، | ۲۲۵-۲۲۶ |
| روح زندگی، | جناب پروفیسر اکبر منیر صاحب، | ۲۲۶ |
| نوائے فراق، | جناب پروفیسر فراق، الہ آباد یونیورسٹی، | ۲۲۷ |
| ہندوستانی زبان کے رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر، | "م" | ۲۲۸-۲۳۶ |
| مطبوعات جدیدہ، | " | ۲۳۷-۲۴۰ |

# شذرات

ہمارے حیدرآبادی فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ابھی اسی جون میں افغانستان کے سفر سے واپس آئے ہیں، وہاں کے نوجوان اہلِ علم و ادب کے روز افزوں ذوق و شوق و انہماک کو دیکھ کر وہ بیحد متاثر ہوئے، لکھتے ہیں:۔

انجمن ادبی کے ارکان کا جوش عمل دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ . . . . ہر رکن اس کوشش میں مسابقت کر رہا تھا کہ وہ کسی نئی چیز کا ترجمہ کر ڈالے، باوجود بے سامانی کے ان کی کارکردگی حیرت انگیز ہے۔ . . . انہماک پر حیرت اور رشک ہے، اور جی چاہتا ہے کہ کاش ان لوگوں کو چراغ علم ملتا ہو۔

---

لیکن ہمارے نوجوان فاضل دوست کو دیکھ کر کابل کے نوجوان اہل قلم طبقہ پر کیا اثر پڑا، وہ افغان ادیب فاضل جناب سرور خاں گویا کے عنایت نامہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے،

"چند روز قبل پروفیسور حمید اللہ خاں تشریف آوردہ بودند، نامۂ مبارک شمارا زیارت کردم، تا اندازۂ کہ مقدور عاجزانہ بود بایشاں مساعدت نمودہ از ہیچگونہ یاوری دریغ نکردم، زیرا شخص نابغہ مردے بود فاضل وکریم النفس ودارای خلق نیکو و اطوار جمیل و نجیبہ، در حقیقت تمثال اخلاق و مثال زندہ روشنی از تتبع و تفحص در راہ علم و دانش بشری، برائے تمام جوانان سرمشق خوبے است، خداوند امثال ایشاں را در دنیائے اسلام بیشتر کند و زحمات شان را پاداش جمیل بدہد . . . . "

ہمارے افغان دوست کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی اس اندرونی تجویز کی کہ وہ وہاں کے چند افغان

نوجوان اہل قلم کو چرا کر ہندوستان لانا چاہتے ہیں، بروقت خبر نہ ہوسکی، ورنہ وہ بہت آسانی سے وہیں چرا لئے جاتے اور حیدرآباد کی ریاست کو اپنے ایک محسن پروفیسر کے چوری جانے پر خسارۂ عظیم برداشت کرنا پڑا،

---

ادیب فاضل سرور خاں گویا کے خط سے یہ معلوم کرکے بیحد خوشی ہوئی کہ انھوں نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک نہایت قدیم و نادر مجموعہ دریافت کیا ہے جس کی کتابت حکیم سنائی کی وفات کے پچاس برس بعد ہوئی ہے، اس مجموعہ میں حکیم ممدوح کی حسب ذیل تصانیف ہیں، کارنامۂ بلخ، عشق نامہ، عقل نامہ، بہرام و بہروز، عفو نامہ اور غریب نامہ ہمارے دوست اس مجموعہ کو جشن فردوسی کے موقع پر ایران لے گئے تھے، وہاں کے فضلاء اس کو دیکھ کر بیحد محظوظ ہوئے، اس کا کوئی نسخہ ایران میں نہ تھا، امید ہے کہ ہندوستان کے فضلاء بھی اس گنج مخفی کے ظہور پر بیحد خوش ہونگے،

---

جاپان سے پروفیسر برلاس اپنے ایک عنایت نامہ میں لکھتے ہیں:-

"معارف کے ماہ مئی نمبر میں ساقی پر تبصرہ کرتے ہوئے، ادارت سے ایک غلطی ہوئی ہے، میں نے دو جاپانی پروفیسروں سے اور دو طالبعلموں سے اس نمبر کے لئے مضمون لکھوائے تھے، ان صاحبان نے خود ہندوستانی میں لکھے تھے،

میں نے ترجمہ نہیں کیا، نیز میں کالج میں استاد اردو نہیں، بلکہ استاد ہندوستانی ہوں"

ہندوستانی کے حامی یہ سنکر کیسے خوش ہونگے، کہ ان کی زبان مشرق اقصیٰ کے گوشوں تک پہنچ چکی ہے، اور نیز یہ لفظ اردو کی تنگی اور اسکی جگہ لفظ ہندستانی کی وسعت ہندوستان کے باہر بھی اب تسلیم کی جانے لگی، اور سمجھا جانے لگا کہ ہندوستان کی مشترک زبان کا صحیح نام ہندستانی ہے نہ کہ اردو!

---

اسی خط میں پروفیسر برلاس نے جاپان میں اسلام کی اشاعت کی نسبت چند فقرے لکھے ہیں، اور بتایا ہے کہ یہاں بعض لوگ کس طرح غلط پروپگنڈے سے دنیائے اسلام میں غلط خبریں پھیلاتے ہیں، اور مسلمانوں کو حقیقت سے بیخبر رکھتے ہیں، جاپان میں درحقیقت صحیح اسلامی خدمت کی توقع اگر کسی سے کیجا سکتی ہے، تو وہ کوبے کی مسجد

اور اس کے مخلص کارکن ہیں،

---

مولنا شبلی اور مولنا حمید الدین صاحب کی تکفیر کے فتویٰ پر جن لوگوں نے دستخط کئے تھے ان میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت مولنا اشرف علی صاحب تھانوی کی تھی، مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی اور دوسرے دوستوں کے خطوط اور جناب صدق لکھنو سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ حضرت مولنا نے فتویٰ کے بعض جوابی تشریحی مضامین پڑھنے کے بعد اپنے مسلک توسع کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کی تکفیر کے فتویٰ سے رجوع فرمایا،

اس زمانہ میں جب کہ اعتراف حق کبریت احمر ہے، حضرت مولانا تھانوی کی یہ حق پسندی نہایت قابل قدر ہے،

---

ہمارے عزیز بدر الدین چینی صاحب نے مصر سے ہم کو ہمارے چینی بھائیوں کی حمیت دینی کی ایک تازہ مثال لکھی ہے، مشہور انگریز مؤلف ویلز نے اپنی کتاب دی اوٹ لائن آف دی ورلڈ ہسٹری میں اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا، اسکا ترجمہ چینی زبان میں بھی شائع ہوا جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے کمرشل پریس کے مالک کو جس کا پریس چین میں سب سے بڑا ہے اور جو خود بھی بڑا عالم ہے لکھا کہ اس حصہ کو جس میں رسول اللہ صلعم کی شان میں بے ادبی ہے نکال ڈالا جائے اور واقعات کے مطابق وہاں ایک مبسوط حاشیہ لکھدیا جائے، مسلمان اس احتجاج میں نہ صرف کامیاب ہوے بلکہ اس پریس سے اور جتنی تاریخی کتابیں نکلی تھیں ان کی بھی نظر ثانی ہونے لگی، اور صاحب مطبع نے اپنے اثر سے شنگھائی پریس کی کمیٹی جنرل کو بھی آمادہ کر دیا کہ اہل مطبع کو متنبہ کر دیا جائے کہ اسلام کے متعلق جب کوئی مضمون یا کتاب لکھی جائے تو چھپنے سے پہلے انجمن علوم اسلام (شنگھائی) کے پاس بھیجدی جائے، اور اسکی منظوری اور تصدیق کے بعد اس کے چھاپنے کی اجازت دیجائے، ہم بھی اپنے چینی بھائیوں کو ان کی اس حمیتِ دینی پر مبارکباد دیتے ہیں،

---

# مقالات

## سفرِ گجرات کی چند یادگاریں

جولائی ۱۹۳۲ء میں بڑودہ کی مجلس سیرت کے سلسلہ میں مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، اس خطہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں چند خصوصیتیں حاصل ہیں، اول یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، دوسرے یہ کہ عرب سے جو علماء دریا کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے وہ پہلے یہیں اترتے تھے، موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے ہندوستان سے جو علماء عرب جانا چاہتے تھے، وہ اسی راستہ سے سفر کرتے تھے، اس صوبہ کے سینکڑوں دیہات حرمین محترمین کے مصارف کے لئے وقف تھے. دوسرے ملکوں سے جو نادر اور تحفہ چیزیں یہاں آتی تھیں وہ پہلے یہیں پہنچتی تھیں، حج کے لئے ہر سال ہزاروں علماء، امراء اور عام مسلمان اسی راہ سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوتے تھے،

اخیر زمانہ میں سلطان عالمگیر اور سیواجی کی سیاسی کشمکش کا میدانِ جنگ یہی خطہ تھا، اور اسلئے سلطانی لشکر کا پڑاؤ اکثر یہاں رہتا تھا، اور اس تعلق سے یہ صوبہ کبھی پورے ہندوستان کا دارالسلطنۃ بنجاتا تھا، اور ہر قسم کے اہلِ کمال ادھر کا رخ کرتے تھے،

دکن و گجرات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، اور جو ہے وہ ہندؤں کی کثرت

زور و قوت اور سیلاب تمدن میں غرق ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہندوستان کے ملکی مذہبی و سیاسی مرکز یعنی ہندوستان خاص سے وہ بہت دور ہے، اس لئے یہاں کے دیہاتوں اور قصبوں میں مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی، سلطان عالمگیر کی دوربین نگاہوں سے ان وجوہ و اسباب کا نتیجہ چھپا نہ تھا، سلطان نے اس پورے علاقہ میں علماء، صوفیہ، اور مذہبی متعینین کی قطار در قطار آبادی کر دی، مؤذن، خطیب، امام اور ملا، (جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے) موروثی مقرر کر دیئے، اور ان سب کے لئے وظائف اور سرکاری، وقفات معین کئے، جو آج تک ان کے اخلاف کے قبضہ میں ہیں۔ وہاں کے دیہاتوں میں آج تک انھیں ملاؤں کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کر رہی ہے، یہانتک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرانا چاہتا ہے، تو یہ خون انھیں کے ہاتھوں سے کراتا ہے، یہاں اب بھی ایسے سینکڑوں ہزاروں شریف خاندان آباد ہیں، جو انھیں مذہبی فرائض کے لئے یہاں آباد کئے گئے تھے، اور ان کو اس کے لئے سرکاری اوقاف دیئے گئے، جن پر وہ آج تک قابض ہیں، انھیں کے بدولت آج انگریزی سرکار میں بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے، اور مسلمانوں کی کچھ ممتاز صورتیں وہاں نظر آتی ہیں،

**بھڑوچ** | بھڑوچ جس کے کنارے دریائے نربدا بہتا ہے، اور جو آگے چل کر بحر عرب میں مل جاتا ہے، عربوں کے جنگی و تجارتی آمد و رفت کا مرکز تھا، عرب اس کو بروص کہتے ہیں، ۱۲ھ میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں جب اسلام کے ملکی فتوحات کا شباب تھا، ان کے جنگی جہاز اس کے ساحل پر آکر لگے تھے، سفر کے اثناء میں جب میں بھڑوچ پہنچا اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں، اور گو میں شاعر نہیں، تاہم جذبات کے تلاطم نے موزوں ترانہ کی شکل اختیار کر لی،

نربدا اے نربدا! اے جادۂ بحر عرب — گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحر عرب
جانتا ہوں تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز — تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز

تو گذشتہ کا رواں کا نشانِ راہ ہو   ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار   تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہو اسکی یادگار
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو   چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
آج کس کو یاد ہے وہ داستان باستاں   تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں
تو ہے دریائی پری یا شاہدِ عام ہے تو   اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہو تو
تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام   اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑانا ہو کام
اے بھڑوچ! اے خاتمِ انگشتِ دو زیبا   عہدِ ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا
توتیائے چشمِ ظاہر آج تیری خاک ہے   ذرہ ذرہ پر توِ خورشیدِ ذی لولاک ہے
یادگارِ عہدِ خیر القرن ہے تیری زمیں   مطلعِ انوارِ ذی النورین ہو تیری جبیں
چشمِ عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں   تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

یہ ترانہ تال سر اور زیر و بم سے خالی ہے، اس لئے اہلِ وجد و سماع اس پر کان نہ دھریں،

**بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان**

بھڑوچ میں عہدِ عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے جو یہاں مسندِ قضا پر متمکن تھا، اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ جناب قاضی نور الدین شیرازی صاحب ہیں، لبِ دریا ان کا فضیلت کدہ یادگارِ زمانہ ہے، ایک موروثی کتب خانہ ان کے اسبابِ زینت میں ہے، افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب موجود نہ تھے، اس لئے میں خود کتب خانہ کی سیر نہ کر سکا، مگر میرے ایک عزیز نے ان کا کتب خانہ دیکھا ہے، اس کے حسبِ ذیل چند نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا،

**اس خاندان کے چند نوادر کتب**

(۱) شرح مثنوی مولانا روم (؟) جلد پنجم، آخر میں ہے،

"ذو القعدہ سنہ ۱۰۹۰ھ میں بسنت رائے نے قصبہ مجھر ہٹہ سرکار خیر آباد میں تحریر کیا"

(۲) حدائق السحر فی دقائق الشعر[1]، مولفہ محمد بن محمد بن عبد الجلیل العمری المعروف برشید وطواط

[1] یہ کتاب ایران میں چھپی ہے اور ملتی ہے،

آخر میں ہے :-

تم الکتاب بعون الملک الوہاب وحسن توفیقہ علی ید العبد الضعیف

محمد الحافظ الہروی، تحریراً فی یوم الاثنین ثانی عشر من ربیع الاول

سنۃ اثنین وستین وثمانمائۃ الہجریۃ النبویۃ بدار السلطنۃ شیراز تبریزیان

(۳) المحیط السرخسی، جلد ثانی، جمع الامام الہمام مولانا رضی الدین محمد بن محمد بن محمد سرخسی الحنفی، آخر میں ہے:

کان الفراغ من کتابتہ فی یوم الرابع ذو القعدۃ سنۃ ۹۰۹ھ، کاتب علی بن علی

بن رمضان العبادی الشافعی الازہری،

(۴) گلستاں، متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ،

مصنف کے اصل نسخہ سے یاقوت مستعصمی نے اور اس نسخہ سے بحکم جہانگیر سید جلال الدین بخاری نے

اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین ابن سید احمد حسن رضوی نے ۱۲۱۹ھ میں نقل کیا،

(۵) مخازن المعروف جلد ثانی شرح مشکوٰۃ فارسی، از کتاب الزکوٰۃ تا کتاب البیوع، دوسری

تیسری اور چوتھی جلد ہے،

صفحہ اول مطلا ہے، تقطیع کلاں، اس پر خواص خاں غلام فرخ سیر بادشاہ غازی کی مہر ۱۱۲۵ھ ہے

ابو معروف حسین ۱۱۱۲ھ بھی تحریر ہے،

مدرسہ دار الارشاد احمد آباد میں بھی رہ چکی ہے۔

(۶) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاویٰ) مؤلفہ طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری، ناقص از وسط

تقطیع کلاں، مختلف مسخ شدہ مہریں ہیں، آخر میں ہے،

تم کتاب الخلاصۃ من املاء الشیخ محمد بن محمد بن نصر الملہ عوعا نظ

البخاری علی ید افقر عبیدہ محمد المدعو صفی الدین بن محمد الخلیلی

ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد، فی دولة الملک محمد بن مراد ابن سلیم بن سلیمان، بن سلیم بن بایزید، من شہور سنة ثلاث بعد الالف سنہ ۱۰۰۳ھ نقل من نسخة تاریخها یوم الجمعة العشرین من شہر ربیع الاول سنة ثلاث وتسعین وستہ مأتہ، سنہ ۶۹۳ھ

(۷) مجمع البحرین ترجمہ "اپنکھت پرم ہنس" از اتھربن وید، فارسی، شاہ سرمد نے ۱۰۶۷ھ میں سنسکرت سے ترجمہ کیا، کاتب نندرام ولد انت رام خط فارسی نستعلیق، ۱۲ × ۸ تقطیع، صفحات ۸۲،

**ہندوستان کی سب سے پرانی مسجد ہیں**

قاضی صاحب کے عزیز خاص جن کو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب کا خطاب حاصل ہے، وہ موجود تھے، ان کا دولتکدہ بھی گذشتہ جاہ وجلال کا کہنہ مرقع تھا، موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیاروں کی سیر کرائی، ان کی عمارت کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے، جس پر سنہ ۳۰ھ کا یہ کتبہ لگا ہے " ھذہ العمارة القدیمة فی شہور سنہ ۳۰ھ" اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو لگایا گیا ہے، بہر حال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے، یا یوں کہئے کہ محمود غزنوی کے حملۂ گجرات سے چند سال بعد کی ہے جو بہرحال کوئی مستقل فتح نہ تھی،

اس کے بعد اس شہر میں اسلام کی ایک اور قدیم یادگار وہاں کی سنگی جامع مسجد ہے، اس جامع مسجد کی اصل تعمیر کا کتبہ سنہ ۶۵۴ھ ہے، بعد کو محمد تغلق کے عہد میں سنہ ۷۲۱ھ میں دروازہ کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے، یہ گنبد سنگ خارا سے بنایا گیا ہے اور اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے۔

" در عہد دولت سلطان عالم غیاث الدین والدنیا محمد تغلق بمقصد وبست ویک"

غالباً ان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہوگی،

**انکلشور کا ایک خاندان**

بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکلشور نام ہے، جو سورت کے سفر میں کبھی

بیچ کی ایک منزل تھا، یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے، خاندان کے بانی شاہ عبد العلیم صاحب ہیں جو اکبر کے معاصر تھے، ۱۰۰۰ھ میں انھوں نے وفات پائی ہے، ان کی خانقاہ و مسجد یہیں واقع ہے، خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعامدار ہے، موصوف کے پاس خاندان کی پرانی آبرو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے، اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں۔

اس خاندان کے چند نوادر کتب: عربی کتابوں میں سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سال کتابت ۶۰۸ھ ہے، نسخہ بخط عرب شیرۂ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے۔

حقہ کی تاریخ: یہاں ایک مجموعہ میں، ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر پڑیں، جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقہ کے رواج کی تاریخ ہے، یہ تاریخ "ناخوشی نبی" کے الفاظ سے نکالی گئی، جس سے ۱۰۲۹ھ نکلتے ہیں، چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے، اس لئے عجب نہیں کہ تاریخی بیان صحیح ہو، ۱۰۲۹ھ جہانگیر کا عہد ہے،

بنائے سورت کی تاریخ: گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحر عرب سے جا کر ملتا ہے، دریائے تاپتی ہے، اس کے ایک کنارہ پر شہر سورت آباد ہے، اور دوسرے کنارہ پر راندھیر پہلے بحر عرب میں جانے والے جہازوں کا بندرگاہ راندھیر تھا، مغلوں کے شروع عہد میں اس کے بجائے سورت کی آبادی بڑھی اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا، اس قلمی یادداشت میں اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ ۹۳۷ھ نظر آئی، تاریخ کا مصرع یہ تھا، ع

بادآباد بندر سورت،

راندھیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے، اسلام کے قدیم فتوحات میں ہے، اس یادداشت میں اس فتح کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبہ سے حسب ذیل بتائی گئی تھی،

بنا کرد مسجد بجائے کنشت — بر ایوانش انّا فتحنا نوشت
۱۰۹۰ھ

راندیر کی پرانی مسجد | چند دوستوں کی دعوت پر راندیر جانے کا بھی اتفاق ہوا، یہ دولتمند دیندار مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، اور دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قصبہ میں جس قدر خوبصورت، اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدیں دیکھنے میں آئیں پورے ہندوستان میں کہیں نہیں آئیں، ان مسجدوں میں سے ایک قدیم مسجد جونا دوارہ ہے، یادداشت مذکور میں اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی،

گر کسے پرسد ز تاریخ ازیں معبد شریف
گو مسمّیٰ مسجد اعلیٰ و در باب شریف
۹۰۵ھ

گجراتی ہندوی کی بعض کتابیں بھی اس خاندان کے ذخیرہ میں دکھائی دیں، جن میں سے درج ذیل کتابیں ذکر کے قابل ہیں،

لغت عربی و ہندی | عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک لغت ملا جس کے شروع کے چند شعر یہ ہیں،

| | |
|---|---|
| الله خدا ہے کرتار | الخالق آفرید سرجنہار |
| الدنیا کہتی سنسار | الاحمق نادان گنوار |
| الجنت بہشت سرگ | السقر دوزخ مرگ |
| الیوم روز دیس | الشعر موئی کیس |
| اللیل شب رات | القول گفت بات |
| السبیل راہ باٹ | السبع ہفت سات |
| الاسم نام ناؤں | الموضع دیہ گاؤں |
| الظل سایہ چھاؤں | المقام جائیگہ ٹھاؤں |
| الراس سر سیس | العشرین بست بیس |

العین چشم آنکھ — اللحیہ ریش ڈاڑھی
الاذن گوش کان — الورق برگ پان
الطعام خوردن کھان — السھم تیر بان

آخری حصہ:

الفرح خوشی بلاس — القنوط ناامید نراس
الفخذ ران تھی جانگ — الجسم تن ہے آنگ
المورد آب خور دوارا — السمر افسانہ پوارتا
الکدر تیرہ گدلا — النقیم نابینا اندلا

مصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا،

اسی قسم کا ایک عربی لغت برادر عزیز سید نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت میں ہے مگر وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں،

الالہ پرستیدہ پوجیا — المعلوم دانستہ بوجھیا
المحمد ستودہ بکھانیا — المعروف شناختہ پہچانیا
الرسول فرستادہ بھجیا — الواضح روشن ستیا
الآل دودمان کنبہ — العنقود خوشہ لونیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات میں عرب اور ایرانی کثرت سے آیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ہندی سے آشنا کرنے کے لئے اس قسم کے لغت یہاں لکھے گئے ہیں،

رسالہ فقیری چار پیر چودہ خانوادہ — اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہے،

"بدانکہ بوجہ توں یہ رسالہ فقیری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے، باید پوچھے دیکھے وگرنہ تو فقیری نہ کرے،

سوال - اگر تیرے پوچھے کہ اوّل فقیری کیا ہے و آخر فقیری کیا ہے، اور خانہ یعنی گھر فقیری کیا ہے، اور کیلی فقیری کیا ہے، اور لقمہ فقیری کیا ہے،

اسی قسم کے سوال و جواب پر رسالہ کے اکیس صفحے ختم ہوئے ہیں، تصنیف و مصنف کے ذکر سے پوری خاموشی ہے،

رسالہ فقہ ہندی | یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے، آغاز کے اشعار یہ ہیں،

حمد و ثنا سب رب کوں خالق کل جہاں — لائق حمد ثنا ہی کے اور نکو نہ جان

علم شریعت آل دی بھیجا پاک رسول — جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول

یا رب اپنے کرم سوں بیحد بھیج درود — نبی محمد مصطفےٰ تسوں ہوں خوشنود

بھیجو اُن کی آل پر اور اصحاب تمام — تس پیچھو احباب پر بہت درود سلام

کیتے مسئلے دین کے ہید رکھے امین — فقہ ہندی زبان سے بوجو کر و یقین

مطلب مسئلے پوچھنا، جو کچھ ہوئے زبان — عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں، خاتمہ میں تصنیف کا سال ۱۰۷۵ھ بعہد اورنگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے، خاتمہ میں ہے،

فقہ ہندی کوں مومناں کرو زباں یاد — مسائل آویں دین کے کبھو نہ ہوے فساد

سنہ ہزار پچھتر بیچہ ماہ رمضان تمام — اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے جو عربی و فارسی کے بجائے ہندی وزن کی پیروی میں ہے، اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگوں کے زمانہ میں ہندی کس کو کہتے تھے،

داستان حضرت ماہ رمضان | اس نظم میں ماہ رمضان کی فضیلتوں کا ذکر ہے، مصنف کا نام بدیع الدین ہے، شروع کے شعر حسب ذیل ہیں :-

سرنامہ از نام سبحان لکھوں — کہ دل کی ورق پر سبھی کر رکھوں
زباں کو ہے جوہر اسی کی ثنا — اسی کی سو قدرت ہر جگ میں عیاں
کریم و رحیم و وہ غفار ہے — کرم عاصیاں پر کرنہار ہے
زبہ چنیر اس کی صنعت کا بیاں — کہ پیدا کیا جن نے ارض و سما

آخر میں لکھا ہے،

کرو اس کی سب نعمتوں پر شکر — مصیبت کے اوپر حکم ہر صبر
کہ تا عاقبت تیری ہووے بھلی — کہ شادی و غم جگ میں جائے چلی
بہ یع الدین تعریف عمل کی کرو — کہ چھونک کی جس میں توقع دھرو

اس نظم کی خصوصیت خاص فارسی آمیز ترکیبیں، اور قافیوں میں صرف صوتی ہمرنگی ہے اور الفاظ حکم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے جس طرح سندھی میں بولے جاتے ہیں،

**داستان قیامت** اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے،

سخن ہے مرا جوں گل بوستاں — نصیحت کی باتاں سنو دوستاں
بباسی مسلمان کہاتے ہیں دوست — کہ کھاتے ہیں سب گاسے بکری کا گوشت
لباس شریعت کریں تن منیں — شریعت کی باتاں نہ کچھ من منیں
بڑی ریش تسبیح خوش پیرہن — بھری دل میں کئیں بھات کے مکروفن

آخری شعر میں اس نظم کا سال ۱۱۰۰ھ (؟) بتایا گیا ہے،

سنہ ایک ہزار و ستو ترنے سو — لکھی یہ حکایت کتابوں کی رو
بتاریخ غرہ دریں ماہ پیر — باتمام آں شد، مدد دستگیر

**فقہ بین** یہ نظم فقہ کے مسائل میں ہے، آغاز اس طرح ہوتا ہے،

نبام پاک رب العلمین سوں شروع کرتا ہوں میں فقہ مبیں سوں

بحق معجز و مقبول مرسل سبھی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل

مسائل فقہ کے ہیں اصل ایماں جو نیں بوجھے سو وہ کیوں ہوئے مسلماں

اس کے بعد اپنے تمام ۴۰ ماخذوں کا نظم میں ذکر کیا ہے، پہلے ایمان کے مسائل، پھر طہارت، وضو، غسل وغیرہ اس کے آخر میں بدعت کا، اور سجدے کی برائی ہے، آخر میں ہے،

یقیں فقہ المبیں کوں کرتے مختوم بحق دین پیمبر و آل معصوم

صد و ہشتاد و دو و الف ہجرۃ بتاریخ ہمایوں گشت تمت

اگیارا سو میں اسی اوپر دو سنہ ہجری نبیوں کے بتایو

رسالہ کے آخر میں خاتمہ کی عبارت ہے،

"نسخہ قوت دین فقہ المبین تصنیف حضرت شاہ یقین رحمۃ اللہ علیہ"

اس سے مصنف کا نام شاہ یقین، کتاب کا نام قوت دین فقہ المبین، اور تصنیف کا سال ۱۱۸۲ھ معلوم ہوتا ہے،

مثنوی کتخدائی کسی رسم شادی کی تعریف و توصیف میں ہے، رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

ثنا و حمد ہو درگاہ یزداں وو خالق سب کا ہے کیا جن و انساں

ثنا و حمد کے لائق سدا ہو سزاوار وہ خدائی کا خدا ہے

. . . . . . . . . . . . . .

محمد اشرف اولاد آدمؐ حبیب و سرور و سردار عالم

شہ آدمؑ محمد سرور دیں کہ ختم الانبیاء ہیں رہبر دیں

ہوا جس شان میں لولاک وارد دیکھو محبوب کا رتبہ ہے شاہد

اس کے بعد خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور امامین علیہما السلام کی تعریف میں چند شعر

ہیں، اس کے بعد نکاح کا قصہ شروع ہوتا ہے،

شروع کرتا ہوں اب شادی کی تعریف　　نزاکت سیں لکھوں میں اس کی توصیف

ہیا سب کیا سامان اظہر　　لباس و زیور و لولو و گوہر

اس کے بعد ان سرخیوں کے ماتحت چند باب ہیں: در وصف الطعام، در وصف المحل، اور وصف بردن برات، در وصف شہر گشت، در وصف نکاح خوانی، در بیان خلوت، خاتمہ اس پر ہوتا ہے،

سخن کو مختصر کان تک لکھے گا　　یہ ہے طومار آخر کون تھکے گا

بعشرت عیش یا داستانہ واری　　مری یو مثنوی ہے یادگاری

شب بست و دوم از ماہ رجب　　کہ شادی ہور شہر گشت ہے شب

سنہ ہجری دراں وقت بود موجود　　ہزار و یکصد و تسعین و یک بود

آخر شعر سے تصنیف کا سال ۱۱۹۱ھ معلوم ہوتا ہے وزن سے حرفوں کا گرنا اس وقت معیوب نہ ہوگا

وفات نامہ حضرت نبیؐ　آغاز:-

بنا اوّل کروں حمد خدا میں　　زبان اوپر ایس کی ابتدا میں

کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت　　بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

بیچ کا ایک شعر ہے جس میں زبان کا نام دکھنی بتایا گیا ہے،

مجھے توفیق دے یارب کہ بولوں　　بنا ہجر نبی دکھنی میں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں، کتابت کا سال ۱۲۵۱ھ ہجری ہے،

قصہ بانو　اس مثنوی میں ایک قصہ بیان ہوا ہے، جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا، اور اب دکھنی میں اس کو نظم کیا جاتا ہے،

عزیزاں روایت سنو کان دھر　　اوّل فارسی تھی یہ دکھنی دگر

اتھا گودڑہ ایک شہر کا جو نام ۔۔۔ ہمیشہ فسیح کا اتھا واں مقام

بیٹھے ایک دن اس جمعہ مسجد منے ۔۔۔ اتھے خرد و بزرگ او سارے جنے

اُتے میں مسافر نیا آن کر ۔۔۔ سلام علیک کہہ کے بیٹھا اگر

پوچھے سب نے اسکو توں کاں تے آیا ۔۔۔ شہر ہے دور ہے نام محمد حیا

لگا بولنے کوں او یوں سُنکے بات ۔۔۔ زلیخا کا قصہ دونوں کے سنگات

اگر ساری مجلس نے سُنکر کلام ۔۔۔ لگے بولنے آفریں سب تمام

فتح شاعر کا تخلّص ہے، آخر میں ہے،

فتح مختصر کر تو اپنی زباں ۔۔۔ کہاں تک تو لکھے گا اس کا بیاں

زمانہ معلوم نہیں، تاہم اس کے بعض الفاظ، خاص لحاظ کے قابل ہیں، "تھا" اور "تھے" کی جگہ "اتھا" اور "اتھے" "اوتے" کی جگہ "اُتے میں" کی جگہ "منے"، "کہاں" کی جگہ "کاں"، "وہ" کی جگہ "او"۔

قصۂ سوداگر بچہ | یہ نظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان میں ہے، آغاز اس طرح ہے:-

ثنا اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں ۔۔۔ درود اں مصطفیٰ اوپر دل و جاں سیں ہمیشہ متا ہوں

درود اں حمد کے پیچھوں حکایت اک کہوں نادر ۔۔۔ عزیزاں تم سنو اسکوں کہو دل کوں تمیں حاضر

آخر میں تاریخ ہے،

اگیارہ سو اوپر چھپن برس گذرے تھے ہجرت کے ۱۱۵۶ھ ۔۔۔ تبھی تصنیف میں آئے خوارق پیر حضرت کے

توجہ رحمۃ اللہ پر کرو تم اے شہ پیراں ۔۔۔ صفائی باطنی ہووے اسے اے حضرت میراں

خالق باری | ہمارے فارسی و ہندی ادبیات میں خالق باری کی تاریخ ایک معما ہے، اس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشہور ہے، لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس میں شک ہے، تعجب کی بات ہے

کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہیں ملا ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ نظر آیا، لیکن وہ بھی قدیم نہیں رسالہ تاریخ سے معرّا ہے، مگر اس کے نستعلیق خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سوا سو برس سے زیادہ عمر کا نہیں

خالق باری کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ ملتا ہے جو "بدا" یا "بڑا" پڑھا جاتا ہے،

ع واحد ایک، بڑا کرتار، مسلم یونیورسٹی کے سلسلۂ تصنیفات خسرو میں جو نسخہ چھپا ہے، اس میں یہ لفظ "بدا" چھاپا گیا ہے، اور اس کے نیچے "ع" لکھا گیا ہے، لیکن عربی میں "بدا" کرتار کے معنی میں میرے پندار میں نہیں آیا ہے، معلوم نہیں فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونوں کے فاضل ہیں، اس کی سند کیا ہے، موجودہ نسخہ میں یہ لفظ بڑا لکھا گیا، لیکن یہ بھی مہمل ہے، بعض مطبوعہ نسخوں میں "ندا" چھپا ہے، اور شاید یہی صحیح ہو،

زیر بیان نسخہ میں اول تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے، دوسرے یہ کہ افعال اور ضمائر میں قدامت زبان کی جھلک دکھائی دی، یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے جو مطبوعہ نسخہ میں مجھے نہیں ملے،

چوں بہ پرسی خسر پورہ کیست، جو کا بھائی ہے ؛ در خسر پرتی جو کا باپ جن دی جائی ہے
ریخت اندر گوش خود سیماب ڈی بورا بھیا ؛ پنبہ پیچک روئی گالا، (کذا) جسم تن آمد - کیا
داں نہالی بستر و بالیں تکیہ اے جواں ؛ غلط بالا - لیٹ اوپر - اس بچھاؤ گستر آں

حسب ذیل شعر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ ۱۸۹۴ء میں اس طرح چھپا ہے

عطسہ چھینک، شاخ سینگ کفش گر ہو کفش دوز ؛ گازر وخیاط ہے دھوبی و درزی جامہ دوز

پہلے مصرع کا وزن صحیح نہیں معلوم ہوتا، فاعلاتن کا دوسرا اور تیسرا رکن کم ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ غلطی نہیں پھر دوسرے مصرع میں قافیہ دوز مکرر ہے، جو درست بھی نہیں، اور جامہ دوز، تو خیاط اور درزی کے تقابل کے بعد بے معنی سا ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ شعر یوں ہے،

عطسہ چھینک و شاخ سینگ و کفش گر ہو کفش دوز ؛ گازر و خیاط ہر دھوبی و درزی، ویس روز

اسی کے بعد تتمۂ نسخۂ مطبوعہ مرہ ۱۰ میں ہے،

وانکہ بے بخت ست ابھاگ بخت بھاگ     فارسی آمد سرود و ہندوی گوئیند راگ

اس کا پہلا مصرع شروع میں غلط ہے، دوسرا رکن ٹوٹتا ہے، اور تیسرا رکن غائب ہے، چار بار فاعلاتن کے بجائے تین ہی بار ہے. پیش نظر نسخہ میں یہ غلطیاں نہیں

واں کہ بدبخت است ابھاگا بخت در فرسِ ابھاگ     فارسی آمد سرود و ہندوی گوئیند راگ

مطبوعہ نسخہ میں ہے ع طعم سواد، و طعام خورش جو کہئے کھانا، پیش نظر نسخہ میں طعم کی جگہ "مزہ" ہے جو زیادہ بامزہ ہے، مطبوعہ میں ہے،

دُر و مروارید موتی جانئے     ہم صدف سیپی، سمندر آنئے

پیش نظر قلمی میں دوسرا مصرع یوں ہے ع ہم شبدرانی گلے پہچانئے، اس قسم کے اختلافات اور بھی ملیں گے، لیکن اہم چیز ضمیر کا معاملہ ہے، مطبوعہ نسخوں میں لوگوں نے زمانۂ مابعد کی ضمیریں کر دی ہیں، مثلاً قدیم "توں" کی جگہ جدید "تو" بہت پرانی زبان میں متکلم "ہوں" تھا جو اب بھی ہوں سے واحد متکلم کا صیغہ ہے، حضرت خواجہ فرید شکر گنج ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۶۴ھ میں وفات پائی اور امیر خسرو نے جن کی طرف یہ خالق باری منسوب ہے ۷۲۵ھ میں وفات پائی ہے، غرض دونوں کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے، حضرت خواجہ گنج شکر کا جو فقرہ میں نے اپنے مضمون "ہندوستانی" کے عنوان سے شائع کیا ہے اس میں واحد متکلم اور واحد مخاطب کی ضمیریں "ہوں" اور "توں" استعمال ہوئی ہیں، بعینہٖ یہی دونوں ضمیریں پیش نظر نسخہ میں ہیں مثلاً

خواہم گفت کہونگا ہوں خواہم کرد کرونگا ہوں     خواہی آمد آویگا توں خواہی نشست بیٹھیگا توں

خواہم دید دیکھونگا ہوں خواہی دید دیکھیگا توں     خواہم داد دہونگا ہوں خواہی داد دیویگا توں

خواہم دوید دوڑیگا ہوں     خواہی دوید دوڑیگا توں ۔

مطبوعہ نسخہ میں "ہوں" کی جگہ "میں" اور "توں" کی جگہ "تین" ہے،

سفر گجرات کی کچھ اور باتیں بھی بیان کرنی تھیں، مگر دیکھتا ہوں کہ یہ قلمی سفر بھی خاصہ طویل ہو گیا ہے، ہمسفر ناظرین کے ملال کا اندیشہ ہے، اس لئے قلم کی باگ یہیں روک لی جاتی ہے،

# دیوان شمس تبریز اور مولانا روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن

(۹)

بجز در عشق مطلق جان نیسا ریم فسونہاے خرد را ما نہ خوانیم

عقل و عشق کا مقابلہ | حقیقت شناسی اور یافت حق کے دو راستے ہیں، ایک عقلی راہ ہے، اور ایک ایمانی راہ ہے، مصرع

مومن از عشق است و عشق از مومن است

پہلی راہ فلسفہ ہے اور دوسری مذہب،

مذہب کی بنیاد چونکہ غیبی حقائق پر ہے، اس لئے فلسفہ یا عقل کی راہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتی، اس لئے کہ عقل حواس کے تابع ہے، اور حواس عالم شہود کے سوا غیر شہود عالم کا علم حاصل نہیں کر سکتے، اور بظاہر ہمارے علم کے ذرائع حواس ہی ہیں، یافت اور معرفت کی ان دو راہوں میں ایک کا سرمایہ قیل و قال اور شک ہے، اور دوسری راہ کا سرمایہ "علم الیقین" "عین الیقین" اور "حق الیقین"، رموز بیخودی میں بڑی خوبی سے ان کے فرق نوعیت کو ظاہر کیا گیا ہے،

عقل را سرمایہ از بیم و شک است عشق را عزم و یقیں لاینفک است

عقل محکم از اساس چون و چند عشق عریاں از لباس چون و چند

عقل در پیچاک اسباب و علل عشق چوگاں باز میدان عمل

عقل می گوید کہ خود را پیش کن عشق گوید امتحان خویش کن

مولانا کے کلام میں بھی خاص طور پر ان دو راہوں کا مقابلہ اور موازنہ پایا جاتا ہے، اور مولانا نے اس پر بڑا زور دیا ہے، اسلام میں اعتزال وغیرہ کے عقلیہ فرقے پیدا ہوئے، مولانا نے ان کو فتنۂ عظیم سے تعبیر کیا ہے،

سوے مدرس خرد آیند در سوال | کیں فتنۂ عظیم در اسلام شد چرا

اس مقابلہ اور موازنہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

عاقلاں را اندراں غفلت بماں | عاشقاں را چشم معنی برکشا

از سینہ پاک کردم انکار فلسفی را | در دیدہ جاے کردم اشکال یوسفی را

مثنوی میں ارشاد ہوتا ہے،

عقل جزوی عشق را منکر بود | گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود

آفتاب عقل را در سوز دار | چشم را چوں ابر اشک افروز دار

داند آں کو نیک بخت و محرم است | زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

درمیان پردہ خون عشق را گلزارہا | عاشقاں را با جمال عشق بیچوں کارہا

عقل گوید شش جہت حد است و بیرون راہ نیست | عشق گوید ہست راہ و رفتہ ام من بارہا

عاشقاں خستہ دل را در درونہ ذوق ہا | عاقلان تیرہ جاں را در درون انکارہا

عقل گوید پامنہ کاندر فنا جز خار نیست | عشق گوید ہست در تو مایۂ آں خارہا

عشق تو چوں درآمد اندیشہ مرد پیشش | عشق تو صبح صادق اندیشہ صبح کاذب

شمع گیتی بود عقل چارہ گر | شمع را پروانہ کردی عاقبت

آتش دریں عالم زنیم این چرخ را برہم زنیم | ایں عقل پا برجائے را از عشق سرگرداں کنیم

بجز در عشق مطلق جاں نپذیریم | فسونہاے خرد را ما نخوانیم

دل بدست آور کہ حج اکبر است
وز ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است (مثنوی رومی)

دل کی عظمت و اہمیت | عشق، یقین اور ایمان کا تعلق قلب سے ہے، قرآن مجید میں ابراہیم حنیف کے

کمالِ باطن کی تعریف پر ان کے "قلب سلیم" کو نشانِ عظمت ظاہر کیا گیا ہے، حدیث میں ہے، کہ دل ہی انسانی صلاح اور بگاڑ کی کنجی ہے، انسان کی عظمت اس کی قلبی وسعت و کیفیت کی نوعیت پر مبنی ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ انسانی علم و عمل کی طاقت قلبی توجہ پر منحصر ہے، جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا کہ مولانا اس کی اہمیت اور اس کے اعلیٰ مقاصد اور نتائج پر اپنے کلام و پیام میں بیحد زور دیتے ہیں، اس لئے تزکیۂ دل اور تصفیۂ قلب پر بھی بے حد اصرار کرتے ہیں اور اسکی اہمیت کو طرح طرح سے ظاہر کرتے ہیں، تاکہ کثرتِ ذکر اور تکرار تعدید سے سامع اس عظیم الشان حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائے، مثنوی میں فرماتے ہیں،

کاں جمالِ دل جمالِ باقیست　　دولتش از آب حیواں ساقیست
گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است　　من نہ گنجم ہیچ در بالا و پست
در دلِ مومن بگنجم اے عجب　　گر مرا جوئی دراں دلہا طلب

مولانا کی یہ معنوی خصوصیت دیوان میں بھی قائم ہے، دل کو منظرگاہِ حق قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں،

درآ در دل کہ منظرگاہِ حق است　　اگرہم نیست منظر می تواں کرد
دلِ آہن زشوقش نرم گردد　　دل ار سنگ است جوہر می تواں کرد

دل کا تیر راست ہونا چاہئے،

گر کاب قوس جوئی دل راست کن چو تیرے　　در قوس او درآید ہر کو چو تیر باشد

دلِ عاشق کی پرواز دکھائی ہے،

سیمرغ دلِ عاشق در دام کجا گنجد　　پروازِ چنیں مرغے از کون برون باشد

آئینۂ قلب میں صفا ہو تو آفتابِ حقیقت اس میں منعکس ہوگا،

چوں کاہ جنت گل بود آئینہ کے مقبل بود　　چوں کہ جدا گردد زگل آئینہ گردد با صفا

دل راتو میقلے کن تا نقشِ او پذیرد زاں نقشِ بے جہت ایں شش سو منقش آمد

مثنوی میں بھی یہی ہدایت ہے،

آئینہ کز زنگ و آلائش جدا است پر شعاعِ نورِ خورشید خدا است

ولایت اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ اہلِ دل کی صحبت اختیار کیجائے،

گر اولیائے حق را از حق جدا شمردہ گر ظنِ نیک داری بر اولیا چہ باشد

اہلِ دل کی صحبت سے مقصود تک رسائی ممکن ہے،

دلا نزدِ کسے بنشیں کہ او از دل خبر دارد بزیرِ آں درختے رو کہ از گلہائے تر دارد

مثنوی میں بھی اہلِ دل کی صحبت کے فیض کا ذکر جگہ جگہ ہے،

یک زمانہ صحبتے با اولیار بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

دل سے متعلق ایسے اشعار سینکڑوں کی تعداد میں ہیں،

صد آہ شرر ریزے اک شعر دلآویزے (رومی)

جذباتِ عشق | شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ جن احساسات اور قلبی حالات اور کیفیات کو بیان کرنا چاہے اس خوبی سے ان کو ادا کرے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے اس حالت کی تصویر کھنچ جائے اور وہ شاعر کے اس احساس میں شریکِ حال ہو جائے، مولانا کے کلام کی اصل خصوصیت یہی ہے، لذتِ دید کی کیفیت بیان کی ہے،

دل پیشِ رخش چہ رقص می کرد وز آتشِ عشق جان چہ می شد

"چہ رقص می کرد" اور "جاں چہ می شد" میں لذتِ دید اور بے تابیِ شوق کا نقشہ کھینچ دیا ہے،

عشق میں غم سہتے سہتے عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اسے اس میں لطف آنے لگتا ہے، اس حال میں اس کی نظر درد و غم پر پڑتی ہی نہیں، صرف لطفِ محبت ہی کا خیال رہتا ہے، ہر غم کو مسرت سمجھتا ہے، اور

آسانی سے برداشت کرلیتا ہے، اس حالت کو بیان کرتے ہیں،

منگر بسوی دلبار، بنگر عشق و دلار را  غم او لطف لقب کن ز غم و درد طرب کن

رندانِ قدح خوار کا کبھی یہ عالم ہوتا ہے کہ جب وہ خوب پی لیتے ہیں تو پھر انھیں پستی اور بلندی کی خبر نہیں رہتی، حالتِ سرور میں رقصاں ہوتے ہیں، مستی کی اس حالت کا نقشہ مولانا نے اس طرح کھینچا ہے

باز رسیدیم ز میخانہ مست  باز رهیدیم ز بالا و پست

جملہ مستان خوش رقصان شدند  دست زنید اے صنما دست دست

ایک اور شعر ہے،

ز شوقت من ز تن بیگانہ گردم  شرابِ عشق را پیمانہ گردم

دوسرا مصرع بے خودی اور خود فراموشی کی بہترین تعبیر اور تصویر ہے،

عاشق انتظار میں ہے، دیر بے حد ہوگئی، کچھ مایوسی سی دل پر چھاگئی، لیکن یکایک محبوب دلنواز سامنے آگیا، عاشق کی آنکھیں "بتِ بے وفا" کو دیکھتی ہیں، لیکن دل کو اس خوش نصیبی کا یقین نہیں آتا، پھر بار بار نظر کرنے سے یہ شک رفع ہوجاتا ہے، اور جوشِ مسرت سے عاشق اچھل پڑتا اور پکار اٹھتا ہے؛

یار آمد زِ درِ خلوتیان دوست دوست  دیدہ غلط می کند نیست غلط اوست اوست

معشوق پری رخ کو دیکھکر اس کی لطافت و رنگینی کا جو نازک احساس دل میں پیدا ہوتا ہے اس حالت کو الفاظ کے مرقع میں پیش کیا ہے، جس سے آنکھوں کے آگے ایک سماں بندھ جاتا ہے،

روے تو چو نو بہار دیدم  گل را ز تو شرمسار دیدم

دعا مغزِ عبادت ہے، عبدیت کی یہ کیفیت مولانا پہ طاری ہوگئی ہے، اور دعا کا یہ عالم ہوگیا ہے کہ جو دیکھتا ہے وہ بھی دعاگوئی ہی کی درخواست کرتا ہے، عجزِ عبدیت کی اس حالت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے؛

ہمہ دعا شدہ ام من ز بس دعا کردن  کہ ہر کہ دید مرا از من او دعا خواہد

عاشقِ خستہ جان مسلسل محبوبِ سنگدل کی بے توجہی کا شکار رہے، اسے خیال ہوتا ہے کہ محبوب ہمیشہ ناز میں ہے وہ ہمارے نیاز کی حالت کو کیا محسوس کریگا، اسے ہماری جگر کاوی اور دلسوزی کا کیا احساس ہوگا، وہ متمنی ہے کہ خدا کرے خود محبوب بھی کسی کو اپنا مطلوب بنائے اور کسی پر جان دے، تاکہ وہ عاشق کے حالِ زار کو محسوس کر سکے؎ کبھی جلوہ گر ہو خدا کرے ترا ناز میرے نیاز میں، اس حالت کو اس طرح بیان کرتے ہیں،

اے خداوند یکے یارِ جفاکارش دہ ۔۔۔ دلبرِ عشوہ گر و سرکش و خونخوارش دہ

چند روزے ز پئے تجربہ بیمارش کن ۔۔۔ با طبیبانِ دغا پیشہ سروکارش دہ

تا بداند کہ شبِ ما بچساں می گذرد ۔۔۔ دردِ عشقش دہ و عشقش دہ بسیارش دہ

کبھی طلب اس قدر شدید ہوتی ہے کہ باوجود کافی سامان ہونے کے دل سیراب نہیں ہوتا، اور تشنگی رفع نہیں ہوتی، بیچینی ہنوز باقی رہتی ہے، اس کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

شمس تبریزی ہمہ دریائے فضل و رحمت است ۔۔۔ یک جانِ تشنہ زاں دریائے سیراب نیست

ما نورِ خدائیم دریں خانہ فتادہ

(رومی)

ما آبِ حیاتیم دریں جوے روانیم

**شرفِ نفس انسانی** | بنی آدم کی کرامت مسلم ہے، روحانی جماعت انسان کو "آئینۂ ذاتِ حق" سمجھتی ہے؎

ذاتِ ما آئینۂ ذاتِ حق است

لیکن مادہ پرست گروہ بھی بہرحال اس کو سلسلۂ حوادث میں افضل ترین کڑی خیال کرتا ہے، اور کائنات میں مادی ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہی قرار دیا گیا ہے حقیقت کو بے نقاب کرنے والوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلان فرمایا ہے کہ انسان خدائی سانچہ پر ڈھلا ہے، ان اللہ خلق آدم علی صورتہ خود خالقِ عالم کا ارشاد ہے، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، ولقد کرمنا بنی آدم،

مولانا نے انسان کی عظمت و بزرگی پر اپنے کلام میں بے حد زور دیا ہے، یہ شئے مولانا کے کلام کے ان خصوصیات میں ہے جو مولنا کو فارسی کے دیگر غزل گو صوفی شعرا سے ممتاز کرتی ہے، میرا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں نے انسان کے شرف اور بزرگی کو بیان نہیں کیا، بلکہ یہ مولنا کے خاص مضامین شعر میں سے ہے۔ اور انھوں نے اس زور اور کثرت سے اس نقطۂ نظر پر بحث کی ہے کہ دوسروں کے کلام میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ ان کا دیوان انسانی شرف اور تعظیم کا ایک نغمۂ دل افزا ہے، کہیں انسان پر اسکی قدر و قیمت کا اظہار کرتے ہیں کہیں اس کی عظمت اور بلندی کی تصویر پیش کرتے ہیں، اسے غیرت دلاتے ہیں اور نصیحت کرتے ہیں کہ تو "دولت بے بہا ہے اپنا اصل محل اور موقف حاصل کر"۔ ع

تو گوہری کہ کسے را بکف بہائے تو نیست

یہ صفت مولنا کی معنوی خصوصیات میں سے ایک ہے، انسان کی حقیقت اور عظمت کا بیان ہے

ما نور خدائیم دریں خانہ فتادیم ۔۔۔ ما آب حیاتیم دریں جوئے روانیم

ما نور خدائیم دریں خانہ نہانیم ۔۔۔ ما مرغ شگرفیم دریں دام نہانیم

ما نور سمائیم ازاں فضل شمائیم ۔۔۔ ما شاہِ زمینیم و سلیمانِ زمانیم

"زبور عجم" میں اسی بحر میں ایک مؤثر نظم ہے جس کا ایک بند یہ ہے،

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی ۔۔۔ دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمینی تو زمانی ۔۔۔ صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

مولانا فرماتے ہیں:۔

ما مہرِ سپہر لا مکانیم ۔۔۔ برتر ز زمین و آسمانیم

ما برزخِ جامعیم و فاضل ۔۔۔ نے نے کہ بروں ز این و آنیم

ما محرم بارگاہ انسیم — در جام جہاں چو جانیم

ایک اور غزل کے اشعار ہیں،

ما گوہر سر کن فکانیم — ما مردم دیدۂ عیانیم

دستار بہ حضرت جلالیم — ما چشم و چراغ انس و جانیم

ما نقطۂ مرکز زمینیم — ما نکتۂ سر آسمانیم

انسان مسجود ملائک ہے،

اوست مسجود ملائک زانکہ بے ہمتاست او — بارگاہ رفعتش بیرون ز چرخ چنبری

مولانا عظم فرماتے ہیں کہ انسان کو ذلت کی نگاہ سے مت دیکھو،

وجود قابل انسان چو مظہر حق است — مکرمت بدیں واسطہ مبیں خوارش

اس مضمون پر مثنوی میں بھی بیحد زور دیا گیا ہے،

وجہ آدم آئینہ اسماء کند — عکس خود در صورتش پیدا کند

از رو صورت نباید غیر دوست — چوں نظر کردی بمعنی جملہ اوست

مولنا کے خیال میں انسان ابد کے لئے بنایا گیا ہے،

طمع مدار کہ عمر ترا کراں باشد — صفاتِ حق و حق را حد و کراں زکجا

انسان کی منزل ذات کبریا ہے،

ما ز فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم — زیں دو چرا نگذریم منزل ما کبریاست

اسی پر ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے،

شعلۂ درگیر زد بر خس و خاشاک من — مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریاست

(پیام مشرق)

انسان کی منزل نہایت بلند ہے، اس کو کبھی پستی کی طرف مائل نہ ہونا چاہئے،

نہی بر فرقِ جان تاجے بری دل را بمعراجے ۔۔۔ چو خورشیدش برآرانی کہ سبحان الذی اسریٰ

انسان میں بے شمار کمالات چھپے ہوئے ہیں،

دلا زین تنگ زندانہا رہے داری بمیدانہا ۔۔۔ مگر خفتست پائے تو تو پنداری نداری پا

بانگ درا میں ایک شعر ہے جو اس مفہوم کو ادا کرتا ہے،

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ۔۔۔ ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

انسان جب اس قدر با عظمت مخلوق ہے تو مولانا کے نزدیک اس کا نصب العین بھی نہایت بلند ہونا چاہئے، اس کی عظمت اس کے مقاصد کی بلندی ہی سے قائم رہ سکتی ہے،

مناقب العارفین میں لکھا ہے، مولانا نے ایک دن انسان کے بلند نصب العین کے متعلق یہ حدیث سنائی۔ ان اللہ یحب المعالی الامور

دیوان میں انسانی نصب العین متعین فرماتے ہیں،

ہمائی قاف قربم اے برادر ۔۔۔ ہمارا جز ہمائے مصلحت نیست

ز آفتاب و ز مہتاب بگذرد نورم ۔۔۔ چو روئے خود بہ شہنشاہِ دلنواز کنم

عہد حاضر کے پیامبر شاعر اقبال نے انسان کو یہی پیام دیا ہے،

در دستِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے ۔۔۔ یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

مولانا کے نزدیک زندہ دلی کا یہی شعار ہے،

شعارِ زندہ دلاں در طریق گرم رویست ۔۔۔ اگر فسردہ نۂ گرم دار بازارش

مثنوی معنوی میں ایک شعر ہے،

جملہ عالم ہست حاجتمند تو ۔۔۔ تو گدایانہ چہ گردی کو بکو

اسی منشاء اور مفہوم کی ایک غزل دیوان میں ہے، جس میں مولانا کی یہ خصوصیت سخن کامل

طور پر عیاں ہے،

منگر بہر گدائے کہ تو خاص از ان پاکی مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گرانبہائی

بعصا شگاف دریا کہ تو موسیٔ زمانی بدر آں قبائے مہ را کہ تو نورِ مصطفائی

بخراش دست خوباں کہ تو یوسفِ جمالی چو مسیح دم فرو دم کہ تو نیز از ان ہوائی

بصف اندر آئی تنہا کہ سفندیارِ وقتی درِ خیبرست برکن کہ علیِ مرتضائی

بستاں ز دیو خاتم کہ توئی بجاں سلیمان بشکن سپاہ اختر کہ تو آفتاب رائی

چو خلیلؑ در آتش کہ تو خالصی و دلکش چو خضر ز آب حیواں کہ تو جوہرِ بقائی

تکسیل زبے اصولاں مشنو فریب غولاں تو ز فیضِ ذوالجلالی تو ز پرتو خدائی

تو ہنوز ناپدیدی کہ جمال خود ندیدی سحرے چو آفتابی ز درونِ خود برآئی

شدہ غلام صورت بمثال بت پرستان تو چو یوسفی ولیکن سوئے خود نظر نداری

بخدا جمال خود را چو در آئینہ ببینی بتِ خویش ہم تو باشی بکسے گذر نداری

من کان للہ فکان اللہ لہٗ

**رنگ بقا، سرِ خودی اور رمزِ بے خودی**

حضرات صوفیائے کرام کے نزدیک سلوک الی اللہ کی دو حالتیں ہیں، ایک حالت کو فنا فی اللہ اور دوسری کیفیت کو بقا باللہ کہتے ہیں، جب بندہ عبد کامل بنتا ہے اور اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں کمال عجز کے ساتھ پیش کرتا ہے یعنی

لن تنالوا البر حتی تنفقوا ہرچہ داری صرف کن در راہِ او

پر عمل کرتا ہے تو اسے حالتِ فنا کہتے ہیں، اس منزل میں سالک پر مسکینی عجز اور شکستگی طاری رہتی ہے، اس نسبت کی طرف اس کی توجہ رہتی ہے،

لیکن جب بندہ فانی بنکر خدائے شکور و غیور کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے، تو ادھر سے کمالات

کی تجلی ہوتی ہے،

چوں ازو گشتی ہمہ چیز از تو گشت　　　چوں ازو گشتی ہمہ چیز از تو گشت

فانی پر بقا کا پرتو پڑتا ہے، اس مرتبہ میں سالک کا حال مختلف ہوتا ہے، اس پر عظمت و جلال کا وہ دبدبہ چھایا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس نسبت کے آگے دنیا ے دوں کی بڑی سے بڑی قوت اور شوکت کو ہیچ سمجھتا ہے، بڑے بڑے صاحبان شوکت لرزہ براندام ہو جاتے ہیں، ع

بے نیازی نازہا دارد بسے

جب اس نسبت کا استحکام ہو جائے تو کائنات کی ظاہری اور باطنی قوتیں تابع ہو جاتی ہیں، اسی حالت کو دوسرے الفاظ میں خودی اور بے خودی سے تعبیر کرتے ہیں، اور عالم فراق اور حالت وصال بھی کہتے ہیں،

افلاکی کا بیان ہے کہ

" روزے در تفسیر این آیت معنی غریب بیان کرد کہ حق تعالیٰ کل شیٔ ہالک الا وجہہ فرمودہ است، نہ افست کہ مدح خود می کند و بر بندگانش از قدم بقا تفاخر می آرد کہ من باقیم شما فانی بلکہ دعوت رحمت می کند کہ بکلی در من مستہلک شوید تا در وجہ کریم ما کہ "الا وجہہ" باقی و ابدی شوید،

کل شیٔ ہالک الا وجہہ　　　چوں نۂ در وجہ او ہستی مجو

ہر کہ اندر وجہ او باشد فنا　　　کل شیٔ ہالک نبود جزا

زانکہ در الا ست او از لا گذشت　　　ہر کہ در الا ست او فانی نگشت

مولانا نے "کل شیٔ ہالک الا وجہہ" کی یہی تفسیر فرمائی ہے،

بعض سالکان راہ پر ایک آن میں دونوں تجلیات ہوتے ہیں، مولنا کا یہی قول ہے،

گہ جانب شہر بقا گہ جانب دشت فنا

حضرت شمس کے متعلق فرماتے ہیں،

شمس گر گشت فانی بالذات در فنا ہا بقاست تا دانی

مولنا پر نسبت بقار کا غلبہ رہتا تھا، چونکہ ان کا کلام ان کے وجدان اور حال کا آئینہ ہے، اسلئے اس میں وہ جلال، بلند آہنگی، زور، اور وجد ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بجلیاں ہیں کہ چمک رہی ہیں، بادل ہیں کہ گرج رہے ہیں اور جھوم جھوم کر برس رہے ہیں، مولنا کی غزلیات کی یہ خاص صفت ہے، یہ کیفیت اس رنگ میں شعرا میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی، نہ خسرو کی غزل میں یہ رنگ ہے نہ حسن کے کلام میں، نہ بلبل شیراز کے نغموں میں یہ زور ہے، نہ عراقی کے ساز میں یہ بلند آہنگی ہے، نہ سعدی کے بیان کا یہ طرز ہے، مولنا اس خصوص میں سارے صوفی شعرا سے ممتاز ہیں،

یہ انکے کلام کی ایسی خصوصیت ہے کہ خود مولانا نے بہ نفس نفیس اس کا اظہار فرمایا ہے۔

مناقب میں ہے کہ حضرت مولانا نے سراج الدین تبرزی سے فرمایا کہ

"حکیم الٰہی خواجہ سنائی و خدمت فریدالدین عطار قدس اللہ سرہما بس بزرگان دین بودند، لیکن اغلب سخن از فراق گفتند اما ہمہ از وصال گفتیم" (مناقب العارفین صلہ)

کلام پڑھ کر اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس میں لذت امروز اور جوش فردا دونوں ہیں،

بزبان ربانی رمز بقا کا اظہار فرمایا ہے،

چون خلیل من شدی ز آتش مترس کہ من از آتش گلستانت کنم
بر گلویت تیغہا را دست نیست گرچہ اسمٰعیل قربانت کنم

ان اشعار میں من کان للہ فکان اللہ لہ کی تفسیر فرمائی ہے،

چو جان زار بلا دیدہ با خدا گوید کہ کس بجز تو ندارم چہ خوش بود بجدا
جوابش آید آزان سو کہ من ترا زین پیش ہیچ کس نہ گذارم چہ خوش بود بجدا

عبدیت کی چند روزہ "چاکری" سے باقی رہنے والی شاہی نصیب ہوتی ہے،

دو سہ روز شاہیت را چو شدم بصدق چاکر ۔۔۔ بجہاں نماند شاہے کہ او چاکرم نیامد

رہ فنا ہی سے در بقا تک رسائی ہوتی ہے،

خمش کن و بشنو از قائلانِ روحانی ۔۔۔ رہ فنا چو بہ بندی در بقا بگشاد

نسبت بقا کا جوش ملاحظہ ہو، ع

چو در کفِ سلطاں شدم یک ذرہ بودم کان شدم

نیست کردم ننگِ ہستی را تمام ۔۔۔ تاکہ بر زینِ بقا محکم شدم

کاسۂ پر مہر بودم دست در عیسیٰ زدم ۔۔۔ خام دیدم خویش را در پختۂ آویختم

چو بہ سایۂ آفتاب رفتم ۔۔۔ گہہ کاستم و گہے فزودم

خاموش کہ عاقبت مرا کار ۔۔۔ محمود بود چو من ایازم

دولت عشق ہی سے انسان دولت پایندہ اور مردہ سے ابدی زندہ بنجاتا ہے،

مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم ۔۔۔ دولت عشق آمد و من دولت پایندہ شدم

ز شمس الدین تبریزی نگارا ۔۔۔ وسے کو مست شد ہشیار باشد

طبیعت کا جوش اور نسبت بقا کا زور ملاحظہ ہو،

گفتند یافت نیست کہ بس جستہ ایم ما ۔۔۔ گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

باز از پستی سوئے بالا شدیم ۔۔۔ طالب آں دلبر زیبا شدیم

ما دل اندر راہِ جاں انداختیم ۔۔۔ غلغلے اندر جہاں انداختیم

مرزا غالب مولانا کے ایک شعر پر جس میں جوش بقا کا اظہار ہے سر دھنا کرتے تھے،

بہ زیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند ۔۔۔ فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

گر تو خواہی وطن پر از دلدار
خانہ را رو تہی کن از اغیار (رومی)

توحید | مولانا نے مثنوی میں تصوف کے مسائل اور معارف تفصیل سے بیان کئے ہیں، کیونکہ وہ دور تمکین کی تصنیف ہے، لیکن دیوان میں صوفیانہ مسائل معارف اور علوم کی نہیں بلکہ صوفیانہ جذبات اور احساسات کی پرجوش ترجمانی ہے، تصوف کی بنیاد مسئلہ توحید پر ہے، صوفی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ہر طرح ایک کا ہو رہے، توحید کے معنی یہی ہیں کہ انسان ماسوائے اللہ سے آزاد ہو جائے سوائے حق کے نہ کوئی اسکا معبود ہو نہ مقصود ہو، موجود ہو نہ مشہود ہو[1]،

ہر کہ پیماں با ہو الموجود بست | گردنش از بند ہر معبود رست

اس کی زندگی اور موت صلوٰۃ و قربانی صرف ذات واحد کے لئے ہو، باطنی ترقی اور مذہب کا نصب العین یہی ہے، زندگی کے اسی رنگ کو صبغۃ اللہ کہتے ہیں، قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، ابراہیم اسی توحیدی مسلک کے باعث "حنیف" کہلاتے ہیں، سارے روحانی امراض اور اخلاقی خبائث کا واحد علاج توحید ہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی مسلک کی پیروی اور تکمیل کا منصب عطا ہوا،

اہل حق را رمز توحید از براست | در اتی الرحمٰن عبدا مضمراست
دیں از و حکمت از و آئیں از و | زور از و قوت از و تمکیں از و
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد | عاشقاں را بر عمل قدرت دہد
ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ | ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ

[1] اس کا یہ مطلب نہیں کہ مخلوق (محسوسات) کی نفی قطعی کی جائے، بلکہ یہ کہ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی وجود ذاتی خارجی نہیں رکھتا، ساری مخلوق صور علمیۂ الٰہیہ ہے اور غیر حق ہے، اور وہ موجود موجود حق ہوئے ہیں ھو الاول والاٰخر والظاہر والباطن وھو بکل شیء علیم،

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
ماسلا نجم وز و لا ور خلیل از "ابیکم" گیر اگر خواہی دلیل
تیر خوش پیکانِ یک کیشیم ما یک نمائیک بین، یک اندیشیم ما

(رموز بیخودی)

مثنوی معنوی میں مسائلِ تصوف کی روحِ اعظم یہی مسئلہ ہے،

چیست توحید خدا آموختن خویش و احد خویشتن را سوختن
گر ہمی خواہی کہ بفروزی چو روز ہستیِ ہمچون شب خود را بسوز
دو گو و دو مدان و دو مخواں بندہ را در خواجۂ خود محو داں

دیوان میں مسئلۂ توحید یعنی ایک کے ہو رہنے پر مولانا نے بیحد زور دیا ہے اور اس میں جوش اور غیرت و لانے کا ان کا جو خاص انداز ہے، وہ ہر جگہ نمایاں ہے،

صوفی شعراء میں، اگرچہ ہر ایک نے اصولاً اسی مسئلہ کو بنیاد ٹھہرایا ہے لیکن ان جذبات کا اظہار ان کے کلام اور ان کے بیان کا جزوِ اعظم نہیں ہے، مثلاً جامی کا رنگ زیادہ تر نعتیہ ہے، سعدی، خسرو اور حافظ نے پیرایۂ مجاز اختیار کیا ہے، خواجہ حافظ فرماتے ہیں،

از دل و جاں شرفِ صحبتِ جاناں غرض است ہمہ این است وگرنہ دل و جاں این ہمہ نیست

ان کے کلام میں یہ مضمون بکثرت نہیں آتا، جیسے اور مضامین آتے ہیں،

البتہ عراقی اس خصوص میں ایک حد تک مولانا کے ہمرنگ ہیں،

مرا جز عشقِ تو جانے نمی بینم نمی بینم دلم را جز تو جانانے نمی بینم نمی بینم

لیکن دونوں کا اسلوبِ ادا بالکل جداگانہ ہے،

مولانا کے دیوان میں خیال اور بیان کے زور اور جوش کی روح یہی مسئلہ ہے، اس گلزارِ توحید کے چند پھول ملاحظہ ہوں،

ایک کا ہو رہنا،

از بہر خدا عشق دگر یار مدارید — در مجلس جاں فکر دگر کار مدارید

یار دگر و کار دگر کفر محالست — در مذہب حق مذہب کفار مدارید

مولانا کے نزدیک ظہور کثرت کا مقصد ہی حصول توحید ہے،

اے از جمال حسن تو عالم نشانہٗ — مقصود حسن تست دگر ہا بہانہ

اگر عکس غیر آب حیات میں بھی ہو تو مولنا کے نزدیک ہیچ ہے،

ہر آں آبے کہ در روے عکس غیراست

اگر آب حیات است آں نشاید

بیگانگی خار عشق ہے،

ہر چہ غیر خیال معشوق است — خار عشق است اگر بود گلزار

خار بیگانہ را تو یکسو کن — خار گل را بجاے دل می دار

گر تو خواہی وطن پر از دلدار — خانہ را رو تہی کن از اغیار

مولنا کو صرف جمال حق منظور ہے، اور وہی مشہود ہے،

مرا غیر تماشاے جمالت — نباشد در جہاں خود کار دیگر

کائنات کے سارے مشاغل سے عشق حق اپنے لئے انتخاب کیا ہے،

از جملہ جہان و عیش عالم — من عشق تو اختیار کردم

اس اعلیٰ نسبت کے بعد ادنیٰ نسبت کی طرف توجہ نہیں ہوسکتی،

چونکہ کمر بستہ ام بہر چناں مہے بجد

از پئے ہر ستارۂ ترک قمر چرا کنم

ترکِ شہودِ حق — توئی آفتاب چشمم بجمال تست روشن،
اگر از تو باز گردم بکہ چشم باز دارم،

ہمہ جہاں تو بینم چو چشم باز کنم — ہمہ شراب تو نوشم چو لب فراز کنم
بایں بہانہ درین بزم محرمے جوئیم، — غزل سرائیم و پیغام آشنا گوئیم

**پیغام گوئی** عہد جدید میں پیغام گوئی شاعری کی ایک خاص نوع سمجھی جاتی ہے اور اسکی آجکل علمی اور ادبی حلقوں میں اہمیت بھی بہت زیادہ ہے، جب شاعر کا کلام سامنے آتا ہے، تو اس کے دفتر معنی میں یہ تلاش کیا جاتا ہے کہ آیا اس نے زندگی کے متعلق کوئی خاص نصب العین اور کوئی خاص تصور پیش کیا ہے، یا نہیں، اس کے پاس بنی نوع کے لئے کوئی خاص پیغام بھی ہے یا نہیں، جس کسی شاعر کے کلام میں یہ صفت پائی جاتی ہے، اسے پیغام گو اور اس شاعری کو پیغام گوئی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے،

اردو میں اکبر اور اقبال دو زبردست پیغام گو شاعر ہیں، اسی بنا پر ایک کو ترجمانِ حقیقت اور دوسرے کو لسان العصر کہتے ہیں، چونکہ اس دور میں شاعری کے اس رنگ کی قدر ہے، اس لئے اس رنگ کی اہمیت محسوس کیجا رہی ہے، سوال یہ ہے کہ پیغام گوئی کی تعریف کیا ہے،

کہا یہ جاتا ہے کہ جب کوئی شاعر زندگی کے بنیادی حقائق، اور عروجِ انسانی کے اساسی اصول کو موزون اور پر اثر کلام کی صورت میں بطور پیام پیش کرے، اور مخاطب کے لئے خیال اور عمل کی ایک مخصوص راہ منتخب کرے، تو اس قسم کی شاعری کو پیام گوئی سے موسوم کیا جاتا، اور شاعر اسی روشنی میں پیغامبر کہا جاتا ہے، اسی نقطۂ نظر سے گرامی مرحوم نے علامہ اقبال کے متعلق لکھا ہے،

در دیدۂ معنی نگہان حضرتِ اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتوان گفت،

لیکن اس سے اخلاقی پند و نصائح کی وہ صورت خارج ہے، جو بوستان وغیرہ میں پائی جاتی ہے، یا اردو میں مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی کی نظموں میں ہے،

فارسی شاعری کہ صوفی اور رند مشرب شعرار کے منظومات مین اپنے اپنے مشرب کے مطابق کچھ نہ کچھ ایسا پیام ملتا ہے شلاً عطار اور عمر خیام کا کلام لیکن وہ اتفاقیہ ضمنی یا غیر شعوری طور پر ہی جس کسی کے کلام مین حقائق کی ترجمانی ہے تو وہ بصورت پیام نہین، برخلاف اس کے مولانا کے کلام مین یہ رنگ غالب ہے اور مولانا نے عمداً یہ رنگ اختیار کیا ہے، شاعری اوھون نے اسی لئے اختیار کی ہے، ان کے لئے غزل یا مثنوی صرف ایک بہانہ ہے، جس کے ذریعہ سے انھین پیام آشنا محرم راز یا گوش آشنا تک پہونچانا مقصود ہے، جامی نے اون کے متعلق بالکل یہ کہا ہے، کہ ع

نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

شاعری انھین اس لئے ملی ہے کہ اون کا پیام جذباتی رنگ کے ذریعہ لوگون کے دلون تک پہونچ جائے، ان کی شاعری ان کے پیغام کے تابع ہے، اس کی تاریخی شہادت ہم نے پچھلے مباحث مین درج کر دی ہے،

پیغام گوئی کے نقطۂ نظر سے مولانا ے روم اس زمانہ سے دور حاضر تک فارسی زبان کے سب سے بڑے پیغام گو شاعر ہین،

البتہ اس دور مین ڈاکٹر اقبال ہی فارسی کے ایک ایسے شاعر ہین، جنھون نے مولانا کے کلام کی اس خصوصیت کو کامل طور پر محسوس کیا، اور اس کے قدر شناس ہین، اس رنگ کو خود اونھون نے ایک خاص مجتہدانہ طریقہ پر حیرت انگیز ترقی دی ہے، اسرار خودی مین اقبال نے اس کا اقرار کیا ہے،

بازبر خوانم زفیض پیر روم دفتر سربستۂ اسرار علوم
جان اُو، از شعلہ ہا سرمایہ دار من فروغ یک نفس مثل شرار
پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
موجم و در بحر او منزل کنم تا دُر تابندۂ حاصل کنم،

من کہ مستیہا ز صہبایش کنم،

زندگانی از نفسہایش کنم،

بمصداق خشتے نمونہ از خروارے مولانا کے پیامات کی طرف توجہ کیجاتی ہے، مولانا مادی ذہنیت اور مادی زندگی کے سخت مخالف ہیں، وہ انسان سے مخاطب ہوکر یہ پیام دیتے ہیں کہ تیری ہستی اشرف ترین خلائق ہے، تو صرف ادنیٰ چیزون پر کیون نظر کرتا ہے، اور قانع ہوتا ہے،

حرص کا، وجہ اد و تیران درآب و گل　　　تا نمانی زآب و گل مانند خرا ندر خلاب

چون بسگ نان افگنی سگ بو کند آنگہ خورد　　　سگ نہ شیری چہ باشد بہر آن چندین شتاب

---

عشق حق است و عاشق است کہ باقیست تا ابد　　　دل برجہد منہ کہ بجز مستعار نیست

**حیات و پیغام طرب،** مولانا صاحب ولایت ہین، ولایت اور حزن و خوف مین تضاد ہے، چنانچہ قرآن مجید مین وارد ہے، الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون، بندۂ مسلم طریق رضا اور راہِ ہستی مین کوکب درخشان کی طرح تبسم بر لب گذر جاتا ہے، غیر اللہ کا خوف آزادانہ عمل کا دشمن ہے، اور یہی حریت اور زندگی کے میدان مین راہزنی کرتا ہے،

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر　　　از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

قوتِ ایمان حیات افزایدت　　　وردِ لا خوف علیھم بایدت

چون کلیمے سوے فرعونے رود　　　قلبِ او از لا تخف محکم شود

گر خدا داری ز غم آزاد شو،

از خیالِ بیش و کم آزاد شو،

(باقی)

# نطشے

از جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمن صاحب ایم اے جامعہ عثمانیہ

یہ مضمون پروفیسر ایف ایس شلر کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو اونھون نے کوارٹرلی ریویو بابتہ جنوری ۱۹۳۱ء مین لکھا تھا اور بعد مین اون کی کتاب (.......) مین بصورت باب نہم شائع ہوا۔ (مترجم)

تقریباً چالیس برس قبل فریڈریخ نطشے پاگل خانے مین داخل کیا گیا، جہان سے موت کے ہاتھون نے اسے باہر نکالا، اس تمام عرصے مین براعظم پر بہ حیثیت پیغمبر اس کی شہرت روز افزون رہی، جنگ عظیم کے شروع ہونے کے وقت چند فلسفیانہ مزاج شاہ پسنے دنیا کو خود اپنی ہستی سے واقف کرانے کی استعداد کی کوشش کی جس مین اونھون نے قیصر ولیم ثانی کے عہدِ حکومت مین جرمن حکمت عملی کی تمام پریشان خیالیون کی روحانی ذمہ داری نطشے کے سر تھوپنی چاہی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس تمام کوشش کے باوجود نطشے کی تعلیمات نے انگلستان مین جڑ نہ پکڑی، اس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ خیالات و افکار کی دنیا مین برطانوی تفکرات کی تنگ دلی نہین تو علٰحدگی ایک بالکل حقیقی واقعہ ہے، سر دست ہم کو اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہین، کہ یہ علٰحدگی طبعی ہے یا کسبی، یا یہ کہ یہ تفکر کی ان ندرتون کے خلاف ایک نازک تعصب کا نتیجہ ہے جو ایک ایسے نظامِ تعلیم کی قدامت پرستی سے پیدا ہوتی ہین جو اگر ناکام رہتا ہے، تو کلی تصورات من حیث ہی کی طرف سے ایک نہایت عمیق بے اعتمادی کا باعث ہوتا ہے، اور اگر کامیاب ثابت ہوتا ہے تو ارسطو کو اب بھی فلسفیانہ تفکر و تدبر کا پہلا اور آخری نمونہ ظاہر کرتا ہے، لیکن اب نطشے سمندر کو عبور کر کے انگلستان مین داخل ہو چکا ہے، لہذا اوسکی تصانیف اوسکے پیشروون یعنی کانٹ اور ہیگل کی تصانیف کے مقابلے مین بہت زیادہ اور اچھی طرح سمجھ کر پڑھی

جائین گی، کانٹ اور ہیگل تو اس سے آگے نہ بڑھ سکے کہ ان کے نام کا بجرن اور یونیورسٹیون کے تربیت یافتہ
فلسفیون کے ہاتھون مین عوام کالانعام کو مرعوب کرنے کا آلہ بنجائین، اس کے برعکس نٹشے کی تحریر
زوردار ہوتی ہے، اور سیدھی مطلب پر پہونچتی ہے، مدت العمر کے مطالعے کے بغیر بھی اس کی تحریر پڑھی
اور سمجھی جا سکتی ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اس کے خیالات کردار پر اثر آفرین ہون، جن خیالات کا وہ
وکیل ہے، ان کو کبریائیا[1] کے مریض کی پریشان خیالی کہہ کر حقارت کے ساتھ ہونٹ پچکانا تو بہت سہل
ہے لیکن دنیا کی موجودہ حالت مین وہ متعدی ثابت ہو سکتے ہین؛ اور اگر کچھ دن اور دنیا کی یہی رفتار
رہی تو فوق الانسان[2] کا عقیدہ عمرانی کرشے کے عقیدے کے مقابلے مین زیادہ مرجح معلوم ہوگا،

(۱)

لہذا ہم کو یہ خیال دل سے فوراً نکال ڈالنا چاہئے کہ زندگی کے متعلق نٹشے کی رائے جنون محض ہے
اس لئے ناقابلِ التفات ہے. نوعِ انسان کی تاریخ مین نئے خیالات و افکار کی پیدایش اس قدر نادر
واقعہ ہے کہ ہم اون خیالات و افکار کو نظر انداز نہین کر سکتے، خواہ اون کی پیدایش ایک بالکل غیر متوقع
مقام ہی مین ہوئی ہو، علاوہ ازین ولیم جیمس نے ہمین بتایا ہے کہ "طبی مادیت" (medical materialism)
یعنی کسی مصنف کی فعلیاتی (physiological) حالت سے اوس کے خیالات و
افکار کی تخمین و تقدیر کا عقیدہ بالکل سست بنیاد ہے، اب یہ یقین کر لینا بہت دشوار ہے کہ چونکہ ایک مصنف
فاتر العقل تھا، لہذا اوس کے خیالات بھی بعید از عقل ہین، یا چونکہ یہ خیالات بعید از عقل ہین، لہذا اونکی
کوئی قیمت نہین، اور اس سے بھی کمتر یہ کہ ان کی کوئی اہمیت نہین، یہ قول کہ ہر نادر طبیع
genius شخص فاتر العقل ہوتا ہے، بلاشبہ اتنا ہی غلط ہے، جتنا یہ قول کہ ہر فاتر العقل

---

[1] جنون کی ایک قسم ہے جس کا مریض اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا ہو، انگریزی مین اوس کو megalomania
کہتے ہین، [2] Superman کسی نے انسان کی تعریف کی ہے کہ "یہ بندر کی وہ نوع ہے جس کو کبریائیا کا مرض ہے" (مترجم)

شخص نادر طبع ہوتا ہے، اکثر فاتر العقل اشخاص بالکل کند ذہن ہوتے ہین، لیکن نادر طبع اشخاص کی ایک خاص
صنف بہ ظاہر فتور عقل سے بہت قریب ہوتی ہے، اور تہذیب و تمدن کے بعض پہلو کسی ذی فکر انسان کو
فاتر العقل بنانے کے لئے کافی ہین، بالعکس یون کہا جا سکتا ہے، کہ فاتر العقل اشخاص چونکہ رسمی تمدنات
و تقدیرات کی گرفت مین بہت کم ہوتے ہین، لہذا بعض اوقات وہ نادر طبع اشخاص کے جوہر ان جانچنے
والے اور ان کو سب سے پہلے معلوم کرنے والے ہوتے ہین، چنانچہ کوئی لکھا پڑھا شخص اس واقعہ کو نہین
بھول سکتا کہ دنیا کو واگنر (Wagner) کی موسیقی کی عمدگی کا یقین دلانے کے لئے ایک
مخبوط الحواس بادشاہ کی ضرورت تھی، علاوہ ازین یہ مسئلہ بھی حل طلب ہے کہ ایسا بری عن الخطا حکم کہان سے
آئیگا، جو خیالات و افکار کی صحت و استقامت پر حکم لگائیگا؟ فلسفہ اور مذہب کے عقائد اس قدر متباین
ہوتے ہین کہ ہر شخص یہ شبہہ کرنے پر مجبور ہے کہ خود اوس کے علاوہ باقی تمام دنیا فاتر العقل ہے پھر ہم
قطعیت کے ساتھ یہ بھی ثابت نہین کر سکتے کہ ہم سب فاتر العقل نہین ہین، بلکہ یہان تک کہا جا سکتا ہے
کہ معائنے کے بعد غالباً معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ مشہور اشخاص کا ایسے عقائد پر ایمان ہوگا، جن کو تمام
دنیا، یا خود اون کے علاوہ باقی سب پاگل پن کہین گے،

(۲)

نطشے کی تصانیف کو تنقیدی نگاہ کے ساتھ چھان بین کرنے کی ضرورت ہے، یہ نہ صرف اس لئے
کہ آخری زمانے مین اس کی حالت بہت زبون ہو گئی تھی، بلکہ اس حیثیت سے بھی، جو مصنف نے
ان تصانیف کو دی ہین، نطشے اپنے خیالات کو چھوٹے چھوٹے مقولون کی صورت مین بیان کرنا مرجح
سمجھتا تھا، اور یہ غالباً اس کے کام کرنے کے خاص طریقے کا نتیجہ تھا، لیکن ایسے مقولے طبعاً استبعاد
اور مبالغے کی طرف لیجاتے ہین، لہذا اس کی تصانیف پر حکم لگاتے وقت ان کے اثرات کو خارج
کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، تاہم اس نے اپنی تصنیف "Will to Power"

(جس کو وہ اپنا شاہکار بنانا چاہتا تھا) کے جو مسودے اپنے پیچھے چھوڑے ہین، ان سے خصوصیت کیساتھ معلوم ہوتا ہے کہ تصنیفی مشاغل کے آخری زمانے مین وہ اپنے خیالات کو باقاعدگی کے ساتھ ظاہر کرنے کی طرف بہت زیادہ مائل ہوگیا تھا، ان ہی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے مقولون نے انداز اظہار کی مخصوص صورت اختیار کرلی تھی، نہ کہ نفسیاتی ضرورت کی، اور یہ کہ اس کے خیالات اس سے کہین زیادہ مربوط تھے، جتنا کہ وہ بظاہر معلوم ہوتے تھے،

(۳)

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ نطشے نے اپنی قابلیت کے اندازہ کرنے مین مبالغے کی وجہ سے اپنی تصانیف کو مسخ کردیا ہے، اس نے تنہائی مین اس قدر زمانہ گذارا ہے کہ نسبت کا جو احساس اس مین تھا بھی وہ بھی مفقود ہوگیا، اپنی خود نگاشتہ سوانح عمری مین جس کو وہ اپنے مخصوص انداز مین ( EccE homo) کے نام سے موسوم کرتا ہے، اس نے اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے کی ایک مجنونانہ کوشش کی ہے، اس لئے اس مین کبر یا نیا کا اظہار ضرورت سے زیادہ ہے، ہم مین سے ہر شخص کا خود اپنے متعلق ان لوگون کے مقابلہ مین اعلیٰ رائے رکھنا، جو ہمارے کام سے بہت کم واقف ہین، اور خود اپنا اندازہ اپنے کامون سے نہین، بلکہ اپنی صلاحیتون سے کرنا، ایک طبعی امر ہے، اور کش مکش حیات کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے شاید ضروری بھی ہے، اس سے کوئی خود نگاشتہ سوانحعمری یقیناً بیکار نہین ہوجاتی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس نفسیاتی دلچسپی مین اضافہ ہوجائے لیکن نطشے کی خود نگاشتہ سوانحعمری نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت مایوس کن ہے، اس سے اس کی سیرت اور اس کے تفکر کی پیدایش و ترقی پر بہت کم روشنی پڑتی ہے، اس مین ایک نافہم دنیا کی غفلت پر اس پیغمبر کی ناراضگی کا اظہار ہوا ہے، اس سے ہمارے اس استعجاب کی تشفی نہین ہوتی کہ ایک جرمن پروفیسر نے علم کی نمود کے خلاف کیون اور کس طرح علم بغاوت بلند کیا، اس سے یہ بھی معلوم نہین ہوتا

کہ ایک جرمن پادری کا لڑکا جس کی تمام تربیت شولپ فورٹا (Sch[illegible]) (جو
گویا اون جیسٹر ( [illegible] ) کا مماثل ہے) مین ہوئی، کس طرح مسیحیت کی جان کا دشمن،
قنوطی، اور شوپنہائر کا پرستار بن گیا، پھر اوس نے شوپنہائر؛ درواگنر دونون کو کیون ٹھکرایا، اور ایک
بیوہ مان اور ناکتخدا بہن کے ہوتے ہوئے گوشہ نشین راہب کی زندگی کیون اختیار کی، جسمین وہ اپنے تقریباً
تمام دوستون سے (چھڑا) خود اوس نے اپنے متعلق، یا اورون نے اس کے متعلق جو کچھ شائع کیا ہے اس سے
اس کی شخصیت کا معمہ حل نہین ہوتا، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ان مین سے کوئی نہ کوئی شخص ایسا ضرور ہوگا
جو ان سوالات پر روشنی ڈال سکتا تھا،

اس روشنی نہ ڈالنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس سے اس پیغمبر کی عبا کے سوراخ بہت زیادہ نمایان
ہو جاتے ہین، یہ بعید از قیاس نہین کہ جب نتشے نے ایک مرتبہ بہن کو خط مین لکھا کہ "میرے اچھے دوست
میرے متعلق کچھ نہین جانتے، اور اونھون نے ابھی تک اس مسئلے پر غالباً غور ہی نہین کیا، مین خود اپنے
بڑے بڑے معاملات کے متعلق ہمیشہ بہت زیادہ خاموش رہا ہون، اگرچہ بظاہر ایسا معلوم نہین ہوتا
تو اوس نے سچی بات لکھی ہو، اس قسم کے لوگ بھی دنیا مین پائے جاتے ہین، یہ لوگ بالعموم روزنامچے لکھنے
پر قناعت کرتے ہین، لیکن بعض اوقات وہ اپنے روزنامچے طبع کرا کے امیدوار رہتے ہین کہ دوسرے
ان مین وہی دلچسپی لین گے، جو وہ خود لیتے ہین، اور اون کے احباب نہین لیتے، اس سے یہ شبہہ کیا جا سکتا
ہے کہ ادبیات کا بڑا حصہ اسی محرک کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک خبطی کی لکھی ہوئی فلسفے کی ایک عجیب و غریب
کتاب مین مین نے یہ نہایت بے تکلفانہ اعتراف پڑھا تھا کہ اس نے یہ کتاب اس لئے لکھی ہے کہ خود
اوس کے خیالات اوس کی سمجھ مین آجائین، اس وقت سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ اکثر مشاہیر فلاسفہ کا
یہی حقیقی راز ہے، بہرحال نتشے کی تصانیف تو اولاً اسی قسم کے ادبیات سے تعلق رکھتی ہین، یہ ایک ایسی
روح کے ارتقا کی ضمنی پیداوار ہین، جس کی ترقی ۴۴ برس کی عمر مین یکدم رک گئی، اس نے ایک خط مین

جو اپنے ایک دوست (Erwin Rohde) کے نام لکھا تھا اس کا اعتراف کیا ہے

اُس نے (بلا تخصیص) بیان کیا ہے، کہ اس پر لیوپارڈی (Leopardi) سے زیادہ مصیبتین پڑی ہین، اور یہ کہ ۱۸۶۸ء کے بعد جو ادب اُس نے پیدا کیا ہے، وہ زندگی سے نفرت کے لئے نمانہ ساز دوا ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ نتشے بہت سی رعایات کا مستحق ہے، وہ گوشۂ تنہائی مین زندگی بسر کرتا تھا، اور اس کو یہ محسوس ہو گیا تھا، کہ اس کی تصانیف اور اون کا مواد، عام تنقید نویسون کیلئے اس قدر سخت ہین کہ ناقابل فہم ہو گئے ہین، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ بھی شوپنہائر کی طرح برہم ہو گیا، لہذا وہ روحانی صحرا مین حلق پھاڑ پھاڑ کر چلایا، اور اس کو ایسے ایسے خواب دکھائی دیئے جن کی وجہ سے حقیقت منخ اور اصلیت سے زیادہ بڑھ گئی، لیکن ان تمام باتون کو خارج کر دینے کے بعد بھی اس کی تصانیف مین بڑا حصہ ایسا باقی رہجاتا ہے، جو پر زور، بینا اور اہم ہے، اور جس کو بہت بار آور اور آیندہ ترقیون کا پیش خیمہ کہا گیا ہے، اگر ان ترقیون نے اسی زمانے مین استعدادات کو رفع کر دیا، اور نتشے کے خیالات کی تیزی و تندی کو کم کر دیا، تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ خیالات ان غیر معمولی حالات سے متاثر ہوئے، جن مین ان کی پیدایش اور پرورش ہوئی،

لہذا اگر ہم نتشے کو ایک بڑا ادیب، اور ایک ایسے خاص طرز تحریر کا موجد سمجھنے کے وسوسے سے بچنا چاہتے ہین جس نے کرخت جرمن زبان سے نئی نئی طرح کی باتین کہلوا ئین، اور اگر ہم بہ اتفاق اس کو پیغمبرون کی حد تک پہنچائے بغیر ایک مفکر سمجھنے کے لئے تیار ہین، تو ہم کو اس کے نظریات عمل و علم پر زیادہ تر غور کرنا چاہیئے ان مین سے مقدم الذکر خصوصیت کے ساتھ نہایت عجیب و غریب، حیرت انگیز اور مشہور لیکن ساتھ ہی کم ٹھوس ہین، اور موخر الذکر اغلباً زیادہ اہم اور با معنی ہین، اور ان ہی کی بنا پر نتشے زمانۂ جدیدہ کے تفکرات کی مثالی ترقی مین ایک مستقل جگہ پاتا ہے،

(۴)

نٹشے کا فلسفہ بیان کرتے وقت عوام اپنی تمام لیاقت اور اپنا پورا زور صرف یہ واضح کرنے پر ختم کر دیتے ہیں، اور یہ خیال خود بھی سمجھتے ہیں کہ انھون نے نٹشے کا تمام فلسفہ بیان کر دیا، کہ وہ ایک سفاک انقلاب پسند تھا، جو جدید تہذیب و تمدن کے نصب العین اور خیالات کی دنیا میں تلوار ہاتھ میں لئے دیوانہ وار پھر رہا ہے، اور بلا تخصیص و امتیاز ان سب کو قتل کرنا چاہتا ہے، وہ ایک ایسا ملحد ہے، جو بہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ خدا مر چکا ہے، وہ مسیحیت کا وہ مخالف ہے، جو اپنے آپ کو فخراً دجال کہتا ہے، وہ اخلاق کا وہ دشمن ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ اخلاق ایک غلامانہ ذہن کے انحطاط پذیر توہم سے زیادہ اور کچھ نہیں! وہ ایک نواب ہے جو عوام کالانعام کو ان کی اصلی جگہ بتاتا ہے، اور یہ جگہ حکمران طبقے کے "خونخوار وحشیون" کے پاؤن کے نیچے ہے، وہ ایک مورخ ہے، جس نے تاریخ کو آزاد اور طاقتور حاکمون اور ان کے باغی غلامون کے درمیان ایک ارضی کش مکش کا افسانہ کہا ہے، وہ ایک قوی الروح رجائی ( [illegible] ) ہے، جس کا ہیرو کا ساسخت استقلال زندگی کی ابتدائی صورت کو دوبارہ بیان کرکے زندگی کی الم انگیزیون کے متعلق قنوطیون ( Pe[illegible] [illegible] ) کے موقیانہ آہ و نالہ پر غلبہ پاتا ہے، وہ ایک شاعر ہے، جو طاقتورون کی فتح کے گیت گاتا ہے، اور کمزورون کی محکومیت پر خوش ہوتا ہے، وہ آنے والے فوق الانسان کا پیغمبر ہے، جس نے تمام قیمتون کو بدل دیا ہے، اور احکام کی نئی فہرست بنائی ہے، اور جو اس کائناتی کھیل کی تمام تفصیلات کے "ابدی اعادے" کی پیشین گوئی کرتا ہے، جس کا نہ کوئی مقصد ہے، نہ کوئی غایت اور نہ جس کے خود اپنے علاوہ اور کوئی معنی ہیں، آخری بات یہ ہے کہ نٹشے انسانی خود بینی کا دقیق خوشامدی ہے جو ہمیشہ کہتا رہتا ہے کہ جو شخص جراُت کرکے اس کے مذہب کو قبول کر لیتا ہے، وہ خود اپنی برتری کا اظہار کرتا ہے، اور جید ذہنون کی جماعت میں شریک ہو جاتا ہے،

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نٹشے کی تصانیف میں ان تمام دعووں کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں،
لیکن یہ اس کے عقائد کے سطحی معنی ہیں، اور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ اس کے پورے معنی ہیں، یا یہ کہ جس
شکل میں ان کو بیان کیا جاتا ہے، وہ اس کی تصانیف کے بہترین حصے ہیں جن پر غور کیا جانا ضروری
ہے، اور یہی تنقید میں سب سے زیادہ مزاحم ہوتے ہیں، طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس قسم کی تنقید اس کے عقائد کو
انقلابی نوعیت سے معرا کر دیتی ہے، مثلاً کوئی متین، و سنجیدہ شخص نٹشے کو دجال نہ سمجھے گا، مذہب بالعموم
اور مسیحیت بالخصوص، ایسی چیزیں نہیں جن کو کسی شخص کی فصاحت و بلاغت کا سیلاب بہا کر لیجائے،
جب تک لوگ ہر اوس چیز کو "خدا" کہنے کے لئے تیار ہیں، جو اس بات کی ضامن ہے کہ کسی نہ کسی طرح
ہر چیز درست ہے، اور جو ہر اوس عقیدے کو "مسیحیت" کے ساتھ ملحق کرنے پر آمادہ ہیں، جس سے انکی
بہترین تمنائیں مرکب ہیں، اس وقت تک یہ کہنا مہمل ہے کہ خدا مرچکا ہے، اور مسیحیت بے کار ہو گئی ہے،
دنیا پر روز بروز روشن ہوتا چلا جارہا ہے کہ مذہب محض عقلی ضوابط پر نہیں بلکہ ضروریات زندگی پر
مبنی ہے، اور جدلیات اس کو مٹا نہیں سکتے،

(۵)

نٹشے کی عدم اخلاقیت میں بھی بہت مبالغہ کیا گیا ہے، یہ عدم اخلاقیت دراصل اس روایتی
اخلاقیت کی متضائف ہے، جس کی قیمت کا وہ منکر ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا عقیدہ
ہے کہ ہر شخص جو کچھ چاہے کر سکتا ہے، اور اس کے ہیجانات پر کوئی روک نہیں، وہ یہ ضرور تسلیم کرتا
ہے کہ عمل محض "اخلاقی اصول" کا سوال نہیں بلکہ اصلاً ہیجانات کا سوال ہے، لہذا ہمارے لئے لازمی
ہے کہ ہم اپنے ہیجانات کو سلیم و صحیح بنائیں، "رہبانیت" پر تمام لعنتیں بھیجنے کے باوجود اس کا ایمان ہے
کہ ایسے اعلیٰ انسان کو اس کے مرضی کے مطابق بنانے کے لئے شدید تربیت (اور دراصل یہی تربیت
رہبانیت کی غایت تھی) کی ضرورت ہے، جس کی زندگی مسرات و لذات کے جویا کی زندگی سے یقیناً

مختلف ہوگی، لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ "آقایانہ" اخلاقیت کی نئی قیمتون کو قایم کرنے کے لئے اس غلامانہ "اخلاقیت کی قدیم قیمتون کا انکار لازمی ہے، جو مسیحیت نے ہمارے سر تھوپی ہین، اس طرح اس کی عدم اخلاقیت "تجاوز عن القیمت" (Transvaluation of Values) کا ایک اجمالی پہلو بن جاتی ہے،

یہ ایک اہم اور گران بہا خیال ہے، اور نٹشے مستحق داد ہے، کہ اوس نے ہم کو اس سے روشناس کرایا، مسئلہ قیمت کا انکشاف، انیسوین صدی کے فلسفیانہ تفکر کا غالباً سب سے بڑا کارنامہ ہے لیکن حیرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ یہ انکشاف کس قدر بتدریج اور خفیہ طریقہ سے ہوا، اور جو مفکرین کہ گذشتہ زمانے کے رنگ مین رنگے جاچکے ہین، وہ اب بھی اس کی اہمیت کو کس قدر کم سمجھتے ہین، یہ مسئلہ غالباً قنوطیت کی ترقی سے زیر بحث آیا ہے، اگر ہم رجائی اور قنوطی تمثیلات زندگی کے تصادم پر غور کرین، تو معلوم ہوگا کہ دونون عقائد مین واقعات بجنسہ ایک ہی ہین، اس طرح ہم اس عام تر سوال پر پہنچ جاتے ہین کہ واقعات کے متعلق ہماری راے سے نفس ان واقعات مین کیا فرق پڑتا ہے؟ اس سوال کی روشنی مین سب سے پہلے تو "واقعات اور قیمتون" کے تضاد کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، جو انیسوین صدی کے نصف ثانی مین رونما ہوا، اور جس کا شاہی اظہار رتشل (Ritschl) کی دینیات مین ہوا ہے، کہا جاتا ہے کہ "واقعہ" ایک چیز ہے، اور اوسکی تثمین بالکل دوسری اور جداگانہ چیز ہے، واقعے کی نوعیت لازماً اس کے متعلق کسی شخص کی راے کو معین نہین کرتی، لہذا ایک ہی واقعہ کی مختلف و متنوع قیمتین ہو سکتی ہین، اور قیمتون مین ان تغیرات سے ان کے انسانی معنی متغیر ہو سکتے ہین، مختصر یہ کہ جیسا کہ نٹشے نے بوضاحت معلوم کر لیا تھا: "تثمین تخلیق ہے" علاوہ ازین فنون، اخلاق، اور مذہب کی دنیا مین حقیقی اہم واقعات انسانی تثمین کے ایسے ہی واقعات ہوتے ہین، لیکن شروع شروع مین یہ نظر نہین آتا کہ واقعے اور قیمت کا یہ تضاد بالآخر باقی نہ رہے گا، جن "واقعات" کو ہماری سائنس تسلیم کرتی ہے اون مین قیمت کے وہ قضایا بھرے پڑے ہین جنکے متعلق خیال تھا کہ وہ ان واقعات پر مخصوص انسانی اضافے ہین، تاہم یہ واضح ہے کہ قیمت کا ہر قضیہ واقعے کے درجے

کے متبادل دعویدار کے مقابلے مین لازماً مرجح خیال کیا گیا ہوگا، کیونکہ جن ماہرین نے یہ قضایا قائم
کئے ہین، انھون نے ان کو دیگر دعویدارون کی بہ نسبت زیادہ قیمتی کہا ہوگا، مختصر یہ کہ ہر قضیہ مین
انسانی تثمین پوشیدہ ہوتی ہے، اس طرح یہ استدلال کلیٔ انسانیت" ( Humanism )
پر جاکر ختم ہوتا ہے،

(۶)

نطشے کی تحلیل اس حد تک نہ پہونچی تھی، لیکن دنیائے فنون مین تثمین کا حیرت انگیز تغیر اس کی
آنکھون کے سامنے ہوا، اور وہ اس سے بخوبی واقف تھا، اس نے اپنی آنکھون سے دیکھا کہ واگنر
کی "موسیقی مستقبل" جس کو عام طور پر ناہموار کہہ کر مردود کردیا گیا تھا، چند ہی برسون مین سخت کشش وکوشش
کے بعد مقبول عام بن گئی، اب ہر شخص کے نزدیک صرف یہی سننے کے قابل تھی، خود نطشے بھی اس
ہنگامے مین شریک رہا، اگرچہ بالآخر اس نے اپنے دوست کو عین فتح کے وقت برا بھلا کہا، اور
چھوڑ دیا، کیونکہ اس نے پارسی فال ( Parsifal ) کو مسیحت کے سامنے نہایت
شرمناک طریقے سے ہتھیار ڈالنے کے ہم معنی کہہ دیا تھا، اگر وہ اتفاق سے اس قضیہ سے واقف نہ ہوجاتا، جسین دو ہزار برس
قبل یوری پے ڈیس ( Euripides ) نے اس چیز کو مٹنے سے بچالیا، جو اوس وقت مستقبل
کی موسیقی تھی، اور اس موسیقی کے مصنف ٹوتھی اس ( Timotheus ) کے گلے مین سے پھانسی
کا پھندا نکالا، اگر وہ یہ معلوم نہ کرلیتا کہ فیشن کی دنیا مین تثمین مین سالانہ تغیر ہوا کرتا ہے، اور یہ کہ ہر سال
کے شروع مین اس مذاق کو مذموم قرار دینا لازمی ہوا کرتا ہے، جو سال بھر قبل جاری تھا، تو یہ واقعہ
اس کو عجیب وغریب معلوم ہوتا، اور اس سے اخلاقی قیمتون سے تجاوز کے امکان کی طرف اشارہ ہوتا،
لیکن اس مین کلام نہین کہ نطشے نے اپنی قابلیتون کو اصلیت سے بہت زیادہ، اور
تجاوزات عن القیمت کو حقیقت سے بہت کم سمجھا، یہ تجاوزات ہمارے گرد و پیش ہر جگہ اور

ہر وقت ہو رہے ہین، اور ایک فرد واحد تمام دنیا کی تعینات پر متصرف نہین ہو سکتا، مختلف افراد ایک ہی شے کی مختلف قیمتین لگاتے ہین، لہذا یہ سوال ہمیشہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مین سے کس کی تعینات بالآخر رائج ہون گی، متنازع قیمتون کی اس عمرانی کش مکش مین کم و بیش سنگین تغیرات کم و بیش سرعت کے ساتھ برابر واقع ہو رہے ہین، یہی قول قیمتون کی ایک ہی عام کم پر بھی صادق آتا ہے، یہان تک کہ قیمتون کی سچی فہرست مین سے ریاضت، ور رہبانیت بہ حیثیت اس کے اخلاقی نصب العین کے اجزائے مرکبہ ہونے کے عملاً چھانٹ دیئے گئے ہین، اس کے علاوہ آج کل بھی عیسائیون کے طرز سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ پرخوری کو اب بھی منجملہ سات مہلک گناہون کے شمار کرتے ہین، اس صورت حال مین مزید پیچیدگی اس واقعے سے پیدا ہوتی ہے کہ اکثر قیمتون کے مطابق عمل تو کیا جاتا ہے لیکن ان کو الفاظ مین بیان نہین کیا جاتا، اس کے برعکس بعض کو برائے نام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان کے مطابق عمل نہین کیا جاتا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ درحقیقت ان کو مانا ہی نہین جاتا، کیونکہ کسی عقیدے کے خلوص کا سخت ترین امتحان یہ ہے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے، مختصر یہ کہ جن قیمتون پر ہم اعتقاد رکھتے ہین، ان کو "ابدی" کہنے مین ہم خواہ کسی قدر سرگرمی کا اظہار کیون نہ کرین، ہم ان کو "ابدی" کہکر حقیقت کی گردش سے مستثنیٰ نہین کر سکتے،

(۷)

ماحصل اس کا یہ ہے کہ نتشے کا عقیدہ اتنا صحیح ہے کہ خود اس کو اس صحت کا اندازہ نہ ہوا، قیمتون کو بدلنا جتنا سہل ہے، اس سے کہین زیادہ دشوار بھی ہے، کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، اخلاقی قیمتون کو جمالی اور حزمی قیمتون کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اور پھر اکثر افعال پر مختلف طریقون سے نگاہ کی جا سکتی ہے، چینیون کا علم اخلاق آداب و مراسم کا محض ضابطہ معلوم ہوتا ہے، اس کے مقابلے مین یونانی علم اخلاق، احساسِ حسن پر تکیہ کرتا ہے نہ کہ "احساسِ فرض" پر، مطلب یہ ہے کہ فوق الانسان

کی اخلاقیت کو صرف ایک دشمن سے نہین بلکہ دشمنون کے جم غفیر سے مقابلہ کرنا ہے، اور ان مین سے ہر ایک اشخاص کے مختلف اصناف کو مرغوب ہے، جس مسیحی اخلاقیت کو نتشے دبانا چاہتا ہی، وہ کیا وتمنا تھی اگر وہ تنہا ہوتی، تو آج تاریخ کا رخ بالکل مختلف سمت مین ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ اس کو ہمیشہ بہت سے تبادلات سے مقابلہ کرنا پڑا ہے، اور روح انسانی پر اون کے اثرات مین شرکت کرنی پڑی ہی، اس حل مین یہ قوی، ملائم اور دقیق ہوتی گئی، اگر نتشے یہ سمجھا تا کہ مختلف و متنوع عمرانی و عسکری ذاتون مین عزت و معقولیت، یا آداب و مراسم کے مختلف ضوابط کا مطالب کیا ہی، اور اگر وہ کاروباری اور پیشہ ورانہ اخلاقیت، تاجرانہ رسوم اور اخلاقی طرز و طور ر ( جو خصائص تخصیصہ سے بہت زیادہ مختلف نہین ) کے رواج کو معلوم کر لیتا، تو اوس کو اپنے مخصوص تجاوز عن القیمت کی کامیابی کا اتنا زیادہ یقین نہ ہوتا،

پھر اس کا مجوزہ تجاوز عن القیمت اتنا نیا بھی نہین، جتنا کہ اس کا گمان ہے، اشتداد اور طاقت کے عقیدے پر ہمیشہ عمل کیا جاتا رہا ہے، اگرچہ اس عقیدے کے مدون کرنے والے اس قدر مصروف رہے ہین کہ اون کو اس کے اصول کے متعلق نظریات سازی کا وقت نہ ملا، لیکن یہ علمی عقلیت ( Academic ) کا ایک مغالطہ ہے، کہ جو چیز طبع نہین ہوئی وہ صحیح نہین ہو سکتی، نظریہ ساز سے کم از کم ایک بات کا تو مطالبہ کیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ اس کو ایسے صاف اور واضح تصورات دریافت کرنے چاہئین جو تمام واقعات پر حاوی ہون، لہذا ہم نتشے سے بحیثیت اس کے کہ وہ "طاقتور" کا وکیل ہی یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہین کہ وہ "طاقت" سے کیا مراد لیتا ہی؟ اسکے حکمرانون کا تسلط کس چیز پر مشتمل ہی؟ اور وہ کون سی صفات ہین جو اسقدر بیش بہا ہین، کہ انکو حاصل کرنے کے لئے کرورون افراد کی مسرت اور زندگی کا ایثار بھی کم ہی؟ کیا یہ طاقت محض جسمانی ہی، یا عقلی اور اخلاقی صفات بھی اسکی ترکیب مین شامل ہین؟ کیا ہم یقین کرینگے کہ ظاہر ہی کہ "طاقت ور" وہ ہی جو فی الواقع حکومت کرتا ہی، یا وہ جسکو حکومت کرنی چاہئے، اور جو عمرانی موانع کی عدم موجودگی مین

واقعۃً حکومت کرتے بھی؟ مختصر یہ کہ اس نظریے کا مرافعہ دنیا کے مروجہ طریقے کی طرف ہو یا سکے ماورا کسی نصب العین کی طرف؟

یہ معلوم کرکے قارئین کو حیرت ہوگی کہ اس سوال سے ہم ایسے میدان میں پہنچ جاتے ہیں، جو اکثر مناقشات ہوئے ہیں، چنانچہ افلاطون کا سقراط "جمہوریت" میں تھریسی ماکس (Thrasymachus) سے کہتا ہے کہ زبردست اشخاص حکمرانوں کے فائدے کیلئے اخلاقیت کو زیردستوں کے سر تھوپتے ہیں، جو فی الواقع حکمران ہیں، وہ تو اکثر غلطی کرتے ہیں نصب العینی حکمران ممکن ہو کہ با اخلاق ثابت ہوں، اس قول میں افلاطون نے نٹشے کی پیش بینی کی ہے، اسیطرح ڈارونیت (Darwinianism) میں بھی "لیاقت" (Fitness) کا تصور شامل معلوم ہوتا ہے، اور یہ تصور بھی نٹشے کی "طاقت" کے تصور کی طرح زیر بحث لایا جا سکتا ہے، کیا "لائق" وہ افراد کہلائیں گے جو فی الواقع باقی رہتے ہیں، یا وہ جو کسی نصب العینی دنیا میں لائق ہونگے، ؟ اگر ہم پہلی صورت تسلیم کرتے ہیں، تو کیا بقاے الیق محض تکرار الفاظ نہیں بنجاتا، ؟ اگر دوسری صورت تسلیم کیجاتی ہے، تو کیا ہم چوری چھپے یہ کوشش نہیں کر رہے ہیں کہ نیچر نے "لیاقت" کے کسی ایسے انسانی نصب العین کی تصدیق کرائیں جو ممکن ہو کہ اس حقیقی دنیا کے گرم و سرد اور نشیب و فراز میں بقائی "لیاقت"، کو مطلق شامل نہ ہو؟ ڈارونیت تو اس بظاہر خوشنما لیکن حقیقۃً لفظی جدلیات سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑاتی ہے کہ سائنٹفک واقعات کا علمی مطالعہ ہونا چاہئے، ڈارونیت فرض کرتی ہے کہ ہر وہ چیز جو زندہ ہے لازماً ایسے کام کرتی ہے جس سے وہ باقی رہتی ہے، اسکے بعد پھر وہ سوال کرتی ہے کہ جاندار مخلوق فی الواقع کس طرح عمل کرتی ہے، وہ کون سی صفات اور کون سے طرق عمل ہیں، جنکی وجہ سے باقی رہنے والی مخلوق باقی رہتی ہے؟ وہ اون خطرات سے اپنے آپکو کیونکر بچاتی ہے، جو اس کی زندگی کے لئے مہلک ہیں، اور کیا وہ پہلے کے مقابلے میں بہتر صورت میں باقی ہیں، یا بدتر صورت میں؟ جب تک کہ بقا کے واقعی عمل کی پوری طرح چھان بین نہیں ہو جاتی، اس وقت تک ایک سچا اور پکا ڈارونی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس مسئلے کے متعلق استنتاجات کئے جائیں کہ ہم کس طرح عمل کریں کہ خود ہماری یا اوروں کی بقا کی امید بہتر ہو جائے، دوسرے الفاظ میں حیاتیاتی تحلیل کو اخلاقی حکم سے علیحدہ رکھا جاتا ہے،

(۸)

نٹشے مین یہ تفریق مفقود ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اتنے عرصے پہلے پیدا ہوا کہ ڈاروینیت کے اصلی معنون کو پوری طرح سمجھ نہ سکا، کیونکہ جرمنی کے علم دوست طبقے مین ڈاروینیت بہت آہستہ آہستہ مقبول ہوئی، نٹشے نے بھی کہین صاف اور بری عن التضاد الفاظ مین بیان نہین کیا، کہ "طاقت" سے اسکی کیا مراد ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خود اس کے ذہن مین اس کا کوئی واضح تخیل نہ تھا، بعض اوقات تو وہ اس کو محض جسمانی طاقت کے مترادف سمجھتا ہے، اور "تند خو بہائم" کو دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے، جو "معنون نظام و ترتیب اور تعداد سے مساوی طور پر نفرت کرتے ہین اور سب پر مساوی طور پر غالب ہین" لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی "طاقت" مکر و فریب کے سامنے قدم نہین جما سکتی، چنانچہ خود نٹشے نے واضح کیا ہے کہ انحطاط پذیر لوگون کے مذہبی پیشواؤن کی ترتیب دی ہوئی غلامانہ اخلاقیت آقاؤن کی تمیزات پر غالب آئی، مذاجن جملون مین اس نے توجیہ کی ہے کہ "کمزور کیون غالب رہتے ہین" اور "مریضون اور کمزورون مین عقل زیادہ ہوتی ہے .... اور یہ زیادہ کینہ پرور اور دلچسپ ہوتے ہین، .... عورت نے ہمیشہ انحطاط پذیر اصناف، مثلاً پادریون کیساتھ ملکر "طاقتورون" "زبردستون" یا بالفاظ دیگر مردون کے خلاف سازش کی ہے، .... طاقتور قومین جنگ، طاقت کی حرص، اور اولوالعزمی کے ذریعے سے ایک دوسری کو تباہ کرتی ہین، .... ان کا وجود بہت گران پڑتا ہے، اور تمام بڑے بڑے زمانون کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، طاقتور بہرکیف اوسطاً کم وزن کے مقابلے مین کمزور تر، کم مضبوط ارادون والے اور زیادہ لغو ہوتے ہین، یہ فضول خرچ قومین ہین" ان تمام جملون مین عیاری یا طاقت عقل، طاقت کے تصور مین شامل معلوم ہوتی ہے،

---

لہ نٹشے نے اپنے "ارادۂ طاقت" ([illegible]) کو "تنازع للبقا" کے مقابلے پر کھڑا کیا ہے، اس نے طبعی انتخاب کو غلط سمجھا ہے، اور ارادہ کو ارتقاء کے ساتھ خلط ملط کیا ہے، یہ اہم واقعہ اس کی سمجھ مین نہ آیا کہ جسمانی ساخت کا "انحطاط" حیاتیاتی نقطۂ نظر سے بہتر مطابقت کا موجب ہو سکتا ہے، (مصنف)

جس صفائی اور کھرے پن سے نٹشے نے اعتراف کیا ہے کہ "طاقت ور" واقعۃً کمزور ہوتے ہیں، اوس نے طاقتور انسان کے عقیدے کی نٹشے کی وکالت میں بہ ظاہر کچھ جان نہیں چھوڑی، لیکن نٹشے نے اپنی تصنیف " [illegible] " خود اپنے آپ شائع نہیں کی۔ بہر حال یہاں ہمکو "طاقت" کے وسیع تر زیادہ سائنٹفک اور ڈارونی تصور سے نٹشے کی اصلاح کرنی چاہئے، اس لحاظ سے ہر وہ صفت "طاقت" میں شمار کی جانی چاہئے جو بقا میں واقعۃً مددد دے، یہان تک کہ ڈرپوکی، دون ہمتی اور حماقت بھی "طاقت" میں شامل ہے جس کی وجہ سے ایک اژدحام کسی قابل فرد کی قیادت کو قبول کر لیتا ہے لیکن اس صورت میں اخلاقی صفات کو "طاقت" کی ترکیب سے کیونکر خارج کیا جا سکتا ہے، کیا ہر اخلاقی نظام میں مسلمہ قیمتیں زیادہ تر وہ نہیں ہوتیں، جو عمرانی خوشحالی کی طرف مودی ہوتی ہیں؟ کیا افراد سے ہر جگہ یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ اپنی حاکمانہ جبلتوں کو عمرانی تعاون کی ضروریات کے قدموں میں ڈال دیں؟ کیا نظام ترتیب اور ضبط نفس اجتماعی عمل کے لئے ناگزیر نہیں؟ حیوانات کی دنیا میں بھی بڑے بڑے شکاری جانور تنہا زندگی بسر کرتے ہیں، اور اصولاً وہ دوسرے جانوروں کے غول کا مقابلہ نہیں کر سکتے، فوق الانسان کے ایک جم غفیر سے بھی ڈاکوؤں کا جتھا نہیں بنتا، ڈاکوؤں کا ایک جتھا کسی سلطنت کو فتح نہیں کر سکتا، اور تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مند سپاہیوں کے غول مفتوحہ تہذیبوں اور تمدنوں میں سے اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جس طرح صحرا میں سے برف، اور جب یونانی "آقایانہ اخلاقیت" ٹھوس صورت میں اپنا اظہار کرتی ہے تو یہ عظیم الشان روح والے انسان کی اس مضحکہ خیز تصویر پر ختم ہوتی ہے، جو ارسطو نے کھینچی ہے "اس عظیم الشان روح والے انسان" کا "مضبوط بنا پر مبنی احترام ذات" ہمیں خود نمائی اور عمرانی محالیت، دونوں کا نمونہ معلوم ہوتا ہے، عمرانی اور اجتماعی حالات میں غرور و تکبر کے مقابلے میں مسیحی عجز و انکسار بقا کی طرف زیادہ مودی ہوتا ہے یعنی یہ کہ "غلام" کی تمنیات دنیا کو فتح کرتی ہیں،

(باقی)

# تلخیص و تبصرہ

## یورپ کے جدید سیاسی نظام میں عورت کی حیثیت

یورپ کو اپنی نسوانی حریت نوازی پر بڑا ناز تھا، اور اس باب میں وہ ہمیشہ سے مشرق کو مطعون کرتا چلا آرہا ہے، لیکن ادھر چند برسوں سے یورپ کے جدید سیاسی نظام نے خود یورپ میں عورتوں کو جس درجہ پر پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ ہیبرٹ جرنل ([illegible]) کے اس اقتباس سے ہوگا،

فاسزم اور نسوانی آزادی دو متضاد چیزیں ہیں، فاسزم عملاً اور اصولاً قوت کی حکومت ہے، جس نظام میں عقل، انصاف اور انسانیت کے بجائے فوجی دستوں اور مادی دولت و ثروت کی قوت کی حکومت ہو، وہاں نسوانی تحریک کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے، عورتوں میں برداشت کی قوت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو لیکن وہ جسمانی قوت کے لحاظ سے مردوں کے مقابلہ میں ہمیشہ فروتر رہینگی، وہ میدانِ جنگ میں صف آرا نہیں ہو سکتیں، پھر بچوں کی پرورش کے تفکرات اور وراثت کے یورپین قوانین کے سبب سے مادی دولت کا حصول بھی ان کے بس میں نہیں،

یورپ میں عورتوں میں سیاسی رائے، تعلیم، پیشوں کی ملازمت اور شادی کے بعد آزاد رہنے کے حقوق کی تحریک جمہوریت کے غلغلہ کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی، چنانچہ میری وول اسٹون کرافٹ نے عورتوں کی آزادی کا علم اس وقت اٹھایا تھا، جب یورپ انقلابِ فرانس کے تخیلات پر بحث کر رہا تھا، اگرچہ وہ انگلستان کی رہنے والی تھی لیکن صحیح معنوں میں شورشِ فرانس کی بیٹی تھی، اس کے بعد مختلف

عورتوں نے نسوانی آزادی کی علمبرداری کی، لیکن اس کا اصلی دور گلیڈاسٹون کے زمانہ میں شروع ہوا، جب سے عورتوں پر سے قانونی، تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی پابندیاں دور ہونے لگیں، درمیان میں انیسویں صدی کے آخر میں یہ بڑھتی ہوئی تحریک کچھ رک گئی تھی، لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں اعتدال پسندوں کی از سرِ نو تشکیل اور مزدور جماعت کی تکوین سے یہ تحریک پھر شروع ہوئی، اور جنگِ عظیم کے اختتام پر بالغ مردوں کے ساتھ بالغ عورتوں کو بھی سیاسی رائے کا حق دیا گیا، جو جمہوریت کی خود مختار حکومت کی فتح کی دلیل تھی،

لیکن فاسزم اس قسم کی فتح کی سخت مخالف ہے، وہ ہر قسم کے جمہوری حقوق سے انکار کرتی ہے، وہ انقلاب فرانس کے تمام تخیلات اور نصب العین کو نظر انداز کر دینا چاہتی ہے، وہ انقلابی اور جمہوری تحریک کو فنا کرنے کی کوشش کرتی ہے، وہ ایک مطلق العنان حاکم کی قائل ہے جس کا مدار قوت پر ہو، وہ صنعت و حرفت، سیاست و مذہب اور قوانین وغیرہ جملہ امور میں محض ایک جماعت اور صرف ایک رائے چاہتی ہے جس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کریں، وہ قوت اور سپاہیوں کے زور پر حکومت کرنا چاہتی ہے، اسی لئے وہ حکومت میں عورتوں کی مداخلت مطلق نہیں پسند کرتی، اور عورتوں کو مردوں کے حکم کے تابع رکھنا چاہتی ہے، وہ علی الاعلان کہتی ہے کہ فاسزم میں عورتوں کا حصہ صرف جنگجو آدمی پیدا کرنا، تھکے ہوئے سپاہیوں کی خدمت کرنا اور ان کے لئے سامانِ تفریح بننا ہے،

مسولینی نے ایک بار گفتگو میں کہا کہ عورتوں پر اطاعت کرنا فرض ہے، میں امورِ سلطنت میں نسوانی تحریک کا مخالف ہوں، اگر میں عورتوں کو رائے کا حق دے دوں تو لوگ مجھ پر ہنسیں گے، ہماری جیسی سلطنت میں انھیں اپنے کو اہمیت نہ دینی چاہئے، تم جانتے ہو کہ اینگلو سیکسن کا خاتمہ کس طرح ہوگا؟ عورتوں کی حکمرانی کے ذریعہ سے" اسلاف میں مجھکو ایک ہی شخص سے دلچسپی ہوئی، یہ وہ شخص ہے، جس نے اپنی بیوی کو اسلئے قتل کر دیا کہ وہ وفا شعار نہ تھی، وہ اس کے سینہ میں دو چھریاں بھونک کر فرار ہوگیا عورتوں کیساتھ روما کے لوگوں کا طرزِ عمل رہا ہے، اور میں انھیں کا خلف ہوں"۔

فاسزم کی جماعت میں کوئی عورت رکن نہیں ہے، اس میں شک نہیں کہ عورتوں کی بھی فاسزم کی جماعتیں ہیں، لیکن یہ جماعتیں محض کیتھولک گرجاؤں کے خلاف برسر پیکار ہونے کی خاطر قائم کی گئی ہیں، کیونکہ مذہبی سرگرمیوں کا اظہار عورتوں ہی کے ذریعہ سے خوب ہوسکتا ہے، مگر ان جماعتوں کی مشغولیتیں بالکل محدود ہیں اور وہ مردوں کی زیرنگرانی کام کرتی ہیں، ان کی ناظمہ اپنی جماعت کے اراکین سے نہیں بلکہ مرد حکام سے احکام حاصل کرتی ہے، یہ جماعتیں کسی سیاسی کام میں دخیل نہیں ہوسکتیں، بلکہ صرف انہی کاموں میں حصہ لیتی ہیں، جو انسانی ہمدردی سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں خاص طور سے فاسزم کے ان افراد کے پسماندگان کے مصائب کو دور کرنے کی تاکید کیجاتی ہے، جنھوں نے حکومت کی خاطر جانیں گنوائی ہیں،

فاسزم کا ایک قانون یہ ہے کہ کوئی عورت گیارہ برس سے زیادہ عمر والے نوجوانوں کو ایسی تعلیم نہیں دے سکتی جو ان کی سیرت کی نشوونما پر اثرانداز ہو، اسی لئے اسکول اور کالج میں عورتوں کو کوئی جگہ نہیں ملسکتی، ایک بار ایک عورت ایک تھیٹر کی ڈائرکٹر مقرر ہوئی، گو وہ ہر لحاظ سے اس جگہ کے لئے موزوں ثابت ہوئی لیکن فاسزم کے تمام اخبارات نے اس تقرر پر ملامت آمیز مضامین لکھے اور اس کو ڈرامہ کے مشتاقوں اور اطالوی اساتذۂ فن کی اہانت قرار دیا گیا، ایک اخبار نے لکھا کہ "کیا ہمارا انقلاب مردوں کے معاملہ میں اسقدر نادار ثابت ہوا کہ ایک عورت اٹلی کے سب سے بڑے تھیٹر کی منتظمہ مقرر کی گئی ہے"!

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ فاسزم کے ماتحت اٹلی میں عورتوں کی قانونی اور معاشرتی حیثیت کتنی پست ہوگئی ہے، قانوناً ایک عورت مرد سے فروتر ہے، ایک اطالوی اپنے خاندان کی عورتوں کو زدوکوب کرسکتا ہے، بشرطیکہ ان کی ہڈیاں ٹوٹنے نہ پائیں، اور اگر ٹوٹ جائیں تو یہ قصور بھی قابلِ معافی ہے، اور عورتیں بطور احتجاج اس کی شکایت نہیں کرسکتیں" اگر زدوکوب سے عاجز آکر کوئی بیوی اپنے شوہر کے گھر سے بھاگ جائے تو پولیس کو حکم ہے کہ وہ اس کا تعاقب کرے، اور مفرور عورت ایک سال کی قید یا ایک ہزار سے دس ہزار اطالوی سکے کے جرمانہ کی مستحق قرار دیجاتی ہے، شوہروں کے لئے اس قسم کی کوئی پابندی نہیں

وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں، مرد اگر اپنی عزت و ناموس کے تحفظ کے لئے اپنی عورتوں مثلاً بیوی، بہن یا بیٹی کو قتل کر دیں تو ان سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ چند اطالوی فوجی افسروں نے اپنی بیویوں کو قتل کر دیا، لیکن وہ بدستور اپنے عہدوں پر برقرار رہے،

فاسزم میں عورتوں کا درجہ اسی حد تک قابل التفات ہے کہ وہ بہادر اور جنگجو افراد کی تولید کا آلہ ہیں، جو عورتیں چھ، سات، آٹھ، یا تو ام بچوں کی ماں ہوتی ہیں انھیں نقد انعام دیا جاتا ہے، اس نظام میں اضافۂ آبادی کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ حکومت کے محکموں میں کنوارے اور مجرد مردوں کے مقابلہ میں متاہل اور گھر بار رکھنے والوں کو ترجیح دیجاتی ہے، اور حکومت کے ملازمین سے تو جبراً شادی کرائی جاتی ہے،

جرمنی میں ہٹلر کی قومی اشتمالی حکومت میں بھی عورتوں پر اسی قسم کی پابندیاں ہیں، بلکہ ان کی بندشیں تو اور بھی زیادہ سخت ہیں، جرمنی میں یہ خیال سرعت کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے، کہ مردوں کو زندگی کا اور عورتوں کو خانگی دھندوں کا ماہر ہونا چاہئے، ایک جرمن اخبار نے ۳۲ء میں لکھا تھا کہ "وہ عورتیں جو اپنی آپ کفیل ہیں مردوں کی خودداری پر نہ صرف اس حیثیت سے کاری ضرب لگاتی ہیں کہ وہ ان کی حریف بن رہی ہیں، بلکہ ان کو اپنے خاندان کے ذریعۂ معاش ہونے کے احساس غرور سے بھی محروم کر دینا چاہتی ہیں"

نازی حکومت کے قائم ہوتے ہی عورتیں مرکزی، صوبجاتی پارلیمنٹ اور مقامی مجلس قوانین سے جن میں انھوں نے ۱۹۱۸ء کے انقلاب کے بعد شہریت کے حقوق کی بنا پر کافی جگہیں حاصل کرلی تھیں، نکال دی گئیں، ان کی تنظیم کا شیرازہ منتشر کر دیا گیا، ان کی کارکن خواتین یا اپنا ملک چھوڑ کر بیرونی ممالک میں پناہ گزیں ہوگئیں یا گرفتار کر لی گئیں یا کسی اور کام میں لگا دی گئیں، نازی حکومت کی یہ کھلی ہوئی حکمت عملی ہے کہ عورتیں مقامی مجلس مقننہ، ہسپتال، اسکول، کالج اور تمام محکموں سے ہٹا دی جائیں، پینتیس برس سے کم عمر کی عورتیں کسی سرکاری ملازمت کی اُمیدوار نہیں ہو سکتیں، اس عمر کے بعد بھی اگر وہ کسی برسر روزگار شخص یا غیر آریائی نسل کے آدمی سے شادی کر لیں تو ان کی ملازمت

کا حق منسوخ ہو جاتا ہے، جون ۱۹۳۳ء میں ایک قانون پیش ہوا جس کی رو سے تمام شادی شدہ عورتوں کو اس صورت میں ملازمتوں سے علحدہ کیا جا سکتا تھا، جب ان کے اعلیٰ حکام کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ان عورتوں کے پاس زندگی بسر کرنے کے سامان و وسائل موجود ہیں، ان غیر شادی شدہ لڑکیوں کو بھی اس حالت میں علحدہ کرنے کی ہدایت تھی جب ان کے والد، بھائی یا بہنیں ان کی کفالت کر سکتے ہوں لیکن قبل اس کے کہ اس قانون کا نفاذ ہو، نازی حکومت نے ہزاروں عورتوں کو مختلف عہدوں سے ہٹا دیا جن پر وہ جمہوریت کے زمانہ سے مامور تھیں، یہودی عورتیں تو خصوصیت کے ساتھ ہر شعبے اور ہر پیشے سے بالکل نکال دی گئی ہیں،

یونیورسٹی میں عورتوں کا داخلہ نہایت ہی محدود ہو گیا ہے، میٹریکولیشن کے امتحان کی پاس شدہ طالبات میں صرف دس فیصدی یونیورسٹی میں داخل ہو سکتی ہیں، ان کو بھی پیشہ کی تعلیم حاصل کرنے کی سخت ممانعت ہے، سال میں صرف ۷۵ عورتیں طب کی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، سائنٹفک علوم صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں، معلمی کا پیشہ صرف مردوں کی ماتحتی میں اختیار کر سکتی ہیں، پروشیا کا ایک اخبار لکھتا ہے کہ مرد اساتذہ کا نسوانی حکام سے نفرت کرنا ان کی تندرست جبلت کی دلیل ہے،

وہ عورتیں جو ذمہ دار پیشوں اور صنعت و حرفت کے کاموں میں تھیں اب زمین اور کاشت وغیرہ میں لگا دی گئی ہیں، حکومت تو ایسی عورتوں کو بھی جو ذہنی حیثیت سے نہایت بلند ہیں، ایسے کاموں کے لئے مجبور کرتی ہے، جن کی سختی غلامی کی مترادف ہے، اب ہر جگہ یہی کوشش جاری ہے کہ عورتیں صنعت و حرفت کے کاموں سے ہٹا کر گھر بار، کاشت یا کارخانوں میں لگا دی جائیں، کارخانوں میں بھی ان سے صرف مخصوص کام لئے جاتے ہیں، مثلاً زہریلی گیس اور بارود وغیرہ بنوائی جاتی ہے، اور وہ بھی ایسے تاریک کمروں میں جن میں صرف سرخ اور نیلی روشنی ہوتی ہے، صنعت کے کاموں میں عورتوں کی اجرت مردوں سے ۱۰ فیصدی کم کر دی گئی ہے، ان قیود و شرائط اور سختیوں کے باوجود بھی عورتوں کو

زبردستی کارخانوں سے نکال دینے کا عمل برابر جاری ہے، چنانچہ ہسپتال اور دوسرے اداروں میں جہاں عورتیں کھانا پکانے کا کام کرتی تھیں، اب ان کے بجائے باورچیوں سے یہ کام لیا جاتا ہے،

عورتوں کو ملازمتوں سے نکالنے کا ایک اور ذریعہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ حکومت ملازمت پیشہ عورتوں کو شادی کے لئے اس شرط پر پچاس پونڈ قرض دیتی ہے کہ وہ اس وقت تک اپنی ملازمت پر واپس نہیں آسکتیں جب تک کہ ان کے شوہروں کی آمدنی چھ پونڈ پانچ شلنگ ماہوار سے گھٹ نہ جائے یا قرض بالکل ادا نہ ہو جائے، یہ قرض نقد نہیں بلکہ رسید (کوپن) کی صورت میں دیا جاتا ہے، جس سے وہ گھر کے لئے ضروری سامان خریدتی ہیں، یہ قرض آٹھ سال سے کم کی مدت میں ادا نہیں کیا جاسکتا،

بیکار عورتیں کیمپ میں بھیجدی جاتی ہیں، جہاں ان سے صفائی کا کام لیا جاتا ہے، ان کے لئے گھر، اصطبل، اور کھیت میں کام کرنا ضروری ہے، دس یا بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد ان کے لئے نازی فلسفہ پر لکچر سننا لازمی قرار دیا گیا ہے، وہ کوئی اجرت نہیں پاتیں اور نہ انھیں اچھی غذا دیجاتی ہے، مختصر چھاؤنی اور غلہ کی تنگ کوٹھریوں میں انہیں گھاس پر سلایا جاتا ہے، اور آہنی ضبط و نظم اور شدید سزا کے ساتھ رکھا جاتا ہے، اور ان میں سے کوئی عورت علحدہ کردیجاتی ہے تو اس کے سرٹیفکٹ میں علحدگی کے اسباب بیان کردیئے جاتے ہیں، جس سے پھر کہیں وہ کوئی کام نہیں پاسکتی، علحدگی کے بعد اگر اس کے والدین اس کو اپنے دامنِ عاطفت میں لے لیں تو وہ بھی بے کار ہونے کے بعد بے روزگاری کے تمام حقوق سے محروم کردیئے جاتے ہیں، کارخانوں، دفتروں، یونیورسٹیوں اور دوسرے محکموں سے نکالی ہوئی کثیر التعداد عورتوں سے کیچڑ سے بھرے ہوئے کھیتوں میں مسلسل دس بارہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے، جہاں کیمپ میں پہلے صرف غیر شادی شدہ عورتوں سے کام لیا جاتا تھا، اب شادی شدہ عورتوں کو بھی مجبور کیا جاتا ہے، اور ان کے بچے یتیم خانوں میں بھیجدیئے جاتے ہیں،

سترہ سے بیس برس تک کی لڑکیوں کے لئے کام کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے جس کی مشقت فوجی خدمات سے کم صبر آزما نہیں ہوتی،

نازی حکومت سے اختلاف رکھنے والی عورتوں کے ساتھ جو ظلم اور تشدد برتا جاتا ہے وہ نہایت روح فرسا اور نفرت انگیز ہے، ایک اشتراکی جرمن خاتون میریا جانکوسکی کو جس کی عمر ۴۱ برس تھی، اسکے خیالات کے جرم میں بیس مسلح آدمیوں نے گھر کے اندر گھس کر گرفتار کر لیا اور اسکو جمہوریت کا علم دکھا کر گندے الفاظ میں اسے یاد کرنے کی فرمائش کی، خاتون نے انکار کر دیا، اس کے انکار پر آدمیوں نے اسے بالکل برہنہ کر کے بیدوں اور چھڑیوں سے مارنا شروع کیا، ننو ضربیں لگی ہونگی کہ اس کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے، اس پر بھی ان سنگدلوں کی تشفی نہیں ہوئی، اور انھوں نے اس کے منھ پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بے حال ہو کر زمین پر گر گئی، لیکن جب تک وہ اشتمالیت سے انکار پر آمادہ نہیں ہوئی اس وقت تک اسکو نہیں چھوڑا، انکار کرنے کے بعد وہ ہسپتال لائی گئی، لیکن زخموں سے جانبر نہ ہو سکی،

اتفاق سے ایک مرتبہ بیٹی سویس نامی ایک خاتون ایک یہودی کے ساتھ دیکھ لی گئی، اس جرم کی اس کو یہ سزا دی گئی، کہ اس کا سر مونڈ کر سڑکوں پر اس کی تشہیر کی گئی، اس کے گلے میں یہ تختی آویزاں تھی کہ "میں نے اپنے کو ایک یہودی کے حوالہ کیا تھا" ایسی ذلت آمیز اور دلشکن سزا سے اس کا دماغی توازن بالکل بگڑ گیا،

اس قبیل کی اور بہت سی مثالیں ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اٹلی اور جرمنی کی مطلق العنان حکومت میں عورتوں کی محکومیت اس زمانہ سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہے جس سے انھوں نے ایک صدی کی مصیبت خیز کوششوں کے بعد اپنے کو آزاد کیا تھا۔

"ص ع"

# اخبار علمیہ

## آیندہ جنگ میں زہریلی گیس سے بچنے کی تدبیریں

۱۹۲۵ء میں دنیا کی قوموں نے ایک معاہدہ پر دستخط کرکے زہریلی گیسوں کا استعمال جنگ کے زمانہ میں ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا، لیکن آج وہی قومیں نہایت سرگرمی کے ساتھ گیس کے ایک متوقع حملہ سے بچنے کی تدبیریں کر رہی ہیں جو نہ صرف فوجوں پر ہونے والا ہے، بلکہ غیر فوجی آبادی بھی اس کی زد میں آئے گی، حکومتیں لوگوں کے خوف اور گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے ایسے تہ خانے تعمیر کرا رہی ہیں، جن میں باہر کی ہوا داخل نہیں ہوسکتی، نیز باضابطہ طور پر تمام باشندوں حتیٰ کہ بچوں اور جانوروں کو بھی گیس کی نقابوں کا استعمال سکھایا جارہا ہے، گذشتہ جولائی میں برطانیہ نے اعلان کیا کہ دو سال کے اندر وہ اپنی پوری آبادی کے لئے گیس کی نقابیں فراہم کر دے گی، جن کے استعمال سے گیس کے حملے بے اثر رہیں گے، چنانچہ ایسی نقابیں ایک بڑی تعداد میں تیار بھی کرلی گئی ہیں، ان کا وزن صرف ڈیڑھ پونڈ ہے اور یہ اس قدر چھوٹی ہیں کہ آسانی سے کوٹ کی جیب میں رکھی جاسکتی ہیں، حکومت کی نگرانی میں یہ نقابیں غیر سرکاری انگریزی کارخانوں میں تیار ہونگی، ان کی قیمت دو شلنگ ہوگی، دیکھنے میں یہ نقابیں نہایت ہیبت ناک معلوم ہوتی ہیں، شیشہ کی بڑی بڑی عینک کے علاوہ ان میں ایک موٹی اور لچیلی نلکی بھی ہوتی ہے جو بالکل ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹکی رہتی ہے، یہ کیمیائی طور پر اس طرح تیار کی گئی ہیں کہ باہر کی ہوا تمام زہریلے مادہ سے صاف ہوکر اندر جاتی ہے، بچوں کے لئے ایسی بند گاڑیاں تیار کی گئی ہیں جن کے اندر صاف ہوا بھر دی جایا کرے گی، اور باہر کی ہوا کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا،

کوشش کی جارہی ہے کہ بچوں کے لئے بھی نقابیں بنا دی جائیں، برطانیہ میں گیس کے حملہ کا خوف لوگوں پر اس قدر طاری ہے کہ ملک میں ہر جگہ ان نقابوں کی مشق کرائی جارہی ہے، برطانیہ کے علاوہ اور کسی ملک میں تمام باشندوں کے لئے نقابوں کا استعمال تجویز نہیں کیا گیا ہے، فرانس نے صرف سپاہیوں، نرسوں، اور ان غیر فوجی باشندوں کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی، جو لڑائی کے لئے تیار کئے جاتے تھے، عام لوگوں کے لئے حکومت نے محفوظ تہ خانوں کا انتظام کیا تھا، ان میں سے ایک میں جو پیرس میں واقع ہے، اس وقت آٹھ ہزار آدمی پناہ گزیں ہو سکتے ہیں، فرانسیسی موجدوں نے نقابوں کی موجودہ ہیئت ناک شکل میں اصلاح کی کوشش بھی کی ہے، ایک شخص نے ایک قسم کا بکس بنایا ہے جس میں مائیں حملہ کے دوران میں اپنے بچوں کو محفوظ طور پر رکھ سکتی ہیں، ایک دوسرے موجد نے غبارہ کی شکل کی ایک چیز تیار کی ہے جس میں داخل ہو کر انسان زہریلی گیس سے محفوظ رہ سکتا ہے، جرمنی میں نقابوں کے بجائے ایسے تہ خانوں کی تعمیر ہو رہی ہے، جنہیں گیس داخل نہ ہو سکے، اور حکومت کی طرف سے مرکزی مقامات پر فولاد کے تہ خانے بنوا دیئے گئے ہیں، تاہم وہاں بھی بعض لوگوں نے اپنے کتوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نقابیں خریدلی ہیں، امریکہ میں اس وقت صرف فوج کے لئے نقابیں خریدی جاتی ہیں، جن کی قیمت ۵۰ء۱۱ ڈالر ہے، لیکن اگر ضرورت پیش آئی تو امریکن کارخانے عام باشندوں کیلئے لاکھوں نقابیں ۵ ڈالر فی نقاب کے حساب سے تیار کر دینگے،

اکثر فوجوں میں اس وقت جو نقابیں مستعمل ہیں وہ ہر قسم کی زہریلی گیسوں کے لئے بالکل کافی ہیں، ماہرین کا بیان ہے کہ گیسوں کا خوف جو عام طور پر اس درجہ طاری ہے، غلط اطلاع پر مبنی ہے، جنگ عظیم کے دوران میں بھی جب ۷۰۷۵۲ امریکن گیس سے زخمی ہوئے تھے، میدان جنگ میں گیس سے مرنے والوں کی تعداد صرف ۲۰۰ تھی اور ہسپتالوں میں کل (۱۲۲۱)۔ کسی بڑے شہر کو گیس سے برباد کر دینے کے لئے سب سے اہم سوال گیس کی مقدار اور مصارف کا ہے، یعنی کوئی دشمن کسی بڑے

شہر پر بیک وقت کافی مقدار میں گیس برسا بھی سکتا ہے یا نہیں، ماہرین اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، چنانچہ جنگ عظیم میں ۳۵۰۰۰ آدمی جو گیس سے زخمی ہوئے ان میں ہلاک ہونے والوں کا اوسط صرف ۲،۵ فی صدی تھا، یعنی ایک آدمی کو ہلاک کرنے کے لئے ڈیڑھ ٹن گیس صرف ہوئی، اس حساب سے لندن کے ۸۲۰۳۹۴۲ مردوں، عورتوں، اور بچوں کو ہلاک کرنے کے لئے ۱۲۳۰۵۹۱۳ ٹن گیس کی ضرورت ہوگی جسے ۶۰۰۰۰۰ ہوائی جہازوں سے برسانا پڑیگا،

## ایک نہایت قدیم شہر کا انکشاف

شاہ حمورابی (Hammurabi) سنہ ۲۰۲۴ قبل مسیح میں بابل میں حکومت کرتا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے، لیکن اسی زمانہ میں کرۂ ارض کی دوسری جانب امریکہ کے علاقہ نبراسکا (Nebraska) میں ایک اور شہر بھی آباد تھا جو بابل سے کئی گنا بڑا تھا، یہ شہر تین میل لمبا اور نصف میل چوڑا تھا، اس کی عمارتوں پر مٹی کا پلاسٹر تھا، اس کے میدانوں میں غلہ اور سیم کے کھیت تھے، جن کی آبیاری پونکا کریک (Ponca Creek) نامی ایک قریب کے چشمہ سے ہوتی تھی، اسکے باشندے مٹی کے برتن، پتھر کے چاقو، اور سیپ کے زیورات استعمال کرتے تھے، وہ اپنے کھانے کی چیزیں زمین میں چھوٹے چھوٹے گڈھے کھود کر یا مٹی کے گھڑوں میں رکھتے تھے، تین ہزار سال ہوئے اس علاقہ میں زبردست خشک سالی آئی تھی، اور لوگوں نے اس شہر کی سکونت ترک کردی تھی، اس کے بعد ایک طوفان ایسا آیا کہ پورا شہر ریگ کی ایک موٹی چادر کے نیچے چھپ گیا، اور تین ہزار برس تک تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ رہا، مگر حال میں ایک ویسا ہی طوفان پھر آیا جس نے اس چادر کے ایک حصہ کو چاک کردیا، اور شہر کے بعض آثار دکھائی دینے لگے، چنانچہ گذشتہ جولائی میں نبراسکا یونیورسٹی کے ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر بل (Dr. Earl Bell) نے ایک جماعت کے ساتھ اس مقام کی کھدائی شروع کردی اور چند ہی دنوں میں بہت سی چیزیں برآمد کیں، کچھ پکی ہوئی کھانے کی چیزیں بھی ملیں جو کسی قدر جل جانے کی وجہ سے اب تک

محفوظ تھیں، گھڑوں میں غلہ وغیرہ کی قسم سے جو چیزیں رکھی ہوئی تھیں وہ بھی درست حالت میں پائی گئیں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے جانوروں کی ہڈیاں اس کثرت سے نکلیں کہ ماہرین اثریات کو ان کے مطالعہ کے لئے کافی وقت نہیں ملا، ہڈیاں زیادہ تر جنگلی بھینسوں اور بارہ سنگھوں کی ہیں، لیکن سب سے زیادہ اہم چیز جو ڈاکٹر ....ل نے اس خطہ میں پائی ہے وہ وہاں کی خاک کے مخصوص ذرات ہیں، ڈاکٹر موصوف کو امید ہے کہ ان ذرات کے مطالعہ سے یہ صحیح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ یہ مدفون شہر کب آباد تھا، اس کی آب و ہوا کیسی تھی، اور اس کے باشندے اسے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے،

## ایک عجیب و غریب درخت

افریقہ کے مشرقی ساحل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کو پراسلن (Praslin) کہتے ہیں، اس جزیرہ میں ایک ایسا درخت ہوتا ہے جو دنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں پایا جاتا، یہ درخت ایک خاص قسم کے ناریل کا ہوتا ہے جو کوکوڈی میر (Coco-de-mer) کے نام سے مشہور ہے، اس ناریل کے اندر دو بڑے پھل ہوتے ہیں جو آپس میں جڑے رہتے ہیں، اور ان پھلوں کے اندر بیضاوی شکل کا گودا ہوتا ہے جو ایک باریک پردے میں لپٹا ہوتا ہے، یہ گودا بالکل شفاف اور سفیدی مائل یا ہلکے گلابی رنگ کا ہوتا ہے، ذائقہ میں لذیذ اور اثر کے اعتبار سے مقوی اور نشاط انگیز ہوتا ہے، جزیرہ والوں کی ضرورت سے جو پھل فاضل ہوتے ہیں وہ مشرق میں بھیج دیئے جاتے ہیں جہاں ان سے اعادۂ شباب کی دوائیں تیار کیجاتی ہیں، اس عجیب و غریب پھل کے درخت بہت دنوں میں بڑھتے ہیں، سا ٹھ سال کے بعد ان میں پھل آتے ہیں، اور پھلوں کے پکنے میں سات برس لگ جاتے ہیں، بہتیرے درخت سو فٹ اونچے ہیں، بعض دو سو فٹ بلند بھی ہیں، اس جزیرہ میں یہ درخت پانچ سو برس سے لگے ہوئے ہیں، کچھ ہزار برس کے بھی ہیں۔

"ع ز"

# ادبیات

## شغلِ تکفیر

### علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک پرانی نظم

بعض پرانے نوادر ایسے ہوتے ہیں کہ امتدادِ زمانہ کے باوجود ہر دور کے حالات انھیں نیا بنا دیتے ہیں، انہی میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک پرانی نظم ہے جو ان کے مجموعۂ کلام میں چھپ چکی تھی، یہ گویا موجودہ دورِ تکفیر میں خود مصنف کی زبان سے اس کی تکفیر کی معذرت و توجیہ ہے،

اک مولوی صاحب نے کہا میں نے کہ "کیا آپ — کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں
آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں — ہر چند ابھی مائلِ اظہار نہیں ہیں
تقلید کے پھندوں سے ہوئے جاتے ہیں آزاد — وہ لوگ بھی جو داخلِ احرار نہیں ہیں
جو نام سے اسلام کے ہو جاتے تھے برہم — ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں
افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا — یا ہیں تو بقول آپ کے دیندار نہیں ہیں
کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد — کیا آپ بھی اسکے لئے تیار نہیں ہیں"
جھلا کے کہا یہ کہ "یہ کیا سوءِ ادب ہے — کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر

بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں"

# روحِ زندگی

از جناب پروفیسر اکبر منیر صاحب

اٹھو خوابِ شبانہ سے جوانو! — افق خونِ شفق سے لالہ گوں ہے

ہے سیلِ ظلمت تہذیبِ مغرب — فسوں اندر فسوں اندر فسوں ہے

بڑھے آتے ہیں فتنے فوج در فوج — یہ ہنگامہ قیامت سے فزوں ہے

ہے ضربِ تیشۂ فرہاد درکار — کہ رستے میں تمھارے "بیستوں" ہے

ہے روحِ زندگی عشقِ جنوں خیز — پیامِ مرگ عقلِ ذو فنوں ہے

کرو پیدا وہ عشقِ تند و بیباک — جو مثلِ تیغِ برّاں غرقِ خوں ہے

نظر جس کی ہے سوئے عرشِ اعظم — قدم میں جس کے چرخِ نیلگوں ہے

اسی سے ہے بدن میں روحِ رقصاں — یہ پر نغمہ مثالِ ارغنوں ہے

اسی سے زندگی کی شمع روشن — یہی عقل و خرد کا رہنموں ہے

ہے اس کے بال و پر میں زورِ جبریلؑ — اسی شمشیر سے شیطاں زبوں ہے

یہی دیتا ہے نورِ علم و عرفاں — یہی انساں کی شمعِ دروں ہے

منور اس سے ہیں روح و دل و جاں — مسخر گردشِ گردونِ دوں ہے

اسی آتش سے ہے انساں سرافراز

جو یہ بجھ جائے تو وہ سرنگوں ہے،

# نوائے فراق

از

جناب پروفیسر فراق الہ آباد یونیورسٹی

وفورِ شوق کو اندازِ حسن راہ توڑے
یہ برقِ جلوہ تری فرصتِ نگاہ توڑے

رہیگا کھل کے کبھی رازِ ہوش و غفلت بھی
پتہ کچھ اپنا سیہ مستیِ نگاہ توڑے

وصالِ حسن سہی عالمِ شہود سہی
نشاں مرا بھی کہیں تیری جلوہ گاہ توڑے

غم و خوشی میں ترے حسنِ بے پناہ کی خیر
خراب حال دلوں کو کہیں پناہ توڑے

دل اپنا بیٹھ چلا جب تو ذکرِ ساحل کیا
یہ ناؤ ڈوب کے دریائے غم کی تھاہ توڑے

کہیں نہیں ترے گم گشتگانِ عشق مگر
ہوائے عالمِ ہو دل کی سرد آہ توڑے

حجابِ حسن کو بے باک بھی بنالیں گے
پتہ کچھ اپنا تری شرمگیں نگاہ توڑے

ہر اک کے ہوش کا کھل جائیگا بھرم ساقی
کچھ اذنِ بادہ کشی نرگسِ سیاہ توڑے

نہیں ہے چین جو قسمت میں اے غمِ جاناں
کشاکشِ غمِ دنیا سے کچھ پناہ توڑے

علاجِ خوبیِ تقدیرِ عشق کیا ہمدم
وہ دل سے عہدِ وفا باندھ کر نباہ توڑے

فنا کی موج کا سر سے گذر مبارک ہو
اترنے والوں کو دریائے عشق تھاہ توڑے

فراق گمرہیِ وصل و ہجر سے بچ کر
تو اپنے دل کو کبھی اپنے دل میں راہ توڑے

# بابُ التقریظ والانتقاد

## ہندوستانی زبان کے رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر

رسالوں کے سالنامے، اور خاص نمبر نکالنے کا مذاق اتنا بڑھتا جاتا ہی، کہ کوئی ششماہی ایسی نہیں گذرتی، جس میں متعدد اچھے سالنامے نہ نکلتے ہوں ۳۶ء کی گذشتہ ششماہی کے سالناموں اور خاص نمبروں میں حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں،

**شاہکار کا سالانہ نمبر**، مرتبہ پروفیسر تاجور صاحب، حجم ۱۰۰ صفحات تقطیع $\frac{20\times26}{4}$ کاغذ سپید، کتابت وطباعت روشن، قیمت ۸؍، علاوہ محصول ڈاک سالانہ قیمت چھ روپیہ، پتہ دفتر شاہکار، کوٹھی مجذوب شاہ، احاطہ کالو چراغ دین روڈ مزنگ لاہور،

تاجور صاحب کو سالنامہ نکالنے کا خاص مذاق ہی، شاہکار ۳۶ء کا سالانہ نمبر انھوں نے بڑے اہتمام سے نکالا ہی، مضامین کے تنوع انتخاب اور ترتیب سے حسنِ مذاق اور سلیقہ مندی نمایاں ہے، ہندوستان کے ممتاز اہلِ قلم کے مضامین، اور مشاہیر شعرا کے کلام سے سالنامہ مزین ہے، مضامین کے انتخاب میں ہر مذاق کا لحاظ رکھا گیا ہے، سنجیدہ، علمی تفریحی اور افسانے، ہر رنگ کے مضامین ہیں، افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا افسانہ "قانونی مجرم" ایثار و قربانی کا بہترین سبق ہی، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا "سفرنامہ" نہایت دلچسپ اور انکے خاص رنگ ظرافت کی چاشنی، اور شگفتہ نگاری کا مرقع ہے، خصوصًا یورپ کی "علمی انجوبہ پرستی"، کا نہایت لطیف اور ظریفانہ رنگ میں خاکہ اڑایا گیا ہے، سلطان حیدر صاحب جوش کا "منظر العجائب" ظریفانہ رنگ میں، اور گیتی آرا اچھے اور دلچسپ افسانے ہیں،

سنجیدہ مضامین میں "اردو کے ماخذ کے متعلق بعض اہم غلط فہمیاں" ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور قادری؛ "جدید اردو شاعری کی خصوصیات" پروفیسر مجاز صاحب "محاورہ میں تبدیلی" حکیم عیش امروہوی، "عطار کی غزلیات" سید حسن صاحب برنی مفید اور لائق ذکر مضامین ہیں، حکیم صاحب کا مضمون تشنہ اور مزید وضاحت کا طالب ہے، اصلاحات ناطق کی کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں، نظم کا حصہ بھی خوشرنگ ہے، حسرت موہانی فانی، جلیل، آرزو، جوش، سیماب وغیرہ مشاہیر شعراء کی غزلوں سے رسالہ مرصع ہے، ظاہری حسن کے لئے چند تصاویر زیب رسالہ ہیں،

**عالمگیر کا سالنامہ**، مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب حجم ۲۰۲ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر، سالانہ قیمت للعہ، علاوہ محصولڈاک، پتہ دفتر رسالہ عالمگیر، بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نہایت پابندی کیساتھ اپنا سالانہ نمبر نکالتا ہے، چنانچہ حسب معمول اس نے ۳۶ء کا سالنامہ بھی اہتمام کے ساتھ نکالا ہے، اور اپنے ناظرین کی دلچسپی کے لئے رنگ برنگ کے مضامین فراہم کئے ہیں، بڑا حصہ افسانوں کا ہے، دوسری زبانوں کے ترجمہ شدہ افسانے زیادہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں، "ملکۂ جنوب" مترجمہ قاضی محمد شفیع صاحب سامی عہد عتیق کی یادگار ہے، "بوڑھا غازی" مرزا عاشق بیگ صاحب جو فارسی ڈرامے کا ترجمہ ہے سرفروشی و وطن پرستی اور درس یگانگی "اتحاد قومی کا بہترین سبق ہے، "سندری اور شنکر" کسی بنگالی افسانے کا ترجمہ یا اس سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، اور ان لوگوں کے لئے عبرت آموز ہے جو ذات پات کی بیجا بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں، خواجہ عبدالرؤف عشرت نے بھی اپنے مخصوص رنگ میں قدیم لکھنؤ کے بعض مناظر دکھائے ہیں،

سنجیدہ مضامین میں "شاہان سلف کی ادب نوازی"، "ولی دکنی کا نظریہ محبت"، "عہدی سودائی" "اردو غزل کا جدید اسکول"، لائق مطالعہ ہیں، نثر کے مقابلہ میں نظم کا وزن ذرا ہلکا ہے، مجموعی حیثیت سے سالنامہ کامیاب ہے،

**ساقی کا افسانہ نمبر**، مرتبہ شاہد احمد صاحب بی اے، حجم ۲۰۰ صفحات تقطیع ۲۰ × ۳۰

کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲؎ سالانہ قیمت للعہ؎ پتہ دفتر ساقی دہلی،

ساقی دہلی کے اچھے رسائل میں ہے، اس کے صفحات پر اکثر وہاں کے ممتاز ادیب و اہل قلم نظر آتے ہیں، شاہد صاحب سال میں ساقی کے کئی خاص نمبر نکالتے ہیں، جولائی ۳۶ء کا خاص نمبر انھوں نے افسانہ نمبر کے نام سے نکالا ہے، افسوس ہے کہ ہر مفید شے کی طرح آج کل افسانوں کا حقیقی مقصد بھی فوت ہو کر رہ گیا ہے، جس ستے سے مفید نتائج پیدا کئے جا سکتے تھے وہ محض حسن و عشق کی کہانی بن گئی ہے، منشی پریم چند کا جو ہندوستان کے نامور افسانہ نویس ہیں کوئی افسانہ کسی مفید نتیجہ اور مقصد سے خالی نہیں ہوتا، لیکن ہمارے نوجوان ادیبوں کے افسانوں کا عموماً بے معنی افسانوی "رومانیت" کے سوا کچھ مقصد نہیں ہوتا، اور تو خیر اڈیٹر ساقی کا قلم خصوصیت کے ساتھ اس باب میں زیادہ غیر معتدل واقع ہوا ہے، اس کی تازہ مثال ان کا افسانہ "دیوار" ہے جس کو انھوں نے غالباً اپنے ماحول کی فضا سے متاثر ہو کر ارقام فرمایا ہے، کیا وہ یہ رنگین کھیل کسی شریف گھرانے میں پسند کریں گے؟

اس پہلو کو قطع نظر کر کے محض افسانوں کی حیثیت سے یہ نمبر نہایت کامیاب ہے، بیشتر افسانے دلچسپ اور بعض مفید اور نتیجہ خیز بھی ہیں، ان میں مشہور فرانسیسی اہل قلم گستیو فلابیر کا افسانہ "ہرودیا" جسے مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے شگفتہ نگار قلم نے ہندوستانی زبان کا جامہ پہنایا ہے، خاص طور سے لائق ذکر ہے، جو قدیم سامی تاریخ اور روایات کا حامل ہے، اس کے علاوہ "ایثار" ل احمد صاحب "سچی کہانی" "پریم پجاری" "لندن کی ایک رات" سجاد ظہیر صاحب "نجومی کی وصیت"، وغیرہ دلچسپ افسانے ہیں، پروفیسر براس کے "شذرات" میں "ہندوستانی ہوں" "ان شایستہ" ہندوستانیوں کے لئے جو بیرونی ممالک میں اپنے "اعمال حسنہ" سے ہندوستان کا نام روشن کرتے ہیں عبرت آموز ہیں،

**ادب لطیف افسانہ نمبر**، مرتبہ چودھری برکت علی صاحب و مرزا ادیب صاحب

حجم ۱۰۰ صفحات کاغذ سپید کتابت وطباعت صاف و روشن قیمت ۲ رسالانہ قیمت تین روپئے۔

پتہ:- پنجاب بکڈپو لاہور،

ادبِ لطیف کی عمر ابھی کوئی ایسی بڑی نہین، لیکن اتنے ہی دنون مین اس نے خاصی ترقی کرلی ہے جس کا ثبوت اس کا افسانہ نمبر ہے، اس نمبر مین ہر رنگ و مذاق کے اچھے افسانے فراہم کئے گئے ہین "یونانی رقاصہ"، "اینجی"، "بوڑھی ایکٹرس" اور "دختر صحرا" دلچسپ اور پڑھنے کے لائق افسانے ہین، مفید او نتیجہ خیز افسانون کی بھی خاصی تعداد ہے، ان مین "دلہن کا سلام"، "خانۂ خدا"، "جواری"، اور "دوسری بیوی" خاص طور سے سبق آموز ہین، نظم کا حصہ بھی غنیمت ہے، ظاہری زینت کے لئے چند تصاویر بھی زیب رسالہ ہین، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر نہایت کامیاب ہی،

**ادب محمود آباد نمبر**، مرتبہ جناب ناصر لکھنوی حجم ۹۰ صفحات کاغذ صاف و دبیز کتابت وطباعت بہتر، قیمت درج نہین، غالباً ایک روپیہ تک ہوگی، پتہ دارالاشاعت نظامی پریس لکھنؤ،

ادب لکھنؤ کے وقیع اور سنجیدہ رسالون مین ہے، والی ریاست محمود آباد کی گدی نشینی کی تقریب کی یادگار مین اس نے "محمود آباد نمبر" نکالا ہے، جسمین علمی، ادبی، تاریخی، اور افسانے ہر مذاق کے مضامین ہین، محمود آباد نمبر کی مناسبت سے ریاست محمود آباد کی مختصر تاریخ، اور اوس کے امرا کے حالات ہین، علمی مضامین مین مولوی سید ظفرالحسن کا تنقیدی مضمون "خواب نوشین یا نغمۂ غم"، مفید اور فارسی زبان سے ذوق رکھنے والون کے پڑھنے کے لائق ہی،

موجودہ دور کی تنگ نظری نے جسے خوش مذاقی اور سلامت ذوق سے تعبیر کیا جاتا ہی داغ کی شاعری پر بڑا ظلم کیا ہی اور اوس کے بانکپن اور اوس کی دلکش شوخیون کو اخلاقی نقطۂ نظر سے نشانہ ملامت بنایا جاتا ہے، لیکن سلیم المذاق ناقدین یہ نہین سمجھتے کہ وہ کوئی واعظ نہین، مصلح نہین،

بلکہ صرف مصور جذبات شاعر ہے، اس لئے اس کی شاعری سے اخلاقی سبق حاصل کرنے کی توقع کرنا خود اپنی غلطی ہے، ہماری زبان کے مشہور کہنہ مشق ادیب مرزا عسکری صاحب نے "داغ کی شاعری پر ایک بسیط نظر" میں داغ کی خصوصیات دکھائی ہیں، اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ معاملہ بندی جو داغ کی شاعری کا ذمیمہ شمار کی جاتی ہے، ہمیشہ سے شعراء کا موضوعِ سخن رہی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ داغ کے یہاں یہ رنگ زیادہ ہے، پھر بھی اونھوں نے جس شائستگی سے اس کو نباہا ہے وہ دوسروں کے بس سے باہر تھا،

"مسدس حالی کے معترضین کی بے اعتدالیان" کے عنوان سے مسدس اور اوس کے تقریب نگاروں کی تحریروں پر جو تبصرہ کیا گیا ہے، اگر وہ محض انیس پر حملے کے جواب کی حد تک محدود رہتا تو قابلِ اعتراض نہ تھا، لیکن اس لپیٹ میں غریب مسدس کو لے لینا کون سا اصولِ نقد اور کہاں کا انصاف ہے، ان کے علاوہ اور متعدد مضامین اور افسانے اور امرائے محمود آباد اور تقریب جشن کے متعدد فوٹو ہیں،

**عصمت راشد الخیری نمبر**، مرتبہ رازق الخیری صاحب حجم ۲۹۰ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰،

کاغذ سپید کتابت وطباعت معمولی قیمت عہ سالانہ للعہ، پتہ دفتر عصمت کوچہ چیلان دہلی،

مولانا راشد الخیری مرحوم کے لائق فرزند اور جانشین رازق الخیری صاحب نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں ان کے محبوب رسالہ عصمت کا خاص نمبر نکالا ہے، مولانا مرحوم جیسی جامع اور ہمہ گیر شخصیت رکھتے تھے، اور اونھوں نے زبان و ادب اور نسوانی دنیا کی جیسی گران قدر خدمات انجام دی ہیں اسکے لحاظ سے اسکی ضرورت تھی کہ اون کی زندگی کے ہر پہلو کو دکھایا جائے، اس نمبر نے اس ضرورت کو پورا کر دیا، اور مولانا مرحوم کے اعزہ احباب، قدر دانوں اور ہندوستان کے بہت سے مشاہیر اور اہلِ قلم نے انکی خانگی، معاشرتی زندگی انکی علمی اور قومی خدمات، ان کے کارناموں، غرض اون کی زندگی کے ہر پہلو پر معلومات کا کافی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، مولانا کی علمی اور قومی خدمات سے تو کم و بیش تعلیم یافتہ طبقہ واقف تھا، لیکن انکی خانگی زندگی کے واقعات اور اون کے محاسنِ اخلاق اس آئینہ کے علاوہ اور کہیں نظر آ سکتے تھے، مضامین کے علاوہ

اس نمبر مین متعدد نظمین جو مولانا کی وفات پر لکھی گئی ہین، مرثیہ خوان مین مختلف مانون کی چند تصاویر بھی ہین،

**کنول آگرہ کا خاص نمبر** ، مرتبہ منظور صاحب صدیقی اکبرآبادی حجم ۴۴ صفحات تقطیع اوسط کاغذ کتابت طباعت صاف اور عمدہ قیمت ۲ر سالانہ چندہ ۳ روپیہ، پتہ جنگ کی منڈی آگرہ،

آج کل ہر رسالہ اپنی ترقی کے ثبوت مین کوئی نہ کوئی خاص نمبر ضرور پیش کرتا ہی، یہی وجہ ہے کہ ابھی کنول کو نکلے زیادہ زمانہ نہین گذرا لیکن اوسکو خاص نمبر نکالنا پڑا، ظاہر ہے کہ ایک نونہال سے، اس باب مین وہ اہتمام ممکن نہین ہی، جو ایک جہاندیدہ سے ہو سکتا ہی، اسلئے معنوی اعتبارات دوسرے سالنامون کے مقابلہ مین اس کا پلہ کچھ ہلکا نظر آتا ہے، پھر بھی اسکی عمر کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہی، سنجیدہ مضامین مین "سلطنت آصفیہ کا نامور بانی" "شاعر و ناظم کی سرحد امتیازات" اور "ذکر ہیگو" خاصے مضامین ہین، افسانون مین "بدنصیب" نظامین ظاہر اور ظاہر پرست دنیا کے لئے عبرت آموز ہی، "اناطول فرانس کے مشہور ناول تائیس" کا ترجمہ عرصہ ہوا نامور ادیب مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے شائع ہو چکا ہی، پھر ل احمد صاحب کی اس سعی رائگان سے کیا حاصل ہی؟ "کنول" "چمن سخن" اکبرآباد کا رسالہ ہی، اسلئے قدرۃً نثر کے مقابلہ مین نظم کا پایہ زیادہ بلند ہو، مشاہیر شعرا کی اچھی اچھی غزلین اور نظمین ہین، قدامت کے لحاظ سے "مثنوی سحر معنی" لائق ذکر ہے،

**مساوات کا سالانہ نمبر** ، مرتبہ محمد منیرالدین صاحب حجم ۴۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ اور صاف قیمت ۲ر سالانہ قیمت ۶ر پتہ دفتر مساوات پھلواری شریف پٹنہ،

اس لحاظ سے مساوات کو ایک گونہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ایک خاص مقصد اپنے پیش نظر رکھتا ہی، یعنی مساوات اسلامی کی تعلیم اور اسکی تبلیغ و اشاعت، اسلئے سالنامہ مین خاص طور سے اس موضوع اور اس کے متعلقات پر اچھے مضامین فراہم کئے گئے ہین، لیکن ان مین بعض بحثین غیر متعلق آگئی ہین، اور کہین کہین لہجہ اور الفاظ مین درشتی اور تلخی پیدا ہو گئی ہے، جو ممکن ہے بعض جماعتون کی دل آزاری کا باعث ہو، یہ طرز تبلیغ اصولی حیثیت سے نہ مناسب ہی اور نہ مفید، بغیر ان مباحث کے بھی مساوات اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا،

شاہ محمد جعفر صاحب خطیب جامع کپورتھلہ کا مضمون "اسلام اور طلاق" مفید اور پرازمعلومات ہے "تاثیر القرآن فی حیات الانسان" "جھوٹی اقبال" "اچھوتوں اور ملت اسلامیہ کا نصب العین" "مسلمان بادشاہوں کی انصاف پسندی" اچھے مضامین ہیں، مولانا شاہ سلیمان قدس سرہٗ کے بعض ملفوظات تبرکاً شامل رسالہ ہیں، نظم کا حصہ بھی خاصہ ہے، جماعت مومنین کے چند ممتاز افراد کی تصویریں بھی رسالہ میں،

## سفیر سخن کا اردو ہندی سرکلر نمبر

مرتبہ ابوالکلیف صاحب سرحدی حجم ۲۰۰ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰ کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت مہ رسالانہ قیمت سے پتہ منیجر مجلہ سفیر سخن پشاور سرحد،

سفیر سخن کئی سال سے پشاور جیسے دور و دراز مقام سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، ۱۹۳۶ء کا خاص نمبر اس نے "اردو ہندی سرکلر نمبر" کے نام سے نکالا ہے، اردو ہندی کا جھگڑا اتنا عالمگیر ہو گیا ہے کہ صوبہ سرحد بھی اس سے نہ بچ سکا، چنانچہ وہاں بھی کئی سال سے یہی کشمکش جاری ہے، کچھ عرصہ ہوا وہاں کے شعبہ تعلیم نے بعض مالی دقتوں اور صوبہ سرحد کی اکثریت (جسے کلیت کہنا زیادہ موزون ہے) کے جذبات کو مدنظر رکھکر ایک سرکلر جاری کیا تھا جس کی رو سے پانچ سال کے لئے تجربۃً صوبہ کی عام اور مشترک زبان ہندوستانی ذریعہ تعلیم قرار دی گئی تھی، اس سرکلر میں بھی پہلی دو جماعتیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھی گئی ہیں، اور ان میں ہندی، گورمکھی اور پشتو زبان میں تعلیم دینے کی آزادی حاصل تھی،

اس سرکلر کو بھی حسب معمول ہندوؤں نے فرقہ دارانہ آنکھ سے دیکھا، اور پشاور سے لیکر پنجاب بلکہ دوسرے صوبوں تک ایک شور مچ گیا، اخبارات میں اسکے خلاف بڑے بڑے مضامین نکلے، جلسوں میں پرزور تقریریں ہوئیں، کونسل میں سوالات ہوئے، غرض ہر سمت ایک غل مچ گیا، جس کی تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں،

سفیر سخن کے اس خاص نمبر میں اس سرکلر کے اسباب و نتائج کے متعلق تفصیلی معلومات و مقالات جمع کئے گئے ہیں، ان کے دیکھنے سے صوبہ سرحد کے ساتھ ہندوؤں کے اس دیرینہ عناد کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے جس کا ثبوت وہ ہمیشہ سے دیتے چلے آئے ہیں، اس سلسلہ میں بہت سے دلچسپ اور حیرت انگیز

معلومات جو اس موضوع سے متعلق ہین سامنے آگئے ہین، یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ صوبہ سرحد مین بھی جہان پچانوے فیصدی مسلمان اور صرف پانچ فیصدی سکھ اور ہندو ہین ستر فیصدی سکھون اور ہندوؤن کی تعلیم پر صرف ہوتا ہے، اور صرف تیس فیصدی جاہل مسلمانون پر اور سرکاری و غیر سرکاری تمام محکمون مین بڑے بڑے عہدون پر ہندو ہی قابض ہین، اس خاص موضوع کے متعلقہ مضامین کے علاوہ عام دلچسپی کے لئے متعدد سنجیدہ مضامین اور افسانے بھی ہین،

**طلبہ کا سالگرہ نمبر** مرتبہ محمد ابراہیم صاحب صدیقی و محبوب الرحمٰن صاحب

حجم ۱۰۶ صفحات تقطیع (۲۰ × ۳۰) کاغذ سپید، کتابت و طباعت اچھی، قیمت آٹھ آنے، سالانہ قیمت ۱۲؍ پتہ دفتر طلبہ عید گاہ مجگوان بارا عید گاہ، پورنیہ،

جیسا کہ اس رسالہ کے نام سے ظاہر ہے، یہ خاص طلبہ کا رسالہ ہے، جو ان مین تحریر و مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے نکلتا ہے، لیکن مضامین مین طلبہ کی تخصیص نہین ہے، طلبہ کو دیکھتے ہوئے سالنامہ خاصہ ہے: سنجیدہ، مزاحیہ، افسانے ہر قسم کے مضامین ہین، افسانون کا حصہ زیادہ ہے، لیکن طلبہ کے مفاد کے مضامین سے سالنامہ بالکل خالی ہے، حالانکہ یہ موضوع اس رسالہ کا خاص مقصد ہونا چاہئے، چند نظمین بھی ہین؛ بہرحال مجموعی حیثیت سے طلبہ کی یہ کامیاب کوشش لایق ستایش ہے،

**ہمدرد صحت دہلی کا عورت نمبر** مرتبہ حکیم حاجی عبد الحمید صاحب دہلوی

حجم ۲۰۶ صفحات، تقطیع (۲۲ × ۲۹) کاغذ سپید، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت سالانہ ایک روپیہ خاص نمبر کی قیمت باختلاف کاغذ ۱۲؍ و ۸؍ پتہ ہمدرد منزل لال کنوان دہلی،

طبی رسالون مین ہمدرد صحت نہایت مفید رسالہ ہے، جو اپنی ادویہ کے اشتہار کے ساتھ صحت و علاج کے متعلق مفید مضامین پیش کرتا ہے، حال مین اوس نے ایک خاص نمبر

عورت نمبر کے نام سے نکالا ہے، عموماً اس قسم کے نمبروں میں ترغیبات جنسی کے مضامین کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، لیکن ہمدرد صحت کا یہ نمبر خاص طبی نقطۂ نظر سے شائع کیا گیا ہے، اس میں نسوانی اعضا، اون کے وظائف، امراض، علاج حمل، اوس کے مدارج، اسکی احتیاطیں، وضع حمل، ان کے معالجات اور عام صحت و تندرستی وغیرہ عورت کے جملہ متعلقات پر طب جدید و قدیم دونوں کے نہایت مفید اور پر از معلومات مضامین ہیں، اسلئے یہ نمبر نہ صرف عام لوگوں کے لیے بلکہ خواص اور اطبا کے لئے بھی معالجات نسوانی کا ایک اچھا نصاب ہے، رسالہ میں نفس موضوع کے متعلق اور بعض مقالہ نگاروں کی متعدد تصاویر ہیں،

**صدائے نسوان سالانہ نمبر**، مرتبہ انور بزمی و سعید الرحمٰن صاحب، حجم ۱۲۰ صفحات، تقطیع ۲۰ × ۳۰ کاغذ سپید، کتابت و طباعت اچھی، سالانہ قیمت سے رسالنامہ کی قیمت درج نہیں، پتہ صدائے نسوان ترکمان گیٹ دہلی،

سالناموں کی کچھ ایسی ہوا چل گئی ہے کہ نومولود رسائل ابھی اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہونے پاتے کہ اون کو سالنامے کے لئے دوا دوش کرنی پڑتی ہے، جس کا بار ان کی طاقت سے باہر ہوتا ہے، صدائے نسوان معمولی اشاعتوں میں اوسط درجہ کا مختصر نسوانی رسالہ ہے لیکن سالنامے کا بار وہ نہ اوٹھا سکا، اس لئے اوس کے بیشتر اچھے مضامین "مذہب اسلام"، "خازنۂ اسلام"، "نظام اخلاق"، اور "صحت و تندرستی"، پورے کے پورے کتابوں سے منقول ہیں، چند نئے اور مفید مضامین بھی ہیں، "اخبار و افکار" کے ماتحت عورتوں کے لئے مفید معلومات جمع کئے گئے ہیں، "ترکی خواتین کے حالات" "روسی خواتین کی آزادی" اور "اسلام اور طبقۂ نسوان" عورتوں کے پڑھنے کے لائق ہیں، لیکن پھر بھی خالص نسوانی مذاق کے مضامین کی جو اس سالہ کی اصل غرض و غایت ہے، بڑی کمی ہے،

"م"

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۰ — اکتوبر ۱۹۳۶ء

# معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

---

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

# دار المصنفین کی تاریخی کتابیں

**تاریخ صقلیہ جلد اول:** مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی، اور اسپین کی طرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، وہ تقریباً پانسو برس تک اس سے وابستہ رہے مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اسکی تاریخ مرتب کی گئی ہے جن میں سے پہلی جلد اب شائع ہوئی ہے، جو سیاسی سرگذشت پر مشتمل ہے، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی کی وجہ تسمیہ، سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتداء، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب جلاوطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہے، ضخامت مجموعی ۵۴۰ صفحے کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت: للعہ جلد دوم زیر طبع ہے، مرتبہ سید ریاست علی ندوی۔

**تاریخ فقہ اسلامی:** مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، حجم ۴۸۰ صفحے، قیمت للعہ مترجمہ مولانا عبدالسلام ندوی،

**رقعات عالمگیر:** اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اور رقعات جو شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں اور ان سے علم و ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۲۹۷ صفحات، چھپائی لکھائی کاغذ بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب قیمت: للعہ مرتبہ سید نجیب اشرف ایم اے ندوی

**مقدمہ رقعات عالمگیر:** اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فن انشاء، شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے ماخذ، اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط اور رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ ضخامت ۷۰۴ صفحے، قیمت: عہ مصنفہ سید نجیب اشرف ایم اے، ندوی،

**الفاروق:** یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل، اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولانا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۳۱۲ صفحے، قیمت: للعہ

**خلفائے راشدین:** سیر المہاجرین کا حصہ اول، چاروں خلفاء کے ذاتی فضائل اور مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا تذکرہ، حجم ۴۸۰ صفحے قیمت: [illegible] از مولانا حاجی معین الدین ندوی

(دار المصنفین کی کتابوں کی مفصل فہرست دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ سے طلب کیجئے)

مسعود علی ندوی، منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۳۸ | ماہ رجب المرجب ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء | عدد ۴

## مضامین


| مضمون | مصنف | صفحات |
| --- | --- | --- |
| شذرات، | سید سلیمان ندوی | ۲۴۲-۲۴۴ |
| تابعین، | شاہ معین الدین احمد ندوی، | ۲۴۵-۲۵۸ |
| دیوان شمس تبریز اور مولانائے روم، | مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے حیدرآباد دکن | ۲۵۹-۲۶۲ |
| نقشے، | پروفیسر معتقد ولی الرحمن صاحب ایم اے، | ۲۶۳-۲۸۵ |
| مظہر الانسان کا مصنف، | مولوی عبداللہ صاحب چغتائی | ۲۸۶-۲۸۹ |
| روس کا آئندہ دستور حکومت، | "ع ز" | ۲۹۰-۲۹۳ |
| امریکہ میں خودکشی کی رفتار، | " | ۲۹۳-۲۹۵ |
| ملک کی خوشحالی پر آفتاب کے داغوں کا اثر، | " | ۲۹۶-۲۹۷ |
| اخبار علمیہ، | " | ۲۹۸-۳۰۱ |
| حقیقت دل، | جناب عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی | ۳۰۲-۳۰۳ |
| غزل، | مولنا عبدالسلام ندوی، | ۳۰۳ |
| رنگ تغزل، | جناب احسان دانش صاحب، | ۳۰۴ |
| "دی ریل سیواجی" | "ص ع" | ۳۰۵-۳۰۷ |
| چند نئے رسائل و اخبارات، | "م" | ۳۰۸-۳۱۹ |
| مطبوعات جدیدہ، | " | ۳۱۰-۳۲۰ |

# شذرات

دار المصنفین میں ایک مفصل و مبسوط تاریخ اسلام کی تالیف کا خیال شروع سے تھا، پانچ چھ برس ہوئے کہ مختلف رفقاء کو اس تاریخ کی مختلف جلدیں حوالہ کی گئیں، انھوں نے اس مدت میں اپنے اپنے دور کی تاریخ کا مطالعہ کیا، واقعات کی تلاش و تحقیق کی، اور بڑی بڑی سلطنتوں سے لیکر چھوٹی چھوٹی ریاستوں تک کا پتہ لگایا، اور دو دو جلدوں میں مشرقی، مغربی اور ترکی سلطنتوں کی تاریخیں مرتب کیں، اور اب موجودہ اندازہ کے مطابق یہ تاریخ چھ ضخیم جلدوں میں تمام ہوگی، اس کی چھپائی کا کام امید ہے کہ آیندہ سال سے شروع ہو جائے،

ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ایک نیا ادبی معجزہ ضرب کلیم[1] کے نام سے ظاہر ہوا ہے، اس میں موصوف کی وہ تازہ اردو نظمیں ہیں جن میں اسلام کے نقطۂ نظر سے زمانۂ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہ یہ حضرت کلیم کی وہ ضرب ہے جو بحر احمر پر پڑی تھی جس سے دریا پھٹ گیا تھا، اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی، یا وہ ضرب ہے جو وادی تیہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی، جس سے پانی کی بارہ دھاریں بنی اسرائیل کے پیاسوں کے لئے پھوٹی تھیں، بہرحال ان دونوں سے جو ہو وہ ہمارے لئے فال نیک ہی ہے،

حضرت اقبال کی شاعری، اب شاعری کے حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے اور اِنّ مِنَ الشّعرِ لحکمۃً کے خلعتِ نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے، اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں، بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے، اب وہ لطف و لذت نہیں، بلکہ بصیرت اور موعظت ہے، وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کے لئے نہیں، بلکہ ان کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ سمجھانے کیلئے ہے، وہ اب میدان جنگ کا رجز یا مسافران راہ کے لئے بانگِ درا نہیں، بلکہ وہ غور و فکر کے غار حرا سے ناموس اکبر کی آواز، اور جبریل امین کا پیام ہے،

[1] دفتر طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور، قیمت:- عہ/

آج کل یورپ سے چند نئی کتابین چھپ کر شائع ہوئی ہین، مثلاً روما سے ابو حاتم رازی کی منتخب اعلام النبوۃ، پیرس سے بیرونی کا رسالہ محمد بن زکریا رازی کی فہرست کتب مین، اور شیخ شہاب الدین سہروردی کا فارسی رسالہ آواز پر جبریل، اسی طرح برلن سے متکلمین کے جزء لا یتجزیٰ پر جرمن مین ڈاکٹر پینس (PENES) کا مقالہ اور پیرس سے شہر کوفہ کے نقشہ اور تشریحات پر پروفیسر میسنیون کا مقالہ فرنچ مین،

امسال مرحوم مارماڈیوک پکتھال کے علاوہ جن کو ہم سب جانتے تھے، کئی نامور مستشرقین نے وفات پائی، اٹلی کے پرنس کائتانی اور پروفیسر گویدی اور لائڈن کے پروفیسر اسنوک ہرخرونئے نے امسال ہماری دنیا کو الوداع کہا، پرنس کائتانی تاریخ اسلام کے عالم، اور گویدی عربوں کے ریاضیات اور جغرافیہ کے ماہر اور اسنوک ہرخرونئے "محمڈنزم" نامی کتاب کے مصنف ہین، جس کو انھون نے خطبہ کی صورت مین امریکہ کی مجلس تاریخ مذاہب مین پیش کیا تھا، اور بھی دوسری کتابین اور مضامین ان کے قلم سے نکلے تھے،

مصر مین جب سے شیخ مصطفی المراغی نے ازہر کی عنانِ مشیخت اپنے ہاتھ مین لی ہے، وہان بہت سی اصلاحات وجود مین آئی ہین، اب ازہر پرانا مدرسہ نہیں رہا، بلکہ یورپ کے طرز کی یونیورسٹی بن رہا ہے، اس وقت وہان کی اعلیٰ تعلیم تین کالجون پر منقسم ہے، عربی زباندانی کا کالج (کلیۃ اللغۃ العربیۃ) مذہبی عقائد کا کالج (کلیۃ اصول الدین) اور فقہی علوم کا کالج (کلیۃ الشریعہ) ہر ایک کی تعلیم کی مدت چار سال ہے، اس کے بعد تخصص، یعنی خاص خاص علوم مین تکمیل کے درجے ہین، پہلے کالج مین تکمیل کے دو شعبے ہین، نحو و قواعد، اور بلاغت، دوسرے کالج مین اس کے چار شعبے ہین دعوت و تبلیغ و ارشاد، توحید و کلام، علوم قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام، تیسرے کالج کے دو تکمیلی شعبے ہین، قضائے شرعی، اور فقہ و اصول، معلوم نہین اس نئے قالب مین دینداری کی پرانی روح بھی رہی یا نہین،

آجکل مصر مین قرآن پاک کے ترجمہ پر بڑے جھگڑے برپا ہین، ایک فریق اس کو ناجائز کہتا ہے، اور دوسرا اسکو واجب بتاتا ہے، اس پر فریقین نے رسائل اور مضامین لکھے ہین، خدا رحمت بھیجے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان پر کہ انھون نے فارسی اور ہندستانی میں قرآن پاک کا ترجمہ فرماکر ہندوستان کے مولویوں کو اس جھگڑے سے بچا لیا،

ورنہ عجب نہیں کہ یہاں جواز و عدم جواز سے بڑھ کر شاید کفر و اسلام کا معیار قرار پاجاتا،

مولانا شبلیؒ و مولانا حمید الدینؒ کے فتوا ے تکفیر پر دستخط کرنے والوں میں دوسری اہم شخصیت جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تھی، موصوف نے حقیقت حال سننے اور مولانا شبلی کی آخری تحریر دیکھنے کے بعد اپنے فتوے سے رجوع فرمایا، مولانا حمید الدین صاحب کے دونوں فقروں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کو زیادہ سے زیادہ نقص تعبیہ، یا سماجت بیان کہہ سکتے ہیں، ان سے کفر لازم نہیں آتا، ان کی پوری تحریر اخبار صدق لکھنؤ میں چھپی ہے، مولوی محمد طیب صاحب دیوبندی نے بھی رجوع کیا، انھوں نے اپنا خط مدینہ بجنور میں چھپوایا ہے، اسی طرح مولوی لطف اللہ صاحب شاہجہانپوری مدرس زکریا مسجد بمبئی نے بھی رجوع فرمایا، اُن کا خط اصلاح سرائے میر میں چھپا ہے، فالحمد للہ،

افسوس کہ اس مہینہ مولوی نور الحسن صاحب نیر (بی اے ال ال بی) خلف حضرت محسنؔ کاکوروی نے ایک مدت کی علالت کے بعد وفات پائی، وہ انگریزی کیساتھ عربی کے بھی عالم تھے، ندوۃ العلماء کے ممتاز رکن، اور دار العلوم کے سابق معتمد تھے، وہ سخنور سخن سنج سخن شناس سخندان سب کچھ تھے، ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ اردو لغت نور اللغات کی تالیف ہے، خدا ہمارے اس ادیب شاعر کو اپنی رحمت کے انعام و اکرام و صلہ سے سرفراز فرمائے،

ہمارے دوست کشن پرشاد کول نے ہندوستانی میں ہندی اردو پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ہندی اور اردو دونوں کے لئے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہیں، اور ملک کی سرکاری تعلیمی اور عام صوبجاتی زبان انگریزی قائم رہے، پہلی تجویز تو وہی ہے جس کا زمانہ اپنے اصول کے مطابق پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ نہ اردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، نہ ہندی اُردو کو، اور دونوں اپنی اپنی راہ چلتی رہینگی لیکن دوسری تجویز ایک سیاسی اہل الرائے کی دور بینی سے بہت دور ہے، اس مادری زبان کی عالمگیری تو اسی وقت تک ہے جبتک اسکی شہنشاہی کا چتر آپکے سر پر سایہ فگن ہے، کیا آج اکبر اور عالمگیر کی فارسی شہنشاہی قائم ہے؟ تو پھر کل کیلئے انگریزی کی شہنشاہی کا تصور آپ کیونکر کر سکتے ہیں، حکمران قوم کی زبانی حکمرانی، انکی شاہی حکمرانی کیساتھ ہے، امریکہ کی مثال نہ پیش کیجئے کہ وہ بیچ میں قوم پہلے سے نہ اپنا کوئی تمدن رکھتی تھی، نہ قومیت نہ حیثیت نہ زبان

# مقالات

## تابعینؒ

### اور اُن کے علمی اور مذہبی کارنامے

از شاہ معین الدین احمد ندوی

تم دنیا کے کسی مذہب کی تاریخ پر نظر ڈالو تم کو اس کے ابتدائی ابواب عملی نمونوں سے خالی نظر آئینگے، تمام مذاہب عالم میں یہ امتیاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے دورِ تاسیس ہی میں اپنے پیروون کی ایسی جماعت پیدا کر دی تھی، جو اسلامی تعلیمات کا مجسم پیکر تھی جس کے آئینۂ عمل مین اس کے ایک ایک خط و خال نمایاں تھے، یہ جماعت صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تھی، جو آنحضرت صلعم کے بعد تعلیماتِ اسلامی کی حامل اور دینی علوم کی وارث ہوئی،

پھر یہ سلسلہ صحابہ پر تمام نہین ہو گیا، بلکہ اسلام کی سحر آفرین روحانیت کے اثر سے کئی پشتون تک اسی زور و قوت کے ساتھ قائم رہا، جنھین ہم اصطلاح مین "تابعین" اور "تبع تابعین" کے نام سے تعبیر کرتے ہین، قرآن نے برسون پہلے اس مقدس طبقہ کا تعارف کرا دیا تھا، کہ وہ مہاجرین و انصار کے نقشِ قدم پر ہو گی، اور رضوانِ الٰہی کے طغرائے امتیاز سے سرفراز ہو گی،

| | |
|---|---|
| وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ | اور مہاجرین و انصار میں جن لوگوں نے قبولِ اسلام میں |
| وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ | سبقت کی اور سب سے پہلے ایمان لائے اور جو لوگ |

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ وَاَعَدَّ لَھُمْ جَنّٰتِ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (توبہ)
خوبی کے ساتھ ان کے پیچھے ہوئے. خدا اُن سے خوش، اور وہ خدا سے خوش ہیں، خدا نے ان کیلئے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں،

احادیث میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ان کو خیر کے لفظ سے یاد فرمایا گیا ہے،

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم
زمانوں میں سے سب سے اچھا میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہونگے. پھر وہ لوگ جو انکے بعد ہونگے،

یعنی اسلام کے تین طبقات یا تین عہد زریں ہیں جن میں مسلمانوں کے کل قوی پورے شباب پر ہونگے، ان میں ہمارا موضوع بحث تابعین کا طبقہ ہے جس نے صحابہ کرام سے علمی اور روحانی فیض حاصل کر کے اس کو سارے عالم میں پھیلایا،

**تابعی کی تعریف** صحابہ کی طرح تابعین کی تعریف میں بھی علماء کا اختلاف ہے، بعضوں کے نزدیک تابعی وہ ہے جس نے کسی صحابی کی صحبت اٹھائی ہو بعض صحبت اور ہم نشینی کو بھی ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ صرف صحابی کی رویت کو کافی سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت تابعی وہ ہے جو کسی صحابی کی صحبت اور اس کے کمالات سے فیضیاب ہوا ہو، اور اسی میں کمی یا زیادتی اور زمانہ نبوت سے قرب و بعد کے اعتبار سے تابعین کے طبقات قائم کئے گئے ہیں،

**جماعت تابعین اور عہد تابعین میں فرق** تابعین صحابہ کرام کے دامن فیض کے تربیت یافتہ تھے، اس لئے علمی و اخلاقی کمالات میں ان کا عکس و پرتو تھے لیکن اس موقع پر ایک فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ جماعت تابعین اور عہد تابعین دونوں میں بڑا فرق ہے، شرف صحبت اور اس کے آثار کو چھوڑ کر مذہبی روح کے اعتبار سے تابعین اور صحابہ میں بہت کم فرق تھا، جو فرق تھا بھی وہ تابعیت کے نقص و کمال کے اعتبار سے تھا، اور یہ فرق وہ ہے جس سے جماعت صحابہ بھی مستثنیٰ نہ تھی، مہاجرینؓ و انصارؓ اور فتح مکہ

کے بعد مؤلفۃ القلوب صحابہ مین علانیہ فرق نظر آتا ہے، اس کے مقابلہ مین دورِ تابعین مین عہدِ رسالت کے بعد، دولت کی فراوانی، غیر اسلامی تمدن کی اشاعت اور غیر قومون کے میل جول سے یہ دور بہت کچھ بدل گیا تھا، اور بیرونی اقوام کے اثرات سے عہدِ صحابہ کی سادگی ختم ہوگئی تھی، لیکن تابعین کی جماعت اس سے اثر پذیر نہ ہوئی، بلکہ اسلام کی امانتون کو محفوظ رکھکر اسکو ساری دنیا مین تقسیم کیا،

جہانتک خالص دینِ اسلام کا تعلق ہے، عہدِ نبوی مین مکمل ہوچکا تھا، آنحضرت صلعم نے اس کی ایک ایک تعلیم کو برت کر دکھا دیا تھا، اور صحابہ نے اُسے جان لیا تھا، پہچان لیا تھا اور عمل کرکے دکھا دیا تھا، اور الیوم اکملت لکم دینکم کی تکمیل کے بعد اس مین کسی ترمیم و اضافہ کی گنجایش نہ تھی، لیکن اس کے جزئیات تفصیلات اور متعلقات مین ترقی کی بڑی وسعت تھی جو تابعین کے ہاتھون مکمل ہوئی، انھون نے جزئیاتِ مسائل کا استقصار کیا، علوم دینیہ کی بنیاد رکھی، نئے علوم پیدا کئے، اسلام کی اشاعت کی، مذہبی علوم کو پھیلایا اور اس قبیل کے بہت سے کام کئے جو عہد صحابہ مین تشنۂ تکمیل رہ گئے تھے،

ان کا سب سے بڑا کارنامہ دینی علوم کی خدمت، اس کی حفاظت و اشاعت ہے، اس لئے سب سے اوّل ہم اسی کو پیش کرتے ہین، انھون نے بڑی جانکاہ مشقتین اٹھاکر دنیاے اسلام کے گوشہ گوشہ سے ایک ایک دانہ چُنکر علم کا خرمن جمع کیا، اگر وہ اس راہ مین بڑی بڑی قربانیان کرکے علم کو محفوظ نہ کرتے تو دینی علوم کا بڑا حصہ برباد ہوجاتا، آج ہمارے پاس ان کا جو کچھ ذخیرہ ہے، وہ سب تابعین ہی جانکاہیون کا طفیل ہے، اس مختصر مضمون مین اس پر تفصیلی بحث کی گنجایش نہین، اس لئے صرف اجمال اور سرسری تبصرہ پر اکتفا کیجاتی ہے،

**عہد تابعین مین حصول تعلیم کی دشواریان**

جب ہم اس عہد کے تعلیمی نظام اور حصولِ تعلیم کی دشواریون پر نظر ڈالتے ہین تو تابعین کے خدمات کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اس زمانہ مین آجکل کی طرح تعلیم و تعلم کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا، نہ یہ سہولتین میسر تھین اور نہ تعلیم کے لئے کوئی خاص مقام مخصوص

تھا کہ مدینہ، کوفہ، اور بصرہ وغیرہ علمی مرکز ضرور تھے لیکن ان مین سے کوئی مقام ایسا نہ تھا جو علم کے حقیقی جویا کو دوسرے مقامات سے بالکل مستغنی کر دیتا۔ بلکہ اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ دینی علوم کے سرچشمے ساری دنیائے اسلام مین پھیل گئے تھے، اس لئے ایک شائق علم کو خراسان سے لیکر مصر و مغرب تک کی خاک چھاننی پڑتی تھی، دنیائے اسلام مین کوئی مرکزی مقام ایسا نہ تھا جہان صحابہ کی مسندِ علم و ارشاد نہ بچھی ہو، مثلاً حضرت علیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سعید بن زیدؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، سلمان فارسیؓ، ابو مسعود انصاریؓ، براء ابن عازبؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، عمار بن یاسرؓ، خبابؓ بن ارت وغیرہ اکابر صحابہ زیادہ تر کوفہ مین مقیم تھے، عتبہ بن غزوانؓ، بریدہ بن حصیبؓ، ابو برزہ اسلمیؓ، عمران بن حصینؓ، انسؓ ابن مالک، ثابت بن زیدؓ، ابو بکرہؓ، معقل بن یسارؓ وغیرہ کا مستقر بصرہ تھا، ابو درداء انصاریؓ، بلال حبشیؓ، امیر معاویہ وغیرہ صحابہ کی ایک معتد بہ تعداد شام مین تھی، عمرو بن العاصؓ، عبد اللہ بن عمرو بن العاص وغیرہ مصر مین تھے، ابن سعد نے ہر ہر ملک کے صحابہ کے علٰحدہ علٰحدہ طبقات لکھے ہین، جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتوحہ ممالک میں سے کوئی ایسا ملک نہ تھا جہان صحابۂ کرام کے قدم نہ پہنچے ہون، تابعین کے عہد مین اس کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو گیا تھا، صحابہ عموماً مرکزی مقامات پر رہتے تھے اور تابعین تو قریہ قریہ مین پھیل گئے تھے، ایسی حالت میں ایک طالب علم کو مشرق سے لیکر مغرب تک کا دورہ کرنا پڑتا تھا، لیکن یہ دشواریان تابعین کے ذوقِ طلب مین حارج نہ ہو سکین، اور انھون نے دینی علوم کی تحصیل کے لئے ساری دنیا کی خاک چھان ڈالی،

**حصولِ تعلیم کی راہ میں تابعین کی مشقتین**

مکحول دمشقی نے جو بڑے جلیل القدر تابعی ہین تحصیلِ علم کے لئے ساری دنیائے اسلام کا سفر کیا، سب سے پہلے انھون نے مصر مین جو ان کا ابتدائی مستقر تھا علم حاصل کیا، جب یہان کا سارا علم اپنے دامن مین سمیٹ چکے تو مدینہ گئے، یہان سے لعل و گہر لینے کے بعد عراق پہنچے، پھر شام کا سفر کیا، غرض انھون نے دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان مارا، ان کا خود بیان ہے کہ

میں نے علم کی تلاش میں ساری دنیا کی خاک چھانی[1] علم کی تحصیل میں بڑی جانکاہ مشقتیں اٹھاتے تھے، امام شعبی سے جو بڑے جلیل القدر امام تھے، ایک شخص نے پوچھا آپ نے اتنا علم کہاں سے حاصل کیا، انھوں نے جواب دیا غم و اندوہ کو بھلا کر، ملک ملک کی خاک چھان کر، گدھوں کی قوت برداشت اور کووں کی سحر خیزی پیدا کرکے[2] پھر تحصیل علم کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، بلکہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، صالح بن کیسان نے سن کہولت میں تحصیل علم کی[3] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نامور غلام عکرمہ نے کامل چالیس سال طالب علمی کی[4]، قتادہ بچپن سے لیکر مرتے دم تک طالب علم رہے[5]، نافع نے تیس برس حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں بسر کردی[6]،

طلب علم کا ذوق ان کے رگ و ریشہ میں سرایت تھا، امام شعبی کا جنھوں نے خود بڑی محنت سے تحصیل علم کی تھی، مسروق بن اجدع کے متعلق بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ علم کا طالب نہیں دیکھا[7]، بحیر، خالد بن معدان کے بارہ میں کہتے تھے کہ میں نے ان سے زیادہ علم سے چمٹنے والا نہیں دیکھا[8]، امام ذہبی کثیر بن مرہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ امام عالم اور بڑے طالب علم تھے[9]، ابن شہاب زہری ہر وقت کتابوں کے ڈھیر میں گھرے رہتے تھے، ان کی بیوی تنگ آکر کہتی تھیں کہ یہ کتابیں میرے لئے تین سوتوں کے جلاپے سے زیادہ ہیں، (ابن خلکان ج اول ص ۴۵۱)

**ذوق علم کی وسعت و ہمہ گیری**

تابعین کا یہ ذوق کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ جملہ علوم کے ساتھ یکساں شغف تھا جس کا اندازہ ان کی جامعیت سے ہوتا ہے، ائمۂ تابعین بیک وقت تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ جملہ علوم کے امام تھے، سعید بن جبیر، عبداللہ بن عباسؓ کے حلقۂ درس میں شریک

[1] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۹۵، [2] ایضاً ص ۷۱، [3] ایضاً صفحہ ۱۳۳، [4] ایضاً صفحہ ۸۴،
[5] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۵۰، [6] تذکرۃ الحفاظ ج اول صفحہ ۸۹، [7] ایضاً صفحہ ۴۴،
[8] تذکرۃ الحفاظ ج ا صفحہ ۴۵ [9] ایضاً صفحہ ۴۴

ہوتے تھے جن میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، ادب و انشا، شاعری اور جملہ فنون کا دریا بہتا تھا[1]، اس حلقہ میں ہر علم و فن کے سائلین آتے تھے، ابن عباسؓ انھیں جو جوابات دیتے تھے ابن جبیر سب کو قلمبند کر لیتے تھے، بعض بعض دن سائلین کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ ابن جبیر کی بیاض پر ہو جاتی تھی، اور کپڑوں اور ہتھیلیوں پر لکھنے کی نوبت آجاتی تھی[2]،

ابن شہاب زہری کا ذوق اتنا ہمہ گیر تھا کہ جو کچھ سنتے تھے سب لکھ لیتے تھے، ابو الزناد کا بیان ہے کہ ہم لوگ صرف حلال و حرام کے مسائل قلمبند کرتے تھے اور زہری جو کچھ سنتے تھے سب لکھ لیتے تھے[3]، یہی وجہ ہے کہ ان کو جملہ فنون پر یکساں کمال حاصل تھا، جس فن پر وہ گفتگو کرتے تھے وہ ان کا خاص موضوع معلوم ہوتا تھا[4]

تابعین کا علمی درجہ | اس ذوق و طلب نے تابعین کو جملہ فنون میں صاحب کمال بنا دیا تھا، تفسیر، حدیث، فقہ، فرائض، مغازی، سیرت کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں بڑے بڑے ائمہ موجود نہ رہے ہوں،

تفسیر | تفسیر میں سب سے زیادہ ممتاز مجاہد بن جبیر کی شخصیت تھی، انھوں نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے جو صحابہ میں قرآن کے سب سے بڑے مفسر تھے، تیس مرتبہ قرآن کا دورہ کیا تھا[5]، اور اس محنت و تحقیق کے ساتھ کہ ہر ایک آیت کے جملہ متعلقات اور ما لہ و ما علیہ کا پورا استقصا کرتے جاتے تھے[6]، دوسرے ممتاز مفسر ابن عباسؓ کے غلام عکرمہ تھے جن کی انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ تعلیم و تربیت کی تھی، خصوصاً تفسیر بڑی محنت سے پڑھائی تھی[7]، تفسیر میں ان کا کوئی حریف نہ تھا، عباس بن مصعب مروزی کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ کے تلامذہ میں عکرمہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے[8]، امام شعبی کہتے تھے کہ عکرمہ سے بڑا تفسیر کا جاننے والا کوئی باقی نہیں ہے[9]، قتادہ جو خود بہت بڑے مفسر تھے ان کے کمال علم کے معترف تھے[10]، اس

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۳۰ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۶۷، [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸، [4] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۰۹ [5] ابن سعد ج ۵ ص ۹۰ [6] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳ [7] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۲، [8] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۴ [9] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۲ [10] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۶،

عہد کے بڑے بڑے فضلاء نے ان سے تفسیر حاصل کی ہے، چنانچہ مجاہد اور ابن جبیر ان سے استفادہ کرتے تھے، تیسرے مفسر سعید بن جبیر تھے، یہ بھی حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود کے خرمنِ کمال کے خوشہ چیں تھے[۳] یہ تفسیر کا درس بھی دیتے تھے[۴]

چوتھے بزرگ جابر بن زید تھے، یہ بھی حضرت عبداللہ بن عباس کے تلمیذ رشید تھے، ان کے شاگرد کے متعلق استاد کی یہ رائے تھی کہ اگر ان کے ہم وطن (بصری) کتاب اللہ کے بارہ میں جابر کا قول اختیار کریں تو قرآن میں ان کا علم نہایت وسیع ہو جائے[۵] پانچویں عالم قرآن قتادہ بن دعامہ سدوسی تھے، تفسیر قرآن پر ان کی نظر اتنی وسیع تھی کہ کوئی آیت ایسی نہ تھی جس کے متعلق ان کے کچھ نہ کچھ معلومات نہ رہے ہوں[۶]، امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ قتادہ تفسیر قرآن کے سب سے بڑے عالم تھے[۷]، ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ قرآن کے سب سے بڑے جاننے والے تھے[۸] چھٹے بزرگ حضرت حسن بصری تھے، انھوں نے بارہ سال کی عمر میں قرآن کی تعلیم حاصل کر لی تھی، اور اس محنت اور تلاش و تحقیق کے ساتھ تفسیر پڑھی تھی کہ جب تک ایک سورہ کی تفسیر و تاویل اور شانِ نزول وغیرہ جملہ معلومات کا پورا احاطہ نہ کر لیتے اس وقت تک آگے نہ پڑھتے[۹] صاحبِ درس بھی تھے ان بزرگوں کے علاوہ اور بہت سے مفسرین تھے لیکن یہ لوگ امتیازی پایہ رکھتے تھے،

**تفسیر کی اشاعت حفاظت اور تدوین**

ان بزرگون کے تفسیری کمال سے زیادہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے تفسیر کی حفاظت و اشاعت کی، ان مین ایک آدھ کے علاوہ باقی تمام صاحب درس تھے ان کے حلقۂ درس سے سیکڑون مفسرین پیدا ہوئے، اس سے بھی بڑی خدمت یہ ہے کہ ان میں سے بعض نے تفسیر قرآن پر مستقل کتابین لکھین جنکا اگرچہ آج کہین پتہ نہین ہے، لیکن کتابون

---

[۱] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۴ [۲] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۶ [۳] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲ [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹ [۵] ایضاً [۶] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۵۵ [۷] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۷،

میں ان کا ذکر ملتا ہے، ابن ندیم نے مجاہد، حسن بصری، سعید بن جبیر، امام باقر، عکرمہ اور حضرت علیؓ کے ایک رفیق ابو حمزہ کی تفسیروں کا ذکر کیا ہے[1] اگرچہ آج یہ ناپید ہیں، لیکن انہی بنیادوں پر تفسیر کی عمارت قائم ہوئی۔

**حدیث**

تفسیر سے زیادہ تابعین کو حدیث کے ساتھ ذوق بلکہ شغف و انہماک تھا، اس فن شریف کو انھوں نے جس ذروۂ کمال تک پہنچایا اس کی تفصیل کیلئے مستقل کتاب چاہیئے، تحصیل علم کے سلسلہ میں اوپر تابعین کی جن مشقتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ زیادہ تر حدیث ہی کی طلب میں تھیں،

**حدیث کا ذوق اور اس کی طلب میں شغف و انہماک**

سعید بن جبیر ایک ایک حدیث کی تلاش میں کئی کئی دن اور کئی کئی رات کا سفر کرتے تھے[2]، ابو قلابہ جرمی محض ایک حدیث سننے کے لئے تین تین دن تک مدینہ میں مقیم رہتے تھے[3]، ابن شہاب زہری احادیث کی تلاش میں مدینہ کی گلی گلی کا چکر لگاتے تھے، کمسن مسن، پیر و جوان اور زن و مرد مدینہ کے ہر فرد سے استفادہ کرتے تھے[4] مکحول نے ساری دنیائے اسلام چھان ڈالی، حدیث میں تابعین کی تلاش و جستجو کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک نہیں سیکڑوں تابعین ایسے ہیں جو دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے محدثین سے روایت کرتے ہیں،

**اخذ حدیث میں احتیاط**

لیکن اس ذوق و شوق اور تلاش و جستجو میں آنحضرت صلعم کا یہ فرمان ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا کہ "جو شخص عمداً میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے گا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے" اس لئے وہ اخذ حدیث اور روایت حدیث دونوں میں بڑے محتاط تھے، اور بغیر پوری چھان بین کے حدیثیں قبول نہ کرتے تھے، عامر بن شراحیل نے یہ اصول بنا دیا تھا کہ علم حدیث اسی شخص سے حاصل کرنا چاہیئے جس میں زہد و تقویٰ اور عقل و دانش دونوں اوصاف کا اجتماع ہو، ان میں سے محض ایک وصف رکھنے والا علم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا[5]، بہت سے تابعین جب تک اصل راوی سے روایت نہ سن لیتے اس وقت تک دوسرے کے بیان پر اعتماد نہ کرتے، ابو العالیہ

---

[1] ابن ندیم ص ۰۰، [2] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۴۲ [3] مسند دارمی ص ۷۴، [4] تہذیب الاسماء ج اول ص ۹۰

[5] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۷۴،

راوی کا بیان ہے کہ ہم اہل بصرہ بصرہ میں رسول اللہ کی روایات سنتے تھے مگر اس وقت تک ان پر اعتماد نہ کرتے تھے جب تک مدینہ جا کر خود ان کی زبان سے اس کی تصدیق نہ کر لیتے۔[۱] محمد بن سیرین کا قول تھا کہ علم حدیث دین ہے اس لئے اسے حاصل کرنے سے پہلے اس شخص کو خوب پرکھ لینا چاہئے۔[۲]

**حفظ حدیث میں تابعین کا درجہ** ان احتیاطوں کا مقصد صرف احادیث کی صحت تھی ورنہ اس کے حصول اور حفظ کی راہ میں تابعین نے جو جو مشقتیں اٹھائی ہیں اس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، انھوں نے اپنی انتھک کوششوں اور جانکاہ محنتوں سے تمام دنیائے اسلام کی حدیثیں اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیں، حسن بصری، ابن جبیر، ابن مسیب، سالم بن عبداللہ، طاؤس، عامر شعبی، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، عروہ بن زبیر، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، نافع، علقمہ، قتادہ، مجاہد، محمد بن سیرین، محمد بن مسلم زہری، محمد بن منکدر اور مکحول شامی وغیرہ احادیث کے بحر بے کران تھے، اس میں ان کے علم کی وسعت کا اندازہ ارباب فن کی ان رایوں سے ہوگا،

حسن بصری کو علامہ ذہبی علم کا سمندر لکھتے ہیں،[۳] سالم حضرت عبداللہ بن عمر کے جو صحابہ میں حدیث کے رکن اعظم تھے، خلف الصدق تھے،[۴] علامہ نووی ابن جبیر کو سرگروہ محدثین کے لقب سے ملقب کرتے ہیں،[۵] ابن مسیب اس پایہ کے محدث تھے کہ مکحول شامی جنھوں نے ساری دنیائے اسلام کے محدثین سے استفادہ کیا تھا کہتے تھے کہ میں نے ابن مسیب کے جیسا عالم نہیں پایا،[۶] امام زین العابدین فرماتے تھے کہ ابن مسیب گذشتہ آثار کے سب سے بڑے عالم تھے،[۷] طاؤس کا علم سارے ارباب علم میں مسلم تھا،[۸] امام شعبی نے حجاز، کوفہ، بصرہ، تینوں مرکز احادیث کی حدیثیں اپنے دامن میں سمیٹ لی تھیں،[۹] ان کے وسعت علم کا یہ حال تھا کہ کوئی حدیث ان کے حافظہ سے باہر نہ تھی، ان کا خود بیان تھا کہ میں نے بیس سال کے عرصہ میں کوئی ایسی حدیث نہیں سنی جس سے میں بیان کرنے والے سے زیادہ واقف نہ رہا ہوں،[۱۰] مکحول کہتے تھے کہ میں نے شعبی سے زیادہ سنت ماضیہ کا عالم نہیں دیکھا[۱۱]

---

[۱] ابن سعد ج ۷ ق اول ص ۱۴۲ [۲] ایضاً ص ۱۴۱ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶۲ [۴] تہذیب الاسماء ج ۱ ق اول ص ۲۱۶ [۵] ایضاً ص ۲۲۰ [۶] ابن سعد ج ۵ ص ۹۰ [۷] تہذیب الاسماء ج ۱ ق ۱ ص ۲۱۹ [۸] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۳ [۹] ایضاً ص ۷۲ [۱۰] ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۰،

عروہ حضرت عائشہ صدیقہ کے بھانجے تھے، حدیث میں حضرت عائشہؓ کا جو پایہ تھا وہ ارباب علم سے مخفی نہیں ہے، ان کا سارا ذخیرۂ حدیث عروہ نے اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا تھا[1]، امام زہری انھیں حدیث کا بحر بیکران کہتے تھے[2]، عطار کے حفظ کے ائمہ اہلبیت تک حدیث جن کے گھر کی دولت تھی قائل تھے، امام باقر لوگون کو انسے احادیث سننے کی ہدایت کرتے تھے[3]، عکرمہ حبر الامۃ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے ساختہ و پرداختہ تھے اور ان کی تمام حدیثین انھون نے محفوظ کر لی تھیں ابن عباسؓ کی مرویات کی تعداد ہزارون تک پہنچتی ہے انکا بڑا حصہ عکرمہ ہی سے مروی ہے، اس بے پایان علم نے ان کو حدیث کا دریا بنا دیا تھا[4]، علقمہ دوسرے حبر صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے تربیت یافتہ تھے، اور ان کی مرویات کا بڑا حصہ ان کے حافظہ میں محفوظ تھا، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ خود فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ میں جانتا ہون وہ سب علقمہ جانتے ہین[5] قتادہ کو حافظ ذہبی حافظ العلامہ لکھتے ہین[6]، ابن مسیب انھیں عراق کا سب سے بڑا محدث مانتے تھے، سفیان ثوری ان کو دنیا مین بے مثل سمجھتے تھے[7]، محدث ابن حبان انھین ان کے عہد کا سب سے بڑا حافظ حدیث لکھتے ہین[8]، مجاہد کو امام نووی امام الحدیث لکھتے ہین[9]، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جیسے بزرگ ان کے حفظ پر رشک کرتے تھے اور فرماتے تھے، کاش عکرمہ کا حفظ بھی تمھارے جیسا ہوتا[10]،

محمد بن سیرین کو امام ذہبی، امام نووی، حافظ ابن حجر وغیرہ تمام علمائے فن بالاتفاق امام حدیث لکھتے ہیں، امام زہری کو تلاش حدیث میں جو شغف و انہماک تھا، اس کا ذکر اوپر گذر چکا، پھر ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ ایک مرتبہ جو چیز سن لیتے تھے وہ ہمیشہ کے لئے نقش کالحجر ہو جاتی تھی[11]، اس ذوق اور حافظہ نے حجاز کے ثقات کا سارا علم ان کے سینہ مین محفوظ کر دیا تھا[12]، بعض روایات کے مطابق ان کے مرویات کی

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۸۲ [2] ایضاً [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ق ۱ ص ۳۳۴ [4] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۶ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۴۱ [6] ایضاً ص ۱۰۹ [7] تہذیب الاسماء ج ۱ ق ۲ ص ۵۰۷ و ۵۰۸ [8] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۰، [9] تہذیب الاسماء ج ۱ ق ۲ ص ۸۳ [10] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵ [11] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸ [12] ایضاً ص ۹۹

تعداد دو ہزار تک پہنچتی ہے[1]، محمد بن منکدر فن حدیث میں اپنے عہد کے امام تھے[2]، مکحول کے ذوق علم اور اسکی تلاش و جستجو کا حال اوپر گذر چکا ہے کہ انھون نے دنیاے اسلام کا کوئی گوشہ باقی نہین چھوڑا تھا، اور جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سب ان کے حافظہ مین محفوظ تھا[3]، جس طرح عکرمہ حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباس کے تربیت یافتہ تھے اسی طرح نافع ابن عمرؓ کے ساختہ و پرداختہ تھے، انھون نے بڑی توجہ سے ان کی تعلیم و تربیت کی تھی، اور اپنا سارا علم ان کے سینہ مین منتقل کر دیا تھا، چنانچہ ابن عمرؓ کی مرویات کا بڑا حصہ جن کا شمار ہزارون تک پہنچتا ہے، ان کے سینہ مین محفوظ تھا[4]، اور انہی سے مروی ہے جس کا ثبوت موطا امام مالک ہے جس کی بیشتر مرویات مالک عن نافع عن ابن عمر پر مشتمل ہین، حافظ ذہبی نافع کو امام العلم[5] لکھتے ہین۔

روایت حدیث مین احتیاط، لیکن اس وسعت علم کے باوجود تابعین کرام اخذ حدیث کی طرح روایت حدیث مین بھی بڑے محتاط تھے کہ روایت کی ذمہ داری اخذ حدیث کی ذمہ داری سے بھی بڑھ کر ہے، اس مین غلطی کا نتیجہ صرف ایک شخص کی ذات تک محدود رہتا ہے اور روایت مین غلطی اور بے احتیاطی کا نتیجہ عالمگیر ہو جاتا ہے، اس لئے بڑے بڑے ائمہ حدیث بیان کرنے میں بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے بلکہ گھبراتے تھے، محمد بن سیرین جب حدیث بیان کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز صاف کر رہے ہین یا ان پر خوف طاری ہے[6]، مسروق بن کدام جو بڑے محدث تھے، روایت حدیث کی ذمہ داری اور عظمت کو خیال کر کے فرماتے تھے کہ کاش یہ حدیثین میرے سر پر شیشے کا بار ہوتین اور گر کر چور چور ہو جاتین[7] یعنی میرے حافظہ سے محو ہو جاتین، علقمہ کی علالت کے زمانہ مین ایک شخص نے خواہش کی کہ آپ اس وقت تھوڑی دیر ہم کو سنت کی تعلیم دیتے، آپ نے فرمایا کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میری پیٹھ روندی جائے[8]، سلیمان بن طرخان تیمی اتنے محتاط تھے کہ حدیث بیان کرتے وقت ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا[9]، ابراہیم نخعی روایت میں آنحضرت صلعم

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۲، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳، [3] ایضاً ص ۹۵، [4] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱، [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۰، [6] ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۱۴۱، [7] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۰، [8] ابن سعد ج ۶ ص ۶۰، [9] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۵،

کی طرف نسبت نہیں کرتے تھے، ایک شخص نے ان سے پوچھا کیا آپ کو رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث نہیں پہنچی ہے جسے آپ بیان کریں جواب دیا پہنچی کیون نہین ہے، لیکن عمر، عبد اللہ، علقمہ اور اسود سے روایت کرنا میرے لئے آسان ہے[1] امام شعبی اشاعت حدیث کے خیال سے ایک زمانہ میں بے تکلف حدیثین بیان کیا کرتے تھے، لیکن پھر زمانہ کا رنگ دیکھ کر انھین کہنا پڑا، کہ گذشتہ سال کثرت روایت کو برا سمجھتے تھے، جو حقیقت مجھ پر بعد کو کھلی اگر پہلے منکشف ہو جاتی تو میں صرف محدثین کی متفقہ حدیثین بیان کرتا[2] عبد اللہ بن عون روایت کرنے سے اتنا گھبراتے تھے کہ اس کے خوف سے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا،[3] اسی احتیاط کی بنا پر بہت سے تابعین احادیث کو بالفاظہا روایت کرنا ضروری سمجھتے تھے، بعض روہ بدل کے خیال سے حدیثون کو قلمبند کر لیتے تھے، بعض کا عمل اس کے خلاف تھا کہ غلط روایت کے قلمبند ہو جانے سے اسکی غلطی اور زیادہ متعدی اور پائدار ہو جاتی تھی، غرض تابعین نے حدیث مین احتیاط اور اس کی صحت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہین رکھا،

**اشاعت و حفاظت حدیث** لیکن ان احتیاطون کے ساتھ حدیثون کی اشاعت بھی ایک ضروری فرض تھا، ورنہ مسلمان بہت سے مسائل اور دینی احکام سے بے خبر رہ جاتے اور حدیث رسول کا بڑا حصہ محض سینون مین محفوظ رہ کر برباد ہو جاتا۔ تابعین کا ایک مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے احادیث کی صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ انکو ساری دنیائے اسلام مین پھیلایا، سعید بن جبیر کا قول تھا کہ مجھے تم لوگون کو حدیثین سنانا اس کے مقابلہ مین زیادہ پسند ہے کہ انھیں اپنے ساتھ قبر مین لیجاؤن،[4]

**پہلا طریقہ درس حدیث** انھون نے اس کی اشاعت اور حفاظت مختلف طریقون سے کی، سب سے عام اور متعارف طریقہ درس کا تھا، اکثر بڑے بڑے علما و محدثین کے حلقہاے درس ہوتے تھے، جس سے ساری دنیاے اسلام کے طلبہ استفادہ کرتے تھے، اگرچہ ان حلقون مین زیادہ تر حدیث ہی کا درس ہوتا تھا، لیکن چونکہ وہ تنہا حدیث کے لئے مخصوص نہ تھے، بلکہ ان مین دوسرے علوم کی بھی تعلیم ہوتی تھی، اس لئے ہم آیندہ ان کے

---

[1] ابن سعد ج ۶ ص ۱۹۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۲، [3] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵ [4] ایضاً ج ۶ ص ۱۸۰،

مستقل حالات لکھیں گے،

**دوسرا طریقہ کتابتِ حدیث** دوسرا طریقہ کتابت کا تھا، اس سے ہمیشہ کے لئے حدیثیں محفوظ ہو جاتی تھیں، اگرچہ اس عہد کے علما عموماً کتابت پسند نہ کرتے تھے، پھر بھی تابعین کی ایک معتد بہ تعداد حدیثیں قلمبند کرتی تھی،

سعید بن جبیر جو بڑے محتاط تھے حدیثیں قلمبند کرتے تھے[1]، ابو قلابہ اپنے جملہ معلومات (جس میں احادیث بھی داخل تھیں) قلمبند کرتے تھے[2]، امام زہری کو لکھنے سے بڑا شغف تھا، وہ جو کچھ سنتے تھے سب لکھ لیتے تھے ابو الزناد کا بیان ہے کہ ہم زہری کے ساتھ علما کے آستانوں کا چکر لگاتے تھے، زہری کے ساتھ تختیاں اور بیاضیں ہوتی تھیں، وہ جو کچھ سنتے تھے سب کو قلمبند کر لیتے تھے[3]، ان کے دوسرے ساتھی صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ زہری نے ایک مرتبہ کہا کہ ہم کو سننِ رسول قلمبند کر لینا چاہئے ان کے کہنے پر ہم لوگوں نے اس کو لکھ لیا اس کے بعد انھوں نے کہا اب سننِ صحابہ کو بھی لکھ لینا چاہئے، لیکن اسے ہم لوگوں نے نہیں لکھا، مگر انھوں نے لکھ لیا[4]، بشیر بن نہیک حضرت ابو ہریرہؓ سے جو حدیثیں سنتے تھے ان کو لکھ لیتے تھے، نافع اپنے تلامذہ کو حدیثیں لکھواتے تھے[5]، رجاء بن حیوۃ حدیثیں قلمبند کرتے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے تابعین حدیثیں قلمبند کرتے تھے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

**حدیثوں کے مجموعے** ان کے ذوقِ کتابت سے اسی زمانہ میں حدیثوں کے بہت سے مجموعے مرتب ہو گئے تھے ان میں سے بعض مجموعوں کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے،

خالد بن معدان کے پاس ان کے معلومات کا ایک صحیفہ تھا[7]، خلاس بن عمرو الہجری کے پاس ایک صحیفہ تھا اسی کو دیکھ کر وہ حدیثیں بیان کیا کرتے تھے[8]، عطاء بن ابی رباح نے صحابہ سے جو حدیثیں سنی تھیں ان کو ایک صحیفہ میں قلمبند کر لیا تھا[9]، عبد اللہ بن مسعودؓ کے پر پوتے عبد الرحمٰن کے پاس حدیثوں کا ایک مجموعہ

---

[1] مسند دارمی باب من رخص فی کتابۃ العلم [2] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۸۲ [3] ایضاً ص ۱۰۹ [4] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۴۴۸ [5] مسند دارمی باب من رخص فی کتابۃ العلم [6] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۸۱ [7] ابن سعد ج ۷ ق اول ص ۱۶۲ [8] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۲۹،

تھا جس سے وہ بھول چوک میں مدد لیا کرتے تھے[1] سلیمان بن قیس الیشکری نے جابر بن عبد اللہ کا صحیفہ نقل کیا تھا[2] سمرہ بن جندب فزاری کے پاس حدیثون کا ایک مجموعہ تھا جو ان کے لڑکے سلیمان سے مروی ہے[3] منبہ بن منبہ کے پاس حدیثون کی کتابین تھین[4] خلیفہ ہشام نے اپنے ایک لڑکے کے لئے امام زہری سے چار سو حدیثون کا ایک مجموعہ لکھوایا تھا، (تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۹۷)

یہ سیکڑون مین سے صرف چند ہین، رجال کی کتابون کی ورق گردانی سے اس سے کہین زیادہ کا اور پتہ چل سکتا ہے، اگرچہ ان مین سے کسی کا پتہ نہین ہے، لیکن ایک زمانہ مین یہ محدثین کا سب سے بڑا ماخذ رہے ہون گے اور ممکن ہے وہ موجودہ حدیث کی کتابون کا جزو بن گئے ہون،

**احادیث کے مجموعون کی اشاعت**

حضرت عمر بن عبد العزیز نے جو بڑے جلیل القدر تابعی تھے فرمان جاری کرکے دنیائے اسلام کے سارے علمی مرکزون کی حدیثین جمع کرائین[5] اور ان کی نقلین تمام ممالک محروسہ مین شائع کین[6] اگرچہ یہ عمر بن عبد العزیز کا تنہا فعل تھا، لیکن اس مین یقیناً اس عہد کے اکثر علمائے تابعین کی کوششین شامل رہی ہونگی، اس لئے کہ ان کے عہد مین صحابۂ کرامؓ بہت کم رہگئے تھے، علمائے حدیث مین زیادہ تعداد تابعین کی تھی، جنھون نے اپنی حدیثین قلمبند کی ہونگی،

(باقی)

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۱۳ [2] ایضاً ج ۴ ص ۲۱۵ [3] ایضاً ص ۱۹۰ [4] ایضاً ج ۱۱ ص ۶۶
[5] فتح الباری ج ۱ ص ۱۵ [6] جامع العلم بیان العلم وفضلہ ص ۳۸۔

---

# حیات امام مالکؒ،

امام مالکؒ کی سوانحعمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ ہے، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی پہلی کتاب موطائے امام مالک پر تبصرہ، طبع دوم ضخامت ۱۰۶ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

# دیوان شمس تبریز او مولنا روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن

(۱۰)

**حزن و یاس ام الخبائث ہیں**، مولینا اسے حزن و یاس کے بڑے دشمن ہیں کہ یہ دونوں جذبات زندگی کو ختم کر دیتے ہیں، انکو وہ کم دیتے ہیں

سوے شورستان روان کن شاخ از آب حیات ۔ چون گل و سوسن بخندان خار غم فرسود را

بجہ دا ے مرغ دل پیرامن غم ۔ کہ در غم بال و پر محکم نہ گردد

دل اسرار را محرم نہ گردد

**عالی ہمتی**، مولینا کے کلام میں انسان کے لئے بلند نظری، عالی ہمتی اور اظہار عزم کے قوی پیامات ہیں،

چون چشمہ بجوش از دل سنگ ، بگشن تو سبوے جسم و جان را،

بر بند دو چشم عیب بین را ، بکشائے دو چشم غیب دان را،

چون عنکبوت چنان صید ہائے زفت گرفت ۔ ببین چہ صید کند دام ربی الاعلیٰ

گفتم کہ نہ یافت میشود جستہ ایم ما، ۔ گفت آنکہ یافت مین نشود آنم آرزوست

میان حلقہ عشاق چون نگیں میباش ۔ علم بزن چون دلیران میانہ صحرا

مولینا جمود شک اور تذبذب کے سخت مخالف ہیں، انکا پیغام جذ جذ ایمان اور یقین تجربات کا حامل ہے:

دامن جدو جہد را بکشائے، ۔ کز فلک دُر نثار خواہد بود،

**آزادی عشق** در گلستان چو سرو آزاد باش ۔ در کنار دل چو عشق استاد باش،

وہ عشق کے پیغامبر و مبلغ ہیں،

گرنہ دیوانۂ رو خویش را دیوانہ ساز

در زنخ عشق نگر تا بصفت مرد شوی　　پیش سروان منشین کز دم شان مرد شوی

قلب انسان کو محرم اسرار غیب ہونا ضروری ہے، ان کا پیغام یہ ہے کہ انسان عرش مجید کو اپنا مقام بنائے،

ما زا بیند و باده از چشم غیب باید،　　مارا مقام و قبلہ عرش مجید باید،

وہ منادی کرتے ہیں کہ رسالت سے ربط رکھو، علم و عمل کی تصحیح انسانیت اسی روشنی میں کرے، ملاحظہ ہو،

نیش بکشتی نوح دگیر دامن روح　　بہ بحر عشق کہ ہر لحظہ جزر و مد باشد

مشکوٰۃ رسالت کی آخری شمع حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، انکے متعلق فرماتے ہیں،

ردائے احمد مرسل بگیر اے عاشق　　صلائے عشق شنو ہر دمے ز روح بلال

مجو سعادت و دولت درین جہان کہ نیابی　　ز بندگیش طلب کن سعادت دو جہانی

بعض بعض غزلین کا ما پیغام ہی کی صورت میں ہیں،

ہمرنگ جماعت شو تا لذت جان بینی　　در کوی خرابات آتا درد کشان بینی،

بشکن بت خاکی را تا روے بتان بینی،　　بر بند دو چشم سر تا چشم نہان بینی،

یا وسعت ارض اللہ در حبس چہ چسپیدی　　ز اندیشہ گرہ کم زن تا شرح جنان بینی

خاموش شو از گفتن تا گفت بری یابے

از جان و جہان بگذر تا جان جہان بینی

تو یار خلوت نازی مقیم پردۂ رازی　　قرارگاہ چہ سازی درین نشیمن فانی

تو مرغ عالم قدسی ندیم مجلس انسی　　ازین حظیرہ برون پر کہ مرغ عالم جانی

بحال خود نظرے کن برو برد سفرے کن

ز جیب عالم صورت بر غسرازمعانی

پیر روشن ضمیر کی تعریف، مولینا کے مہمات مضامین سے ایک خاص مضمون اپنے پیر روشن ضمیر حضرت شمس کی مدح کا ہے انھوں نے سینکڑوں اسلوب سے اس مضمون کو ادا کیا ہے، یہ ان کے دیوان کی ایسی خصوصیت ہے جو کسی صوفی شاعر کے دیوان میں نہیں پائی جاتی، اس موضوع سے متعلق ہم نے داخلی شہادت میں طول طویل بحث کی ہے، اسلئے اب یہاں نہایت اختصار سے کام لیا جاتا ہے، اگرچہ یہ شمس تبریزی کی مدح ہے، لیکن درحقیقت انسان کامل کا تصور پیش کیا ہے،

شنو این رمز عشاق از فولے بریط جانم　　که شمس الدین تبریزی ہمی گوید بافسانہ

بیا اے شمس تبریزی کہ در رفعت سلیمانی　　زہے بزم خدایانہ زہے سیمائے شاہانہ

اے قاصد باد صبا از راہ لطفت عرض کن　　بر شمس تبریزی زما ہر دم ہزاراں آفرین

دل خود را از شمس الدین تبریز　　ہمیشہ روشن و معمور خواہم

شمس الدین تبریزی در آئینہ صفایت　　گر غیر خدا بینم باشم بتر از کافر

اے شمس دین اے شمس دین مفتاح علم گنج دین　　عشق تو در ہر دو جہان ماہمگنان درکار شد

استدلال تمثیلی، مسلمہ حقائق یا ذاتی خیالات اور نظریات کو ظاہر کرنے اور ان پر زور دینے کا ایک دلچسپ اور پر اثر طریقہ یہ ہے، کہ انھیں تمثیلی پیرایہ میں بیان کیا جائے، یہ طریق استدلال بعض موقع پر صحیح ہوتا ہے، اور بعض موقع پر غلط بھی ہو سکتا ہے، بعض لوگ اس میں زبردست منطقی دھوکا دیتے ہیں، اچھی اور صحیح بات کو اچھی مثال کے پیرایہ میں پیش کر کے اسے قوی کر سکتے ہیں، اور بری مثال اور غلط تمثیل سے مخاطب کو غلط تخیلات میں مبتلا کیا جا سکتا ہے، یا کسی غلط تصور یا خیال کو نہایت لطیف تشبیہ اور مثال کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، گویا سوفسطائت سے کام لیتے ہیں لیکن

جب کوئی خیال حقیقت کا بھی حامل ہو، اور اسے عمدہ تمثیلی پیرایہ میں پیش کیا جائے تو اس سے اسکی قوت بڑھجاتی ہو، یہ استدلال عام فہم ہوتا ہے، مولینا تمثیلی استدلال میں بڑا کمال رکھتے ہیں، مثنوی میں ہزاروں مواقع پر اس کمال کا بڑی خوبی سے اظہار فرمایا ہے، جس سے مثنوی کے دقیق مطالب واضح اور روشن ہوگئے ہیں، دیوان میں بھی ان کا یہ رنگ قائم ہے، عمر خیام وغیرہ جیسے شعراء یا حکماء نے اپنے ذاتی خیالات اور عیش پسندانہ جذبات کو تمثیلی پیرایہ میں ظاہر کیا ہے، اور ان پر خطابی یعنی شاعرانہ دلائل قائم کئے ہیں،

مولینا اس کے جواب میں دینی حقائق اور غیبی معارف اور اخلاقی مسلمات کو اس پیرایہ میں بیان کرتے ہیں، اور جواباً نہایت خوبی سے خطابی دلائل لاتے ہیں،

مثلاً معاد کے انکار میں عمر خیام نے لکھا ہے، کہ آدمی کوئی گھاس نہیں ہے، کہ ایک بار کاٹ لیں، اور وہ دوبارہ زمین سے پیدا ہو،

مولینا اس خیال کی تردید اسی پیرایہ میں فرماتے ہیں،

کدام دانہ فرورفت در زمیں کہ نہ رست    چرا بہ دانۂ انسانت این گمان باشد

اور کئی مسائل مولینا نے اسی پیرایہ میں لکھے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں :-

شمع جاں را گر داین لگن تن چہ کنی    این لگن گر نبود شمع ترا صد لگن است

چنانکہ آب حکایت کند ز اختر و ماہ    عقل در روح حکایت کنند قالبہا

کائنات میں ایک چیز مختلف مراتب ترقی سے گزر رہی ہے، مولینا فرماتے ہیں تو ایک درجہ پر پہنچکر مایوس مت ہو، کہ تجھے اس سے آگے کا درجہ ملے گا،

ہزار مرغ عجیب از گل تو پر سازند    چو ز آب و گل گذری تا دگر حیات کنند

ذمہ داری کے نقطۂ نظر سے اپنی حیثیت واضح فرماتے ہیں،

من نہ خود آدم اینجا کہ بخود باز روم | ہر کہ آورد مرا باز برد در وطنم
--- | ---

عربیت

مہمات مضامین کی بحث ختم ہو چکی، لیکن ابھی بعض اور خصوصیات توضیح اور تشریح کی محتاج ہیں۔ مولینا نے بچپن ہی میں اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں علوم ظاہر کی تحصیل شروع کر دی تھی اور لغت، ادب، فقہ، معقولات، حدیث، و تفسیر میں ایسا کمال پیدا کیا، کہ بہت جلد مستند علما میں شمار ہونے لگے۔ سپہ سالار کا بیان ہے،

"در علوم رسمی چوں اقسام لغات و عربیت و فقہ و حدیث و تفسیر و معقولات و منقولات

بہ غایتے رسیدہ بود کہ در آن عصر سرآمد ہمہ علماء دہر شدہ بود۔"

(سپہ سالار ص ۱۶)

اس سے مقصود یہ بتانا ہے، کہ عربی ادب اور لغت میں بھی مولینا کو پورا کمال حاصل تھا دیوان میں بھی ان کا یہ کمال مختلف صورتوں میں نمایاں ہے،

کہیں کسی غزل میں بعض اشعار عربی کے ہیں، کہیں صرف بعض مصرعے عربی کے ہیں، کہیں پوری کی پوری غزل، اسی جوش و روانی کے ساتھ جو فارسی غزلیات میں ہے، عربی میں لکھی ہے، اس طرح دیوان میں عربی کی کئی غزلیات ہیں،

عربی غزل میں بھی حضرت شمس کی مدح و تعریف اپنی عام عادت کے مطابق کرتے ہیں،

| | |
| --- | --- |
| یا منیر النجد یا روح البقا | یا مجیر البدر فی کبد السماء |
| انما التبریز عرش منیر | حبذا تبریز اسرضا حبذا |
| قمر سار الینا وجبہ الحب علینا | سطع العشق لدینا طرد العشق منا |
| سلب العشق فوادی حصل الیوم مرادی | بزن ای مطرب عارف بزد وقت زہی شادی |

قرآن مجید کی آیات کے مختلف ٹکڑے اپنے اشعار میں داخل کرتے ہیں جن سے بعض اوقات

معنی کی پوری خوبی اور کلام کا منشا، اور مفہوم کامل طور پر واضح ہوجاتا ہے،

نوبت ہجر در انتظار گذشت — فادخلوا الدار یا اولی الالباب

گر شما محرم ضمیر نشید — فاسئلوا ھن من وراء حجاب

لعنتر مافی القبور حصل مافی الصدور — آمده آواز صور روح بمقصد رسید

برگسا چون تا ماہ بروی نوشته خط سبز — شرح آن خطها بجوں از عند ام الکتاب

تسلسل مضامین، جب سے مغربی تعلیم مشرق میں پھیلی ہے، اور مغربی ادب کا اثر مشرقی ادبیات پر پڑا ہے، بعض لوگ عموماً مشرقی شعرا، اور خاصکر اردو اور فارسی غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں، کہ یہ تو شعر کی ایک مہمل صورت ہے، اس میں نہ خیالات کا کوئی تسلسل ہوتا ہے، نہ جذبات کی یکرنگی ظاہر ہوتی ہے، اصولاً یہ اعتراض غلط ہے، کیونکہ یہ کیا ضروری ہے کہ شاعر کے جذبات میں یکرنگی ہو، اور جذبات و خیالات کا اظہار ایک علمی مضمون کی طرح شعر میں بھی منطقی تسلسل کے ساتھ کیا جائے، یہ تو شاعر کے شخصی رجحان پر ہے، جیسا طبیعت کا رنگ ہوگا، جذبات کی جو نوعیت ہوگی، اسی طور پر خیالات اور جذبات کی ترجمانی ہوگی،

اس بحث کے قطع نظر بھی یہ اعتراض غلط ہے، فارسی میں متعدد ایسے شعرا ہیں جن کی غزلیات میں مضامین کا تسلسل پایا جاتا ہے، مثلاً عراقی، مغربی، مولانا روم وغیرہ، مولینا غزل گوئی میں تسلسل مضامین کے موجد ہیں، کیونکہ مولینا کے ہمعصر مجتہد غزل گو شاعر سعدی ہیں، ان کی غزلیات میں یہ خصوصیت نہیں ہے، ہاں مولینا کے معاصرین میں عراقی کی غزلیات میں بھی مضمون کا تسلسل ایک حد تک پایا جاتا ہے،

مولینا کے دیوان میں بکثرت ایسی غزلیں ہیں، جن پر نہایت آسانی کے ساتھ کوئی عنوان لکھدیا جاسکتا ہے، جس سے وہ صاف مسلسل نظمیں معلوم ہوں گی، اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کی غزلین

کسی خاص حالت کے تحت میں لکھی گئی ہیں، اسلئے ہر غزل میں کسی نہ کسی خاص حالت یا جذبے کا مسلسل بیان ہے ان کا کلام جذبات کا آئینہ ہے، مثلاً ایک غزل میں شادی وصال کا اظہار کیا ہے،

معشوقہ بہ سامان شد تا باد چنیں بادا، کفرش ہمہ ایمان شد تا باد چنیں بادا

زان طلعتِ شاہانہ زان مشعلۂ خانہ، ہر گوشہ چو لستان شد تا باد چنیں بادا

غم رفت و فتوح آمد شب رفت و صبوح آمد خورشید درخشاں شد تا باد چنیں بادا

ایک غزل ہے جس میں مسلسل بے نیازی عشق کو بیان کیا ہے،

مردِ خدا مست بود بے شراب مردِ خدا سیر بود بے کباب،

مردِ خدا شاہ بود زیر دلق مردِ خدا گنج بود در خراب،

مردِ خدا بحر بود بے کران مردِ خدا قطرہ بود بے سحاب،

یار مطلوب ہے، اور ربط یار کی اہمیت و لذت کا احساس قلب پر طاری ہے فرماتے ہیں،

مرا عقیقِ تو باید شکر چہ سود کند مرا جمال تو باید قمر چہ سود کند

چو چشم مست تو نبود شراب را چہ طرب چو ہمرہم تو نباشی سفر چہ سود کند

یہ خیال آتا ہے کہ بے یار سب عیش و عشرت بے معنی ہے، بس اسی خیال کو ظاہر فرماتے ہیں،

اے بے تو حرام زندگانی خود بے تو کدام زندگانی،

اے وصل تو آبِ زندگانی تدبیر خلوص ما تو دانی،

از دیدہ برو ل مشو کہ نوری، از سینہ جدا مشو کہ جانی،

مولینا ایک محرمِ راز کی تلاش میں ہیں، اس تمنا کا اظہار مسلسل ایک غزل میں فرماتے ہیں،

چہ بودے کہ یک گوش پیدا شدے شنیدے زبانہاے مرغان ما

چہ بودے کہ یک چشم پیدا شدے کہ دیدے درختانِ بستانِ ما

چہ بود سے کہ موجے پدید آمدے گہر ہا را زان بحر عمان را

کہیں کہیں مسلسل غزلیں پر لطف مکالمہ کی صورت میں ہیں،

گفتم شہا بس قطرہا در ہجر تو باریدہ ام گفتا چہ غم ہر قطرہ را من لولوٴ مکنون کنم

گفتم شہا بسیار شب ویدہ ندیا لودم بخواب گفتا شبے را صد شبے در عمر تو افزون کنم

کبھی حال کی شدت ہوتی تھی تو اسکو نہ صرف ایک غزل میں بلکہ مسلسل کئی غزلوں میں ظاہر کرتے ہیں بعض اوقات یہ غزلیں ایک ہی بحر اور ردیف وقافیہ میں ہوتی ہیں، ایک غزل جس کا مطلع یہ ہے،

واں رباب را بگو مرواں سلامت میکنند واں مرغ آبے را بگو مردان سلامت میکنند

مسلسل چار غزلیں اسی مضمون اور اسی بحر ردیف اور قافیہ میں لکھی ہیں، ابتدا میں وجد اور مستی طاری رہتی تھی، کئی ایسی غزلیں مسلسل ہیں جنکی ردیف "مست" ہے جس سے شدت حال کا پتہ بھی چلتا ہے، ہم مثالاً چند مطلعے درج کرتے ہیں،

آمد آن ساقی کہ مارا کرد از دیدار مست وز شراب لعل او شد زاہد و خمار مست

از تبسم رہم بین جملہ ابرار مست، وز شراب لایزالی ہفت و پنج و چار مست

اے سرمن در ہوائے احمد مختار مست وے دل من در ہوای حیدر کرار مست

شاعرانہ بیان کی خوبیاں یعنی شعر کے صوری محاسن

ہم نے ابتک مولینا کی غزلیات کی معنوی خوبیان یا شاعرانہ خیال کے محاسن بیان کئے، اب ہم ان کے کلام میں شاعرانہ بیان کی جو خوبیان پائی جاتی ہین، انکی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

مولینا کے کلام میں شاعرانہ طرز ادا کی بہت سی خوبیاں ہین،

سادگی

ان میں سے ایک سادگی بیان ہے، یعنی مولینا اشعار میں اپنا مطلب اس طرح ادا کرتے ہیں

کو سمجھنے میں معلق وقت نہیں ہوتی، جیسے فارسی کے نامی غزل گو شاعر بیدل کے کلام کے سمجھنے میں ہوتی ہے، مولانا بالعموم ایسے ہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے زبان مانوس اور کان آشنا ہیں، ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ خود ان کے خیالات میں سادگی ہے، یعنی ان کے تصورات، ورخیالات پیچیدہ اور الجھے ہوئے نہیں ہیں، جس خیال پر وہ شعر کی بنا رکھتے ہیں، وہ ان کے سامنے واضح ہوتا ہے، وہ کوئی ایسی بات دوسروں کو نہیں سمجھانا چاہتے جسکو خود انھوں نے بخوبی نہ سمجھا ہو اور کسی ایسی کیفیت کی ترجمانی نہیں کرتے، جو ان پر گذری نہ ہو، لفظوں کی ترکیب اکثر جگہ قواعد زبان اور اصول بیان کے مطابق ہوتی ہے، ان کے اشعار میں مضمون کے ضروری اجزا ترک نہیں کر دیئے جاتے جس سے شعر کا سمجھنا معمہ کا حل کرنا ہو جائے، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جن کے باعث ان کے کلام میں سادگی اور سلاست پیدا ہوگئی ہے،

بر چرخ سحرگاہ یکے ماہ عیاں شد     تا بہر تجلی از ل جملہ بیان شد

چنان آمیختم با وے کہ دل با من نیامیزد     نخست از عشق او زادم بآخر دل بدو دادم

من از عالم ترا تنہا گزینم     روا داری کہ من غمگین نشینم

مکانم لامکان باشد نشانم بے نشان باشد     نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من از جانِ جانانم

عشق است در آسمان پریدن     صد پردہ بہر نفس دریدن

ہر کہ بہر تو انتظار کند     بخت و اقبال را شکار کند

ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ سلاست کمال کی اس حد تک نہیں پائی جاتی، جسے سہل ممتنع کہتے ہیں، غزل گو شعراء میں یہ صفت شیخ سعدی کا خاص کمال ہے۔

**جدت و حسن تشبیہ** شاعر کا فرض جذبات کی ترجمانی ہے، جذبات کی ترجمانی ہر موقع پر بلا استعارہ و تشبیہ کے ممکن نہیں، ناقابل بیان جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنایا، اور محسوس کو مشہود بنانے کے لئے تشبیہ اور استعارے

سے کام لیا جاتا ہے، اس کا منشا یہ ہوتا ہے، کہ مطلب واضح ہو جائے، مولینا اپنے کلام کے مقصد اور منشا کے مطابق نہ صرف تشبیہ کا استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ تشبیہ کے موجدین میں ہیں، یہ اسلئے کہ وہ غزل کے دور اول کے شعراء میں ہیں، انھوں نے سیکڑوں تشبیہات کو غزل میں استعمال کیا ہے، ان کا کلام کثیر ہے، اسلئے ان کا شمار مقلدین میں نہیں بلکہ موجدین اور مجتہدین میں ہے،

وہ اپنے کلام میں ایسی تشبیہیں اور استعارے نہیں لاتے جن تک ذہن کی رسائی مشکل ہو، اور کلام ایک حل طلب معمہ بنجائے، بلکہ انھوں نے کلام میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال اس طریقہ سے کیا ہے، کہ اگر ایک طرف اعلیٰ مطالب اور بلند خیالات واضح تر ہو گئے ہیں تو دوسری طرف ان سے ان کے حسن بیان میں اضافہ ہو گیا ہے، حسن بیان اور حسن تشبیہ کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

در ہر کہ کشید است سہیل و قمرے را      در شہر کہ دید است چنیں شہرہ بتے را

ہر بدر ست روے تو کزو رفت ظلمتہا      شب قدر است موے تو کزو یابند دولتہا

رقصاں ہمی شویم چو شاخ نہال گل      گیریم دامن گل و ہمراہ گل شویم،

روان عاشقاں را شاد کردم،      ز زندان زہرہ را آزاد کردم،

**بحر کی موزونیت اور کلام کی روانی**

شاعرانہ بیان یا طرز ادا کے محاسن میں ایک اہم جزو بحر کا انتخاب ہے، یہ شاعر کے ذوق سلیم پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ جذبات اور خیالات کی مناسبت سے بحر کا انتخاب کرے، پرجوش اور مسرت انگیز جذبات کے لئے ایسی بحریں استعمال نہ کرے جس سے اداے مطلب میں سستی ظاہر ہو، عشق کے لطیف اور نازک احساسات کے لئے ایسی بحر منتخب کرنی چاہئے جو رزمیہ نظم کے لئے موزون ہو، مثلاً فردوسی نے اپنی مثنوی یوسف و زلیخا میں یہی غلطی کی تھی، جس سے اس کی نظم شاہنامہ کے مقابلے میں ناکام رہی،

مولینا کے کلام میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے خیالات ان کی قوت اور جوش کے مطابق

بحریں استعمال کرتے ہیں، نہ صرف بحر، بلکہ ردیف اور قافیہ تک اکثر جگہ نہایت مناسب اور برمحل ہیں، یہ خصوصیت خسرو میں بھی حد کمال تک پہنچ گئی ہے، اگر ان خیالات کو حافظ یا خسرو کی بحروں میں ادا کیا جائے، تو ان کے کلام کا زور اور اسکی روانی باقی نہ رہے گی، اسی طرح حسن دہلوی اور خسرو نے جن خیالات کو چھوٹی چھوٹی پاکیزہ بحروں میں ادا کیا ہے، اگر انکے لئے مولینا کی غزلوں کی بحریں استعمال کیجائیں، تو کلام بدمزہ ہو جائے گا،

مولینا کے اس حسن انتخاب کے باعث ان کے کلام میں بڑی روانی پیدا ہو گئی ہے، اکثر بحریں شدت حال، جوش دل اور زور و وارفتگی کے مناسب ہیں، چند مثالوں سے ان کی اس خصوصیت کا اندازہ ہو جائے گا،

جوش بہار:-

بہار آمد بہار آمد سلام آورد مستاں را ازاں شاہنشہ خوبان پیام آورد مستاں را

چو خسرو زلف شیریں را اگر فتم اگر قصد سر فرہاد کردم،

اپنی حقیقت:-

نہ از دنیا نہ از عقبی نہ از جنت نہ از دوزخ نہ از آدم نہ از حوا نہ از فردوس رضوانم

ربط پیر:-

بے دولت مخدومی شمس الحق تبریز نے ماہ تواں دیدن، نے بحر تواں شد

فخر نسبت:-

بخت جوان یار ما دادن جان کار ما قافلہ سالار ما فخر جہاں مصطفٰی است

لطیف اور نازک مضامین کے لئے پھول سی شگفتہ اور چھوٹی بحریں استعمال کرتے ہیں،

آن دلبر گلعذار آمد، آن یوسف روزگار آمد،

پیغام ز نفخ صور داری، بکشاے لب چپیری را،
بگستر سایہ خود بر سر ما، کہ ظل حق تعالیٰ داری از دے

پرگوئی | مولینا نہایت پرگو شاعر ہیں، یہ وصف مثنوی اور دیوان غزلیات دونون سے ظاہر ہے، لیکن دیوان میں زیادہ نمایان ہے، کیونکہ یہ ضخیم تر ہے، اس میں ذوق کلام سے زیادہ غلبۂ حال کو دخل ہے، البتہ اثر کے اعتبار سے مثنوی کا درجہ بلند ہے، لیکن دیوان میں بھی ایک ایک لفظ سے ولولہ جوش اور مستی ٹپکتی ہے، دیوان میں کثرت کلام یا پرگوئی کی وجہ یہی ہے، کہ اس دور سرمستی میں میلان طبیعت سخن کی طرف زیادہ تھا، کیونکہ اس زمانہ میں محفل سماع کی بھی کثرت تھی، مثنوی "صاحب مقام" ہونے کے بعد لکھی ہے، اس دور میں وہ ولولہ اور ہنگامہ کہاں، جب کہ وہ صاحب حال تھے، اس دور میں حقیقت حال کو خود بے نقاب فرماتے ہین،

"فرمود کہ اول شعرمی گفتیم داعیۂ عظیم بود، کہ موجب گفتن بود"

(فیہ مافیہ ص ۲۰)

مدح گوئی سے احتراز | باوجود اس پرگوئی کے مولینا کا دامن کسی بادشاہ یا امیر کی مدح گوئی کے داغ سے داغدار نہیں ہوا خصوصاً اس دور مین جب کہ نظامی سعدی اور خسرو جیسے اہل دل بھی اس سے نہ بچ سکے،

عیب مکن گر غزل ابتر بماند، نیست وفا خاطر پرندہ را،

(شرح محی)

شاعرانہ بیان یا طرز ادا کے نقائص | مولینا کے کلام میں ایک طرف شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اگر مختلف محاسن ہین، تو بعض نقائص اور کمزوریان بھی اس حد تک نمایان ہین کہ ہم انہیں انکی خصوصیات کلام کے دائرہ سے خارج نہیں کرسکتے، اسکا سبب تو ہم آگے عرض کرین گے، پہلے فرض تنقید کی ادائی کے لئے اس نوع کی چند نقائص کا بھی ذکر کرتے ہین،

زبان صنف غزل کے مناسب نہیں، — ہر صنفِ سخن میں زبان کا رنگ خاص ہوتا ہے، جو زبان انوری خاقانی ظہیر اور سلیمان وغیرہ کے قصائد کی ہے، وہ کبھی خسرو، سعدی اور حافظ کی غزل کی نہیں ہو سکتی، لیکن مولینا اس اصول کے پابند نہیں، درحقیقت غزل کا منشا، ومفہوم ہی اصطلاحی حدود سے وسیع ہے، اس لئے مولینا کو نہ الفاظ کی کچھ پروا ہے، اور نہ خاص ترکیبوں کی طرف ان کی کچھ توجہ ہے، اس سے اون کی غزلیات میں وہ لطافت پیدا نہ ہو سکی، جو سعدی، حافظ یا حسن دہوی کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے،

تعقید لفظی پیچیدہ ترکیبیں — مولانا اپنی دھن اور رو میں بعض بعض جگہ غریب نامانوس اور ثقیل الفاظ بھی بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں، جنھیں غزل تو غزل قصیدے میں بھی استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا، مثلاً:-

غلط گفتم کہ مسجد ہاے مارا — برون در بود خورشید پرتاب،

اے آفتاب رُخ بنما از نقاب ابر — کان چہرۂ مشعشع تابانم آرزوست

پندے بدہ وبصلح آور، — آن چشم خمار عبہری را،

انکے کلام میں لفظی تعقید پیچیدہ اور غیر شگفتہ ترکیبیں بھی ہیں،

این مجمع ملامت وآن محشر قیامت — گشتست پیش حسنت مستغرق عجائب

ما بے خبر ہم اینجا بر بند در خانہ، — پرندہ و خر تندہ لنگ اند درین حضرت

عجب نباشد اگر مردہ بجوید جان — دیا کہ سینۂ تقسیدۂ صبا خواہد

فک اضافت: — نظم ونثر میں عموماً اور فارسی زبان میں خصوصاً اضافت، اختصار وایجاز کا حسن اور اس کی جان ہے، فک اضافت سے جملہ یا شعر نہایت غیر فصیح ہو جاتا ہے، بقول مولینا شبلی "یہ شریعت شعر میں ابغض المباحات ہے"، لیکن مولینا جہاں چاہتے ہیں، اس کی پروا کئے بغیر

تک اضافت کرتے ہین ،

عاشقان را شمع و شاہد نیست از بیرون خویش　　آب انگوری بخورد بادہ شان از خون خویش

آب یار نور آمد در صفا و روشنی ،　　ہر دو غماز ند صورت را و لیکن زاعتاب

ہیچ می دانی چہ می گوید رباب　　زاشک چشم و وز جگرہا ے کباب

نقص تشبیہ | مولانا نے چونکہ کثرت سے تشبیہیں ایجاد اور استعمال کی ہین، اسلئے ان میں ایسی تشبیہیں بھی آگئی ہیں جو نہایت غیر لطیف اور نامناسب ہین ،

شمس حق تبریزی ما چوجہ و تو مرغی　　این چوجہ دریں بیضہ مانداست چو نُہ در خم

اسے دارو سے فربہی صحت　　از بہر تن نزار عاشق ،

زبادہ چون افیون فضل او خوردیم　　برون شدیم ز عقل و برآمدیم از کار

پیرایۂ مجاز | اگرچہ غزل شعر کی ابتدا بھی ہے، اور انتہا بھی لیکن اس کی زبان سادہ اور سہل ہوتی ہے، اسی لئے وہ عوام اور خواص دونون طبقوں میں مقبول ہو، جو قبولیت اس صنف سخن کو حاصل ہے، وہ کسی اور صنف کو نصیب نہین ،

ہرچند غزل کی خوبی کے لئے یہ لازم نہین کہ وہ پیرایہ مجاز ہی میں ہو، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ قبولیت عام اس غزل کو زیادہ حاصل ہوتی ہے، جس میں بلند خیالات اور روحانی حقائق بھی پیرایہ مجاز میں ادا کئے جائیں، سعدی خسرو اور حافظ کے تغزل کی قبولیت کا سبب یہی ہو کہ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی تقریبًا بلکہ تمامتر بادہ و ساغر ہی کے پیرایہ مجاز میں کرتے ہین، مولینا کے کلام میں یہ بات اس حد تک نہیں ہو، انھون نے اسرار و حقائق کو اکثر بے پردہ ظاہر کیا ہے، اور دیوان میں اپنے ہی اصول

خوشتر آن باشد کہ سرّ دلبران　　گفتہ آید در حدیث دیگران

پر عمل نہیں کیا ،

(باقی)

# نطشے

(۲)

از جناب پروفیسر مقصود ولی الرحمن صاحب ایم اے جامعہ عثمانیہ

(۹)

کیا طاقت کا ڈاروینی تصور نطشے کا اتنی ہی آسانی کیساتھ خاتمہ کر دیتا ہے، جتنا کہ تھرے سی مارکس کا؟ کیونکہ نطشے ایک زیادہ عینی اور ٹھوس مسئلہ استدلال بھی رکھتا ہے، وہ بعض اوقات یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ جن اخلاقی صفات کو وہ ناپسند کرتا ہے یعنی انکسار، رحم اور ہمدردی، وغیرہ، وہ مفروضہ اجتماعی طاقت کے سرچشمے نہیں، یا یہ کہ ان کی نگہداشت اور پرداشت اس حد تک کی گئی ہے، کہ یہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے خطرناک ہو گئے ہیں، اور یہ انحطاط کے مظاہر ہو سکتے ہیں، اور نطشے نہایت بلند آہنگی کیساتھ تمام تہذیب و تمدن میں اس انحطاط کے وسیع وجود کا اعلان کرتا ہے۔

یہ ایسا دعوی ہے جسکو سائنس سرسری طور پر اور آسانی کیساتھ رد نہیں کر سکتی، کیونکہ اس خیال مین انواع اقوام اور معاشروں کے انحطاط پذیر ہو سکنے میں کوئی استحالہ نہیں، زمانہ گذشتہ میں وہ انحطاط پذیر بلکہ مردہ ہو چکے ہین، اسکے علاوہ تطابق کی ایک چھوٹی سی ناکامی سے بھی انحطاط پذیری کا یہ عمل شروع ہو سکتا ہے، اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ یہ ناکامی عین اُن صفات کی بہت زیادہ ترقی کا نتیجہ ہوئی ہے، جو ابتداً کامیابی کی طرف یجاتی ہین، یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ اگر کوئی سحر خیز پرندہ صبح کے وقت کوئی کیڑا پکڑ لیتا ہے، تو وہ اپنے ذخیرۂ خوراک کو کم کر دیتا ہے، اسلئے فاقوں مرتا ہے، لہذا سائنس نہایت احتیاط کیساتھ مطالعہ کرنا چاہیے، کہ کہین ہم حقیقی حیاتیاتی معنوں مین انحطاط کی طرف تو نہیں جا رہے ہین یعنی کہین کسی اہم اور شاید لازمی حیثیتوں سے بقا کی قابلیت ہم مین کم تو نہیں ہو رہی ہے،

اس قسم کے مطالعے کے نتائج بہت زیادہ اذعان بخش نہیں، یہ تسکین دینے والا عقیدہ کہ کسی مہربان قدرت کی عنایت سے نسلِ انسانی برابر بہتر ہو رہی ہے، کوئی سائنٹفک سند نہیں رکھتا، کوئی اذعان بخش شہادت اس امر کی موجود نہیں کہ جسماً یا ذہناً ہم اسلاف سے بہتر ہیں، اسکے برعکس یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم ترین عہد حجری کی کھوپڑی میں بالکل اتنی ہی گنجایش تھی، جتنی کہ آجکل کے انسان کی کھوپڑی میں ہے، یہ ممکن ہے کہ ہم بعض جراثیم کے حملوں سے اپنے آپ کو بچالیں، لیکن جسمانی عیوب و نقائص مثلاً کوتاہ نظری وغیرہ روز افزوں ہیں، کیونکہ اب یہ ہتا کے دُہلک نہیں رہے، فتورِ عقل برابر تیزی کیساتھ بڑھ رہا ہے، اور زمانۂ جدیدہ کے حالات نالائقی، اور سخافتِ عقل کے خاص درجے کو برداشت کرلیتے ہیں، بلکہ انکی پرورش کرتے ہیں، حالانکہ قدیم زمانے میں ان ہی سے زندگی کا خاتمہ ہو سکتا تھا، لہذا یہ فرض کیا جاسکتا ہے، کہ جس طرح ہم بعض حیثیتوں سے حقیقۃً انحطاط کی طرف جارہے ہیں، اسی طرح ہم من حیث الکل بھی انحطاط کی طرف مائل ہیں، لیکن مایوسی کی بہرحال ضرورت نہیں، بہ شرطے کہ ہم اس علاج کو اختیار کرلیں، جو نٹشے نے اپنے مخصوص استبعادی انداز میں تجویز کیا ہے،

(۱۰)

فوق الانسان سے نٹشے انسان کی وہ نصب العینی صنف مراد لیتا ہے، جو اسوقت متحقق ہوتی ہے جب انسان خود اپنے ارتقار کی رہنمائی کی جانب سائنٹفک اور باقاعدہ توجہ کرتا ہے، ہم اس اصول سے اتفاق کرسکتے ہیں، خواہ اُس صنفِ فوق الانسان سے ہمیں اختلاف ہو جس کی ہمیں ضرورت ہے، اس وقت تو ہم یہ بھی نہیں جانتے، کہ نسلِ انسانی کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے، یا اسکو انحطاط سے کیونکر بچایا جاسکتا ہے، لیکن علم توریث روز بروز سائنٹفک تحقیق کا موضوع بنتا جاتا رہے، اور جسقدر ہم اس پر عمل کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہم اس کے متعلق جانتے ہیں ہمیں اتنا تو بہ کیف معلوم ہے کہ تمام مہذب و متمدن معاشرے بعض غلط اور اکثر عمرانی اداے بے ڈھنگے طریقے سے کام رہے ہیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اشرافیت (- aristocra cy

کو جو ترجیح نطشے نے دی ہی، وہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے جائز ہے، کیونکہ ہر جگہ ترقی کا انحصار چند ایسے افراد پر ہوتا ہے، جو نئی چیزیں اور باتیں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنی اشترا کیتیں ابتک وجود میں آچکی ہیں، وہ سب کی سب درست تھیں، اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ سیاسی نقطۂ نظر سے تمام عوامی ( Democratic ) اداروں کو توڑ دینا چاہئے، اس سے مراد صرف اسقدر ہے کہ انسان بہت سی حیثیتوں سے غیر مساوی ہیں، اور یہ کہ حقیقت کو نظر انداز کر دینا، اور ان کی صلاحیتوں کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کرنا نسلِ انسانی کے لئے مہلک ہو سکتا ہے،

( ۱۱ )

لیکن کیا نسلِ انسانی کے مستقبل کے متعلق یہ اندیشہ و تشویش ایک نئی، اور ایسی بات نہیں جس کے اظہار کی توقع نہ صرف غیر متفکرین، بلکہ قنوطی سے بھی نہیں کیجا سکتی، ؟ اور نطشے شوپنہائر کو کیا جواب دیتا تھا، ؟ اس کا جواب اس لئے اور بھی زیادہ سبق آموز ہے، کہ بادی النظر میں یہ جواب معلوم ہی نہیں ہوتا وہ "زندہ رہنے کے ارادے" سے انکار نہیں کرتا، اگرچہ اس نے اسکو فتح کرنے اور حکومت کرنے کے ارادے کی شکل میں پھیلا دیا ہے، اسی طرح وہ زندگی کی الم ناکیوں کا بھی منکر نہیں، لیکن وہ اس سے وہ نتیجہ نہیں نکالتا جو شوپنہائر نے نکالا ہے، اور وہ زندگی کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس وہ اس کا اثبات کرتا ہے، کیونکہ یہ المناک ہے، اور قنوطیت کے ساتھ استدلال کرنے کے بجائے زندگی کی نفی کرنے والے میلانات کو انحطاط کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے، لیکن اس سے قنوطیت کی عقلی تردید کیونکر ہوتی ہے، ؟

جواب ظاہر ہے کہ اس سے تردید نہیں ہوتی، لیکن یہ استدلال اسی لئے بہتر ہے، نطشے نے قنوطیت اور زندگی کی ماہیت کو ان فلاسفہ کی بہ نسبت کہیں بہتر سمجھا تھا، جو نہائی طور د طریق اور ہمارے تمام ثبوتوں کے "عقلی ثبوتوں" کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں، اس نے معلوم کر لیا تھا، کہ زندگی

کا اذعان یقینی طور پر ایک جبلت اور زندہ رہنے کے ایسے ارادے کی پیداوار ہوگا، جو موروثی اور خلقی ہے، اور یہ کہ رجائیت ذہن میں ماہیت اشیاء کا منصفانہ اور سچا محض عکس نہیں، بلکہ ارادے کا ایک طرز و طریقہ ہے، لہذا اسکے نزدیک قنوطیت اولاً اس جبلت کی کمزوری کے ہم معنی اور اسلئے انحطاط کی علامت ہی، اس کا مقابلہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہی، کہ زندہ رہنے کے اس ارادہ کو اور مضبوط کیا جائے، جس کی مدد سے نسل انسانی نے زمانہ گذشتہ کی تمام ہولناکیوں کا مقابلہ کیا ہی،

اس علاج کی صحت میں شبہہ کیا جا سکتا ہے، اور یہ یقینی ہے کہ اس سے ایک قنوطی کی تشفی نہ ہوگی، لیکن اس میں عقلیت کی خالص ترین صورت کی جدید تنقید کا اظہار ہوا ہے، حیاتیات نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے، کہ زندگی کی دنیا میں عقل نو وارد ہے، اور یہ اس سے قبل جبلت کی محکوم تھی، واقعہ یہ ہے کہ ہم اب بھی اپنی جبلتوں کی مدد سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور اگر ان جبلتوں میں خرابی واقع ہوتی ہے، تو ہم فنا ہو جاتے ہیں، جس عقل پر ہمیں فخر ہے، وہ محض ایک آلہ ہے، جس سے ہم اپنی غایات کے وسائل کی پیمایش اور اصلاح کرتے ہیں، ہمارے تمام قوا کی طرح یہ بھی قانون طبعی انتخاب کے تابع ہے، اگر یہ تنازع للحیات کے لئے مفید اور قوی آلہ نہ ہوتا، تو اس میں کبھی بھی ترقی نہ ہوتی، عقل کسی طرح بھی زندگی کو قابل مذمت قرار نہیں دے سکتی، کیونکہ اگر یہ ایسا کرتی ہے تو پھر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اس حالت میں فطرت پھر ان لوگوں کا انتخاب کرے گی، جو یا تو اتنے احمق ہیں کہ قنوطیت کے دلائل کو معلوم نہیں کر سکتے یا زندہ رہنے کے ارادے کے اتنے زیر اثر ہیں، کہ ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس طرح فکر اپنے آپ کو بے عقلی کے اندھیرے گڑھے کی طرف جاتی ہوئی پاتی ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ یہ گڑھا تمام عقلی قیمتوں کو گھیر لینے اور تمام عقلی "اصولوں" کو الٹ دینے کی دھمکی دے رہا ہے، اور سائنس ہیوم کے اس قول کی تائید کرتی نظر آتی ہے، کہ "عقل جذبے کی غلام ہے، اور اس کو ایسا ہونا ہی چاہئے"، اکثر فلاسفہ نے اس قول کو ازالۂ حیثیت عرفی کے برابر سمجھا ہی، لیکن واقعہ یہ ہی کہ اس کی نازک خیالی پر کبھی غور کی

نہیں کیا، یہ فلسفۂ جدیدہ کی بہت بڑی ترقیون کا نقطۂ آغاز ہے، ان ہی ترقیون میں کَنٹ کا نظریۂ علم بھی ایک
معین اور اہم مقام رکھتا ہے، لیکن اسکی اہمیت پوری طرح سمجھی نہیں گئی، اس کو واضح کرنے کے لئے ہیوم
کے وقت سے تاریخِ فلسفہ کے خاکے کی ضرورت ہے، اس خاکے مین ان مقامات پر زور دیا جائے گا
جن پر بالعموم زور نہین دیاجاتا،

(۱۲)

ہیوم نے وہ کمال کیا جو فلسفے میں بہت نادر ہے یعنی اسنے ایک حقیقی اور بڑا انکشاف کیا، وہ یہ
ہے کہ علاقۂ علّی کا تصور مظاہر کے تعاقب میں ہم کو حاصل نہیں ہوتا، اسکو ہم اس تعاقب پر ایک توجیہ طلب
طریقے سے اضافہ کرتے ہین لیکن اس انکشاف کی اہمیت نہ یہ تھی کہ اگر اضافہ کرنے کا یہ حق ہم سے چھین لیا
جائے، تو ارتیابیت پیدا ہوتی ہے، اور نہ یہ تھی کہ اگر اسکو صحیح خیال کیا جائے تو حضوری (APRIORI)
کی ایک نئی صورت کا اثبات ہوتا ہے، اس کی اہمیت اس واقعے میں تھی، کہ تاریخ فلسفہ میں پہلی مرتبہ اس
افتراض پر شبہہ کیا گیا، کہ علم مین ذہن کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کا عکس دیکھے،

علّی استدلال کے جس واقعے کا ہیوم نے مشاہدہ کیا، اسکی بہت سی تاویلیں ہوسکتی ہین، اور فلاسفہ
نے اسکی وسعت کو بتدریج معلوم کیا ہے، کانٹ کی تاویل یہ ہے، کہ لہذا علّت ایک "حضوری معقولہ"
(ARIORI CATEGORY) ہے، ظاہر ہے کہ اس سے ہیوم کے شبہات رفع نہ ہوسکتے تھے،
بلکہ یہ معلوم کرنے سے کہ معطیاتِ تجربہ کو صورت دینے، اور ان کو سائنٹفک واقعات میں بدلنے کے لئے
حضوری شیئون کی کتنی تعداد درکار ہوتی ہے، علم انسانی پر اسکے شبہات کی اور زیادہ تائید ہوئی، اسکی وجہ
یہ ہے کہ جب تک یہ فرض کیا جاتا ہے، کہ فکر کو حقیقت کی شبیہ ہونا چاہئے، اسوقت تک جس قدر زیادہ
اضافے اور جس قدر زیادہ ردوبدل ہم کریں، اسی قدر ہماری فکر کے نتائج کم قابلِ اعتبار ہوجاتے
ہین، اور اسی قدر زیادہ یقین کے ساتھ ہم علم کو سائنٹفک تکذیب کہ کر عیب ناک کرسکتے ہین، لہذا اگر یہ تسلیم

بھی کر لیا جائے، کہ کانٹ نے ثابت کیا تھا کہ علاقۂ علی اس لحاظ سے اکیلا نہیں، اور یہ کہ ایسے "واقعات" کہیں بھی دستیاب نہیں ہوتے، جو ہمارے "حضوری" اضافون سے "گھڑے" نہ گئے ہون، یا جو بقول اسکے "بنائے" نہ گئے ہون، تب بھی جو شخص ہمارے معطیات میں اس مداخلت کا منکر ہے، وہ مجبوراً نتیجہ نکالے گا کہ جس چیز کو "صداقت" کہا جاتا ہے، وہ حقیقت میں وہم ہے، خود کانٹ نے یہ دکھا کر اس خیال کی تصدیق و تائید کی، کہ بعض صورتون میں "عقلی اصول" ارادے کے "مفروضات" سے پیدا ہوتے ہین، اور یہ کہ تمام مسائل شعوری وہمون پر مبنی کیجا سکتی ہین، مختصر یہ کہ بجائے اسکے کہ کانٹ اُن شبہات کو رفع کرتا، جو ہیوم کے انکشاف سے پیدا ہوئے تھے، اس نے ان کی وسعت اور زیادہ کردی، نطشے نے صحیح کہا ہے کہ جو لوگ اپنے تفکر کو کانٹ سے شروع کرتے ہیں، ان کے لئے "صداقت" ایک ایسا مسئلہ بن گئی ہے، جس پر شبہہ کیا جاتا ہے،

نطشے نے اپنے اس ادراک کو غلطی سے شوپنہائر کی طرف منسوب کیا ہے، شوپنہائر تو باقی ماندہ کانٹی مفکرین کی طرح مابعد الطبیعیات کا ادعا پسند ماہر ہے، اگرچہ اس کے غیر معقول ارادۂ زندگی کو حقیقت کے جوہر کی حیثیت سے اختیار کرنے کو ہیوم کے اس انکشاف کے مابعدی اثرات کا نتیجہ ثابت کیا جاسکتا ہے، جو اس نے "جبلت" کے متعلق کیا،

(۱۴)

لیکن اس میں کلام نہیں کہ نطشے مسئلۂ صداقت کے روبرو آگیا تھا، اور اس کو انتقادیت کے اس درجے کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوگئی تھی جس پر کانٹ نے اسکو چھوڑا تھا، اس نے جلدی ہی معلوم کرلیا کہ عقلی قیمتیں اتنی ہی محلِ اعتراض ہوسکتی ہین، جتنی کہ اخلاقی، اسکو اپنے اس الہام کے نقل کرنے کا بہت شوق تھا، کہ "کوئی چیز بھی نہیں، ہر چیز جائز ہے"، اپنی کتاب "شوپنہائر بہ حیثیت ماہر تعلیم" لکھنے کے زمانہ (۱۸۷۴ء) تک اس نے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے فلسفے کی عدم حقیقت اور بے ثمری کو بھی محسوس

کر لیا تھا، تا آنکہ وہ یہ کہنے کے قابل ہو گیا تھا، کہ "فلسفے پر تنقید کا واحد طریقہ، جس سے کچھ ثابت ہو سکتا ہو، یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے، کہ آیا یہ قابلِ عمل بھی ہے، یا نہیں، یونیورسٹیوں میں اس طریقہ کی تعلیم کبھی بھی نہ ہوئی، ان میں محض الفاظ کی تنقید سکھائی جاتی ہے"، لیکن ایک واضح اور متعین نظریۂ علم جا کر "ارادۂ طاقت" میں صورت پذیر ہوا، یہ نظریہ ان دو ادراکات کا نتیجہ تھا، کہ اولاً صداقت "تدبر" سے زیادہ "واہمہ" سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسرے یہ کہ اسکو زندگی سے ضرور کچھ نہ کچھ تعلق ہونا چاہئے، لیکن یہ نظریہ تکمیل طلب ہی رہا، اسکی ترقی میں دو ممیز بلکہ متباین پہلو معلوم کئے جا سکتے ہیں، ایک تو بہ حیثیت اس کے کہ زندگی کو باقی رکھنے والے عقائد "جھوٹے" ہیں، اور دوسرے بہ حیثیت اس کے کہ "سچے" ہیں،

ان میں سے پہلا پہلو قدیم تر اور بدیہی تر ہے، اسکی طرف نہ صرف کانٹ کے نظریۂ علم کے رجحان سے، بلکہ اس مشاہدے سے بھی اشارہ ہوتا ہے کہ معاشرہ صرف ان عقائد کی باقاعدہ تلقین کرتا ہے، جو سچے نہیں، بلکہ (استادوں، حاکموں، وغیرہ کے لئے) مفید اور عملی نقطۂ نظر سے مستحسن سمجھے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ موجودہ حالات کا یہ اندازہ منطقی نتیجہ ہے اس افتراض کا کہ "صداقت" لازماً "حقیقت" کا عکس ہونی چاہئے، اگر ہم لفظ "حضوری" کو بہ صورت اسکے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، کہ یہ منطقی گناہوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو چھپانے کا ایک ذریعہ ہے، تو ہمارے علم میں مفروضات و اوہام کا بہ ظاہر بے قاعدہ استعمال "تکذیب" کہلانا چاہئے، لیکن کانٹ اور حیاتیات دونوں متفق ہیں، کہ ان عمدی طرقِ عمل میں سے کم سے کم بعض طریقے زندگی کی عملی ضروریات میں سے ہیں، کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہم انکی مدد سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور یہ کہ سائنس کی جنت کو انسان نے مستحسن التباسات سے بنایا ہے؟

اپنے نظریۂ علم کے پہلے درجے کو نٹشے نے اس طرح بیان کیا ہے "نفس صداقت کذب ہے، واقعات من گھڑت چیزیں ہیں، تمام وہ چیزیں جن کا عقل احترام کرتی ہے، التباسات ہیں، چنانچہ نٹشے لکھتا ہے: "صداقت غیر موجود ہے، صداقت غلطی کی وہ قسم ہے جس کے بغیر جاندار مخلوق کی ایک خاص نوع زندہ

نہیں رہ سکتی"، "زندگی کے لئے اسکی قیمت بالآخر فیصلہ کن ہوتی ہے"، "یا یہ ایقان و ایمان کی ایک صورت ہے، جو وجود کی شرط بن چکی ہے"، "ایسی کوئی چیز موجود نہیں جسے ذہن، عقل، فکر، شعور، روح و ارادہ یا صداقت کہتے ہیں، یہ سب اوہام ہیں"، فلسفے کی گمراہیاں اس واقعہ کا نتیجہ ہیں، کہ منطق اور معقولات عقل کو افادی غایات کے لئے دنیا کے تطابق (بالفاظ دیگر بالخصوص ایک مفید تکذیب کے) محض وسائل سمجھنے کے بجائے ان کو صداقت اور خصوصًا حقیقت کا معیار سمجھ لیا گیا، حال آن کہ دراصل اس قسم کی باقاعدہ تکذیب کا حیاتیاتی افادہ "معیار صداقت" تھا، "وغیر ذلک" "واقعات غیر موجود ہیں، وجود صرف ان تاویلات کا ہے، جو ہماری ضروریات کا نتیجہ ہوتی ہیں" "ذات" غیر موجود ہے، یہ محض وہم ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک عقیدہ زندگی کو باقی رکھنے والا ہو، اور پھر بھی "کاذب" ہو، علت کا کوئی وجود نہیں، یہ کچھ پیدا کرنے کی قوت ہے، جو خیالًا اس چیز پر اضافہ کیجاتی ہے، جو وقوع پذیر ہورہی ہے، منطق کا کوئی وجود نہیں کیونکہ منطقی فکر کلیۃً ایسا وہم ہے، جو حقیقت میں کبھی واقع نہیں ہوتا، اس کے اصول یعنی، "قانون عینیت" اور "قانون اجتماع نقیضین" اوہام اور "احکام" ہیں، جن کا اطلاق صرف اختراعات پر ہوتا ہے، اور جو حقیقت کے لئے موزون نہیں، اس وجہ سے کہ بعینہ ایک ہی قسم کی مثالیں نہایت "کثیف" وہم ہیں، جسکو ایک ارادۂ طاقت نے اس شکل میں پیدا کیا ہے، مختصر یہ کہ ریاضی کی طرح منطق بھی ایسے مفروضہ وجودوں کے لئے صحیح ہے، جسکو خود ہم نے پیدا کیا ہے، یہ ہماری کوشش ہے کہ دنیا ہمارے مقاصد کے لئے زیادہ قابل مساحت اور ضابطے کی صورت میں بیان کرنے کے زیادہ قابل ہوجائے،"

(۱۴)

یہ صحیح ہے کہ عقل انسانی کے کمالات کا یہ اندازہ پوری طرح ثابت شدہ نہیں، معمولی اور عام فلسفی اس سے دہشت زدہ ہوگا، اس سے اس کی تشفی نہ ہوگی، لیکن یہ خیالات صرف نطشے ہی کے نہیں، اسکے نتائج کی اعلیٰ طبقے کے اصطلاحی فلاسفہ نے بھی تائید کی ہے، برگسان کا یہ عقیدہ کہ سائنس

حقیقت کے عملی ضروریات کیساتھ تطابق کا دوسرا نام ہے، اسی فیصلے کا زرم الفاظ میں اظہار ہے، اس سے بھی زیادہ مشابہت نٹشے اور اوہام کے اس سائنٹفک وظیفے کا یادگار زمانہ مطالعے میں ہے جو پروفیسر فے ہنگر نے کیا ہے، یہ کتاب اگرچہ ۱۹۱۱ء میں "THE PHILOSOPHY OF AS IF" کے نام سے شائع ہوئی، لیکن اس کا زمانہ تصنیف ۱۸۷۵ء کا ہے، پروفیسر فے ہنگر انتقادِ عقل نظری کی ایک جید شرح کا مصنف ہے، کانٹ کے فلسفے کے عمیق مطالعے کے بعد وہ بھی انہی نتائج پر پہنچا جن پر نٹشے پہنچا، ان کے علاوہ افادیتِ صداقت[1] کی جو مختلف صورتیں امریکہ و انگلستان میں پیدا ہوئیں وہ اگرچہ الگ الگ اور براہِ راست نفسیات، حیاتیات اور منطق کے واقعات سے شروع ہوئیں لیکن ان سب کا ارتقا ایک ہی سمت میں ہوا،

واقعات کے متعلق مستند مصنفین کا روز افزون اور اہم اجماع ان سب پر مستزاد ہے، علم صداقت منطق، یہانتک کہ ادراک دراصل حقیقی اشیاء کی شبیہیں نہیں، بلکہ مصنوعات ہیں، اور ان اشیاء پر مختلف اعمال کا نتیجہ ہیں، اس صنعت اور عمل کی وجہ سے یہ حقیقی اشیاء مختلف اور حیرت انگیز طریقوں سے بدل جاتی ہیں، لیکن اس واقعہ کی تشخیص کیا ہوگی، ؟ کیا یہ نتیجہ نکالنا ضروری ہے کہ "صداقت" کذب ہے، اور "علم" تکذیب ؟ کیا نفس یہ استاج تخمین نہیں، ؟ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ کیا یہ تخمین صادق و کاذب کے فرق کو مٹا کر خود نہیں مٹ جاتی، ؟ اگر "صداقت" "وہم" ہے، اور بغیر بناوٹ کے کوئی علم ہمکو حاصل نہیں ہوسکتا، تو وہم کے برے معنوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اسکے علاوہ علم کی تحلیل کی حیثیت سے اس استعمال پر اعتراض وارد ہوسکتا ہے، کہ یہ بہت زیادہ تکلیف دہ ہے، کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ صادق و کاذب میں ہم فی الواقع تمیز کرتے ہیں، اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس تمیز کا ایک وظیفہ ہے، اور اسکے ایک خاص معنی ہیں،

(۱۵)

تو پھر کیا اس کے علاوہ کوئی اور تاویل نہیں، ؟ نٹشے کی تصانیف میں چند باتیں ایسی ہیں جن سے

[1] PRAGMATISM

اشارہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی اور تاویل کی تلاش میں ہے، یہ باتیں خصوصیت کیساتھ اس کی کتاب "WILL TO POWER" کے اس مسودے میں ملتی ہیں، جو اسکے سلسلۂ مصنفات کی انیسویں جلد ہے اور جس کا بدقسمتی سے انگریزی ترجمہ نہیں ہوا، لیکن یہ بتانا آسان نہیں، کہ یہ منفرد مختصر بیانات ہیں، یا "ذہن کے کام" کی بحیثیت صادق یا کاذب، بازتمین کی ابتدا، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نطشے کس حد تک ان کے اور اپنے عام تمینات کے تباین سے واقف تھا،[1]

لیکن ہم کو اس افتراض کا امتحان کرنا چاہئے، کہ انسانی فعیت صداقت کا سرچشمہ ہو سکتی ہے، نہ کہ کذب کا، ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتے ہیں، کہ ہر علم میں انسان کی دست درازی شامل ہوتی ہے صداقت جوہراً ایک تمین ہے، احساسات واقع نہیں ہوتے، اور ادراکات پہلے ہی سے تمینات سے پر ہوتے ہیں، کیونکہ اصلی معطیات بحالت فساد تھے،[2] اور صرف وہ تصورات باقی رہ سکتے ہیں، جو مفید تھے، اور یہ کہ "تمام کے تمام وقوفی آلون کا رُخ اشیا پر غلبہ پانے کی سمت ہے، نہ کہ علم کی طرف"، لیکن ان سب سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جائے کہ "جس دنیا سے ہمیں تعلق ہے، وہ کاذب ہے، ؟" اس کو "کاذب" کہنے کا آخر مطلب کیا ہو؟

---

[1] نطشے نے اپنے اس عقیدے کو کہ سائنس ایک وہم ہے، غیر متناقض طور پر استعمال نہیں کیا، چنانچہ وہ "ابدی اعادے" کے عقیدے کو بقاے توانائی کے سائنٹفک اصول پر مبنی کرتا ہے، اور یہ نہیں دیکھتا کہ سائنس کی وہمی نوعیت کی وجہ سے اس کا عقیدہ بے کار ہوا جاتا ہے، (مصنف)

[2] لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہیوم سے قبل اور بعد کے اکثر فلاسفہ اور کانٹ کی طرح نطشے اس خیال میں ہیوم سے متفق ہے کہ یہ فساد "ذروی (ATOMIC) تمثالات" یا "تصورات" کے سلسلے سے مرکب ہے، نہ کہ ایک مسلسل تغیر سے، لہذا وہ یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ چونکہ مسئلۂ علم ترکیب کا نہیں، بلکہ تحلیل کا مسئلہ ہے، اور یہ کہ بحیثیت سلسلہ اس کی ان گنت طریقوں سے تحلیل کی جا سکتی ہے، لہذا اس فساد میں نظام و ترتیب پیدا کرنے کا ہر طریقہ لازماً من گھڑت لہذا کاذب ہوگا، بہ شرطیکہ ہماری مداخلت تکذیب کا باعث ہو، (مصنف)

کیا یہ نتیجہ نکالنا بہتر نہیں کہ ایک "حقیقی" دنیا جس سے ہمیں کوئی تعلق نہیں "کاذب" ہے ؟ یہ مسلّم ہے کہ دُنیا کی تمام قیمت کا انحصار اسکی اس تاویل پر ہے، جو کیجاتی ہے" تو پھر کیون نہ ہم اپنے تعصبات کی تردید کے متعلق اپنے خیال کو کلیتہً بدل دین، اور "واقعات" زندگی کے خطرات اور فکر کی جرأتوں کو خوش آمدید کہین، ؟ واقعات کی طرف سے اغماض کرنے یا ان کو بُرا کہنے کی بجائے یہ کیون نہ کہا جائے کہ "مسرت یقین میں نہین بلکہ عدم یقین ....... اور مسلسل خلاقیت میں مضمر ہے، آیندہ سے اس عاجزانہ گلے کے بجائے کہ "یہ محض موضوعی ہے" کیون نہ یہ کہا جائے کہ "یہ سب ہمارا کام ہے، ہم کو اس پر فخر ہونا چاہیے" خصوصًا اس وقت جب ہم یہ معلوم کرلین، کہ تجربے کو "موضوعی" یا "معروضی" کہنا بہ ذات خود قیمت کی ایک تصدیق کا نتیجہ ہے، ؟

(۱۶)

ہیوم کے اس انکشاف پر کہ ہم اپنے معطیاتِ حواس پر اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہین، اس آخری تجاوز عن الثقت کے عمل کرنے کی خواہش افادیت صداقت کی اس صورت کا نکالنا ہے جسکو "انسانیت" کہتے ہین، اور اس حد تک یہ اس خاص اہم طریق فکر کے ارتقار کی آخری کڑی ہے، تاہم یہ تیقین کا بہت آسان اور سادہ تغیر ہے، یہی تغیر فلسفے کو ان مشکلات سے نجات دلاتا ہے، جو صدیوں سے اسکو درپیش تھیں، اور یہی ارتیابیت کے التباس کا خاتمہ کرتا ہے، اس کے لئے ضرورت صرف یہ کہنے کی ہے، کہ صداقت بلاشبہہ انسانی ہے، علم فعال ہے، اور زندگی اور طاقت کی شرط ہے نہ کہ ارتسامات کا انفعالی وصول، اور ایک اجنبی حقیقت کا عکس، یہ سب ٹھیک ہے، اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے؟ ہم کو اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، کیونکہ کیا اس طرح حقیقت ہمارے لئے امید افزا طور پر انسانی نہیں بنجاتی، ؟ آؤ ہم اس تعصب کو کہ صداقت کو "دی ہوئی چیز" کا عکس شبیہ یا نقل ہونا چاہیے، بیکار اور بلاسند کہہ کر مسترد کردین کیونکہ صداقت نہ ایسی ہے، اور نہ ہوسکتی ہے، اگر ہماری صداقت انسانی ہے،

تو کیون نہ ہم یہ بھی تسلیم کر لین، کہ حقیقت بھی ایسی ہی ہے، اسلئے ہماری صداقت اس کے لئے موزون ہوسکتی ہے، ؟ ہم یہ کیون فرض کرین کہ ہمارے تجربات کی دنیا ہماری عقل کے مساوی ہے، ؟ اوس کو اوراس اطلاقی حقیقت کو بعینہٖ ایک ہی ثابت کرنے کی تکلیف کیون گوارا کی جائے، جو ہمیشہ ہم کو دھوکا دیتی ہے، اور ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی ہے، ؟ صداقت کو بلاسبب و بلاسند ایسی صورت میں پیش کرکے جس کو کسی انسان کا ذہن حاصل نہیں کرسکتا، ہمین اپنے آپ کو مایوس کن ارتیابیت کے حوالے نہ کرنا چاہئے، صداقت کو ان تمام اعمال پر حاوی ہونے دو، جو ہماری علمی فعلیتون کے لئے ضروری اور سب سے زیادہ کارآمد ہین، اس سے بھی زیادہ یہ کہ صداقت کو اس کے مقابل کذب سے تمیز کرنے کے لئے جو مختلف آزمائشیں ہم کرتے ہین، ان مین کامیاب ہونے کے لئے اس کے وظیفے اور قیمت کی طرف اشارے کو بھی اسکے معنون کا حصہ بنا لینا چاہئے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ نٹشے اس حد تک پہنچ گیا تھا، پھر بھی یہ دکھایا جاچکا ہے، کہ بعض اوقات وہ اس کے بہت قریب آجاتا ہے، صداقت کے دعوون کی آزمایشوں کے لئے افادیتِ صداقت کا معیار ان کے نتائج کی کامیابی کی تدوین کرتا ہے، اکثر وہ اپنے آپ کو اس تعقب سے نجات نہیں دلا سکتا کہ اگر یہ ہماری فعلیت کا نتیجہ ہے، تو یہ لازمًا کاذب ہے" اسی وجہ سے انسانیت کی طرف میلان کے باوجود اسکو حقیقی معنون میں افادیت صداقت کا قائل نہیں کہا جاسکتا۔ وہ صداقت کی افادی نوعیت کو دریافت تو کر لیتا ہے لیکن اس کو صادق نہیں، بلکہ کاذب کہتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ فرق اسقدر باریک ہے کہ افادیت صداقت کے ناقدین کو دکھائی نہیں دیا، واقعہ یہ ہے، کہ وہ اسکو نہ صرف افادیتِ صداقت کا قائل کہتے ہین، بلکہ اسکے عقیدے کو غلطی سے حقیقی افادیتِ صداقت کی طرف منسوب کرتے ہین، کیونکہ اس طرح وہ یہ ظاہر کرسکتے ہین، کہ افادیتِ صداقت کے قائلین اسقدر غیر محتاط ہین، کہ وہ ہر اس "جھوٹ" کو "سچ" کہدیتے ہین، جو ان کے مفید مطلب ہوتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ افادیتِ صداقت جو ہر

یہ واضح کرنے کی کوشش کرتی ہے، کہ جب کوئی مزعومہ صداقت یا صداقت کا مفروضہ دعویٰ ٹھیک ٹھیک کام کرتا ہے، تو کوئی شخص بھی اسکو کاذب کہنے کا حق نہیں رکھتا، یہ معلوم نہیں کیاجاتا کہ ایک ہی بیان ایک ہی شخص کے لئے ایک ہی وقت میں "جھوٹا" اور "سچا" نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ ہر شخص کے عقائد اس خاص وقت کے لئے اسکے نزدیک ہمیشہ سچ ہی ہوتے ہیں، اس سے جیسا کہ نطشے نے معلوم کیا، نتیجہ یہ ہے کہ واقعیت ملائے واحد نہیں جمع ہے، اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا، کہ "لہذا صداقت غیر موجود ہے" یہ نتیجہ البتہ نکلتا ہے کہ یہ ابھی معرض تکوین میں ہے،

مختصر یہ کہ نطشے کے نظریۂ علم میں عبوری صورت کی تمام سبق آموزی پائی جاتی ہے، وہ ابھی تک اسی خیال کی گرفت میں ہے، کہ یہ ہمارے علم کی غلطی ہے، کہ وہ اپنے معلیات کی نقل کی کوشش نہیں کرتا، لیکن وہ اپنے اس تعصب کو اسقدر صفائی کیساتھ بیان کرتا ہے، اور اس سے پیدا ہونے والے استبعادات کا اسقدر جرأت کے ساتھ کھوج لگاتا ہے، کہ ہر شخص نہایت آسانی کیساتھ دعویٰ کر سکتا ہے، کہ وہ اپنے اس مخصوص استدلال کی وجہ سے ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے، جو بالکل قیاسی اور ناقابل حمایت ہے، یہی اس تمام بحث کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، اپنے نظریۂ اخلاق کی طرح اپنے نظریۂ علم میں بھی نطشے بہت زیادہ نکتہ آفرین ہے، اور خود اپنی غلطیوں کی وجہ سے آیندہ ترقی کی تحریک کرتا ہے، اس کا کام ہر جگہ ناکمل، اور بعض اوقات خام مگر شاندار اور جاندار ہے، جس زمانے میں اس کے قوائے ذہنی اور ملکاتِ نفسانی میں پختگی پیدا ہو رہی تھی، عین اس وقت جنون کے حملے نے اس کی فلسفیانہ زندگی کا خاتمہ کر دیا،

## نطشے

مشہور جرمن فلاسفر فریڈریک نطشے کی سوانحعمری اور اسکے افکار و خیالات اور تصانیف پر بحث و تبصرہ ہی، مصنفہ پروفیسر مظفرالدین ندوی ایم اے، حجم ۱۴۲ صفحے، قیمت ۱۲/ر

# منظر الانسان کا مصنف

از

جناب مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی

معارف جون ۱۹۳۲ء میں مکرمی محمد غوث صاحب کا ایک مقالہ بعنوان "کتب خانہ دفتر دیوانی حیدرآباد دکن" شائع ہوا تھا، فاضل دوست نے علمی نوادر کا ذکر کرتے ہوئے، نمبر ۱۳ میں منظر الانسان ترجمۂ وفیات الاعیان کے متعلق لکھتے ہیں:

"۱۳، منظر الانسان ترجمۂ وفیات الاعیان، اس کتاب کو یوسف بن احمد السنجری نے ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے، سلطان ناصر الدین ابوالفتح محمود شاہ بن محمد شاہ گجراتی (۸۶۳ھ - ۹۱۷ھ) کے حکم سے ترجمہ کا آغاز ہوا، سلطان نے ۹۰۶ھ میں حکم صادر کیا ۹۰۷ھ میں کام کا آغاز ہوا، اور ۹۱۲ھ میں ترجمہ مکمل ہو کر بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش ہوا، ۲۵ - دوسری کتابوں سے اس ترجمہ میں مطالبات کا اضافہ کیا گیا ۹۱۵ھ میں نظر ثانی ہوئی"

محمد غوث صاحب نے غالباً یہ تمام اطلاع اس کے مقدمہ سے حاصل کی ہے، جہاں تک میری

---

[1] شاید کم لوگوں کو یہ علم ہے کہ دفتر دیوانی کے کتب خانے کا قیام علم دوست سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی کا مرہون منت ہے، اللہ تعالیٰ اون کو مزید توفیق دے کہ اس سے بھی زیادہ علمی نوادر جمع کریں،

معلومات کو دخل ہے، محض گجرات ہی ایک ایسا خطہ ہے، جہاں کی صحیح تاریخ ہم کو عربی زبان میں ملتی ہے، ورنہ ہندوستان کی سب تاریخی کتب فارسی میں ہیں، میری مراد

ظفر الوالہ بمظفر وآلہ لعبد اللہ محمد بن عمر الشہیر بالحاج الدبیر الآصفی الکی الغانی،

سے ہے کاش یہ تاریخ مکمل دستیاب ہو جاتی، تو کم سے کم گجرات کے صحیح حالات، اور وہاں کی بہت سی تاریخی اور اسلامی ثقافت کی مشکلات کو حل کرنے میں مدد ملتی، حاجی دبیر نے خصوصیت سے صحیح واقعات اور ثقافتی پہلو پر بہت زور دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ منظر الانسان کا ذکر بھی ہم کو محض اسی تاریخ گجرات میں مفصل ملتا ہے، جیسا کہ حاجی دبیر کے الفاظ ذیل سے عیاں ہے:-

ابن خلکان کے ترجمہ منظر الانسان کے خطبہ میں جسے مولینا یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان نے سلطان محمود بن محمد کے نام پر ترجمہ کیا تھا، کوہ چانپانیر کی فتح کی تاریخ ملتی ہے، جو ۸۸۹ھ میں ہوئی تھی، اسکا پتہ لفظ "فتح" سے چلتا ہے، اور خطبہ میں اس کے تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ تالیف (ترجمہ) اسی سنہ میں ہوئی، ترجمہ کی خوبی دونوں زبانوں میں مترجم رحمۃ اللہ علیہ کی مہارت اور ان کے کمال پر دونوں فریق کی شہادت کا ثبوت ہے، سید عثمان بلا واسطہ مولینا برہان الدین قطب عالم کے خلفائے کبار میں تھے، اور ان کی جانب سے ان کو شمع برہانی کا لقب ملا تھا، انھی نے قریہ عثمان پور آباد کیا تھا، اور وہیں سکونت اختیار کی تھی، ان کا مرقد بھی وہیں ہے، اس قریہ اور حصار احمد آباد کے درمیان دریائے سابہر ہے، یہ دریا اس کے شمال مغرب کے درمیان ہے، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمود بن محمد ان کا مرید تھا، اور یہ ارادت ان کے ساتھ اس کے اعتقاد اور حسن ظن کا نتیجہ تھی، اور کبھی ان سے وہ (ظلم؟) حاصل بھی کرتا تھا، اور اکثر ان کے پاس آیا جایا

کرتا تھا، اور سلطان اور اس کے اسلاف کی جانب سے ان کے، ان کے اہل و عیال، ان کے خاندان اور ان کے اتباع کے بڑے بڑے وظائف مقرر تھے، اور سلطان کی اکثر کتابیں ان کے قبضہ میں اور ان کے مدرسہ میں تھیں، ان کی وفات جمادی الاولی ۹۲۳ھ میں ہوئی، خدا ہم کو ان سے فائدہ پہنچائے[1]"

محمود بیگرہ نے چانپانیر کو ۸۸۹ھ میں فتح کیا تھا، اور اسی فتح کی یادگار میں اس نے ابن خلکان کے ترجمہ کا حکم دیا جیسا کہ مقدمہ کے الفاظ سے ظاہر ہے، اور اس فتح کی مزید تصدیق اس سے ہوتی ہے، کہ محمود بیگرہ نے چانپانیر کا نام محمد آباد رکھا، اور وہاں قلعہ تعمیر کرکے اس کے دونوں دروازوں ہالول اور گودھرہ پر ذیل کا کتبہ بھی خط نسخ میں کندہ کرا کے لگایا،

"الواثق باللہ المنان ناصر الدنیا والدین ابوالفتح محمود شاہ بن محمد شاہ بن احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان خلد اللہ تعالی ملکہ و سلطنتہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ یوم الاحد فی ثانی شہر ذی القعدۃ سنۃ تسع و ثمانین و ثمانمایۃ. کتبہ شیخ احمد بن محمد السلطانی[2]"

افسوس کہ قلعہ محمد آباد اور بیرون قلعہ کی اسلامی عمارتوں کے تمام کتبات ضائع ہو چکے ہیں، ورنہ ان سے محمد آباد کے حالات پر خاصی روشنی پڑتی، ہالول نامی گاؤں میں ایک قدیم شکستہ مسجد کا ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے، جو ۹۳۰ھ مظفر ثانی کے زمانہ کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چانپانیر کو چھوڑ دینے کے بعد بھی وہاں آبادی رہی،

سید عثمان سے محمود بیگرہ کو بہت عقیدت تھی، اس کا ثبوت ان کے مزار اور مسجد کی پرشکوہ

---

[1] عربی تاریخ گجرات ص ۳۲، یہ کتاب سر ڈینیسن راس نے ۱۹۱۰ء میں نہایت آب و تاب سے تین جلدوں میں شائع کرکے اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے، [2] فہرست کتبات ادارۂ معارف اسلامیہ،

عمارتوں سے ملتا ہے، جو آج سید عثمان کے خطاب شمع برہانی کے نام سے مشہور ہیں، اور سابرمتی کے مغربی کنارے پر مرجع خاص و عام ہیں، اگر اس مسجد کا کتبہ گم نہ ہو گیا ہوتا، تو اس پر بھی روشنی پڑ سکتی تھی یہ عمارتیں کب اور کس نے بنوائیں، اس مزار پر اب بھی بے شمار عقیدت مند مرد عورتیں نظر آتی ہیں، سلطان محمود ثالث گجراتی (۹۴۳ھ ۔ ۹۶۱ھ) کے عہد میں سید عثمان کے خاندان کے ایک اور فرد سید اکبر اعظم بن سید آدم عالم کا نام ملتا ہے، جو کبر سنی میں بھی دینی امور کی تحقیق و تدقیق میں ہمہ تن مشغول تھے، ان سے سلطان محمود کو بے حد عقیدت تھی،[1]

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ گجرات ہی ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں اب بھی ابتدائی اسلامی فنی اور ادبی آثار ملتے ہیں، کیونکہ مسلمان ابتدا میں اسی کے گرد و نواح کے بری اور بحری راستوں سے آئے تھے، اصل احمد آباد کی بنا و تعمیر ابتدائی نویں صدی ہجری ہے، مگر وہاں ۲۴ ربیع الاول ۴۴۵ھ کا مسجد کا ایک کتبہ ملتا ہے، جو محمود غزنوی کے چند ہی سال بعد کا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ مسلمان یہاں اسی زمانہ سے آباد تھے، اگرچہ کسی خاص بادشاہ کے تحت میں نہ تھے، متن میں کتبہ کی عبارت یہ ہے،

"هذا المسجد فی الرابع والعشرین من ربیع الاولی وسنة خمس و اربعین واربعمائة"[2]

مندکرۂ بالا تحریر نیز حاجی دبیر اور دیگر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں بیشمار اسلامی کتب خانے تھے، بعض تحریروں سے بعض اہم مسودات کے نام بھی ملتے ہیں، جو آج عنقا ہیں، اگر گجرات کے اس اسلامی اور تاریخی پہلو پر بالاستیعاب لکھا جائے، تو بہت سے معلومات میں اضافہ ہوگا،[3]

---

[1] یہاں مطبوعہ تاریخ مرأت سکندری کچھ غلط ہے، ص ۲۹۶ بمبئی ۱۳۰۸ھ قلمی نسخہ، ترجمہ انگریزی فضل اللہ ص ۲۴۰،

[2] فہرست کتبات ادارہ معارف اسلامیہ لاہور ۱۹۳۶ء نمبر ۹، اسی کتبہ کے اطراف میں کندہ ہے،

"این تاریخ قدیم است یافتہ شد از بنیاد این مسجد"

[3] ہمارے مکرم دوست جناب محمد ابراہیم صاحب پروفیسر گجرات کالج احمد آباد "اسلامی علوم کی ترویج ترقی گجرات پر" لکھنے میں مصروف ہیں،

# تلخیص و تبصرہ

## روس کا آیندہ دستور حکومت

۲۵، نومبر ۱۹۳۶ء کو روس کا جدید دستور حکومت نافذ ہونے والا ہے، اس پر ایک مضمون مسٹر لوئی فشر (Louis Fischer) کے قلم سے روزنامہ ایڈوانس مورخہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۶ء مین شائع ہوا ہے جسکا خلاصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہین :-

جدید دستور سوویٹ حکومت کا تیسرا دستور ہے، پہلا دس جولائی ۱۹۱۸ء کو نافذ کیا گیا تھا، اور دوسرا ۳۱ر جنوری ۱۹۲۴ء کو پہلے اور دوسرے دستورون میں صرف حکومت کا ہاتہ مضبوط کیا گیا تھا، شہریون کے حقوق کی تصریح پیش نظر نہ تھی اسکی وجہ یہ تھی کہ خانہ جنگی کی یاد ابھی تازہ تھی، اور گھر کے دشمنون کی بیخ کنی پوری طرح نہیں ہو چکی تھی، اسلئے آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی شدت اور مطلق العنانی ناگزیر تھی، حکومت نام کے لئے اشتراکی تھی، سرمایہ داری کی طرف سے مقاومت اور قوت کا اظہار ہو رہا تھا، نصف تجارت ایک خمس صنعت و حرفت، اور تمام زراعت غیر سرکاری ہاتھون مین تھی، ان حالات مین حکومت تمام باشندون کے لئے روزگار کی ضمانت نہیں لے سکتی تھی، وہ اسوقت تک اپنے گھر کی مالک نہ تھی، اسی وجہ سے ۱۹۲۴ء میں بھی دستور کی بنیاد شہریون کے حقوق کے بجائے حکومت کی قوت پر رکھی گئی،

تاہم جدید دستور میں جو حقوق شہریوں کو دیے گئے ہین، ان میں سے بہتیرے انھیں پہلے سے عملاً حاصل تھے، مثلاً یہ دستور ملک کے تمام باشندون کے لئے روزگار، اوقات فرصت، اور بے معاوضہ تعلیم کی ضمانت کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سوویٹ حکومت میں اسوقت بھی بے روزگاری نہیں ہے، حکومت کی طرف

سے ہر باشندہ کو کام ملتا ہے، ہر مزدور کو قانونی طور پر کم از کم دو ہفتے کی تعطیل با معاوضہ ملتی ہے، اور اکثر یہ مدت بڑھ بھی جاتی ہے، کام کی مدت عموماً سات گھنٹے ہے، امید کی جاتی ہے کہ آیندہ اس میں کچھ اور تخفیف ہو جائے گی، جبری تعلیم دوسری قوموں نے بھی اختیار کر لی ہے، اس باب میں روس کی مثال کوئی استثنائی مثال نہیں ہے لیکن کسی دوسرے ملک میں بالغوں کی اتنی کثیر تعداد اسکول نہیں جاتی، روس میں ایسے کارخانے بھی ہیں جن میں ساٹھ سے نوے فی صدی تک کام کرنے والے مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں، لہذا جہانتک روزگار، اوقاتِ فرصت اور تعلیم کا تعلق ہے، جدید دستور میں موجودہ صورتِ حال کو صرف قانونی شکل دیدی گئی ہے۔

لیکن اس دستور میں چند ایسے حقوق بھی دیے گئے ہیں، جو پہلے ممنوع تھے، جب کہ آمریت سرمایہ داری سے برسرِ پیکار تھی، مثلاً تقریر کی آزادی، پریس کی آزادی، اجتماع اور جلسوں کی آزادی، جلوس اور مظاہروں کی آزادی، دستور کی دفعہ (۱۲۷) کی رو سے سویٹ روس کا کوئی شہری عدالت کے فیصلہ یا وکیلِ سرکار (Prosecuting attorney) کی منظوری کے بغیر گرفتار نہیں کیا جاسکتا، اور دفعہ (۱۲۰) کی رو سے نہ تو کسی شہری کے گھر میں کوئی دوسرا داخل ہو سکتا ہے، اور نہ اسکے خطوط کھولے جا سکتے ہیں، یہ وہ اہم حقوق ہیں جو ۱۹۲۴ء کے دستور میں عطا نہیں کئے گئے تھے کیونکہ اس وقت ملکی حالات کے اقتضا سے آمریت کے اختیارات غیر محدود رکھے گئے تھے،

جدید دستور میں وکیلِ سرکار سویٹ حکومت کا سب سے زیادہ طاقتور عہدہ دار ہے، اس کا تقرر مجلس عالیہ (Supreme Council) یعنی ملکی پارلیمنٹ کی طرف سے سات سال کے لئے ہوگا، حالانکہ حکومت کے تمام دوسرے ارکان صرف چار سال کے لئے مقرر کئے جائیں گے، اسکا خاص کام شخصی حقوق کا تحفظ ہوگا، حکومت اگر کسی شخص کو گرفتار کرنا یا کسی مکان کی تلاشی لینا چاہے، تو اسے وکیلِ سرکار یا عدالت سے باضابطہ اجازت حاصل کرنا پڑیگی، وکیلِ سرکار حکومت کی جس کارروائی کو نامناسب خیال کرے مسترد کر سکتا ہے،

یہ دستور سوویٹ عدالتوں کو ایک نئی اہمیت اور نئی آزادی عطا کرتا ہے، حال میں سوویٹ یونین کے خاص وکیل سرکار وشینسکی (A. Vyshinsky) کا ایک مضمون "سوویٹ عدالتوں اور سوویٹ" کے عنوان سے رسالہ بولشیوک میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے بیان کیا تھا، کہ سوویٹ عدالتوں کے اولین اصول یہ ہوں گے،:- کھلی ہوئی عدالتوں میں مقدمات کی سماعت، بحث کی آزادی، ملزم کے حقوق کی ضمانت، مقدمہ کے تمام فریقوں میں مساوات، خواہ حکومت بھی اُن میں سے ایک فریق ہو، اور مدعا علیہ کے وکیلوں کے لیے پیروی کی پوری آزادی، یہ مسلک سوویٹ روس میں ایک نئی چیز ہے، یہ اُس جمہوریت کا ایک جزو ہے، جسے نیا دستور جاری کر رہا ہے،

جدید دستور سوویٹ کانگریس کے اجلاس سے جو ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو ماسکو میں منعقد ہوگا، نافذ کر دیا جائے گا، وہ تاریخ سوویٹ شہریوں کے ملکی حقوق کے لئے ایک نئے دور کا افتتاح کریگی، سوویٹ روس کے باشندوں کو ابتدا سے بعض نہایت اہم حقوق حاصل رہے ہیں، مثلاً معاشیاتی استحصال (Economic exploitation) کی غیر موجودگی، عورتوں اور مردوں کی مساوات، اور عورتوں کے لیے مخصوص مراعات، قومی اقلیتوں کی سیاسی عدم قابلیت کا ازالہ، سابق ادنیٰ طبقوں کی جانبداری جنکی وجہ سے وہ سیاسیات، اقتصادی نظم و نسق، اور سائنس وغیرہ کے بلند ترین مقامات پر پہنچ گئے، حکومت کی طرف سے صحتِ عامہ کی نگہداشت، مختلف وسائل، مثلاً مخصوص تحقیقاتی کمیشن، پریس وغیرہ جن کی مدد سے کوئی شہری سرکاری کارروائیوں کے خلاف احتجاج کرکے انصاف حاصل کر سکتا تھا، وغیرہ، وغیرہ، تاہم ملکی حقوق کے بغیر یہ آزادی نامکمل تھی، اب یہ ملکی حقوق سب کو عطا کر دئے گئے ہیں جنہیں اہل کلیسا، زار کے عہد کے افسر اور بالشیوزم کے سابق دشمن بھی شامل ہیں،

جدید جمہوریت کی بنیادی شے دو ایوانوں کی ایک پارلیمنٹ یا مجلسِ عالیہ ہے، جو حکومت کے تمام اختیارات کا سرچشمہ ہے، ایوان زیرین کے ارکان چار سال کے لئے رائے عامہ سے منتخب کئے جائینگے

اور ہر تین لاکھ باشندون کی طرف سے ایک مندوب ہوگا، ایوان بالا مختلف قومیت کی کونسل ہوگی، اور اس کے ارکان کا انتخاب تناسب کے لحاظ سے مختلف قومی جمہوریتوں اور قومی خود مختار ریاستوں کی طرف سے ہوگا، تاکہ روس کی متحدہ سوویٹ جمہوریتوں کے نسلی حقوق کا تحفظ ہوسکے، تمام قوانین کا نفاذ پارلیمنٹ سے ہوگا، اور اسی کی ہدایت سے پارلیمنٹ کے سارے کام ہون گے، پارلیمنٹ کو اختیار ہوگا، کہ اہم مسائل پر ملک سے رجوع کرکے پوری قوم کی راے معلوم کرے، مجرمون کو معاف کردینے کا حق بھی اُسے حاصل ہوگا، پارلیمنٹ کا ممبر قانون کی گرفت سے آزاد ہوگا، صرف پارلیمنٹ یا جب اسکا اجلاس نہ ہوتا ہو، تو ۳۰ ممبرون کی جماعت اسکی یہ آزادی سلب کرسکتی ہے کسی مسودہ قانون کے قانون بننے کے لئے ضروری ہے، کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اُسے منظور کرلین، اگر وہ اتفاق نہ کرسکین، اور کوئی مفاہمت ممکن نہ ہو تو پارلیمنٹ برخاست کردیجائے گی، اور جدید انتخابات ہون گے، مجلس وزراء کا انتخاب دونون ایوانون کے اتفاق رائے سے ہوگا، اسی طرح وزراء کی علٰحدگی کے لئے بھی دونون کا اتفاق ضروری ہوگا، اس کے یہ معنی ہیں، کہ پارلیمنٹ جب چاہے، حکومت کو شکست دے سکتی ہے،

"ع ز"

## امریکہ میں خودکشی کی رفتار

ریاستہاے متحدہ امریکہ مین ہر نصف گھنٹہ کے اندر کوئی نہ کوئی آدمی خودکشی کرلیتا ہے، تیس برس سے ہر سال بیس ہزار آدمی خودکشی کرتے آئے ہین، اس کے علاوہ ان لوگوں کی تعداد جنھون نے خودکشی کی فکر کا مرحلہ طے کیا، سالانہ چالیس ہزار رہی ہے، لیکن تازہ ترین اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے، کہ ۱۹۲۵ء میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد صرف سترہ ہزار تھی، جو پچھلے دس سال کے اعداد کے لحاظ سے سب سے کم تھی، یہ جرم کساد بازاری کے زمانہ میں ہمیشہ ترقی کرجاتا ہے، چنانچہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک خودکشی کرنے والون کا شمار ۱۹۸۳۶ تھا، ۱۹۳۲ء میں ان کی تعداد ۲۰۹۲۷ تھی، جو ۱۹۳۴ء میں گھٹ کر

۱۰۰۸۲۰ رہ گئی،

معاشی حالات کی درستی کے بعد سب سے زیادہ جو چیز اس تخفیف کی ذمہ دار قرار دی جا سکتی ہے، وہ ڈاکٹر ہیری وارن (Dr Harry M. Warren) صدر "قومی انجمن تحفظ جان (National Save-a-life League) کی ذات ہے، موصوف ہر ماہ چار سو خودکشی کا ارادہ رکھنے والوں کی نگہداشت کرتے ہیں، اور تیس سال کے عرصہ میں جب سے انھوں نے یہ انجمن قائم کی ہے تیس ہزار آدمیوں کو اس جرم کے ارتکاب سے باز رکھ چکے ہیں، ۱۹۰۶ء کی کساد بازاری کے زمانہ میں خودکشی کی وبا کثرت سے پھیلی ہوئی تھی، اسی زمانہ میں ڈاکٹر وارن کی نظر سے کسی پروفیسر کا مقالہ گذرا، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ پانچ سال کے اندر دنیا میں دس لاکھ آدمیوں نے خودکشی کرلی ہے، یہ یقین کر کے کہ اکثر صورتوں میں خودکشی کا ارتکاب برمحل مشورہ سے روکا جا سکتا ہے، ڈاکٹر موصوف نے فوراً اپنی لیگ قائم کی، اور گرجاؤں، ہسپتالوں، عدالتوں اور پولیس کی اجازت سے اس بات کا انتظام کیا، کہ جو لوگ خودکشی کا اقدام کرتے ہیں، لیکن کامیاب نہیں ہوتے، ان سے گفتگو کی جا سکے، آج ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس لیگ کے ممبروں کی تعداد چھ ہزار ہے، اور ڈاکٹر وارن بارہ مددگاروں کی جماعت کیساتھ اس کام میں ہمہ تن مصروف ہیں، جو لوگ نیویارک سے باہر رہتے ہیں، انھیں اقدام کی اطلاع ملتے ہی فوراً خط لکھا جاتا ہے، اور خودکشی کے گناہ اور بے سود ہونے کے متعلق بہت موثر طریقے سے سمجھایا جاتا ہے، دوسرے لوگ انجمن کی خدمات سے واقف ہونے کے بعد خود ہی بذریعہ ڈاک اس سے مشورہ طلب کرتے ہیں،

بعض خودکشیاں جسمانی یا دماغی امراض کا نتیجہ ہوتی ہیں، اور مناسب علاج سے روکی جا سکتی ہیں بعض کے روکنے میں قانونی یا مالی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، پچھلے سال لیگ کے کارکنوں نے ۱۲۰۰ ایسے گھروں کے حالات دریافت کئے تھے، جہاں خودکشی کی گئی تھی، اور ۱۹۹۱ ایسے گھروں کے جہاں

ارتکاب کی کوشش نا کام ثابت ہوئی تھی معلوم ہوا کہ دوسرے زیادہ گھروں میں روٹی کمانے والوں ہی نے خودکشی کرلی تھی، اور اپنے پیچھے بیواؤں اور یتیم بچوں کو چھوڑا تھا، لیگ کی کوششوں سے امریکہ کے سو بڑے شہروں میں خودکشی کا اوسط ۱۹۳۲ء کے ۲ء۱۷ سے اتر کر ۱۹۳۵ء میں ۷ء۱۵ فی لاکھ تک آگیا ہے،

امریکہ میں خودکشی کا ارتکاب اکثر جون کے مہینہ میں ہوتا ہے، کیونکہ جون ہی میں مالی مشکلات زیادہ پیش آتی ہیں، مایوسوں کے لئے سب سے زیادہ مایوسی کا دن دوشنبہ کا ہوتا ہے، کیونکہ اتوار کی تعطیل میں انھیں اپنی مشکلات و مصائب پر غور کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے، خودکشی کا وقت عموماً شام کو چھ اور سات کے درمیان ہوتا ہے، جب لوگ تمام دن روزگار کی بے سود تلاش کے بعد انتہائی افسردگی کی حالت میں گھر لوٹتے ہیں، خودکشی کرنے والوں میں مردوں کی تعداد ۳/۴ ہوتی ہے اس کا خاص سبب کاروبار کی ناکامی ہوتی ہے لیکن انیس سال کی عمر تک لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں خودکشی کرتی ہیں، اس کا خاص سبب محبت کی ناکامی ہوتی ہے، انتالیس سال کی عمر تک مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں خودکشی کرنے والیوں کا اوسط ۱/۲ سے ۱/۳ تک ہے، چالیس سال کے بعد عورتوں کی تعداد صرف ۱/۴ رہ جاتی ہے، شادی شدہ لوگوں میں خودکشی کا اوسط بہ نسبت مجرد لوگوں کے کم ہے، اور مجرد لوگوں میں یہ اوسط اُن اشخاص سے کم ہے، جن میں زوجین میں سے کوئی ایک مرچکا ہو، یا طلاق کے ذریعہ علحدگی ہو چکی ہو، نوجوانوں میں خودکشی کی وبا زیادہ تر بڑے شہروں میں ہے، پیشہ والوں اور تجارتی طبقوں کا اوسط بہ نسبت مزدوروں کے بہت زیادہ ہے، سپاہیوں اور مجرموں کے اعداد خصوصیت کیساتھ زیادہ ہیں، یہودیوں میں خودکشی کے واقعات شاذ و نادر ہوتے ہیں، رومن کیتھولک میں ہوتے تو ہیں مگر بہت کم،

(ل - ل)
"ع ز"

# ملک کی خوشحالی پرآفتاب کے داغون کا اثر

گذشتہ جولائی میں ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ کے ہیئت داں ڈاکٹر لورنگ بیل اینڈریوز (Loring Beal Andrews) نے اس خیال کا اظہار کیا ہو کا، دبار کا اُتار چڑھاؤ ممکن ہو آفتاب کے داغون کے سبب ہوتا ہو، اب سے ۶۵ سال قبل ایک انگریز ماہر اقتصادیات ولیم اسٹینلی جیونس (William Stanley Jevons) نے یہ تحقیق شروع کی تھی کہ بیاروں کا ملک کی خوشحالی یاکسادبازاری سے کہانتک تعلق ہو، اور اس نے یہ رائے ظاہر کی تھی، کہ کاروبار پرکسی ایسی چیز کا اثر بھی پڑتا ہے، جو کرۂ ارض سے خارج اور ماوراء ہوتی ہے. ڈاکٹر اینڈریوز کا نظریہ ولیم جیونس کے قیاس کی تائید کرتا ہو، لیکن تمام سائنسدان ڈاکٹر اینڈریوز کی رائے سے متفق نہیں ہیں،

زمین کے بڑے بڑے طوفانون کی طرح یہ داغ آفتاب کی سطح پرایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ اتنے بڑے ہوتے ہیں، کہ بغیر کسی دوربین کے صرف رنگین عینک کی مدد سے دیکھے جاسکتے ہین، پانچ چھ سال تک انکی تعداد اور طول وعرض میں اضافہ ہوتا جاتا ہو، پھراتنی ہی مدت تک وہ تعداد اور طول وعرض میں گھٹتے جاتے ہین، ڈاکٹر اینڈریوز کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہو کہ جب آفتاب کے داغون کی تعداد بڑھتی ہے، تو ملک کی خوشحالی بھی بڑھتی ہے، اور جب انکی تعداد گھٹنے لگتی ہو تو کسادبازاری کا دور شروع ہوجاتا ہو، ڈاکٹر موصوف لکھتے ہین کہ آخری بار آفتاب کے داغوں کی سب سے بڑی تعداد سنہ ۱۹۲۰ء میں ظاہر ہوئی تھی، جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ میں نہایت خوشحالی کا سال تھا، اور سب سے کم تعداد سنہ ۱۹۲۳ء میں تھی، جو شدید کسادبازاری کا سال تھا،

ڈاکٹر ہارلن اسٹٹسن (Dr. Harlan Stetson) ہارورڈ یونیورسٹی کو ڈاکٹر اینڈریوز کی رائے سے اتفاق ہے، انھون نے آفتاب کے داغون کے اثر کا تجربہ متعدد

ایسی چیزوں پر کیا ہے جنکو بظاہر ان داغون سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، مثلاً بالدار جانوروں کے ان کی زیادتی اور کمی، دریاؤں، درجھیلوں کی سطح کا اتار چڑھاؤ، درختوں کی نشو ونما، وہ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر آفتاب کے داغوں کا اثر نمایاں طور پر پڑتا ہے، ان کا خیال ہے کہ ان داغوں کا اثر انسانی کاروبار پر بھی مختلف طریقوں سے پڑ سکتا ہے، مثلاً:-

۱- جب داغ زیادہ ہوتے ہیں، تو آفتاب سے گرمی زیادہ حاصل ہوتی ہے، لہذا سمندروں سے بخارات زیادہ اٹھتے ہیں، بارش زیادہ ہوتی ہے، اور پیداوار کثرت سے ہوتی ہے، خوشحال کاشتکار اسوقت موٹرین، ریڈیو سٹ اور تعیشات کی چیزیں خریدتے ہیں، ملک کی دولت بڑھ جاتی ہے، اور خوشحالی پھیلنے لگتی ہے،

۲- داغون کی کثرت کے زمانہ میں ہوا میں بجلی اور روانات (JONS) کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے، اس سے انسانوں کی صحت پر مفید اثر پڑتا ہے، اور ان میں امنگ پیدا ہوتی ہے، جب داغ کم ہوتے ہیں، تو ہوا میں بجلی بھی کم پیدا ہوتی ہے، اور صحت پر خراب اثر پڑتا ہے، اس طرح کاروبار پر بھی مختلف اثرات پڑتے رہتے ہیں،

ڈاکٹر کالڈول (Dr. Caldwell) نے آفتاب کے داغون اور کاروبار کے سالانہ نقشوں کا مقابلہ کرکے معلوم کیا ہے کہ ۱۸۸۲ء کے بعد سے ابتک برابر یہ ہوتا آیا ہے کہ جس زمانہ میں ان داغوں کی تعداد سب سے زیادہ رہی ہے، کاروبار کی حالت بھی بہت اچھی رہی ہے، اور پھر جب وہ کم ہونا شروع ہوئے ہیں تو تین مہینوں کے اندر کساد بازاری کا دور آگیا ہے، ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ آفتاب کے داغ اسوقت بڑھ رہے ہیں، اور ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں اپنی بڑی سے بڑی تعداد تک پہنچ جائیں گے، اگر اس نظریہ میں کوئی اصلیت ہے تو کاروبار تین سال تک اور ترقی کریگا، لہذا ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں کساد بازاری کے لئے تیار ہو جانا چاہیے،

(ل۔ ڈ)
"ع ز"

## ذہنی خلاء

آپ محنت سے کوئی دماغی کام کرتے رہتے ہیں کہ ایک لمحہ کے لئے آپ کا دماغ خالی ہوجاتا ہے، آپ تقریر کرتے ہوتے ہیں، اور دفعۃً آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے، کہ آپ اپنے خیالات مجتمع نہیں کرسکتے، ان لمحات میں آپ کو یہ خیال ہوتا ہے، کہ آپ کا دماغ جواب دے رہا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ وہ صرف آرام کرنے لگتا ہے، گذشتہ اگست میں پروفیسر آرتھر بلس (Arthur Bills) ماہر نفسیات شکاگو یونیورسٹی نے اپنی یہ تحقیق بیان کی ہے، کہ ہر شخص کو اس "ذہنی خلاء" (Mental Blank) کی شکایت ہوتی ہے، اور یہ ایک بالکل فطری چیز ہے، ان کا تجربہ ہے، کہ ایک دماغی کام کرنے والا شخص جو جسمانی طور پر تھکا ہوا نہیں ہے گھنٹوں بغیر تکان محسوس کئے ہوئے کام کرسکتا ہے، کیونکہ اس کا دماغ اس درمیان میں وقفوں کیساتھ غیر شعوری طور پر آرام کرتا رہتا ہے، دماغ کیلئے آرام کے یہ وقفے ایک منٹ میں تین سے پانچ مرتبہ تک آتے ہیں، یہ کامل ذہنی خلا جب کہ انتہائی کوشش سے بھی خیال کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی، عموماً بہت مختصر ہوتے ہیں یعنی ایک سکنڈ یا اس سے بھی کم لیکن ایک تھکا ہوا آدمی ایک منٹ میں آٹھ دس بار رکتا ہے، اور یہ وقفے دو تین سکنڈ کے ہوسکتے ہیں، ہر شخص کوئی نہ کوئی فقرہ یا الفاظ ان خلاؤں کو پُر کرنے کے لئے عادتاً استعمال کرتا ہے، مثلاً امریکہ کا صدر روز ولٹ (Roosevelt) تقریر کے دوران میں اکثر "میرے دوستو" (My Friends) بہت کھینچ کر کہا کرتا ہے،

قلب کی حرکت بھی یکساں رفتار کیساتھ جاری نہیں رہتی، قلب چند لمحات کے لئے اپنی رفتار کم کر کے چوبیس گھنٹوں میں دس گھنٹے آرام کر لیتا ہے، لیکن دماغ اپنی مصروفیت کے اوقات میں سے اس سے کم وقت چراتا ہے، یہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لئے غافل ہو کر کام کے اوقات کا ۱/۲ حصہ آرام میں صرف کر دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص روز آٹھ گھنٹے دماغی کام کرتا ہے، تو اس کا دماغ حقیقۃً صرف چھ گھنٹے چالیس منٹ کا کام کرتا ہے، اور ایک گھنٹہ بیس منٹ آرام کرتا ہے،

اس دماغی عادت کے مطالعہ کے لئے پروفیسر بلس نے اپنے معمل میں ایک عجیب و غریب مشین لگا رکھی ہے، یہ مشین ایک ٹائپ رائٹر کی طرح ہے، جس کے بٹنوں (Keys) پر حروف کے بجائے سرخ، سبز، نیلے، پیلے اور سفید رنگ ہیں، پروفیسر بلس کے معمول جو سب فارغ التحصیل طلبہ ہیں یکے بعد دیگرے تجربہ کے لئے بٹھائے جاتے ہیں، مشین کے سامنے ایک فیتہ ہوتا ہے، جو ایک روشن شگاف کے بیچ سے حرکت کرتا رہتا ہے، فیتہ پر یہی پانچ رنگ غیر مرتب طور پر لگے ہوتے ہیں، اور ایک وقت میں صرف ایک ہی رنگ نظر کے سامنے رہتا ہے، بٹن دبانے والے کو معلوم نہیں ہوتا، کہ کونسا رنگ اس کے بعد آنے والا ہے، جونہی وہ کسی رنگ کو دیکھتا ہے، اس رنگ کے بٹن کو دباتا ہے، اور اس کا یہ فعل مشین کے ایک حصے میں درج ہو جاتا ہے، یہ بھی درج ہو جاتا ہے کہ اس میں کتنا وقت صرف ہوا، ساتھ ہی ساتھ فیتہ آگے بڑھتا ہے، اور دوسرا رنگ سامنے آتا ہے، جب معمول کا دماغ خالی ہوتا ہے، تو وہ رنگ کی تمیز نہیں کر سکتا، اور اس کا تامل نقشہ پر جو مشین میں لگا ہوتا ہے درج ہو جاتا ہے،

## ایٹن پبلک اسکول

ایٹن انگلستان کا سب سے بڑا پبلک اسکول ہے، اسے شاہ ہنری ششم نے غریب بچوں کے لئے ۱۴۴۰ء میں قائم کیا تھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد اس میں دولت مند لوگوں کے بچے بھی داخل ہونے لگے

اور کئی سو برس سے تو یہ شہزادوں اور طبقہ امراء کے بچوں کے لئے مخصوص ہو گیا ہے، اس کی تعلیم و تربیت کا معیار اسقدر بلند ہے، کہ برطانیہ کا ہر امیر سب سے پہلے اپنے بچوں کو اس میں داخل کرانے کی کوشش کرتا ہے، اور تعلیم شروع ہونے سے برسوں پہلے داخلہ کرا لیتا ہے، امیدواروں کی کثرت کی وجہ سے شاہی خاندان کے بچوں کے لئے بھی یہ احتیاط برتنی پڑتی ہے، چنانچہ ڈیوک آف کنٹ کا بچہ شہزادہ ایڈورڈ جس کی عمر صرف آٹھ مہینے ہے، ابھی حال میں اس کا نام ایٹن کے رجسٹر میں درج کرا دیا گیا ہے تاکہ آیندہ وہیں تعلیم حاصل کر سکے، شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کا بھانجا بھی تقریباً دو سال سے ایٹن ہی میں تعلیم پا رہا ہے، داخلہ کے لئے درخواستوں کی کثرت کا یہ حال ہے، کہ اس وقت سنہ ۱۹۴۵ء تک کے لئے تمام جگہیں پر ہیں، اب والدین عموماً بچہ کی ولادت کے بعد ہی اس کا نام اسکول کے رجسٹر میں درج کرانے کی کوشش کرتے ہیں، تاہم ایٹن کے طلبہ کی تعداد انگلستان کے دوسرے پبلک اسکولوں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں، اسوقت صرف ۱۱۲۰ طلبہ ہیں جن میں سے ۱۰۵۰ شہر ایٹن میں رہتے ہیں، اور صرف ۷۰ اسکول اور کالج کے دار الاقامہ میں، ایٹن میں قرون وسطیٰ کا ماحول ابتک نظر آتا ہے اور تبدیلیاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں، انگلستان کے اکثر ممتاز ترین سیاست دان اور وزراء نے ایٹن ہی میں تعلیم پائی ہے، بہت کم برطانوی سفراء ایسے ہیں، جو ایٹن کے تعلیم یافتہ نہیں ہیں، اس وقت تک چھ ہزار سے زیادہ ممتاز اور شہرہ آفاق مدبرین وہاں کے طالب علم رہ چکے ہیں، گذشتہ صدی میں انگلستان کے پانچ وزیر اعظم ایٹن ہی کے تعلیم یافتہ تھے،

## صحت کے آسان طریقے

انیسویں صدی کے مشہور امریکن ڈاکٹر اینڈریو ٹیلر اسٹل (Andrew Taylor Still) نے طب کے مسلمہ اصولوں سے اختلاف کرکے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر اعصاب و عضلات ریڑھ اور ہڈیاں

کمالش، اور اسی قسم کے دوسرے طریقوں سے قوت پہنچائی جائے، تو جسم خود بخود صحت حاصل کرلیگا، اور دوا کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اس دعوی کے ثبوت میں اُس نے اوسٹیوپیتھی (OSTEOPATHY) یعنی تشریح العظام کا ایک مستقل فن ہی قائم کردیا جسکی کامیابی روز بروز زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے چنانچہ گذشتہ جولائی کے آخری ہفتہ میں امریکن اسٹیوپیتھک ایسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس جو نیویارک میں ہوا تھا، اس کی روئداد سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسوقت امریکہ میں نو ہزار اوسٹیوپیتھ ڈاکٹر کام کر رہے ہیں جن کے زیر علاج دس لاکھ مریض ہیں، اس فن کی بنیاد حسب ذیل اصولوں پر ہے:-

۱۔ جسم اپنی معمولی حالت میں امراض سے اپنا تحفظ خود کرسکتا ہے، اور کرتا رہتا ہے،

۲۔ مرض اسی وقت قابو پاتا ہے، جب پہلے سے کوئی چیز اس حفاظت کرنے والی مشین کے پُرزے خراب کردیتی ہے،

۳۔ لہذا امراض کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس مشین ہی کو درست کردیا جائے، اور جسم میں امراض کے دفع کرنے کی قوت از سر نو پیدا کردی جائے،

انہی اصولوں کی بنا پر ایسوسی ایشن مذکور کے سکریٹری ڈاکٹر میک کاگن (R MC CAN GHAN) نے صحت کے چند آسان قاعدے تجویز کئے ہیں، جو عموماً مفید ثابت ہوں گے، وہ یہ ہیں:-

۱۔ رات کو آٹھ گھنٹے سوؤ، (۲) روز دو ڈھائی سیر کوئی رقیق چیز پیو، (۳) کھانے میں مختلف اقسام کی چیزیں ہوں، تھوڑی سی بھوک رکھ کے کھاؤ، آہستہ آہستہ اور سکون کیساتھ کھاؤ، اگر سکون کیساتھ کھانے کا وقت میسر نہیں ہے، تو بہتر یہی ہو کہ مطلق نہ کھاؤ، (۴) کھیل کود میں انتیاز اور کمال حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو، یہ حوصلہ پیشہ ور لوگوں اور نوجوان کے لئے رہنے دو، (۵) چلو زیادہ، (۶) فکر و تردد اور عجلت سے بچتے رہو،

"ع ز"

# حقیقتِ دل

از جناب عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ال ال بی

وہ دل کہ جور و جفا پر خوشی سے رقصاں ہے
وہ دل کہ رنج و الم میں بھی شاد و فرحاں ہے

وہ دل کہ تیغِ ستم سے لپٹ کے پیار کرے
وہ دل کہ بحرِ الم کو خوشی سے پار کرے

وہ دل کہ تمکنتِ کوہسار ہے جس میں
وہ دل کہ جوشِ یمِ بے قرار ہے جس میں

وہ دل کہ سیلِ حوادث پہ مسکراتا ہو
وہ دل کہ جنگ کے نعروں پہ جھوم جاتا ہو

وہ دل کہ ظلمتِ زنداں میں بھی درخشاں ہو
وہ دل کہ دار و رسن پر بھی زمزمہ خواں ہو

وہ دل کہاں ہے؟ فقط اہلِ حق کے سینے میں

وہ دل جو قیصر و کسریٰ کے سامنے نہ جھکے
وہ دل جو شوکتِ دنیا کے سامنے نہ جھکے

وہ دل جو سدرہ و طوبیٰ سے بھی بلند رہے
پر آستانۂ حق پر نیاز مند رہے

وہ دل جو خنجرِ قاتل ہے اہرمن کیلئے
وہ دل جو شمع ہے یزداں کی انجمن کیلئے

جو بے قرار ہے ہر دردمند کے غم پر
جو اشکبار رہے ہر ایک چشمِ پرنم پر

وہ دل کہ شام و سحر ایک آہ ہے گویا
بہارِ عشق کی اک جلوہ گاہ ہے گویا

وہ دل کہ ہے غم و سوز و گداز کی دنیا
سرور و مستی و ذوقِ نیاز کی دنیا

وہ دل کہاں ہے؟ فقط اہلِ حق کے سینے میں

وہ دل کہ جس میں درخشاں ہے آفتابِ وفا — وہ دل کہ جس میں فروزاں ہے ماہتابِ صفا

وہ دل کہ گوہرِ غلطاں سے بھی ہے تاباں تر — وہ دل کہ صبحِ بہاراں سے بھی ہے خنداں تر

خیالِ شاعرِ رنگیں بیان سے رنگیں تر — تبسمِ لبِ حورِ جناں سے شیریں تر

وہ دل کہ جسمیں محبت کے پھول کھلتے ہیں — وہ دل کہ جس میں ہم سوز و ساز ملتے ہیں

وہ دل کہ شمعِ محبت کا نور ہے جس میں — وہ دل کہ بادۂ حق کا سرور ہے جس میں

وہ دل کہ حضرتِ یزداں بھی جسکو پیار کرے — وفورِ شوق و محبت سے ہمکنار کرے

وہ دل کہاں ہے؟ فقط اہلِ حق کے سینے میں

## غزل

جناب مولینا عبدالسلام صاحب ندوی،

پوچھ لو میری آرزو مجھ سے — آخری ہے یہ گفتگو مجھ سے،

کرکے بیخود نگاہ کے زلف کی بو — چھین لے آج مجھکو تو مجھ سے،

گم کرو خود کو تب اُسے پاؤ — کہتی ہے اس کی جستجو مجھ سے،

یاد اُس چشمِ مست کی آئی — چھین لو ساغر و سبو مجھ سے،

اُنکی تصویر بھی ہے اُنکی شریک — کس مزے کی ہے گفتگو مجھ سے،

میں جو تھک جاؤں ڈھونڈ لائے اُسے — بڑھ کے کچھ شوقِ جستجو مجھ سے،

رُخِ رنگیں کا ہے گلوں سے خطاب — کون لیتا ہے رنگ و بو مجھ سے،

اُٹھ رہے ہیں بگولے صحرا میں — سیکھنے طرزِ جستجو مجھ سے،

ہیں اشارے یہ موجِ مے کے تمام — کر بھی لو آج تم وضو مجھ سے،

# رنگِ تغزل

از جناب احسان دانش صاحب

وہ میری بزمِ تصور پہ چھائے جاتے ہیں — نظر سے چھپتے ہیں دل میں سمائے جاتے ہیں

ترے نثار مری جان مصورِ فطرت — کس اہتمام سے گلشن سجائے جاتے ہیں

مرے نیاز سے پیدا ہیں ناز کے تیور — وہ سربسر مری ہستی پہ چھائے جاتے ہیں

خدا کی شان وہ آنسو ہیں اور مرا دامن — جن آنسوؤں سے ستارے بنائے جاتے ہیں

خوشا کہ عاجزیٔ عشق کی اداؤں میں — غرورِ حسن کے انداز پائے جاتے ہیں

میں اس مقام پہ گم ہوں کہ جس جگہ ہر دم — مسیح و خضر کو رستے بتائے جاتے ہیں

مری وفا پہ نہ جا حسن کی شکست کو دیکھ — تری جفا کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

وصال ہجر کے پردے میں رات دن احساں
حیات و موت کے خاکے بنائے جاتے ہیں،

---

## کلیاتِ شبلی اردو

مولینا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبحِ امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں، جو کانپور، ٹرکی، طرابلس بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی چہل سالہ جد وجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۲۰ صفحے، قیمت :- عہ ر

"منیجر"

# باب التقریظ والانتقاد

## دی ریل سیواجی، (انگریزی)

مرتبہ مؤلفہ سید تفضل داؤد سید خان صاحب ایم اے ال ال بی، وکیل سلطان پور،

او وھ، ضخامت چھوٹی تقطیع ۲۲۰ صفحے قیمت:- عہ

سیواجی ان تاریخی انسانون مین ہے، جو ہوتے کچھ ہین اور نظر کچھ اور آتے ہیں، وہ اپنے کارنامون کے لحاظ سے اپنے ہندو مسلمان معاصرون کی نگاہون میں ایک ہوشیار ڈاکو کے سوا کچھ اور نہ تھا، لیکن آج وہ ہندو اہل قلم کی ذہنی کاوش، بلکہ اختراع سے ہندو قوم کا ہیرو نظر آتا ہے، اصل یہ ہے کہ موجودہ دور میں مرہٹوں کو اپنی قومیت کی تشکیل کے لئے ایک ہیرو چاہئے تھا، وہ ان کو سیواجی مل گیا، انھون نے اسکو اپنی قلمی سرگرمیوں سے ان اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ کا مجسمہ بنا دیا، جن کے لئے ان کو ایک ہیرو کی ضرورت تھی، اسکی وطن دوستی اور قومی سرفروشی تقلید کے قابل سمجھی گئی، اسکی جنگی تدبر اور سیاسی تدبر کو ہنیبال، سکندر، سیزر، اور نپولین کے مقابل قرار دیا گیا، اس کے نام سے فوجی، سیاسی، مذہبی، اور علمی ادارے قائم کئے گئے، اس کے مجسمہ کی پرستش کی گئی، اور وہ پوری ہندو قومیت کا سرچشمۂ حیات ٹھہرایا گیا،

مرہٹون نے اسکو شاید اس لئے اپنا ہیرو بنایا کہ جس طرح اس نے مغلیہ حکومت کے عہد شباب میں طوائف الملوکی پھیلانے کی کوشش کی، اسی طرح اس کے مقلدین موجودہ دور حکومت کے کمال عروج کے زمانہ میں انتشار و اختلال پیدا کرنے کی جرأت سکھین،

مرہٹون اور ہندو مصنفون کی ان خیالی مضمون آرائیون کا نتیجہ یہ ہے، کہ سیواجی کی اصل حقیقت

لوگون کے دلون سے مٹ کر ایک خیالی سیواجی کا مجسمہ تیار ہو گیا ہے، جو دکن کا شہنشاہ اعظم تھا، اور جس کی حکومت کے مرتب وفاتر اور نظم ونسق کے متمدن آداب وقوانین تھے، جو ہندؤں کو مسلمان بادشاہون کی غلامی سے نکالنے کے لئے پیدا ہوا تھا، اسی گمراہ کن تاریخی قلب حقیقت اور مسخ واقعیت کو دور کرنے کے لئے ایک نوجوان مؤلف سید تفضل داؤد سعید خان صاحب ایم اے ال ال بی، وکیل سلطان پور (اودھ) نے سیواجی کو اصلی حقائق کی روشنی میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، ان کی زیر نظر کتاب "حقیقی سیواجی" گو مختصر ہے لیکن سیواجی کے اصلی کردار پر نہایت محققانہ تبصرہ ہے، کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے، پہلا باب "بحث" دوسرا "معلومات کے ذرائع" تیسرا "کیا سیواجی ہندو مذہب کا علمبردار تھا" چوتھا "افضل خاں کا قتل"، اور پانچواں "حقیقی سیواجی" پر مشتمل ہے، اس میں تیسرا باب نہایت اہم ہے اس باب میں مؤلف نے یہ دکھایا ہے کہ سیواجی ہندو مذہب کا علمبردار تھا اور نہ محافظ تھا اور نہ ہندو قومیت کی نئی زندگی اسکا مقصد تھا، اس نے محض ذاتی اغراض کی خاطر آبادیوں اور متمول شہرون کے لوٹنے کا پیشہ اختیار کیا جسمیں وہ ہندو مسلمان عیسائی اور پارسی کا امتیاز نہ کرتا تھا، چنانچہ اس نے جب رائے گڈھ میں تاجپوشی کی تقریب ادا کی، تو آٹھ ہزار روپیہ کفارہ اس جرم میں ادا کیا، کہ اس نے "گئو ماتا" برہمنون عورتون اور بچون کا خون کیا تھا، لائق مصنف نے اس قسم کے بہت سے دلائل اور شواہد پیش کئے ہین،

واقعات کے استناد میں مصنف نے یا تو ہندو اور مرہٹی مورخون کا یا یورپین اہل قلم کا اور خصوصاً ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری یورپین دستاویزون کا حوالہ دیا ہے،

مؤلف نے اس باب کو ایک دلچسپ جملہ پر ختم کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ " ماخذون کے محتاط مطالعہ کے بعد ہمیں قطعی طور پر یہ یقین ہو جائے گا، کہ اسکی (یعنی سیواجی کی) ہندویت کی علمبرداری محض تخیل کی نقش آرائیاں ہین، جو اسی طرح بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہیں جس طرح کہ کوئی آیندہ کا مورخ

اب سے تین صدی بعد یہ ادعا کرے، کہ گاندھی ایک بڑا سپہ سالار تھا جس نے انگریزوں کو اپریل اور مئی ۱۹۳۰ء میں ڈانڈی کے قریب چار صف آرا لڑائیوں میں شکست دی، اور انکو ہندوستان سے ہتھیاروں کے زور سے نکال باہر کیا؟

لائق مؤلف نے سیواجی کی سرداری کی تنظیمی صلاحیت اور بہادری کی تعریف کی ہے، وہ اسکی کفایت شعاری محنت و استقلال کا مداح ہے، اس نے جس دلیری سے اپنے وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھایا، اس کا قائل ہے، وہ تسلیم کرتا ہے، کہ اوس نے عظیم الشان مغلیہ حکومت میں اختلال پیدا کیا، اس کے آگرہ سے فرار ہو جانے کو ایک حیرت انگیز کاروائی بتایا ہے، شایستہ خاں کی عظیم الشان فوج پر حملہ آور ہونے کو اس کا ایک دلچسپ کارنامہ سمجھتا ہے، لیکن پھر بھی اس کے سامنے اس کی حیثیت ایک دغاباز رہزن بے رحم ڈاکو اور سنگدل قاتل سے زیادہ نہیں، یہ نتیجہ ممکن ہے کہ بعض طبائع پر گران گذرے لیکن یہ ایسی حقیقت ہے، جو واقعیت سے خالی نہیں خصوصاً مؤلف ہذا نے جو مستند معلومات فراہم کئے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر نہ پہنچنا مشکل ہے۔

کتاب شروع سے آخر تک واقعات و تحقیقات کی موشگافی اور دلائل و شواہد کی قطعیت کیساتھ لکھی گئی ہے، امید ہے کہ انگریزی خوان طبقہ میں یہ کتاب شوق اور دلچسپی سے پڑھی جائیگی بلکہ ایک تاریخی غلط بیانی کو روکنے کے لئے اس کتاب کی اشاعت جتنی بھی زیادہ ہو کم ہے، مؤلف نے سیواجی کے متعلق نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے، اگر وہ اسی انداز اور مقدار میں جس میں جادوناتھ سرکار نے اورنگ زیب لکھکر سوانح نگاری کی عجیب و غریب مثال پیش کی ہے سیواجی کی مستقل سوانح عمری لکھنے کی کوشش کریں، تو یہ ان کا شاندار علمی کارنامہ ہوگا،

"ص ع"

# چند نئے رسائل و اخبارات

اب آئے دن اس کثرت سے رسائل و اخبار نکلنے لگے ہیں کہ ان پر تبصرہ بھی دشوار ہو گیا ہے، چند مہینے ہوئے گذشتہ ششماہی کے اخبار و رسائل پر ریویو کیا جا چکا ہے لیکن اس درمیان میں پھر ان کی کافی تعداد جمع ہو گئی، جو درج ذیل ہے:۔

ماہانہ رسائل | **الرضوان** (ماہانہ عربی) مرتبہ محمد عسکری صاحب نقوی تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحات کاغذ سپید کتابت و طباعت بہتر سالانہ قیمت للعہ بیرون ہندوستان کے لئے عہ پتہ نمبر ۶ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

عربی زبان کے طلبہ کیا اکثر علماء تک میں یہ خامی ہے، کہ وہ عربی لکھنے پر قادر نہیں ہوتے، سب سے پہلے ندوۃ العلماء نے ادھر توجہ کی، اور اسکو بڑی حد تک اس میں کامیابی ہوئی لیکن اسکی کامیابی ایک خاص حلقہ تک محدود تھی، اس لئے ندوہ کے بعض طلبہ نے عربی انشاء کا عام مذاق پیدا کرنیکے لئے ایک عربی رسالہ الضیاء جاری کیا، جو چند سالوں تک چلنے کے بعد ارباب علم کی ناقدروانی کی وجہ سے عارضی طور سے بند ہو گیا ہے،

مقام مسرت ہے کہ لکھنو کی شیعہ جماعت نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا جس کا نتیجہ الرضوان کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، یہ ایک عربی رسالہ ہے جو محمد عسکری صاحب نقوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے، اور ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں کے اعتبار سے قدر افزائی کا مستحق ہے اکثر مضامین مفید اور سنجیدہ ہیں، نظم کا حصہ بھی بہتر ہے، زبان میں خاصی عربیت ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اسکو مذہبی رنگ نہ دیا جائے، جس کی جھلک بیشتر مضامین میں نظر آتی ہے، بلکہ خالص علمی و ادبی رکھا جائے تاکہ ہر جماعت کے ارباب ذوق اس سے یکسان فائدہ اٹھا سکیں، اور اس کا حقیقی منشا زیادہ سے زیادہ

پورا ہو سکے امید ہے، کہ یہ رسالہ عربی زبان کی قابلِ قدر خدمت انجام دے گا، اور عربی مذاق رکھنے والے اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے،

**معیار** (ماہانہ) مرتبہ قاضی عبد الودود صاحب و آرزو جلیلی صاحب تقطیع اوسط سال کے چھ پرچون کا حجم ۱۱۲ صفحات اور چھ کا ۲۴۲ ہوا کرے گا، کاغذ سپید، کتابت و طباعت اوسط قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ۱۰؍ پتہ:- مراد پور بانکی پور پٹنہ،

انجمن ترقی اورنگ آباد عملاً ایک مقامی انجمن تھی، لیکن اب کچھ دنون سے اس کا حلقۂ اثر وسیع ہونے لگا ہے اور بعض بعض مقامات پر اسکی شاخیں قائم ہونے لگی ہیں، غالباً حال ہی میں پٹنہ میں بھی اسکی ایک شاخ قائم ہوئی ہے، معیار اسی شاخ کا پھل ہے، معیار ہندوستانی زبان کا ایک معیاری رسالہ ہے، اس کا دائرۂ عمل نہایت وسیع ہے، ہندوستانی زبان کی قلمی خدمت کا کوئی پہلو اس کے دائرۂ عمل سے باہر نہیں ہے، اسکی جامعیت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس نے پندرہ عنوانات قائم کیے ہیں جنمین زبان و ادب کی مختلف اصناف پر ادبی و تحقیقی اور تاریخی مضامین ہوا کرین گے، ان میں سے بعض عنوانون کے مضامین کا بالالتزام ہونا ضروری نہیں ہے، ابتک جو نمبر شائع ہو چکے ہین ان میں بڑی حد تک اس کی پابندی نظر آتی ہے، لیکن شاید اتنے مختلف النوع خدمات کا بار ایک رسالہ کے بس سے باہر ہو، بہرحال ابتک یہ رسالہ اپنے معیار پر قائم ہے، اور زبان و ادب کے متعلق معلومات کا نہایت اچھا ذخیرہ فراہم کرتا ہے، ہم کو امید ہے کہ یہ رسالہ ہندوستانی زبان کی نہایت مفید خدمات انجام دے گا، لیکن اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے، رسالہ کی ترتیب ظاہری ستھراؤ اور بعض مضامین کی زبان مزید اصلاح و توجہ کی محتاج ہے،

**سرشار،** (ماہانہ) مرتبہ رشید ذکی صاحب مچھلی شہری تقطیع بڑی، حجم ۴۰ صفحات کاغذ سپید دبیز، کتابت و طباعت صاف، قیمت سالانہ ۳؍ فی پرچہ ۴؍ پتہ:- دفتر سرشار اعظم گڈھ،

اعظم گڈھ کی مردم خیز سرزمین اخبارات و رسائل کے لحاظ سے شور واقع ہوئی تھی، لیکن ادھر دو ایک برسون سے اس کا مذاق پیدا ہو چلا ہے، چنانچہ ڈیڑھ دو سال سے ایک ہفتہ وار اخبار "سہیل" کامیابی کیساتھ نکل رہا ہے، حال میں اس کے کارکنون کے اہتمام میں ایک ماہانہ رسالہ سرشار نکلا ہے، جو ادبی رسائل کی طرح اپنے اندر عام دلچسپی کا کافی سامان رکھتا ہے، ہم کو امید ہے کہ وہ مشرقی اضلاع مین مقبول ہوگا،

**طور** (ماہانہ) مرتبہ محمد موسیٰ خان صاحب کلیم تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحات کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سے، فی پرچہ ۵ ر، دفتر طور ڈیرا اسمٰعیل خان صوبہ سرحد،

یہ رسالہ کئی مہینون سے صوبہ سرحد کی سرزمین سے نکل رہا ہے، اور اوسط درجہ کے علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی ہر قسم کے مضامین پیش کرتا ہے، ہندوستانی تعلیم پر جو سلسلۂ مضامین نکل رہا ہے، وہ خصوصیت کیساتھ مفید ہے، ابھی مضامین کے معیار کو ذرا اور بلند کرنے کی ضرورت ہے، بہرحال صوبہ سرحد جیسے دور دراز مقام میں ہندوستانی زبان کی یہ خدمت بھی لائق ستایش ہے، امید ہے کہ طور صوبہ سرحد میں علم و ادب کی روشنی پھیلانے مین کامیاب ہوگا،

**القمر** (دہلی ماہانہ) مرتبہ عبد الحلیم صاحب جنیدی حجم ۳۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت: سالانہ ، پتہ: القمر دریبہ کلان دہلی،

قمر حال ہی میں افق دہلی سے طلوع ہوا ہے، اس کا مقصد اسلام کی صحیح تعلیم پیش کرنا، اور اس کی روشنی میں خیالات و جذبات کو منور کرنا وغیرہ ہے، اس رسالہ کے بیان کے مطابق اسکو مقدس علماء اور مشاہیر اہل قلم کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے، لیکن پہلے نمبر میں جو گویا نمونے کا پرچہ ہے، زیورات کے استعمال کے متعلق ایک مختصر فتوی کے علاوہ کسی مشہور عالم اور اہل قلم کی سرپرستی کا کوئی نتیجہ نظر نہیں آتا، مضامین بہت معمولی درجے کے ہین،

**نظام جوبلی میگزین**، (ماہانہ) مرتبہ حسین بن خواجہ حسن نظامی صاحب نظامی تقطیع اوسط حجم ۴۰ صفحات کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ سے رفی پرچہ ۴ر مقام اشاعت درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، دہلی،

یہ رسالہ مارچ ۱۹۲۶ء سے خواجہ حسن نظامی کے فرزند حسین صاحب نظامی کی ادارت میں نکلتا ہے، خواجہ صاحب کی زیر سرپرستی نکلنے والے رسائل کی طرح اس کا بھی رنگ عام دلچسپی کے لئے مضامین اچھے ہوتے ہیں، لیکن انکو نام سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی،

طبی

**معین الشفاء**، (ماہانہ) مرتبہ حکیم سید ظفر یاب علی صاحب و حکیم رشید احمد صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی حجم ۴۰ صفحے، کاغذ نہایت معمولی، کتابت و طباعت اوسط قیمت سالانہ عمر فی پرچہ ۲ر، پتہ دفتر رسالہ معین الشفاء کشمیری بازار لاہور،

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ایک طبی رسالہ ہے، جو حال ہی میں لاہور سے نکلا ہے لیکن اسکے دو ہی ایک نمبروں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ بہت جلد طبی رسائل میں ایک ممتاز درجہ حاصل کرے گا، بیشتر مضامین مفید اور علمی ہیں، تاریخی مضامین بھی پر از معلومات ہیں،

**چشمۂ حیات** (ماہانہ) مرتبہ حاجی نور محمد صاحب دہلوی، تقطیع بڑی حجم ۴۰ صفحات کاغذ نہایت معمولی کتابت و طباعت اوسط، سالانہ قیمت ۲ر، پتہ ہمدرد یونانی دواخانہ دہلی،

یہ رسالہ درحقیقت یونانی دواخانہ کی ادویہ کا اشتہار ہے جس میں طبی مضامین کا اضافہ کرکے طبی رسالہ بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے اس رسالہ کی افادیت زائل نہیں ہوتی، کیونکہ طب و صحت کے متعلق بھی مفید مضامین ہوتے ہیں،

سہ روزہ اخبارات

**انصاری**، (سہ روزہ) مرتبہ ہلال احمد صاحب زبیری تقطیع ۲۰×۲۶/۲ ضخامت دس صفحات کاغذ سپید و بیز کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ للعہ ششماہی سے ر بیرون ہندوستان

کے لئو، سالانہ صہ ششماہی للعہ، پتہ منیجر انصاری بلیماران دہلی،

یہ ایک سہ روزہ اخبار ہے، جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی یادگار میں جاری کیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ایسی جلیل القدر ہستی تھی، کہ ان کی یادگار میں جو کچھ بھی کیا جائے کم ہے، یہ مسلمانوں کی ناقدر شناسی بلکہ بدبختی ہے، کہ وہ اپنے محسنوں کی یادگار قائم کرنا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ اس کارِ خیر میں عملی مدد سے بھی گریز کرتے ہیں، حکیم اجمل خان اور مولینا محمد علی مرحوم کی یادگار میں اجمل کے سوا آجتک کوئی اچھا اخبار نہ نکل سکا، اور جو نکلے بھی وہ بھی قوم کے تغافل کی نذر ہو گئے،

اس پہلو کے قطع نظر بھی مسلمانون میں ایسے اخبارات کی بڑی کمی ہے، جو کوئی بلند نصب العین اور اپنا کوئی خاص مسلک رکھتے ہوں جس پر زمانہ کے نشیب و فراز اور مخالف حالات کا اثر نہ پڑتا ہو ایسی حالت میں کسی معقول اور سنجیدہ اخبار کا نکلنا بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے،

زبیری صاحب نے "انصاری" کو جاری کرکے ایک بڑی قومی ضرورت کو پورا کیا ہے، اس کا مسلک اور اس کے مقاصد اس کے انتساب سے ظاہر ہیں، سیاسیات میں اسکی وہی روش ہو گی جس پر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اپنی جان عزیز قربان کی، خوشی کا مقام ہے کہ ملک و قوم کی خدمت کے ساتھ ساتھ مذہب و ملت کی خدمت گذاری بھی اسکے نصب العین میں داخل ہے، اور ہم کو سیاسی مضامین کے دوش بدوش مفید مذہبی مضامین بھی نظر آتے ہیں،

عام اخباری خبرون اور سیاسی احوال و کوائف کے علاوہ انصاری اپنے قارئین کے لئے علمی، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی ہر قسم کے مفید اور پر از معلومات مضامین فراہم کرتا ہے، ہم کو امید ہے کہ "انصاری" زبیری صاحب کے لائق اور تجربہ کار ہاتھوں میں ملک و ملت کی بیش از بیش خدمت انجام دے گا، اور مسلمان عملی حوصلہ افزائی کا ثبوت دیکر اسے روزانہ بنا دین گے،

ہفتہ وار اخبارات

**استقلال**، (ہفتہ وار) مرتبہ مولوی سلطان الحق صاحب قاسمی و مولوی وحید الدین

صاحب قاسمی تقطیع ۲۲×۲۰ حجم ۸ صفحات کاغذ سپید، کتابت وطباعت اچھی، قیمت سالانہ ۳ر،
ششماہی عار، طلبہ کے لئے سالانہ ۲ ششماہی ۱؎ ار، پتہ دفتر استقلال دیوبند ضلع سہارنپور یو پی،

یہ اخبار تقریباً ایک سال سے دیوبند سے نکل رہا ہے، اپنا سے دیوبند کی ترجمانی اس کا مقصد ہے چونکہ وہ ہندوستان کی ایک علمی و مذہبی جماعت کا ترجمان ہے، اس لئے علمی پہلو غالب ہے اور اسمیں علمی مذہبی معلومات کا کافی ذخیرہ ہوتا ہے، اور ان مباحث پر التزام کے ساتھ مفید اور پر از معلومات مضامین نکلتے ہیں، عام معلومات کے لئے ہفتہ بھر کی خبروں کا خلاصہ اور اہم مسائل پر تبصرہ ہوتا ہے، اس اخبار سے سنجیدہ اخبارات کی صف میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے،

**دورِ جدید** (ہفتہ وار) مرتبہ ملک احسن صاحب تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۱۶ صفحات کاغذ سپید، کتابت وطباعت صاف وروشن، قیمت معلوم نہیں، پتہ نمبر ۹۹، کشمیر بلڈنگ میکلوڈ اسٹریٹ لاہور،

یہ اخبار عرصہ سے ملک خدا بخش کی نگرانی میں نکل رہا ہے، ہمیں حال میں ریویو کے لئے موصول ہوا ہے، اسوقت اسکی ادارت ملک احسن صاحب کے ہاتھوں میں ہے، لاہور کے ہفتہ وار اخباروں میں دورِ جدید ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس میں مذہبی سیاسی علمی تاریخی ہر قسم کے مفید اور پر از معلومات مضامین ہوتے ہیں، ہفتہ بھر کی اہم خبروں کا خلاصہ اور قابلِ توجہ واقعات پر تبصرہ ہوتا ہے، ہر صفحہ پر پابندی کیساتھ ایک نظم ہوتی ہے، مجموعی حیثیت سے یہ اخبار دلچسپ اور مفید ہے،

**پیکار** (ہفتہ وار) مرتبہ ملک برکت علی صاحب تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۱۰ صفحات کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت سالانہ للعہ ششماہی ۶ؔ؎ فی پرچہ ار، ماہوار ۱ؔ؎ لیٹن ہیر میلنگ روڈ لاہور،

یہ اخبار تھوڑے دنوں سے نکلنا شروع ہوا ہے، اس کا خاص مقصد ہندوستانی زبان کی خدمت واشاعت ہے، اسی لئے اس کے بیشتر مضامین ماہانہ ادبی رسائل کی طرح ادب اور افسانوں پر مشتمل ہوتے ہیں، ایک آدھ سنجیدہ اور مفید مضمون بھی ہوتا ہے، حوادثِ روزگار کے ماتحت ہفتہ بھر کی اہم خبریں بھی دیجاتی ہیں،

مجموعی حیثیت سے اخبار دلچسپ ہے،

**تاج** (ہفتہ وار) مرتبہ نشتر صاحب جالندھری و قربان علی صاحب تقطیع $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۴}$ حجم ۱۲ صفحات، کاغذ سپید، کتابت وطباعت صاف و روشن، قیمت سالانہ ہے ششماہی ؏ فی پرچہ ۲ ار

پتہ :- دفتر تاج کمپنی لمیٹڈ ڈریلوے روڈ لاہور،

لاہور کی مشہور تاج کمپنی کی جانب سے ایک ماہنامہ رسالہ تاج نکلا کرتا تھا، اب اسکو ہفتہ وار کر دیا گیا ہے، اس تغیر لیبا تھ اس کے مقاصد میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی ہے، کہ ان کا احاطہ دشوار ہے، مثلاً قوم کی مذہبی تمدنی، اقتصادی اصلاح و ترقی، آزادی ملک وملت، علوم جدیدہ ادب وشعر کا مذاق پیدا کرنا ہندوستانی زبان کی توسیع واشاعت، فرقۂ نسوان کی ترقی، اسلام کا پیام دنیا کے گوشوں میں پہنچانا وغیرہ، ان مقاصد کی مناسبت سے وقتاً فوقتاً مضامین کا رنگ و ذائقہ بدلتا رہتا ہے، خدا ان وسیع ذمہ داریوں کی تکمیل میں اعانت فرمائے،

**پاکستان** (ہفتہ وار) مرتبہ سید غلام حسین شاہ صاحب کاظمی تقطیع $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۲}$ حجم ۱۲ صفحات، کاغذ، کتابت، وطباعت معمولی، عام سالانہ قیمت :- صہ ششماہی سے ر پتہ دفتر پاکستان خواجہ بلڈنگ ایبٹ آباد،

صوبہ سرحد اپنی بساط کے موافق ہندوستانی زبان کی خدمت مین کسی صوبہ سے پیچھے نہیں ہے، چنانچہ اس وقت یہان سے کئی رسائل واخبار نکلتے ہین، چند مہینوں سے ایک نیا ہفتہ وار اخبار پاکستان نکلا ہے، جس کا مسلک مذہب کے تحفظ کے ساتھ ملک وقوم کی خدمت ہے، اس میں ہفتہ بھر کی سیاسی خبرین اور اہم واقعات پر تبصرہ ہوتا ہے، کبھی کبھی عام معلومات کے لئے بعض مستقل مضامین بھی ہوتے ہیں، امید ہے کہ صوبہ سرحد کا یہ نقیب وہان کے مسلمانون کی مفید خدمت انجام دیگا۔

**سہیل**۔ (ہفتہ وار) مرتبہ مولینا ابوالجلال صاحب ندوی حجم ۸ صفحات تقطیع $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۲}$

کاغذ سپید کتابت وطباعت غنیمت قیمت سالانہ مقامی خریدار دن کے لئے ۲؍ باہر والوں کے لئے ۳؍ فی پرچہ ۱؍ پتہ :- ۱۲ سیڈن ہام روڈ پارک ٹون مدراس،

ہمارے پرانے رفیق مولانا ابو الجلال صاحب ندوی کئی سال سے مدراس میں مقیم ہیں، اور وہاں مختلف علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، حال میں انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار سہیل نکالا ہے، مدراس سے وقتاً فوقتاً ہندوستانی زبان کے متعدد اخبارات نکلتے رہتے ہیں، اور اب بھی نکل رہے ہیں، لیکن سہیل اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے لحاظ سے ان سب میں بلند ہے، مولانا نہایت پرانے قوم پرست ہیں یہی مسلک ان کے اخبار کا بھی ہے، سیاسی خبروں اور مضامین کے علاوہ سہیل میں بالالتزام اسلامی اور علمی مباحث پر بھی نہایت مفید مقالات ہوتے ہیں، امید ہے کہ یہ اخبار مدراس میں ہندوستانی زبان کی مفید خدمت انجام دیگا، اور وہاں کے اخبارات کا معیار بلند کر دے گا، لیکن ہم کو مولینا کے استقلال سے خطرہ ہے کہ یہ بھی اسکا شکار نہ ہو جائے،

**سرکار**، (ہفتہ وار،) مرتبہ ایس گوپال صاحب، ایم ایس سی، تقطیع $\frac{20\times26}{4}$ حجم ۱۴ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ سے ششماہی :- ۱؍ پتہ لاٹوش روڈ لکھنؤ،

یہ اخبار دو تین مہینوں سے لکھنؤ سے نکل رہا ہے، اس کے ابتدائی نمبر ہماری نظر سے نہیں گذرے اس لئے ہم اس کے مقصد کو صحیح طور سے متعین نہیں کر سکتے، لیکن اس میں دیہاتوں اور پسماندہ طبقوں کی اصلاح و ترقی کے لئے بالالتزام مضامین اور افسانے ہوتے ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید دیہات کی اصلاح و ترقی اس کا مقصد ہو، ہفتہ بھر کی اہم خبروں کا خلاصہ بھی ہوتا ہے، عام دلچسپی کے لئے ایک آدھ افسانہ بھی نظر آتا ہے،

(ض)

ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار | **ٹرُوتھ** (ہفتہ وار) مرتبہ جناب فضل کریم خانصاحب درانی، تقطیع چھوٹی، ضخامت آٹھ صفحات،

کاغذ، ٹائپ اور چھپائی نہایت عمدہ، قیمت سالانہ للعہ، پتہ نمبر ۲۲، ریلوے روڈ، لاہور،

انگریزی کا یہ اسلامی ہفتہ وار اخبار ملک میں اب اس حد تک مشہور ہوچکا ہے، کہ کسی جدید تعارف کی ضرورت نہیں، ڈیڑھ سال سے جناب فضل کریم خاں صاحب درانی کے زیر ادارت پابندی کے ساتھ جاری ہے، اور اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے مسلمانوں کے معدودے چند انگریزی اخباروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مسلمانوں پر جو مظالم غیروں کے ہاتھوں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، انھیں پوری طرح محسوس کرتا ہے، اور ان کے خلاف احتجاج کرنے میں مطلق تامل نہیں کرتا، حال میں فلسطین کے مظالم پر جو افتاحیہ اُس نے لکھا ہے، وہ باوجود مختصر ہونے کے اپنی صداقت میں اسقدر بیباک اور تلخ ہے، کہ مولینا محمد علی مرحوم کے بعد اس کی توقع کسی دوسرے قلم سے مشکل سے کی جاسکتی تھی، مسلمانوں کے معاشی اور اقتصادی مسائل پر بھی اس کی رائیں سنجیدہ اور صائب ہوتی ہیں، انگریزی ایسی عمدہ ہوتی ہے کہ مدیر پر اہل زبان ہونے کا شبہ ہوتا ہے، اخبار بلاشبہہ اس قابل ہے کہ مسلمان اسکی قدردانی میں بخل نہ کریں، (ع ز)

## رسالہ الاصلاح ماہوار

دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ (یوپی)

یہ رسالہ قرآنی مطالب و مباحث کے لئے مخصوص ہے، اس میں استاذ امام مولینا حمید الدین فراہیؒ کے قرآنی معارف بالالتزام شائع ہوتے ہیں، مولینا کے تلامذہ جو ان کے اصول پر قرآن مجید میں تدبر کرتے ہیں، انکے مضامین بھی، اور بساو اسمیں شائع ہوتے رہتے ہیں، عام ضیافت ذوق کے لئے سنجیدہ علمی و ادبی مضامین اور موقر علمی رسائل کے اقتباسات بھی شائع ہوتے ہیں، کتابت، طباعت، کاغذ، عمدہ، صفحات ۴۸،

قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ، منیجر:- رسالہ الاصلاح

# مطبوعات جدیدہ

**قادیانی مذہب**، مرتبہ پروفیسر حاجی محمد الیاس صاحب برنی ایم اے، استاذ معاشیات جامعہ عثمانیہ تقطیع ۲۲×۱۸ ضخامت ۹۰۰ صفحات کاغذ سپید، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۳ روپیہ، پتہ کمال احمد صاحب فاروقی بیت السلام حیدر آباد دکن،

یہ کتاب برنی صاحب کی کوئی تصنیف نہیں ہے، بلکہ ان کی پرانی تالیف قادیانی مذہب کی جو پہلی مرتبہ ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوئی تھی، مکمل تر اور شاید آخری شکل ہے، برنی صاحب محض ایک پروفیسر معاشیات نہیں ہیں، بلکہ اس سے زیادہ وہ مذہب و ملت کا درد رکھنے والے خادمِ اسلام ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے نہایت مفید اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، ادھر چند برسوں سے ان کی دینی حمیت نے انھیں وقت کی ایک اہم ترین ضرورت اور مذہب کی ایک بڑی خدمت یعنی قادیانی مذہب کے احتساب کی طرف متوجہ کر دیا ہے، چنانچہ انھوں نے آج سے چار سال پہلے ایک مختصر کتاب قادیانی مذہب لکھی جس میں مرزا غلام احمد اور ان کی امت کے اکابر کے قلم سے ان کی اور ان کے مذہب کی تصویر دکھائی تھی، اس کتاب کو اتنا حسنِ قبول حاصل ہوا کہ چار سال کے اندر اس کے چار اڈیشن شائع ہوئے، جن میں سے ہر ایک جامعیت و تکمیل میں پہلے سے بڑھکر تھا، موجودہ چوتھا اڈیشن سب میں جامع تر اور مکمل تر ہے، اسکی جامعیت کا اندازہ کتاب کی ضخامت اور اس کے فصول و مباحث کی کثرت سے ہو سکتا ہے، پوری کتاب میں بیس فصلیں اور چند ضمیمے ہیں، ہر فصل میں بکثرت مباحث ہیں، بعض بعض فصلوں کے مباحث کی تعداد سو سے اوپر ہے، پوری کتاب کے مباحث

ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں، استیعاب کی یہ شان ہے کہ مرزا غلام احمد کے خاندانی حالات اور انکی پیدایش سے لیکر ان کی وفات تک کا کوئی واقعہ اور قادیانی مذہب کا کوئی رُخ اور کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے عجب نہیں کہ اس کتاب کو دیکھکر قادیانی امت پکار اٹھی ہو، ما لھذا الکتاب لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصٰھا۔

اس کتاب کی تالیف میں برنی صاحب نے قادیانی مذہب کا سارا لٹریچر کھنگھال ڈالا ہے، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے، کہ بعض ضروری تشریحات اور حواشی کے علاوہ مصنف نے خود اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے، بلکہ خود مرزا صاحب اور قادیانی مذہب کے اکابر کے قلم و زبان سے بنی قادیان اور ان کے مذہب کی تصویر کھنچ دی ہے، گویا مصنف نے قادیانیوں ہی کا بنایا ہوا آئینہ لاکر ان کے سامنے کھڑا کر دیا ہے، جس میں ان کے تمام خط وخال صاف نظر آتے ہیں، اور بہ یک نظر انکی پوری تاریخ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، جہاں خود کچھ لکھنے کی ضرورت پڑی ہے، وہاں بھی تہذیب و متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، جو مناظرانہ تحریروں میں عنقا ہے، اس موضوع پر بلکہ شاید مناظرے کی تاریخ میں اس نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے، یہ طریقہ نہ صرف متین و سنجیدہ بلکہ سب سے زیادہ موثر اور کامیاب بھی ہے۔ آج کل بہت سے ناواقف اور سادہ لوح مسلمان بلکہ بعض کوتاہ نظر تعلیم یافتہ تک قادیانی مذہب کی حقیقت سے بے خبر ہیں، اور کم از کم انکے تبلیغی ڈھونگ سے متاثر ہوسکتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، اسکو پڑھنے کے بعد قادیانی مذہب کی حقیقت بالکل آئینہ ہو جاتی ہے، خدا مصنف کو اس عمل حسنہ کی جزاے خیر دے۔

**فلسفۂ جمال**، مرتبہ ریاض الحسن صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۸۶ صفحات، کاغذ سپید، خط ٹائپ روشن و جلی، قیمت عہ، پتہ کتابستان نمبر ۱۷ اے سٹی روڈ الہ آباد۔

موجودہ علمی ترقیوں نے دنیا کی ہر شے کو فنی حیثیت دیدی ہے، حتی کہ "جمالیات" جیسی لطیف

حقیقت بھی جو محض ایک ذوقی اور وجدانی شے ہے طلسم خانۂ علم میں اسیر ہے، جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں لائق مصنف نے فلسفۂ جمال کی وضاحت بلکہ تجزیہ و تحلیل کی ہے، اس میں جمال اپنے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی خط و خال کے حسن سے لیکر مصوری، صنمگری، موسیقی شاعری وغیرہ تک تمام فنون لطیفہ داخل ہیں، پہلے اس کتاب میں نفس جمال پر بحث ہے، کہ حسن کیا ہے، تخیل سے اس کا کیا تعلق ہے، احساس حسن کے کتنے اجزا ہیں، حسن و آرٹ میں کیا تعلق اور ان میں کیا فرق ہے، پھر حسن کے عامل یا اس کے مظہر آرٹسٹ و شاعر کے کیفیات اور جذبات پر گفتگو ہے، کہ وہ باطنی تاثرات سے متاثر یا ملہم ہوتا ہے، اور یہ تاثرات مختلف رنگوں میں پھوٹتے ہیں، انہی کے ماتحت وہ اپنے تاثرات کو متشکل کرتا ہے، اس طرح گویا حسن کا ظہور ہوتا ہے؛ پھر آرٹ کے اجزا ترکیبی ان کے امتزاج اور ہم آہنگی پر بحث ہے، پھر حسن و بدصورتی کا تعلق دکھایا گیا ہے، کہ بدصورتی کے تقابل سے جمال نمایاں ہوتا ہے، پھر صاحب فن کی عظمت و بزرگی، اور اس کے کمال پر اظہار خیال ہے، آخر میں آرٹ و اخلاق اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہے، اور آرٹ و اخلاص پر اس لطیف حکایت کا خاتمہ ہے،

کتاب مجموعی حیثیت سے دلچسپ ہے، جمالیات کی مناسبت سے حسن بیان کا خاص اہتمام رکھا گیا ہے، جابجا دلچسپ اشعار کی آمیزش سے، جو تشریح و وضاحت کے لئے لائے گئے ہیں، اس میں اور اضافہ ہو گیا ہے، اور کتاب میں فلسفہ کی خشکی کے بجائے ادب کی تری پیدا ہو گئی ہے، اب یہ اہلِ جمال جانیں، کہ اس سے فن کو کہاں تک فائدہ پہنچا،

**افسانہ نگاری** مصنفہ سید وقار عظیم صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی، حجم ۱۰۲ صفحے کاغذ سپید کتابت و طباعت صاف قیمت عہ، پتہ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد،

ہندوستانی زبان میں مختصر افسانہ نگاری کا مذاق روز بروز بڑھتا جاتا ہے، افسانوں کی مقبولیت

اتنی عام ہوتی جاتی ہے، کہ بیشتر رسائل اسی جنس لطیف سے معمور رہتے ہیں، ہر نوجوان کی پہلی قلمی کوشش کا جولانگاہ افسانوں ہی کا میدان ہوتا ہے، لیکن افسانوں کی اس مقبولیت اور ارزانی کے باوجود ہندوستانی زبان میں فن افسانہ نگاری پر دو چار مختصر مضامین اور دو ایک ابتدائی تصانیف کے علاوہ کوئی مستقل کتاب نہ تھی، سید وقار عظیم صاحب نے افسانہ نگاری لکھ کر ایک حد تک اس کمی کو پوری کر دیا ہے، اس کتاب میں فنی حیثیت سے افسانہ نگاری کے اصول، ضوابط، اس کے اجزاء، مثلاً افسانہ کی حقیقت، اس کی سُرخی، اسکی ترتیب، ابتدا، وخاتمہ، افسانہ وکردار نگاری، افسانہ وحقیقت، افسانہ ومحبت، اور تحیا واثر وغیرہ افسانے کے تمام اجزاء اور اس کے لوازم وشرائط پر تفصیلی بحث ہے، یہ کتاب نومشق افسانہ نویسوں کے لئے مفید اور لائق مطالعہ ہے،

**ہماری افسانے،** مصنفہ سید وقار عظیم صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۰ صفحات، کاغذ سپید کتابت وطباعت اچھی، قیمت ۱۲/، پتہ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد،

یہ کتاب گویا پہلی کتاب "افسانہ نگاری" کا تتمہ اور تکملہ ہے، اس میں فنی حیثیت سے پہلی کتاب کے مباحث پر کوئی جدید اضافہ نہیں ہے، بلکہ ابتدا میں افسانہ نگاری کی مختصر تاریخ ہے، پھر افسانوں کے اقسام مقامی رنگ کے افسانے اصلاحی افسانے، تراجم، رومانی، جاسوسی اور ہیبت ناک افسانے وغیرہ پر بحث ہے، اور جابجا "افسانہ نگاری" میں بتائے ہوئے اصول وضوابط کی روشنی میں اون کی وضاحت وتشریح کی گئی ہے، آخر میں ہندوستان کے مشاہیر افسانہ نگاروں کی خصوصیات اور فنی نقطۂ نظر سے ان پر تبصرہ کیا گیا ہے جس سے افسانہ نگاری کے اصول وضوابط ذہن نشین ہوجاتے ہیں، غالباً یہ کتابیں مصنف کی پہلی قلمی کوشش کا ثمر ہیں، اس لئے زبان میں خامی اور ناہمواری ہے، جو امید ہے کہ مشق ومہارت سے دور ہو جائیگی،

(ض)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۰

ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء

# معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

---

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۳۸ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۶ء | عدد ۵

# مضامین


| مضمون | مضمون نگار | صفحات |
| --- | --- | --- |
| شذرات، | سید سلیمان ندوی، | ۳۲۲-۳۲۴ |
| تابعین کے علمی اور مذہبی کارنامے، | شاہ معین الدین احمد ندوی، | ۳۲۵-۳۳۸ |
| دیوان شمس تبریز اور مولانائے روم، | جناب غلام دستگیر صاحب رشید، ایم اے حیدرآباد دکن | ۳۳۹-۳۵۱ |
| کلام اُطت، | مولوی محمد بدرالدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی | ۳۵۲-۳۶۴ |
| مذاہب اربعہ میں فطرت کا لگاؤ، | جناب ہوش بلگرامی، | ۳۶۵-۳۷۵ |
| ڈچ جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی حالت | مولوی محمد اسمٰعیل گاچھیلہ صاحب، | ۳۷۶-۳۷۹ |
| رومن کیتھولک چرچ اور اسلام، | "ع ز" | ۳۸۰-۳۸۶ |
| امریکہ میں سرطان کے علاج کی تدبیریں، | ״ | ۳۸۶-۳۸۷ |
| اخبار علمیہ، | ״ | ۳۸۸-۳۹۱ |
| دعا، | جناب اسد صاحب بی اے ملتانی، | ۳۹۲ |
| سخنِ ماہر، | جناب ماہر القادری صاحب۔ | ۳۹۲-۳۹۳ |
| کیفِ تغزل، | مولوی محمد مبین صاحب کیفی، | ۳۹۳ |
| "اہلِ ہند کی زندگی اور حالات،" | "ص ع" | ۳۹۴-۳۹۶ |
| مطبوعات جدیدہ | "م" | ۳۹۷-۴۰۰ |

# شذرات

ہندوستانی زبان کی ترقی وتحفظ کے مسئلہ پر غور کرنے کیلئے ۲۴-۲۵ - اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء کو علیگڈہ مین اردو کانفرنس کے دو عام اجلاس، اور ایک خاص مشاورتی جلسہ منعقد ہوا، بنگال، بہار، مدراس، اور پنجاب کے متعدد اور صوبہائے متحدہ کے اکثر اہل قلم واہل ادب واہل الرائے موجود تھے، پہلے عام اجلاس مین صدر استقبالی ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی طرف سے کہ وہ بیمار تھے، نواب صدر یار جنگ بہادر نے خطبۂ استقبال پڑھا، پھر صدر منتخب جناب راجہ صاحب محمود آباد نے جن کو شاید پہلی دفعہ اس قسم کے مجمعون مین شرکت کا اتفاق ہوا ہوگا، اپنا خطبۂ صدارت پڑھا، ان خطبون مین کوئی بات نہ تھی لیکن بہرحال ان سے اجلاس کا رسمی افتتاح ہوگیا، اور کل کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی،

ان سب کمیٹی نے ۲۵ کی صبح سے لیکر دوپہر تک اپنا کام کیا، اور ہندوستانی زبان کو پورے ملک مین پھیلانے بڑھانے اور ترقی دینے کی تجویزون پر غور کیا، اور ایک ایسا خاکہ تیار کیا کہ جس پر چند سال بھی اگر مستعدی و گرمجوشی کیساتھ کام کیا گیا، تو یقین ہے کہ ہماری زبان کی جغرافی اور معنوی وسعت اب سے دوچند ہو جائیگی، یہ بھی طے پایا کہ انجمن ترقی اردو کا مرکز دلی قرار دیا جائے، اور سارے صوبون اور دیسی ریاستون مین اسکی شاخین قائم ہون، اور ان کے ماتحت ذیلی انجمنین قائم کیجائین، اور کوشش کیجائے کہ ہر صوبہ کے سرکاری دفترون اور درسگاہون مین ہندوستانی کو وہ حیثیت دیجائے جس کی وہ مستحق ہے، یہ بھی طے پایا کہ دلی مین ہندوستانی کا ایک مکمل اشاعت خانہ اور ایک کتبخانہ قائم کیا جائے، انجمن کے لئے تین کمیٹیان بنائی گئین جنمین سے ایک اصلاح زبان وخط ورسم الخط کے مسئلون پر غور کریگی، دوسری ادبی مجلس ہوگی جس کے ارکان انجمن کے سلسلۂ تصنیف وتالیف وترجمہ کے متعلق رائین دینگے، اور تیسری کمیٹی انجمن کے مطبع اور اشاعت خانہ کے متعلق تجاویز پیش کرے گی،

دوسرے عام اجلاس مین سب کمیٹی کے مجوزۂ لائحۂ عمل کو پڑھ کر سنایا گیا، اور حاضرین نے بالاتفاق اسکو منظور کیا، اس اجلاس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے فرمائی، موصوف نے ہندوستانی زبان اور اس زبان مین تعلیم کے مسئلہ پر ایک مختصر لیکن پرمغز تقریر فرمائی جس کو حاضرین نے توجہ کے ساتھ سنا، آخر مین نواب صدر یار جنگ بہادر نے صدر کے اور مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری نے حاضرین اور منتظمین کے شکریہ کا فرض ادا کیا، اور جلسہ ختم ہوگیا،

یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی گویا پہلی کانفرنس تھی، نہ اس مین پرجوش تقریرین ہوئین، نہ ہنگامہ آرا تجویزین پیش ہوئین، نہ مجوزین اور موئیدین کے نامون کی نمائش ہوئی، نہ تجویزون کی مخالفت اور ترمیم کا شور بلند ہوا، اسکو اور اطمینانِ خاطر کے ساتھ چند کام کرنے والے جمع ہوئے، اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ سب نے مل کر کچھ تجویزین پیش کین اور منظور کین، اور آیندہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کا تہیہ کیا،

---

اس کانفرنس کی دوسری خصوصیت اسکی نمایندہ حیثیت تھی، شاید یہ پہلا موقع ہو جب سیاسیات کے پرشور تماشون کے بغیر کچھ سوچنے والے اور کام کرنے والے لوگ ملک کے مختلف حصون سے اکٹھے ہوئے، اور انکی ایک ایسی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی جس کو دیکھکر یہ ماننا پڑا کہ اہل ملک مین اپنی زبان کی ترقی و تحفظ کا خیال پہلے سے بہت زیادہ ہے، ہمارے لئے یہ بھی تسکین کا باعث تھا کہ جلسہ مین ہندوستانی زبان کے ہندو اہل قلم و اہل ادب بھی شریک تھے،

افسوس ہو کہ اس جلسہ مین ہندی اور ہندوستانی کا وہ ادیب موجود نہ تھا جس کا قلم ان دونون دریاؤن کا سنگم تھا، یعنی منشی پریم چند، مرحوم علیہ نے اسی ہینہ اپنے دوستون کو آخری الوداع کہا، اور اس دنیا سے رخصت ہوگئے، ان کے قلم نے کم از کم پچیس برس تک اپنے دیہاتی بھائیون کی کہانی اپنے شہری بھائیون کو سنائی، وہ زبان کے پرجوش فصیح و بلیغ نہ تھے، ان کی عبارت تکلف اور بناوٹ سے پاک، اور حد درجہ سادی تھی ان کی کہانیون

کا اثر ان کی زبان میں نہ تھا، بلکہ ان کے بیان میں تھا، انھون نے ہمارے دیہاتی تمدن، ہندوستانی وضع و آداب، اور ہندی اخلاق آن بان کی جو تصویرین کھینچی ہین، وہ ہمارے ادبی مرقع کی زندہٗ جاوید یادگار رہین گی،

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن جو ہمارے ملک میں نادر عربی کتابون کا واحد اشاعت خانہ ہے، اب وہ اپنی ترقی کے نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے، اب اس کے لائق مہتمم ہمارے عزیز مولانا سید ہاشم صاحب ندوی رکن دائرۃ المعارف مقرر ہوئے ہین، وہ دن رات اس کی ترقی اور دست برد انقلاب سے اس کے بچانے کی فکر میں مصروف رہتے ہین، چند نئی کتابین چھپکر شائع ہوئی ہین، اور کچھ زیر تصحیح اور زیر طبع ہین،

---

تازہ اشاعت پذیر کتابون میں سنن کبریٰ بیہقی کی آٹھوین جلد ہے جس میں نفقات و حدود و واشربہ کے ابواب ہین، اور دو نادر کتابین جو ادمع کتاب اصلاح المنطق اور کتاب احکام الوقف ہین، اول الذکر کتاب تیسری صدی ہجری کے مشہور ادیب و لغوی ابن سکیت کی مشہور تصنیف اصلاح المنطق کی تہذیب ہے جس کو چوتھی صدی ہجری کے ایک بغدادی ادیب زید بن رفاعہ نے انجام دیا ہے، دوسری کتاب قاضی ابو یوسفؒ کے شاگرد ہلال بن یحییٰ الرائی البصری المتوفی ۲۴۵ھ کی تصنیف ہے، اس میں وقف کے مسائل کی تفصیل و تشریح کی گئی ہے، اس مین بیان کا طریقہ بالکل نیا اختیار کیا گیا ہے، یعنی سوال و جواب اور مکالمہ کی صورت میں، اور ایک دلچسپ رسالہ امام رازی کے مناظرات پر شائع ہوا ہے، امام موصوف کو ماوراء النہر کے مختلف شہرون میں علماے وقت سے متعدد مناظرے کرنے پڑے، انہیں مناظرون کو امام نے اس رسالہ میں جمع کیا ہے،

---

خدا کا شکر ہے کہ سیرت نبویؐ کی چھٹی جلد جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس مہینہ مطبع میں دے دی گئی، پوری کتاب شاید تین سو صفحون میں تمام ہو، اور ۱۹۳۷ء کے آخر میں چھپکر شائع ہو،

---

(۲)

از شاہ معین الدین احمد ندوی،

**فقہ میں تابعین کا درجہ،** فقہ یعنی حلال و حرام کے مسائل کا علم، اور اصول سے مسائل کا استخراج و استنباط، یہ علم بھی تابعین کی علمی موشگافیوں کا مرہون منت ہے، انہی نے اسکو فن بنایا، بلکہ یہ دعوی غلط نہ ہوگا، کہ انہی کے فیض سے فقہ کے مذاہب قائم ہوئے، اس لئے کہ ائمہ مذاہب سب کے سب انہی کے حلقۂ درس کے تربیت یافتہ تھے، تابعین کی جماعت میں علمائے فقہ کی بہت بڑی تعداد تھی، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں،

ابراہیم نخعی اپنے وقت کے امام فقہ تھے، امام شعبی انھیں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا فقیہ مانتے تھے،[۱] سعید بن جبیر جو خود بڑے فقیہ تھے، ان کی موجودگی میں فتویٰ کا جواب نہ دیتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ ابراہیم کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو،[۲] اہل بیت میں امام جعفر صادق کا تفقہ مشہور تھا، ان کے تفقہ کی یہ سند کافی ہے، کہ امام ابو حنیفہ ان کے خرمن فقہ کے خوشہ چیں تھے، اور فرماتے تھے کہ میں نے ان سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا،[۳] حسن بصری مسائل حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم تھے،[۴] ربیع بن انس کا بیان ہے، کہ میں کامل دس سال تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، اور روزانہ ان سے نئے نئے مسائل معلوم ہوتے تھے،[۵] بعض روایتوں سے

۱؎ تہذیب الاسما جلد اول ق اول ص ۱۰۴، ۲؎ ،، ص ۱۰۴، ۳؎ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۵۰، ۴؎ ابن سعد جلد ۷ ق اول ص ۱۱۵، ۵؎ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۵

معلوم ہوتا ہے، کہ فقہ میں ان کا ایک خاص مذہب تھا، جس کے بہت سے پیرو تھے، لیکن زیادہ دنوں تک نہ چل سکا

ربیعۃ الرائی: مدینہ کے فقیہ اعظم تھے، اجتہاد اور تفریع و استنباط مسائل میں انکو اتنی بصیرت حاصل تھی، کہ رائی ان کا لقب ہوگیا تھا[1] صاحب مذہب ائمہ میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ ان کے فیضیافتہ تھے، امام مالک ان کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کی موت کے وقت ان کی زبان پر تھا کہ آج فقہ کا مزا جاتا رہا[2] امام ابو حنیفہ ان کی خدمت میں استفادہ کے لئے حاضر ہوتے تھے، اور ان کے اقوال و آراء کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے[3] سعید بن جبیر کا تفقہ اکابر صحابہ میں مسلم تھا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں اگر کوئی کوفی استفتے کے لئے آتا، تو فرماتے کیا سعید بن جبیر تمہارے یہاں نہیں ہیں[4] سعید بن مسیب مدینہ کے سات مشہور ائمہ فقہاء میں سے ایک تھے، پھر ان ساتوں میں وہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے، قتادہ کہتے تھے، کہ سعید بن مسیب سے زیادہ حلال و حرام کا واقفکار میں نے نہیں دیکھا، سلیمان بن موسیٰ ان کو افقہ التابعین کہتے تھے، ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار اور فقہ و فتاویٰ میں سب پر فائق تھے، ان کو فقیہ الفقہاء کہا جاتا تھا[5] ان کے تفقہ کا ایک بڑا سبب یہ تھا، کہ وہ آنحضرت صلعم اور شیخینؓ کے فیصلوں کے سب سے بڑے عالم تھے، حضرت عمرؓ کے فیصلوں کے خصوصیت کیساتھ بڑے حافظ تھے، اور راویۃ عمرؓ کہے جاتے تھے[6] حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی ان کے تفقہ کے معترف تھے[7] اور اکثر مسائل پوچھنے والوں کو ان کے پاس بھیجدیتے تھے[8] امام شعبی اپنے عہد کے سب سے بڑے فقیہ مانے جاتے تھے، بعض علماء انھیں سعید بن مسیب، طاؤس، عطاء، حسن بصری، اور ابن سیرین سے بھی بڑا فقیہ مانتے تھے[9] ابراہیم نخعی جن کے تفقہ کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، جب خود کسی مسئلہ کا جواب نہ دے سکتے تھے، تو سائل کو شعبی کے پاس بھیجدیتے تھے[10] اس تفقہ کی بنا پر وہ صحابۂ کرام کی موجودگی ہی میں مسند افتاء پر بیٹھ گئے تھے[11]

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۴۱، [2] تاریخ خطیب جلد ۸ ص ۴۲۳، [3] ؍ ص ۴۲۲، [4] تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص ۱۱۶
[5] ؍ ص ۲۲۰، [6] ابن سعد جلد ۵ ص ۸۹، [7] ؍ [8] ابن خلکان جلد اول ص ۲۰۶، [9] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۷۶،
[10] ابن سعد جلد ۶ ص ۱۷۴، [11] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۶۲

عطاء بن ابی رباح سادات فقہاء میں شمار ہوتے تھے[۱] عطاء کا مستقر مکہ تھا، یہاں کے بعض سائلین اکثر مسائل کو مدنی صحابہ کی آمد کے لئے اٹھا رکھتے تھے، چنانچہ جب عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ حج کے سلسلہ میں مکہ آتے، تو لوگ ان سے پوچھتے، یہ دونوں بزرگ جواب دیتے، کہ عطاء کی موجودگی میں تم لوگ مجھ سے پوچھتے ہو، اور میرے لئے مسائل اٹھا رکھتے ہو[۲] امام اعظم فرماتے تھے، کہ میں نے عطاء سے افضل کسی کو نہیں پایا[۳] عمرو بن دینار مجتہد فقہاء میں تھے[۴] ابن عیینہ انھیں اس عہد کا سب سے بڑا فقیہ مانتے تھے[۵] عکرمہ کا خاص فن اگرچہ حدیث تھا، لیکن فقہ کے بھی وہ بڑے عالم تھے[۶] حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان کو اپنی زندگی ہی میں فتوی دینے کا مجاز بنا دیا تھا[۷] علقمہ جتنے دنوں تک بصرہ میں رہتے تھے، اتنے دنوں تک حسن بصری فتوی نہ دیتے تھے[۸] ان کی موت کے وقت ہر شخص کی زبان پر تھا، کہ آج افقہ الناس دنیا سے اٹھ گیا[۹] ابن سیرین باتفاق علماء و ارباب فن فقہ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے[۱۰] امام زہری نے اس عہد کے اکثر اکابر فقہاء کا علم اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا[۱۱] مسلم بن یسار کا شمار ائمہ فقہا میں تھا، مسروق بن اجدع فقیہ الامت عبداللہ بن مسعودؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اور ان کا شغل درس و افتاء تھا[۱۲] مکحول شام کے سب سے بڑے فقیہ تھے[۱۳] ابو سلمہ بن عبدالرحمن کو بعض علماء مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں شمار کرتے تھے[۱۴] مدینہ مرکز فقہاء تھا، اس لئے یہاں ائمہ فقہاء کی ایک جماعت ایسی تھی، جو ساری دنیائے اسلام میں فرد مانی جاتی تھی، باختلاف علماء ان کی تعداد سات سے دس تک ہے، ان میں سے بعضوں کے نام اوپر گذر چکے ہیں، کسی شاعر نے ان کے نام ایک قطعہ میں نظم کئے ہیں،

---

۱ تہذیب التہذیب جلد ۷ ص۲۰۳، ۲ ۔۔ و تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص۳۳۴، ۳ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۹۰، ۴ تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص ۲۰، ۵ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۰۰، ۶ تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۷۱، ۷ تہذیب جلد اول ص ۲۶۵، ۸ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۸۴، ۹ ابن سعد جلد ۵ ص ۲۱۶، ۱۰ دیکھو تہذیب و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ ترجمہ ابن سیرین ۱۱ تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۳، ۱۲ ۔۔ جلد ۱ ص ۱۱۱، ۱۳ تہذیب الاسماء جلد اول ق ۲ ص ۱۱۳، ۱۴ ۔۔ ص ۲۴۱،

اذا قیل من فی العلم سبعة ابحر | روایتهم لیست عن العلم خارجه
فقل هم عبید الله عروة قاسم | سعید ابوبکر سلیمان خارجه

ان کے علاوہ ممتاز فقہاء کی بہت بڑی جماعت تھی، جن کے نام ہم طوالت کے خیال سے قلم انداز کرتے ہیں،

رائے میں احتیاط: فقہ کی بنیاد درحقیقت قرآن وحدیث ہی پر ہے، اور اسی اصول سے تمام مسائل مستنبط ہیں، لیکن نئے مسائل میں صاحب نظر مجتہد کو عقل ورائے سے کام لینا ناگزیر ہے، ورنہ فقہ کا دروازہ بند ہوجائے لیکن تابعین کرام اس باب میں اتنے محتاط تھے، کہ مجتہدانہ نظر اور قیاس ورائے کی باوجود بغیر سند کے اپنی رائے کو دخل نہ دیتے تھے، بلکہ ان مسائل میں بھی جن کی سند موجود ہوتی، شدت احتیاط کی بنا پر جواب سے گریز کرتے تھے، ایوب بن ابی تمیمہ جو سید الفقہاء کہلاتے تھے، اکثر مسائل کے جواب میں لاعلمی ظاہر کرتے تھے، جن مسائل کا جواب بھی دیتے تھے ان میں پہلے سائل کے فہم اور حافظہ کا پورا اطمینان کر لیتے تھے، بغیر سند کے اپنی رائے سے جواب نہ دیتے تھے[۱] ربیعہ جیسے مجتہد جو اپنی قوت استنباط کی وجہ سے 'رائی' کہلاتے تھے، اظہار رائے میں بڑے محتاط تھے، اور بغیر سند کے محض رائے سے جواب دینے کے مقابلہ میں جاہل مرجانے کو ترجیح دیتے تھے[۲] امام شعبی اپنی جلالت شان کے باوجود فتوؤں کے جواب میں عموماً لاعلمی ظاہر کرتے تھے[۳] اور بغیر سند کے کبھی جواب نہ دیتے تھے[۴] عبد الرحمن ابن ابی لیلی بھی عموماً جواب دینے سے گریز کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کے بیس انصاری اصحاب کو دیکھا ہے کہ ان میں سے ہر شخص جواب سے پہلو بچاتا تھا، اور چاہتا تھا کہ دوسرا شخص جواب دیدے، اور آج یہ حال ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں[۵]

عطا ابن ابی رباح کے پاس اگر کوئی سند نہ ہوتی، تو صاف جواب دیدیتے، کہ مجھے نہیں معلوم، ایک مرتبہ کسی مسئلہ کے جواب میں لاعلمی ظاہر کی، لوگوں نے کہا اپنی رائے سے جواب دیدیجئے، فرمایا مجھے خدا سے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۱۷، [۲] تاریخ خطیب جلد ۸ ترجمہ ربیعہ رائی [۳] ابن سعد جلد ۶ ص ۴۷، [۴] ایضاً [۵] ررص ۷۶،

سے شرم معلوم ہوتی ہو کہ روئے زمین پر میری رائے کی اطاعت کیجائے[1]، قاسم بن محمد بن ابی بکر جو مدینہ کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے، بغیر علم کے جواب نہ دیتے تھے، جو مسئلہ معلوم نہ ہوتا، بلاتکلف لاعلمی ظاہر کر دیتے[2]، قتادہ کسی مسئلہ میں رائے کو دخل نہ دیتے تھے، ایک مرتبہ کسی مسئلہ میں لاعلمی ظاہر کی، سائل نے کہا اپنی رائے بتا دیجئے، انھوں نے کہا کہ میں نے چالیس سال سے اپنی رائے سے کوئی جواب نہیں دیا ہے[3]، ابن سیرین جو فقہ کے امام تھے، جواب سے اسقدر گھبراتے تھے کہ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا، تو ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، اور یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر پہلے ہنس بول رہے تھے،

**رائے اور قیاس،** اشخاص کی ذاتی احتیاط علحدہ ایک شے ہے، لیکن اگر اصولی حیثیت سے رائے اور قیاس کا کوئی درجہ نہ رکھا جائے، تو پھر نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کی کوئی صورت باقی نہیں رہ جاتی، اس لئے عہد صحابہ میں بھی رائے و قیاس سے کام لیا جاتا ہے، خود آنحضرت صلعم نے اسکی تحسین فرمائی ہے، گو تابعین کی بڑی جماعت رائے کو احتیاط کے خلاف سمجھتی تھی، لیکن بہت سے تابعین ایسے تھے، جو رائے اور قیاس سے کام لیتے، حضرت حسن بصری جن کی احتیاط اور جن کا زہد و ورع مسلم ہے، رائے سے کام لیتے تھے، اور اسکی نہایت معقول توجیہ فرماتے تھے، ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا، کہ آپ جن جن مسئلوں کا جواب دیتے ہیں، کیا ان سب میں آپ کے پاس سماعی سند ہوتی ہے، فرمایا نہیں لیکن ہماری رائے سائلوں کی رائے سے زیادہ ان کے لئے بہتر ہوتی ہے[4]، عطا بن ابی رباح بھی رائے سے کام لیتے تھے، اگر کسی سند پر کوئی مسئلہ بیان کرتے تو کہدیتے کہ اثر ہے، اور اگر رائے ہوتی تو ظاہر کر دیتے کہ رائے ہے[5]، قاسم بن محمد بن ابی بکر اگرچہ بڑے محتاط تھے اور بغیر سند کے کسی مسئلہ کا جواب نہ دیتے تھے، تاہم کبھی کبھی انھیں بھی رائے سے کام لینا پڑتا تھا، ایسے موقع پر وہ جواب دیکر یہ ظاہر کر دیتے کہ "یہ میری رائے ہے یہ نہیں کہتا کہ حق ہے[6]"،

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۷، ص ۲۰۲، [2] ابن سعد جلد ۵، ص ۱۳۹ [3] ایضاً جلد ۷، ق ۲ ص ۲[4] ایضاً جلد ۷، ق اول ص ۱۴۲

[5] ایضاً جلد ۷، ق اول ص ۱۲۱، [6] ایضاً جلد ۵ ص ۳۴۵، [7] ایضاً ص ۱۳۹،

**قضاء کی استعداد و مہارت،** اگرچہ قضا، فقہ ہی کا ایک شعبہ ہے، لیکن اس میں فقہ کے علم کیساتھ بعض اور لوازم و شرائط کی ضرورت اور فطری صلاحیت و استعداد کو بھی دخل ہے، اس لئے ہر فقیہ میں قضا کا ملکہ ہونا ضروری نہیں، تابعین کرام کی ایک معتد بہ جماعت اس فن میں بھی بصیرت رکھتی تھی،

جیسا کہ اوپر ان کے ذکر میں گذر چکا ہے، سعید بن مسیب رسول اللہ صلعم اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے فیصلوں کے بہت بڑے حافظ اور واقفکار تھے، اسلئے قدرۃً ان میں قضا کی مہارت زیادہ تھی، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ فقہائے قضاۃ میں تھے، حجاج نے انہیں قاضی بنایا تھا[1]، محمد بن سیرین قضا میں اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے[2]، امام زہری میں بھی قضا کا بڑا ملکہ تھا، عبد الملک نے انہیں دمشق کے عہدۂ قضا پر ممتاز کیا تھا[3]، یحییٰ بن سعید ابتداء میں مدینۃ الرسول کے قاضی تھے، پھر عباسی دور میں خلیفہ منصور نے انہیں بغداد کا قاضی القضاۃ بنایا[4]، ابوبردہ بن ابی موسیٰ کوفہ کی مسند قضا پر تھے[5]، ابو قلابہ جرمی کو قضا میں خاص بصیرت تھی، ایوب کہا کرتے تھے کہ بصرہ میں ابو قلابہ سے زیادہ فیصلہ کی استعداد رکھنے والا کوئی نہ تھا، مسلم بن یسار کہتے تھے کہ اگر وہ عجم میں ہوتے تو قاضی القضاۃ ہوتے[6]، مسروق بن اجدع اموی دور میں کچھ دنوں قاضی رہے[7]، ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے بھی تھوڑے عرصہ تک مدینۃ الرسول میں قضاءت کی[8]، سعید بن جبیر قضا میں بڑی بصیرت رکھتے تھے، اور کچھ دنوں تک کوفہ کے عہدۂ قضا پر رہے، لیکن پھر بعض کوفیوں کی مخالفت کی وجہ سے انکی جگہ ابوبردہ کا تقرر عمل میں آیا، اور ابن جبیر انکے مشیر بنا دیئے گئے[9]۔

جماعت تابعین میں سب سے مشہور قاضی شریح اور ایاس بن معاویہ تھے، انھوں نے اس شعبہ کو بڑی ترقی دی، قضا میں قانون کے علم کے ساتھ بہت کچھ فہم و فراست کو دخل ہے، ایاس اور شریح دونوں اپنے زمانہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۵۰۔ [2] ابن سعد جلد ۷ ق اول ص۱۴۳۔ [3] ابن خلکان جلد اول ص۴۵۱۔ [4] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۱۲۲۔ [5] ابن سعد جلد ۶ ص۱۰۳۔ [6] ایضاً جلد ۷ ق اول ص۱۳۴۔ [7] ایضاً جلد ۶ ص۵۵۔ [8] ایضاً جلد ۵ ص۱۱۶۔ [9] ابن خلکان جلد اول ص۲۴۴۔

کے عاقل ترین انسانوں میں تھے، ایاس کے معاصرین کہتے تھے کہ ہر صدی میں ایک عاقل پیدا ہوتا ہے، اس صدی کے عاقل ایاس تھے،[1] ابن سیرین انکو فہم و فراست کا پیکر کہتے تھے،[2] انکی قضائی فراست کے بہت سے واقعات ہیں لیکن ہم طوالت کے خیال سے ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔

قاضی شریح کا پایہ ان سے بھی بلند ہے، وہ تاریخ اسلام کے نامور قاضیوں میں ہیں، انہیں قضاء کی صلاحیت و استعداد فطری تھی، حضرت علیؓ نے بزبان رسالت سے اقضاھم علی کا لقب ملا تھا، شریح کو "اقضی العرب" عرب کا سب سے بڑا قاضی فرماتے تھے،[3] ان کی اس صلاحیت کی وجہ سے لوگ انھیں شروع ہی سے مختلف فیہ معاملات میں حکم بناتے تھے، ان کے ایک فیصلہ کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کی جوہرشناس نگاہ نے انھیں قاضی بنا دیا، انھوں نے اپنی اہلیت کا ایسا ثبوت دیا کہ بڑے بڑے انقلابات میں بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے، اور حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لیکر عبد الملک کے عہد تک مسلسل ساٹھ برس قاضی رہے،[4]

ان کے فیصلے علما کے لئے فقہ اور قضاء کا درس ہوتے تھے، اور بڑے بڑے علماء ان سے استفادہ کرنے کے لئے ان کی عدالت کی درسگاہ میں آتے تھے، عکرمہ کا بیان ہے، کہ میں معلومات حاصل کرنے کے لئے پانچ مہینے تک شریح کی عدالت میں جاتا رہا، ان کے فیصلے میری معلومات کے لئے کافی ہوتے تھے،[5]

انھوں نے شعبۂ قضا میں اپنے فطری ذوق و استعداد کی وجہ سے بڑی مفید ایجادیں اور اصلاحیں کیں، جو فن قضاء کے اصول میں داخل ہو گئیں، فن قضاء میں ان کے آئین، اصول اور اختراعات کا موضوع نہایت دلچسپ ہے، لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

**فقہ کی تدوین اور فقہی مصنفات** اگرچہ فقہ کی باقاعدہ تدوین ائمۂ اربعہ کے زمانہ میں ہوئی، لیکن اس کا آغاز عہد تابعین ہی سے ہو گیا تھا، اور ہم کو تابعین کی متعدد فقہی مصنفات کا پتہ چلتا ہے،

---

[1] تہذیب التہذیب جلد اول ص۳۹۱۔ [2] ایضاً ۳۹۰۔ [3] تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص۲۴۳۔ [4] ابن سعد جلد ۶ ص۹۱۔ [5] ابن خلکان جلد اول ص۲۹۴۔ [6] ابن سعد جلد ۶ ص۹۵

عروہ بن زبیر نے جو مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے ایک تھے، فقہ میں کئی کتابیں لکھی تھیں، لیکن پھر محض شدتِ احتیاط کی وجہ سے جلا ڈالیں[۵۱] جسکا انکو ہمیشہ افسوس رہا، چنانچہ فرمایا کرتے تھے، کہ کتاب اللہ کی موجودگی میں ہم لوگ دوسری کتاب نہیں لکھتے تھے، اس لئے میں نے اپنی کتابیں ضائع کر دیں، لیکن اب میری یہ خواہش ہے کہ کاش وہ میرے پاس ہوتیں، اور خدا کی کتاب اپنی جگہ پر قائم و دائم رہتی،[۵۲] مکحول دمشقی نے مستقل دو کتابیں کتاب السنن اور کتاب المسائل لکھیں تھیں،[۵۳] امام زہری کے فتاوی تین ضخیم مجلدات میں جمع کئے گئے تھے،[۵۴] ان کے علاوہ اور متعدد تابعین نے کتابیں لکھیں تھیں لیکن انکے متعلق یہ تصریح نہیں ملتی کہ کس فن کے متعلق تھیں، اس لئے ان کا تذکرہ آخر میں آئے گا،

**علمِ فرائض،** فرائض کو بھی فقہ ہی کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے، اس میں بھی متعدد تابعین کمال رکھتے تھے، اعمش اس کے بڑے عالم تھے،[۵۵] سعید بن جبیر فرائض کے اتنے بڑے ماہر تھے کہ صحابہ تک فرائض کے سائلین کو ان کے پاس بھیج دیتے تھے،[۵۶] جب وہ مدینہ جاتے تھے، تو یہاں کے علما ان سے فرائض سیکھتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ فرائض کے بڑے عالم تھے ان کے صاحبزادے خارجہ تابعی کو باپ کی اس وراثت سے وافر حصہ ملا تھا، چنانچہ مدینہ میں وہ اور طلحہ بن عبد اللہ تقسیم میراث کا کام کرتے تھے، اور اسکے وثیقے لکھتے تھے، اور اس میں ان کا قول سند مانا جاتا تھا،[۵۷]

**مغازی اور سیرت کے ائمہ اور اس فن کی تصانیف** مغازی و سیرت (یعنی آنحضرت صلعم کی سیرۃ پاک اور آغازِ اسلام کی لڑائیاں) یہ دونوں فنون تاریخی بھی ہیں، اور مذہبی بھی ابتدا میں ان فنون کی مستقل حیثیت نہ تھی، بلکہ حدیث کا ایک جزو تھے، لیکن تابعین نے اسکو مستقل فن بنا دیا، تابعین میں ...

---

۵۱ ابن سعد جلد ۵ ص ۱۳۳، ۵۲ تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۸۳، ۵۳ فہرست ابن ندیم ص ۳۱۸، ۵۴ ... الموقعین جلد اول ص ۲۶، ۵۵ تاریخ خطیب جلد ۹ ص ۱۲، ۵۶ ابن سعد جلد ۶ ص ۱۸۳، ۵۷ تہذیب ... جلد اول ق اول ص ۱۶۲،

زہری سے پہلے اس فن کی مستقل حیثیت نہ تھی، سب سے پہلے انھی نے اسکی طرف توجہ کی، اور اسکو اتنی ترقی دی کہ مستقل فن بنادیا، اور اس پر مستقل کتاب لکھی سہیلی کے بیان کے مطابق یہ اس فن کی پہلی کتاب تھی[۱] ابن شہاب کے تلامذہ میں یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح، عبد الرحمن بن عبد العزیز، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق نے اس میں بڑا کمال پیدا کیا، آخر الذکر دونوں آدمیوں نے خصوصیت کے ساتھ بڑا نام پیدا کیا، یہ دونوں تابعی ہیں، اور اپنے عہد میں مغازی اور سیرت کے امام مانے جاتے تھے، خطیب بغدادی کا بیان ہے، کہ ابن اسحاق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس فن کی طرف توجہ کی، اور اسکو اتنی ترقی دی، کہ اس پر کوئی دوسرا اضافہ نہ کرسکا، انھوں نے سلاطین اور امراء کی توجہ بے نتیجہ اور لایعنی قصص و حکایات سے تاریخ کی جانب پھیردی، اس طرح گویا انھوں نے سب سے پہلے تاریخ کا مذاق پیدا کیا،[۲]

ابن عدی کا بیان ہے کہ اگر اس فضیلت کے علاوہ ابن اسحاق کی کوئی اور فضیلت نہ ہوتی، کہ انھوں نے سلاطین کا مذاق بدل دیا، اور انکی توجہ لاحاصل کتابوں سے رسول اللہ صلعم کے مغازی اور آغاز عالم کی تاریخ کی جانب پھیر دی تو بھی یہ تنہا فضیلت کافی تھی، ان کے بعد بہت سے لوگوں نے اس فن پر کتابیں لکھیں، لیکن کوئی ان کے درجہ کو نہ پہنچ سکا،[۳]

سیرت پر سب سے قدیم کتاب ابن اسحاق ہی کی سیرت تھی، یہ کتاب صدیوں سے ناپید ہے، لیکن اس لحاظ سے اسکی روایات ابتک محفوظ ہیں، کہ ابن ہشام کی سیرت کا ماخذ یہی تھی، اس لیے اسکی تمام روائتیں اس میں محفوظ ہوگئی ہیں، جو ہمارے سامنے موجود ہے،

موسیٰ بن عقبہ مدینہ میں مغازی کے سب سے بڑے عالم تھے، انھوں نے بھی مغازی پر کتاب لکھی تھی، جو کتاب المغازی موسیٰ بن عقبہ کے نام سے مشہور ہے، یہ کتاب اس زمانہ میں اس فن پر صحیح ترین کتاب مانی جاتی تھی،[۴]

---

[۱] روض الانف [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۵۶، [۳] تاریخ خطیب جلد اول،
[۴] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴، [۵] ر جلد ۱ ص ۳۶۱ و ۳۶۲،

یہ بھی ناپید ہے، اس نام کی ایک کتاب برلن کے کتب خانہ میں ہے، جسکا ایک ٹکڑا ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا،[1] عکرمہ نے کوئی قلمی یادگار نہیں چھوڑی، لیکن وہ بھی اس فن کے امام مانے جاتے تھے، جب مغازی بیان کرتے تھے تو اپنی قوتِ گویائی سے میدانِ جنگ کا سماں باندھ دیتے تھے[2]، امام شعبی کی بھی کوئی قلمی یادگار نہیں ہے، لیکن یہ بھی اپنے زمانہ میں مغازی کے امام تھے، اور صحابہ ان کے مغازی کے معترف تھے، حضرت عبداللہ ابن عمر نے ایک موقع پر فرمایا کہ اگرچہ میں خود مغازی میں شریک تھا لیکن جہاں تک علم کا تعلق ہے، شعبی مجھ سے زیادہ مغازی سے واقف ہیں، (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۶۶)

**تاریخ کی کتابیں،** اگرچہ مغازی و سیرت بھی تاریخ ہی کی ایک قسم ہے، گو وہ مذہبی سہی لیکن ان کے علاوہ تابعین کرام تاریخ عام اور خالص تاریخ کے بھی عالم تھے، اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں، خود ابن اسحاق تاریخ عام یعنی لڑائیوں کی تاریخ آغاز خلق کے حالات اور قصص انبیا کے عالم تھے،[3] مہدی کی فرمایش پر انھوں نے اس کے لڑکے کے لئے ایک کتاب (خطیب کے بیان کے مطابق یہ سیرت تھی،) لکھی تھی، جس میں آغاز خلق سے لیکر ان کے زمانہ تک کے حالات تھے،[4] ابن ندیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ انھوں نے تاریخ پر اور بھی کتابیں لکھی تھیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں، ولہ من الکتب کتاب الخلفاء رواہ عن الاموی کتاب السیرۃ والمبتدا والمغازی،[5] ایک اور تابعی وہب بن منبہ نے سلاطین حمیر کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں ان کے اخبار و قصص، ان کے قبور کے حالات اور انکے اشعار جمع کئے تھے، ابن خلکان نے یہ کتاب دیکھی تھی، اور اسکو مفید بتایا ہے،[6] امیر معاویہ نے ایک تابعی عبید بن شریہ سے قدما کی تاریخ اخبار الماضین لکھائی تھی[7]

**علم نحو،** نحو ادب کی ایک شاخ ہے، اس کا مقصد زبان عربی کے تلفظ اور اس کے اعراب کی صحت ہے، اسلئے ادب کی کتابوں کی تدوین سے برسوں پہلے نحو کا فن عالم وجود میں آگیا تھا، اس کا آغاز

[1] تاریخ آداب لغۃ عربیہ جرجی زیدان جلد ۲ ص ۱۵۱، [2] تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۶۵، [3] تاریخ خطیب جلد اول ص ۲۱۹ [4] ایضاً ص ۲۲۱، [5] فہرست ابن ندیم ص ۱۳۶، [6] ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۸۱، [7] ابن ندیم ص ۱۳۲،

طرح ہوا کہ عہدِ صحابہ میں عجمی اقوام بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں، جو صحیح عربی نہیں پڑھ سکتی تھیں، اسلئے انھیں عربی سکھانے کے لئے ایسے قواعد بنانے کی ضرورت پیش آئی، جنھیں سیکھنے کے بعد غیر عرب عربی زبان صحیح پڑھ سکیں، چنانچہ اس کام کو ایک تابعی ابوالاسود دؤلی نے انجام دیا، یہ حضرت علیؓ کے تلامذہ میں تھے، انھوں نے ابتدا میں چند نحوی مسائل قلمبند کئے، اس طرح فنِ نحو کی بنیاد پڑی، پھر ان سے عنبسہ بن معدان، میمون بن اقرن، یحییٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم متعدد آدمیوں نے یہ فن سیکھا،[1]

**غیر مذاہب اور ان کے صحیفوں کا علم۔** صحابۂ کرام کی توجہ تمامتر قرآن کی جانب تھی، اس لئے وہ غیر مذاہب کے صحیفوں کیطرف زیادہ متوجہ نہ ہوئے، تابعین کے زمانہ میں جب علمی ذوق نے وسعت حاصل کی تو ان کی توجہ ادھر بھی ہوئی، چنانچہ متعدد تابعین غیر مذاہب کے صحیفوں کے عالم تھے، ان میں وہب بن منبہ خصوصیت کیساتھ لائقِ ذکر ہیں، غیر مذاہب کے صحیفوں پر ان کی نظر نہایت وسیع تھی، امام نووی لکھتے ہیں کہ وہ گذشتہ کتابوں کے علم و معرفت میں مشہور ہیں،[2] حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے وسیع العلم تھے، اور اپنے زمانہ میں کعب احبار کی نظیر مانے جاتے تھے،[3] انھوں نے بانوے[92] الہامی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، جن میں سے بعض بہت کمیاب تھیں، انکا خود بیان ہے کہ بانوے[92] آسمانی کتابیں پڑھیں، ان میں سے ۷۲ کنیسوں اور لوگوں کے پاس موجود ہیں، اور بیس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے،[4] اگرچہ کعب احبار یہودی نومسلم تھے، لیکن تھے وہ بھی تابعی، وہ اپنے مذہب کے بہت بڑے عالم تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں، کہ وہ علم کا ظرف اور اہل کتاب کے علماء کبار میں تھے،[5] حضرت ابو دردا انصاریؓ جن کا حمص میں کعب احبار کا ساتھ رہا تھا، فرماتے تھے، کہ ابن حمیریہ (کعب احبار) کے پاس بڑا علم ہے،[6] تابعین میں ان کی بڑی علمی منزلت تھی، امام نووی لکھتے ہیں، کہ ان کے وفور علم اور توثیق پر سب کا اتفاق ہے، وہ اپنے وسعتِ علم کی وجہ سے "کعب الاحبار" اور "کعب حبر" کہلاتے تھے، اون کے مناقب بکثرت ہیں، اور ان کے

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۶۰۔ [2] تہذیب الاسماء جلد اول ق ۲ ص ۱۴۹۔ [3] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۸۹۔ [4] ابن سعد جلد ۵ ص ۳۹۵۔ [5] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۴۵۔ [6] ابن سعد جلد ۷، ق ۲ ص ۱۵۶،

اقوال اور حکیمانہ مقولے مشہور ہیں[1]

ان سے بعض صحابہ اور بہت تابعین نے یہودی مذہب کے متعلق معلومات حاصل کئے، تابعین میں مالک ابن ابی عامر، عطاء بن ابی رباح، عبد اللہ بن رباح انصاری، عبد اللہ بن ضمرہ، ابو رافع صائغ، عبد الرحمن ابن مغیث وغیرہ ایک بڑی جماعت ان سے مستفید ہوئی تھی،[2] اگر یہ بھی شمار کرلیئے جائیں، تو غیر مذاہب سے واقف تابعین کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے،

حلقہا ے درس اور انکے علمی فیوض و برکات

تابعین نے جس ذوق اور محنت سے علم کی تحصیل کی اسی شوق اور فیاضی سے اسکو پھیلایا، اگرچہ اُس زمانہ میں آجکل کی طرح کوئی باقاعدہ نظام تعلیم نہ تھا، لیکن ہر شہر میں اکابر علماء کے حلقہا ے درس ہوتے تھے، جن میں مذہبی اور غیر مذہبی جملہ علوم کی تعلیم ہوتی تھی، اور دنیاے اسلام کے گوشہ گوشہ کے تشنگان علم ان سرچشموں سے سیراب ہوتے تھے، اس دور کے جلیل القدر ائمہ اور اکابر علماء انہی حلقہا ے درس کے فیضیافتہ تھے، ان میں سے ہم بعض کا تذکرہ کرتے ہیں

مدینہ مدینۃ العلم تھا، اسلئے یہاں متعدد حلقۂ درس تھے، ربیعۃ الرائی کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا[3] اس میں طلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا، عام طلبہ کے علاوہ مدینہ کے علما زعماء اور بڑے بڑے شرفا شریک ہوتے تھے، اس حلقہ میں بیک وقت چالیس عمامہ پوش علماء کا شمار کیا گیا ہے۔ امام مالک امام اوزاعی یحیی بن سعید انصاری اور شعبہ وغیرہ اکابر علماء اسی حلقۂ درس کے فیضیافتہ تھے،

حضرت عمرؓ کے غلام زید بن اسلم کا حلقۂ درس بھی نہایت وسیع تھا، ایک وقت میں چالیس چالیس فقہا اس سے استفادہ کرتے تھے[4] امام زین العابدین جیسے بزرگ اس حلقہ میں شریک ہوتے تھے، ایک مرتبہ نافع بن جبیر نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ اپنی خاندانی مجلس کو چھوڑ کر ابن خطاب کے غلام

---

[1] تہذیب الاسماء، جلد اول ق ۲ ص ۶۹، [2] تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۴۳۵، [3] تاریخ خطیب جلد ۸ ترجمہ ربیعہ رائی، [4] تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹۶،

کے حلقہ میں شریک ہوتے ہیں آپ نے جواب دیا آدمی اسی جگہ جاتا ہے جہاں اسکو فائدہ پہنچتا ہے[1] اس سے دو باتیں ضمناً معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مدینہ میں بنی ہاشم یا قریش کا کوئی خاص حلقۂ درس بھی تھا، دوسرے یہ کہ اکابر اور شرفا غلام سے استفادہ میں عار نہ کرتے تھے،

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ایک زمانہ میں اہل مدینہ شانِ شرافت میں لونڈیوں کو ام ولد بنانا برا سمجھتے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہوا کہ انہی لونڈیوں کے بطن سے پیدا شدہ اشخاص علی بن حسین، قاسم بن محمد اور سالم بن عبد اللہ علم و تقوی اور زہد و عبادت میں بڑے بڑے نجبا پر بازی لے گئے، اسوقت سے یہ عار جاتا رہا[2] عبداللہ بن ذکوان کا حلقۂ درس اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے بادشاہوں کے دربار سے بڑھ کر تھا، اس میں مختلف علوم و فنون کے سیکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے، عبد ربہ بن سعید کا بیان ہے کہ میں نے ابو الزناد کو اس شان سے مسجد نبوی میں دیکھا ہے کہ ان کے ساتھ اتنا ہجوم تھا کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہ تھا، اس ہجوم میں فرائض، حساب، شعر، حدیث اور مختلف مشکلات اور علوم کے طلبہ اور سائلین تھے[3] لیث بن سعد کا بیان ہے کہ میں نے ابو الزناد (عبداللہ بن ذکوان) کے پیچھے مختلف علوم و فنون کے تین تین سو طالب علم دیکھے ہیں[4]

قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبداللہ بن عمر کا حلقۂ درس بھی تھا، طلوع آفتاب کے بعد قاسم اس میں بیٹھتے تھے[5] محمد بن عجلان کا حلقۂ درس مسجد نبوی میں تھا، اس میں بڑے بڑے تابعین شریک ہوتے تھے[6]

مدینہ کے علاوہ دنیائے اسلام کے اور علمی مرکزوں میں بھی حلقہائے درس تھے، کوفہ میں عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کا حلقۂ درس نہایت ممتاز تھا جس میں صحابہ شریک ہو کر سماع حدیث کرتے تھے[7]

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۲۹۶، [2] ٫٫ ص۴۳۳، [3] تہذیب الاسماء جلد اول ق ۲ ص۲۳۳، [4] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۱۲۱، [5] ابن سعد جلد ۵ ص۱۴۱، [6] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۱۴۹، [7] تہذیب التہذیب جلد ۶ ص۲۶۱،

امام شعبی کا حلقہ، درس صحابہ کرام کی موجودگی ہی میں قائم ہو گیا تھا[1] دوسرا حلقہ، درس مسعر بن کدام کا تھا، اس میں وہ معمولات عبادت کے بعد بیٹھتے تھے، اور شائقین حدیث حلقہ باندھکر استفادہ کرتے تھے[2] حمص میں خالد بن معدان کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، یہ شہرت سے بہت گھبراتے تھے، اس لئے جب حلقہ زیادہ بڑھا، تو اٹھ گئے[3] یہ وہ حلقہا ے درس ہیں جو سرسری مطالعہ سے نظر پڑ گئے ورنہ زیادہ تلاش سے ایک ایک مقام پر متعدد حلقوں کا پتہ چل سکتا ہے،

**ذخیرۂ کتب۔** اوپر جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے علاوہ تابعین کی اور کتابوں بلکہ ذخیرۂ کتب کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کن کن فنون کی کتابیں تھیں، قیاس ہے کہ مذہبی علوم کے متعلق رہی ہوں گی حسن بصری کے پاس کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا، جسے انھوں نے اپنی وفات کے وقت نذر آتش کرا دیا تھا[4]

ابو قلابہ جرمی کے پاس ایک بار شتر کتابیں تھیں، ان کو انھوں نے اپنے مرض الموت میں ایوب سختیانی کو دیے جانے کی وصیت کی تھی[5] ابن شہاب زہری کے پاس بھی کتابوں کا ذخیرہ تھا، ان کا علمی شغف و انہماک اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جب وہ گھر میں بیٹھتے تھے، تو ان کے اردگرد کتابیں ہوتی تھیں، اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے، ان کی بیوی کے لئے ان کا یہ انہماک سخت تکلیف دہ تھا، ایک مرتبہ انھوں نے جل کر کہا کہ ان کتابوں کا جلاپا تین سوتوں سے بڑھ کر ہے[6] اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں اور علما کے پاس بھی کتابوں کے ذخیرے ہی ہوں گے۔

---

۱؎ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۷۱، ۲؎ ابن سعد جلد ۶ ص۲۵۳، ۳؎ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۸۱، ۴؎ ابن سعد جلد ۷ ق اول ص۱۲۷، ۵؎ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۸۸، ۶؎ ابن خلکان جلد اول ص۴۵۱،

# دیوان شمس تبریز اور مولینائے روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد

(۱۱)

**روزمرہ اور محاورہ کی کمی،** ہر چند اشعار کا حسن لفظی، روزمرہ اور محاورہ پر منحصر نہیں، لیکن ان سے اکثر موقعوں پر شعر کے لفظی محاسن میں اضافہ ہو جاتا ہے، مولینا کے کلام میں یہ عنصر بھی غیر نمایان ہو، سعدی اور حافظ کے ہان اسکی کثرت ہو جس سے ان کے کلام کا لفظی حسن بڑھ گیا ہے، نظیری نے بھی اپنے کلام میں کثرت سے روزمرہ اور محاورات باندھے ہیں، تغزل ظہوری بھی اس خصوص میں ممتاز ہے،

**جدت اسلوب کی کمی پیرایۂ ادا کی تکرار اور ان کے اسباب** اسکے علاوہ مولینا کے کلام میں بدیع الاسلوبی یا جدت اسلوب کی کمی ہو، اسلیے پیرایۂ ادا کی تکرار پائی جاتی ہو، اسکے برعکس سعدی اور خسرو اور حافظ جدت اسلوب کے مالک ہین،

اسمیں کوئی شک نہیں کہ مولینا کے کلام میں شاعرانہ طرز ادا یا شاعرانہ بیان کے یہ نقائص پائے جاتے ہین لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اسکی وجہ کیا ہو،

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کبھی مولینا کو محض شاعری مقصود نہ تھی، بلکہ ان کا مقصود دین کی آواز پہنچانا تھا، اور چونکہ اس زمانہ میں لوگ شعر کے بہت دلدادہ تھے، شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، اس لئے انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے شعر کا پیرایہ اختیار کیا،

دیوان غزلیات میں آرٹ کے نقائص کی ایک اور خاص وجہ یہ ہے کہ مولانا نے اکثر غزلیات وجد اور مستی کی حالت میں لکھی ہین، اور اپنے احوال کو الفاظ کی صورت دیدی ہے، ایسی حالت مین اشعار

میں زبان اور بیان پر غور کرنے کا کوئی موقع محل بلکہ امکان ہی نہ تھا، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ جوش طبیعت اور محویت حال وخیال سے فرصت پانا ان کے لئے ممکن نہ تھا،

عیب مکن کہ غزل ابتر بماند نیست وفا خاطر پرندہ را،

اسلئے کثیر معنوی فضائل اور دیگر صوری محاسن کے مقابلہ میں یہ خفیف نقائص نظر انداز کر دینے چاہئیں، مولینا کی شاعری کے لئے کسی محفل مشاعرہ کی ضرورت نہیں، بلکہ انسان کی ضرورت ہے، کہ ان کا کلام تفریحی عناصر سے خالی ہے،

**عطار اور سنائی کا اثر،** مولینا اور ان کی شاعری پر حضرت عطارؒ اور حکیم سنائیؒ کے کلام کا اثر ہے، مولینا نے خود مثنوی اور دیوان میں اس کا تذکرہ کیا ہے جسے ہم اوپر داخلی شہادت کے سلسلے میں درج کر چکے ہیں، علاوہ اس کے اس موضوع کے متعلق مناقب العارفین میں مولینا کا ایک ارشاد درج ہے جس سے عطار اور سنائی کے کلام سے ان کے تاثر کا اندازہ ہوتا ہے،

"فرمود ہر کہ سخنان عطار را بجد خواند، اسرار سنائی را فہم کند و باعتقاد تمام مطالعہ نماید کلام مارا ادراک کند و برخوردار شود و برخورد[۱]"

اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ مولینا اور عطار وسنائی کے کلام میں ایک معنوی ربط ہے،

**مولینا کے کلام پر خود ان کی رائے** مولینا کی ضخیم مثنوی (جس میں تقریباً ساڑھے چھبیس ہزار اشعار ہیں،) اور ضخیم تر دیوان (جو تقریباً ۵۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے،) کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولینا شعر گوئی کی طرف بیحد مائل تھے، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، اس کے ثبوت میں ہم بعض اہم ترین شہادتیں درج کرتے ہیں، جس سے معلوم ہو جائے گا، کہ ان کے منشار اور سخن میں کیا ربط ہے، فیہ مافیہ کی عبارت ہے،

"آخر من تا این حد دل دارم کہ این یاران کہ نزدیک من می آیند، از بیم آنکہ ملول

---

[۱] مناقب العارفین ص ۲۰ ، مطبوعہ آگرہ،

ملول نہ شوند شعری گویم تا بداں مشغول شوند وگرنہ من کجا شعر از کجا؟ واللہ کہ من از شعر بیزارم و پیش من ازین بتر چیزے نیست ہمچنان ست کہ یکے دست در شکنبہ کردہ است و می شوید برائے آرزوے مہمان، چون اشتہاے مہمان بدانست مرا لازم شد آخر آدمی بنگرد کہ خلق را در فلان شہر چہ کالا می باید آن خرد و آن فروشد اگرچہ دون ترین متاعہا باشد۔ من تحصیلہا کردم در علوم و رنجہا بردم کہ نزد من فضلا و محققان و زیرکان آیند تا برائے ایشان چیزے غریب و نفیس و دقیق عرض کنم، حق تعالیٰ خود چنین خواست آن ہمہ علمہا را اینجا جمع کرد و آن سعیہا را اینجا آورد کہ من بایں کار مشغول شوم چہ توانم کرد در ولایت ما از شاعری ننگتر کارے نبود ما اگر در آن ولایت می ماندیم بموافق طبع ایشان می زیستیم آن می ورزیدیم کہ ایشان خواستندے مثل درس گفتن و تصانیف کتب و تذکیر و وعظ و عمل ظاہر ورزیدن[1]"

مناقب میں مولینا کا ایک اور بیان درج ہے،

"مردم این ملک از عالم عشق مالک الملک و ذوق درون قوی بے خبر بودند... چنان مشاہدہ کردیم کہ بہیچ نوع بطرف حق مائل نبودند و از اسرار الٰہی محروم می ماندند بطریق لطائف سماع و شعر موزون کہ طبائع مردم را موافق افتادہ است، آن معانی را در خورد ایشان دادیم چہ مردم روم اہل طرب و زہرہ بیان بودند، مثلاً طفلے رنجور شود و از شربت طبیب نفرت نماید و البتہ فقاع خواہد طبیب حاذق دارو چنان نماید کہ دارو را در کوزۂ فقاع کردہ بدو دہد، تا بوہم آن کہ فقاع ست شربت برغبت نوشیدہ، از خلل علل صافی گشتہ خلعت صحت در پوشیدہ، مزاج سقیم مستقیم کند[2]"

---

[1] مقدمہ فیہ ما فیہ ص ۳ [2] مناقب العارفین،

اپنے دیوان کی معنوی قدر وقیمت کے متعلق ان کا یہ خیال ہے،

آبِ حیات آمد سخن کاید ز علمِ من لدن ... جان را ازو خالی مکن تا بر دہد اقبالہا

خاموش شو کہ بے گفتنی وکس نشنود ... کز ایں دہل زچہ بام است ایں بیاز بانگہا

ع گہر مضم درین دیوان کہ تا تو رستی از دیوان

اپنے کلام کے صوری نقائص کا ان کو پورا علم واحساس تھا، اس کے متعلق بے لاگ رائے اور صحیح وجہ ان کے پاس تھی، ان میں سے ایک شعر اوپر ہم نے عیوبِ شعر کی بحث میں درج کیا ہو، یہاں اسکے علاوہ دوسرے اشعار درج کرتے ہیں،

تو ز لوحِ دل فرو خوان بتمامی این غزلہا ... منگر تو از زبانم کہ لب وزبان نماند

حضرت شمس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں،

شمس تبریز بجز عشق زمن ہیچ مجو ... زان کسے داد سخن جو کہ سخندان باشد

شیخ سعدیؒ کی قدرشناسی، | شیخ سعدی غزل کے بادشاہ ہیں، ان کے کلام میں شاعرانہ حسنِ خیال اور حسنِ بیان دونوں کی خوبیاں کماحقہ موجود ہیں، لیکن مولینا روم کی ذات عالی صفات اور انکے کلام کی معنوی قدر و قیمت کا انھیں بہت احساس تھا، چنانچہ ملک شمس الدین حاکم شیراز کی ایک درخواست پر انھوں نے مولانا کی ایک غزل بھیجی، اور اس کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں، اس سے ان کے دل میں مولینا کی عظمت اور ان کی شاعری کی قدرشناسی کا پورا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ مناقب میں ہو،

"اصحاب عظام روایت کردند کہ ملک شمس الدین ہندی کہ ملک ملک شیراز بود[1]، قعہ بخدمت اعذب الکلام الطف الانام شیخ سعدی علیہ الرحمہ والغفران اصدار کردہ استدعا نمودہ کہ غزلی غریب کہ محتوی بر معانی عجیب باشد از ہر یک کہ باشد بفرستی تا غذای جان خود سازم"

[1] والی یا حاکم تھا،

شیخ سعدی غزل نو از ان حضرت مولینا کہ دران ایام بشیراز بردہ بودند و خلق بکلی ربودہ آن شدہ، نوشت و ارسال کرد و آن غزل اینست،

ہر نفس آواز عشق میرسد از چپ و راست　　ما بفلک می رویم عزم تماشا کراست

در آخر رقعہ اعلام کرد کہ در اقلیم روم بادشاہے مبارک ظہور کردہ است و این از نفحات سر اوست کہ ازین بہتر سخنے نگفتہ اند و نخواہند گفتن و مرا ہوس آنست کہ بزیارت سلطان بدیار روم بیایم و روئے را برخاک پائے او مالم"

حضرت جامی کی رائے، | حضرت مولینا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے مشہور اشعار میں مولانا کے کلام کی معنوی قدر و قیمت کا اعتراف فرمایا ہے، اگرچہ اس میں خاص طور پر ذکر مثنوی کا ہے لیکن یہ دیوان پر بھی صادق آتا ہے،

من چہ گویم وصف آن عالیجناب　　نیست پیغمبر ولے دارد کتاب،

دولت شاہ اپنے مشہور تذکرہ میں مولینا کے کمال اوران کے کلام کے متعلق لکھتا ہے،

"در تحصیل علوم یقینی عالم ربانی و در مراتب توحید و تحقیق سالک صمدانی است و رموز و اشارات عالم غیب را بشیوۂ سخن گستری بیان کردہ و طریق عین الیقین را بواسطہ علم الیقین بعیان رسانیدہ"

موج چون براوج زد آن بحر زخار از شرف
لولوئی منظوم بر ساحل فگند از ہر طرف،

علامہ شبلی نعمانی کی رائے، | علامہ شبلی جو سخن فہمی میں خداداد ملکہ رکھتے تھے، مولانا کے کلام کے متعلق انکی رائے یہ ہے،

"مولانا کا فن شاعری نہ تھا، اس بنا پر ان کے کلام میں وہ روانی برجستگی نشست الفاظ،

حسن ترکیب نہیں پائی جاتی، جو اساتذہ شعرا کا خاص انداز ہے، اکثر جگہ غریب اور نامانوس الفاظ آجاتے ہیں، فکِ اضافت جو مذہب شعر میں کم از کم گناہ صغیرہ ہے، مولینا کے ہاں اس کثرت سے ہے، کہ طبیعت کو وحشت ہوتی ہے، تعقیدِ لفظی کی مثالیں بھی اکثر ملتی ہیں، تاہم سینکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ایسے بھی انکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، جن کی صفائی اور برجستگی اور روانی کا جواب نہیں"

**پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر نکلسن کی رائے**

پروفیسر براؤن آنجہانی جنھوں نے مدت العمر فارسی ادبیات کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور صاحب ذوق بھی تھے، مولینا کے دیوان کے سلسلہ میں ڈاکٹر نکلسن کی رائے سے اتفاق کیا ہے، جسے ہم آگے درج کریں گے،

ڈاکٹر نکلسن کو فارسی کے صوفیانہ ادب سے خاص دلچسپی ہے، خصوصاً مولینا روم کی تصانیف سو انکو بیحد لگاؤ ہے، مثنوی کے صحیح نسخہ کی ترتیب اور ترجمہ کے اہم فرائض بڑی خوش اسلوبی سے برابر انجام دے رہے ہیں، دیوان اور مثنوی کے فرق اور مشابہت پر ان کا یہ خیال ہے؛

"ہم نے دیکھا ہے کہ فلسفۂ تصوف مولینا کی آمد طبع کا سرچشمہ ہے، اس سرچشمہ سے مثنوی اور دیوان دو نہریں الگ الگ جاری ہوئی ہیں، ایک کی شان بے پایاں دریا کی طرح ہے، ساکت و عمیق نہایت زرخیز اور گوناگوں مرغزاروں سے گذرتی ہوئی اس سمندر میں جا گرتی ہے جس کی کوئی حد نہیں، دوسری نہر گویا ایک جوش مارتی ہوئی طوفان خیز موج ہے، جو ابھلتی کودتی ہوئی آبادی سے دور کہساروں میں جاکر جنکی لطافت عالم بالاسے چشمک زنی کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے"،

(دیوان شمس تبریز مقدمہ از ڈاکٹر نکلسن)

مثنوی میں اخلاقی عنصر زیادہ ہے، دیوان میں صوفیانہ خیالات کے اظہار میں دلی کا حال

کا نقطۂ نظر یا نصب العین پیش نظر ہے،

(مکتوب ڈاکٹر نکلسن بنام جناب ڈاکٹر نظام الدین صاحب صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ)

علامہ اقبال کی رائے، اس عہد کے مشہور اور معروف فلسفیون اور شعراء میں ڈاکٹر اقبال مولینا روم کے قدرشناس ہیں، یہ واقعہ ہے کہ ان کی طبیعت اور ذوق کو مولینا سے بیحد مناسبت ہے، انہی کا قول ہے،

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

ان کے پیام اور کلام میں رومی کا اثر نمایان ہے اپنے تازہ ترین شاہکار جاوید نامہ میں ڈاکٹر اقبال نے عالم معنی کی سیر و سیاحت میں مولینا ہی کو راہنما بنایا ہے، اور اپنی تصانیف میں انھوں نے مولینا کے مسلک اور شاعری کے متعلق مختلف پیرایوں میں اظہار رائے کیا ہے، ہم ان اشعار کو یہان نقل کرتے ہین، تاکہ مولینا کی شاعری کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوجائے،

مولینا کے کلام کی معنوی قدر و قیمت کے متعلق انکی رائے یہ ہے،

مرشدِ رومی حکیم پاک زاد — سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد

معنی از حرفِ او ہمی روید — صفتِ لالہ ہائے نعمانی،

نکتہ دانِ المنی را در ارم — ہیچ تے افتاد با پیر عجم

شاعرے کو ہمچو آن عالی جناب — نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

بوعلی اندر غبار ناقہ ماند، — دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

رازِ معنی مرشدِ رومی کشود — فکر من بر آستانش در سجود

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است — ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

باز برخوانم ز فیض پیر روم دفتر سربستۂ اسرار علوم،

جان او از شعلہ ہا سرمایہ دار من فروغ یک نفس مثل شرار

پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

موجم و در بحر او منزل کنم تا دُر تابندۂ حاصل کنم

من کہ مستیہا ز صہبایش کنم

زندگانی از نفسہایش کنم

خود خودی نمود پیر حق سرشت کو بحرف پہلوی قرآن نوشت

مولینا کے کلام کے حیات آفرین اثر کے متعلق ان کا بیان یہ ہے،

مطرب غزلے بیتے از مرشد رومم آور تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے

بیا کہ من ز خم پیر روم آوردم مئے سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی است

شرارے جستہ گیر از درونم کہ من مانند رومی گرم خونم

شعلہ در گیر و زد بر خس و خاشاک من مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریاست

جاوید نامہ ان کی جدید ترین تصنیف ہے، عوالم علویہ کی سیر میں مولینا روم کو انھوں نے اپنا راہنما قرار دیا ہے، اس کتاب میں مختلف جگہ پر حضرت رومی کی شخصیت اور ان کے پیام کے مختلف پہلوؤں پر نظر غائر ڈالی ہے،

روح رومی پردہ ہا را بر درید، از پس کُہ پارۂ آمد پدید،

برلب او سرّ پنہان وجود، بندہائے حرف و صوت از خود کشود،

حرف او آئینۂ آویختہ علم با سوز درون آمیختہ

اجمالی ریویو، الحاصل مولینا کی شاعری متعدد خصوصیات خصوصًا معنوی قدر و قیمت کے نقطۂ نظر سے خاص حیثیت

رکھتی ہے، مولینا نے اپنی قوتِ فکر و شعر، زبان کاری کو سودمندی اور مذموم کو محمود بنانے میں نہیں صرف کی،

انکی شاعری کا مقصد بت پرستی یا بت گری نہیں، ان کا یہ منشا نہیں کہ لوگوں پر افسردگی اور خستگی طاری ہو، اور حسن صداقت سے انکا ربط ٹوٹ جائے، لوگ غلط اندیشہ و فکر میں مبتلا ہو کر ذوق عمل سے محروم ہو جائیں، ان کے کلام سے غفلت میں اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ روحانی جمود دور ہوتا ہے، ان کی فریاد و نالہ سے عشق مجبور، رسوا نہیں ہوتا، بلکہ عشقِ غیور کو سرخروئی حاصل ہوتی ہے، ان کے کلام کے مطالعہ سے یقین محکم اور عمل پیہم کا ذوق پیدا ہوتا ہے، ان کی شاعری افراد اور اقوام کی تعمیر خودی میں مدد و معاون ہے، ڈاکٹر اقبال نے اسرار خودی میں فکر و شعر کا جو معیار پیش کیا ہے اس پر مولینا کی شاعری پوری اترتی ہے،

ہر شاعر کا کلام رطب و یابس کا مجموعہ ہوتا ہے، بقول ہیزلٹ (Hazzlitt) کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے کلام کے بہترین حصہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جائے، اس نقطۂ نظر سے مولینا دنیا کے مشہور ترین شعراء کی صفِ اول میں ہیں، انکے فکر و شعر کی عظمت زمان و مکان کی قیود سے بلند تر ہے، انکی شاعری پر یہ قول صادق آتا ہے،

اہلِ دل را سینۂ سینا دہد

با ہنرمندان یدِ بیضا دہد

---

# مولانا کا مسلک تصوّف یا فلسفۂ حیات

(دیوان کی روشنی میں)

لا الٰہ لے جان رہ الا اللہ است

ما ہمہ از لا تا بہ الا میسرویم

مسلکِ تصوف[1] اس کی بنیاد اور حقیقت کے متعلق مختلف طبقات میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں امتدادِ زمانہ سے پیدا ہوگئیں، مستند اصحابِ طریقت اور اربابِ معرفت اس امر پر متفق ہیں، کہ تصوف اس سے زیادہ کچھ اور نہیں، کہ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کیا جائے یعنی آپ کو ظاہر و باطن میں آیۂ کریمہ اخلصوا دینھم للہ کا مصداق بنایا جائے، خدا کی محبت میں محبوبِ خدا کی اتباع کیجائے تاکہ بارگاہِ ربانی میں محبوب اور مقبول بندوں میں شمار ہو قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ قربانی اور نماز، زندگی اور موت خدا ہی کے لئے ہو، از آدم تا بہ خاتم الانبیا سارے انبیاؑ کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے (قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین،) مخلص تبعین اسی راہ پر چلتے رہے، اور چلتے ہیں، ہاں ایسا ہوا ہے کہ زمانہ کے اقتضا، اور ماحول کی ضرورت کے باعث تعلیمات اور اصول مختلف پیرائے میں پیش کئے گئے، مثلاً جب مسلمانوں میں فلسفہ کا زور ہوا، اور اس مذاق نے اہلِ علم وفن کو گرویدہ کر لیا، تو حضرت شیخ اکبرؒ نے عقائد و اعمال کو فلسفیانہ تفکر کے انداز میں پیش کیا

---

[1] نفس تصوّف کی حقیقت اور اس کا تاریخی انقلاب میرا اصل موضوع بحث نہیں، نہ یہ میری علمی تحقیق کے حدود میں ہے، میرا اصل موضوع بحث مولانا کے مسلک کے اصول ہیں، یہاں میں نے تمہیداً سرسری طور پر چند خیالات کا اظہار کیا ہے،

اور مختلف اصحاب نے اکی پیروی کی فصوص الحکم سے حجۃ اللہ البالغہ تک اسی کی مختلف صورتیں ہیں، اور جب شاعری کا ذوق عام ہوا، تو بعض اہلِ عرفان نے پیغام حقیقت پہنچانے کے لئے شاعری کو اپنا ذریعہ بنایا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے مختلف پیچیدگیاں ضرور پیدا ہوئیں، لیکن حقیقت کبھی تبدیل نہیں ہوئی، حقائق اور معارف اصول اور عقائد میں تبدیلی نہیں ہوئی، سنائی سے جامی تک یہی رنگ ہے شیخ سعدی نے باوجود اسکے کہ عشق حقیقی کا بیان پیرایۂ مجاز میں کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا، توان رفت جز در پے مصطفیٰ

جب مسلمانوں میں زوال کے آثار غالب ہوئے، تو بقول مولٰنا عبد الماجد ان کے دل و دماغ پر ایرانی تخیلات، یونانی توہمات اور ہندی مراسم کا اثر ہوا انھوں نے ان چیزوں کو اپنے علم و عمل کا جزو لازم بنا لیا، غلط خیالات اور غلط کاری عام ہوئی، کثرت سے لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوئے، ایمان گرفتار رسوم ہوگیا، شیوہ ہاے کافری کو وسعت مشرب سے تعبیر کیا گیا، قوالی اور پشمینہ پوشی اہلِ کمال کے لوازم قرار دئے گئے،

قوم ما از ستراین مسموم گشت خفت و از ذوق عمل محروم گشت،

ابتدا میں امام غزالی اور آخر میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے تجدید و اصلاح کا صور بڑے زور سے پھونکا، قلب سلیم رکھنے والے تو چونک گئے، لیکن غلط فہمی اور غفلت کا بالکلیہ ازالہ نہ ہوا، اس دور میں مستشرقین نے غلط فہمیوں میں اور اضافہ کیا، ایک تو وہ خود ان حقائق سے کماحقہ واقف نہ تھے دوسرے ہماری غلط نگاری اور غلط کاری نے انھیں بھی دھوکہ میں ڈالدیا، بعض نے بہت کچھ جاننے پہچاننے، پڑھنے لکھنے کے بعد بھی غلط بیانی کی، انھوں نے کہا کہ دین اسلام تمامتر تقشف اور خوف کا مذہب ہے، تصوف سے جو مسلک محبت مراد ہے، اسکے عناصر دین اسلام میں نہیں ہیں، یہ عناصر اسلام میں عیسائیت سے داخل ہوئے ہیں، اسلام کا خدا توریت کا جبار و قہار خداوند تو ہوسکتا ہے لیکن

انجیل کا مہربان باپ وہ کبھی نہیں یہی وہ مقام ہے، جہاں مستشرقین کے کمال علم اور تعصب کی حقیقت کھلتی ہے، تعصب نے انکی چشم بصیرت کو اندھا کر دیا ہے، غالباً وہ قرآن اور حدیث کو غلط بیانی کی نیت سے پڑھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انھیں کوئی خاص حجاب اصل حقیقت پر نظر ڈالنے سے مانع ہوتا ہے، اور کتاب و سنت کے غالب حصہ کی تعلیمات پر انکی نظر ہی نہیں پڑتی، قرآن میں انھیں اسمار الٰہیہ میں سے قہار، منتقم وغیرہ اسما، جلالیہ تو نظر آتے ہیں لیکن رؤف، رحیم ودود اور غفور وغیرہ جیسے اسمار جمالیہ اور ان اعتبارات کی آیات نظر ہی نہیں آتیں، انکو قرآن میں یہ کہیں نہیں دکھائی دیتا کہ خدا سے شدت محبت ہی کا نام ایمان ہے۔ الذین آمنوا اشد حبا للہ۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دین اسلام اتباع رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نام ہے، یہاں خدا کی محبت ہی شرط اتباع ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بندہ محبوب خدا ہوتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ، اس کے علاوہ قرآن مجید میں محبت کے یہ اعتبارات بے شمار مواقع پر بیان کئے گئے ہیں، کہیں ان اللہ یحب المحسنین ہے کہیں ان اللہ یحب الصابرین ہے، اسکے مقابل ان اللہ لا یحب الظالمین، وغیرہ بھی ہے، اسلام میں اعمال خیر کی بنیاد بھی خدا کی محبت ہی ہے، یطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما و اسیرا، اکثر جدید تعلیم یافتہ حضرات پر جو نہ اپنے دین کے اسرار سے واقف ہیں، نہ غیروں کے دجل و مکر سے مستشرقین کا یہ جادو چل گیا ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کو فی الحقیقت اسلام سے کوئی تعلق نہیں، نہ معلوم تصوف سے ان کی کیا مراد ہوتی ہے، ورنہ انکی لئے اصل تصوف ہی اسلام کی خالص اور پاکیزہ ترین تعبیر ہے۔

غلط فہمیوں کے ان ظلمات سے نکلنے اور صداقت سے مستفید ہونیکا واحد طریقہ یہی ہے کہ کتاب و سنت کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ اسکے بعد سارے اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابو نصر سراج، شیخ علی بن عثمان ہجویری، حضرت ابو القاسم قشیری، خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی وغیرہ خصوصاً بانیان سلاسل صوفیا مثلاً محبوب ربانی حضرت شیخ جیلانی بانی سلسلۂ عالیہ قادریہ، حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی بانی سلسلۂ عالیہ چشتیہ، حضرت شیخ شہاب الدین

بانی سلسلۂ عالیہ سہروردیہ اور شیخ بہاء الدین نقشبند کے تصانیف ملفوظات اور تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے جس سے صاف معلوم ہو جائے گا، کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے، اصل تصوف کسے کہتے ہیں، مرد صوفی کون ہے، راہ صفا کے کیا شرائط ہیں، سب سے بڑھکر یہ کہ تصوف اور کتاب وسنت میں کیا ربط ہے،

صوفیائے کرام اور اکابر اہل عرفان میں عارف رومی کو خاص اہمیت ہے انکا قول اس بارے میں مستند اور انکا بیان حجت ہے، اگر کوئی اس کا کامل اندازہ کرنا چاہے، کہ مولانا کے نزدیک تصوف کسے کہتے ہیں، اور صوفی کون ہے، اور مولنیا کا مسلک کیا ہے، تو مثنوی معنوی اور فیہ ما فیہ یعنی حضرت کے ملفوظات کا مطالعہ کرے، حقیقت حال سے کاملاً باخبر ہو جائے گا،

لیکن ان کی تصانیف میں ایک دیوان بھی ہے، بقول مولنیا عبد الماجد دریابادی ہر چند دیوان کسی ایک وقت کی مسلسل تصنیف نہیں، سالہا سال کی متفرق غزلوں کا مجموعہ ہے، اس سے کسی ایک متعین مسلک کا استنباط ممکن نہیں، کوئی غزل کسی حال کی شارح ہے اور کوئی کسی کیف کی، کیونکہ دیوان دور تلوین کی تصنیف ہے، دور تمکین کی نہیں، غزلیات مولنیا نے اسوقت لکھے ہیں، جبکہ وہ صاحب حال تھے، صاحب مقام نہیں، دیوان میں زیادہ تر صوفیانہ جذبات اور متفرق احوال کی ترجمانی ہے تعلیم وارشاد اصول اور معارف مثنوی میں توضیح اور تصریح کیساتھ ہیں یہ تصنیف دور تمکین کی ہے، یہ مولنیا نے اسوقت لکھی ہے جب وہ صاحب مقام ہو گئے اور سالک نہیں بلکہ راہبر ٹھہرے اور تبلیغ وہدایت پر مامور ہوئے،

لیکن پھر بھی دیوان اسی گلشن کا ایک پھول ہے، اور اسی بہار کا رنگ ہے اس لئے اختلاف حال کے باوجود ان میں وحدت کا ایک رشتہ ضرور ہے چنانچہ انکے مسلک پر اجمالاً دیوان سے بھی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی اور ملفوظات سے اسکا اصولی اور معنوی اتحاد ہے، اسلئے یہ بیان مختصر ہوگا، صفحات آیندہ میں ہمارا موضوع تحریر یہی ہے، اختصار کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ بعض مسائل جنکا مولنیا کے مسلک اور فلسفۂ حیات سے گہرا تعلق ہے، باب سوم کے مہمات مضامین کے تحت زیر بحث آچکے ہیں، ذیل میں انکو ہم اشارۃً اور کنایۃً بیان کریں گے،

(باقی)

# کلام لطف

## یعنی استاذ العلما مولنا مفتی محمد لطف اللہ صاحب کا کلام

از

جناب مولوی محمد بدر الدین صاحب علوی استاذ ادبیات عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈہ

استاذ العلما، کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ معارف اپریل ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی کے قلم سے نکلا تھا جو بعد میں بصورت رسالہ علیحدہ بھی شائع ہوا، مولینا ممدوح مستحق تشکر ہیں، کہ انھوں نے اس مقالہ کے ذریعہ سے ایک بڑی علمی خدمت انجام دی، فجزاھم اللہ تعالیٰ خیرا،

استاذ العلما، کی سوانحعمری نہایت بسیط مضمون ہے، جسپر بڑی ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے، اس کتاب کا ہر باب اخلاف کے لئے نیفس۔ سان اور قابلِ تقلید ہوگا، اس وقت اس کا صرف ایک باب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، جو ان کی شاعری سے متعلق ہے، اگر خدا کو منظور ہے، تو ان کے مخصوص علمی کارناموں کا باب بھی عنقریب پیش خدمت کیا جائے گا،

تمہید | اصل مضمون پر قلم اٹھانے سے قبل اپنے شفیق استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی محبت میں سرشار ہو کر بعض جذبات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ

لابدّ للمصدور من أن ینفثا

حضرت کے انتقال کو بیس سال ہوگئے، جو واقعات کے بھول جانے کے لئے کافی مدت ہے، مگر اسوقت

تک ان کی تقریریں اور کلمات کانوں میں گونج رہے ہیں، اور صورت مبارک نظروں کے سامنے ہے۔

میرا زمانۂ تعلیم وہ تھا کہ جب حضرت نابینا اور معذور ہو کر درس باضابطہ بند فرما چکے تھے، میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ ایسے وقت میں مجھ کو نعمتِ غیر مترقبہ حاصل ہوئی، اور شرفِ تلمذ سے بہرہ ور ہوا، مجھے اکثر فرمایا کرتے تھے، پڑھانا تو میری غذائے روح تھا۔

اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم جو فارسی اور تجوید کے استاذ تھے، باضابطہ درس کے زمانہ سے برابر پڑھتے چلے آتے تھے، ان کے درس کا سلسلہ حالتِ معذوری میں بھی جاری تھا اور وہ اپنی پیرانہ سالی میں بھی شوق کی وجہ سے طالب علم بنے ہوئے تھے، ان کے دو سبق اس شان سے ہوتے تھے کہ منگل اور جمعہ کو بھی تعطیل نہ ہوتی تھی،

میرے حاضر خدمت ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ مجھ کو مولوی اخلاق احمد صاحب مرحوم مسوانی پڑھایا کرتے تھے، جب وہ علی گڈھ چھوڑ کر وطن جانے لگے، تو میرے اسباق کا انتظام زیر غور ہوا، بالآخر ان کی ... ہوئی کہ میرے والد ماجد استاذ العلما کی خدمت میں حاضر ہو کر التماس کریں، کہ ایک سبق مجھکو حضرت پڑھا دیا کریں، والد مرحوم مولوی حافظ محمد عبد الرحیم صاحب وکیل علی گڈھ خود فارغ التحصیل عالم اور اپنے زمانہ کے مشاہیر اساتذہ مولینا فاروق صاحب چریاکوٹی، مولینا ہدایت اللہ خانصاحب رامپوری، مفتی یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولانا معین الدین صاحب کڑوی کے شاگرد تھے، فرماتے تھے، میری طالبعلمی کے زمانہ میں استاذ العلماء کا علم شہرت لہرا رہا تھا، اور ان کے کمالات کے چرچوں نے غائبانہ عقیدت ان کے ساتھ میرے دل میں قائم کر دی تھی، علی گڈھ آنے کے بعد یہ عقیدت نمایاں ہو گئی، اور والد مرحوم استاذ العلما کی خدمت میں شاگردوں کی طرح حاضر ہونا اپنی سعادت سمجھتے رہے، مولوی اخلاق احمد صاحب کی تجویز سنکر فرمایا کہ ایسی معذوری کی حالت میں مجکو التماس کرنیکی ہمت نہیں ہوتی ڈرتے ڈرتے مولوی صاحب مرحوم نے خود مجکو ساتھ لیجا کر التماس پیش کی، جو بہت کشادہ پیشانی کے ساتھ منظور ہوئی، اور حضرت نے مجھکو اپنی علمی آغوش

میں نے لیا، یہ سعادت خود ہی کیا کم تھی، اس پر سے یہ سند قبول بھی عطا ہوئی، کہ حضرت نے میرے بارہ میں یہ کلمات فرمائے ۔۔

میاں مولوی بدر الدین جب پڑھنے آجاتے ہیں، تو میں اپنی تکلیفیں بھول جاتا ہوں ورنہ ایک انکو پڑھاتا رہتا ہوں ہائے ہائے سے نجات ملتی ہے۔ (ملاحظہ ہو رسالہ استاذ العلماء صفحہ)

یہ کلمات میرے لئے جسقدر بھی مایۂ ناز ہوں، بجا ہے، خوشا نصیب و زہے قسمت کہ مجھ حقیر ادنا چیز کے سبق کو حضرت نے اپنی تکلیفوں کے بھول جانے کا باعث اور ہائے ہائے سے نجات دینے کا سبب تصور فرمایا، فالحمد للہ علی ذالک۔ یہ سلسلہ سعادت سات برس تک جاری رہا، شروع سے آخر تک جو شفقت مجھ پر فرماتے رہے، اس کا اظہار غیر ممکن ہے، اگر کسی وقت مجھ کو حاضر ہونے میں ذرا دیر ہو جاتی، تو فوراً خادم میرے دروازہ پر ہوتا، کہ میاں خیریت پوچھتے ہیں، اکثر اعزہ اور شاگردوں کے نام مجھ سے خطوط لکھواتے اور فرماتے کہ ہمارے حضرت مفتی (عنایت احمد) صاحب مجھسے خطوط لکھوایا کرتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے، کہ تم تو ہمارے نور چشم ہو۔

استاذ العلماء کی شاعری اور نقد سخن۔ حضرت کے والد مولوی اسد اللہ صاحب اچھے شاعر تھے مضطر تخلص تھا، اخیر میں ضیق النفس کا عارضہ ہو گیا تھا لیکن دورہ کی شدید تکلیف میں بھی اشعار موزوں کیا کرتے، ان کے اشعار کبھی کبھی حضرت مجکو سنایا کرتے تھے، ایک واقعہ خود حضرت کا بیان فرمایا ہوا یاد آگیا، مولوی صاحب نے ایک غزل لکھی تھی، جسکے صرف تین شعر محفوظ رہ گئے ہیں،۔

لے اڑی طرز فغاں بلبل نالاں ہم سے ۔۔۔ گل نے سیکھی روش چاک گریباں ہم سے

لاکھ روکا نہ رکا دیدۂ گریاں ہم سے ۔۔۔ تو ہوا چاہتا ہے نوح کا طوفاں ہم سے

پاؤں پھیلائے تو ہی رہنا یہاں اے بلبل ۔۔۔ چھوٹتا ہے کوئی دم میں یہ گلستاں ہم سے

یہ غزل کسی نے مرزا غالب کو سنائی، بہت پسند آئی، پوچھا کس کی ہے سنانے والے نے کہا کہ کول

میں ایک مولوی اسد اللہ ہیں، مرزا نے کہا کیوں نہ ہو یہ نام کا کمال ہے (مرزا کا نام بھی اسد اللہ تھا)

استاذ العلماء کی شاعری میرے نزدیک میراث پدری تھی، اوائل عمر ہی میں شعر گوئی کا ذوق ہوا ہوگا لیکن خدا نے ان کو پیدا تو دوسرے کام کے لئے کیا تھا، اس نے دولت علم سے مالامال ہوکر دریائے فیض جاری کیا، اور اخیر تک اسی کے اجراء میں مصروف رہے، ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ حضرت کی شاعری کوئی باضابطہ شاعری نہ تھی، اگر کسی وقت طبیعت شگفتہ ہوئی، تو کچھ اشعار موزوں ہوگئے تاریخیں کبھی خود نظم فرمائیں کبھی کسی کی درخواست پر، کسی وقت دل چاہا، تو کسی شاگرد کو منظوم خط لکھدیا، یہ کیفیت مدت کی ہے، جب درس میں انہماک تھا، اس سے قبل یعنی اوائل عمر کا یا محض فارسی کی تکمیل کے بعد کا کلام بھی ہے،

کلام زیادہ تر فارسی ہے، کچھ اردو میں بھی ہے، عربی میں بجز ایک تاریخ کے کوئی اور چیز نہیں ملی، غالباً اسکی وجہ یہ ہوگی، کہ فارسی تعلیم کے بعد ذوق کا میلان فارسی میں راسخ ہوگیا، اور پھر رخ بدلا فارسی اور اردو دونوں میں کہیں ذرہ اور کہیں لطف تخلص فرماتے تھے،

شعر گوئی کے مذاق کے ساتھ حضرت بڑے نقاد سخن تھے، اور شاعری کا پورا ذوق تھا، مولینا شروانی نے بالکل صحیح لکھا ہے، (میں نے اپنے زمانہ میں بھی یہی مشاہدہ کیا)

"خاص صحبتوں میں اشعار کا ذکر چھڑ جاتا تو گھنٹوں جاری رہتا، اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اردو ادب سے یکساں ذوق تھا" (رسالہ استاذ العلماء ص ۱۹)

ایسے نقاد سخن کے کلام میں جتنی خصوصیات اور خوبیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب حضرت کے کلام میں موجود ہیں، جو فصاحت و بلاغت سلاست و روانی اور بے تکلفی و آمد، وہ ناظرین کو آئندہ نمونوں سے خود معلوم ہو جائے گی، سارے کلام میں استادانہ انداز نمایاں ہے،

# فارسی کلام

اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق حضرت مرحوم کا اصل ذوق سخن فارسی میں تھا، آپ نے فارسی کے بیشتر اصناف سخن پر طبع آزمائی فرمائی ہے اور ہر صنف کے نمونے آپ کے کلام میں موجود ہیں، جو بلا تامل اہل زبان کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں۔ ہر صنف کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں

مناجات باری تعالی،

| | |
|---|---|
| بجناب تو خداوندِ دو عالم نالم | زان کہ جز تو نرسد ہیچ بداد حالم |
| بر منِ زار ببخشای کہ از جور سپہر | سخت شوریدہ سر و طرفہ کسیر البالم |
| گر این چرخِ جفا پیشہ بےجہت زیافت | از پےِ مشقِ ستم جز تنِ من در عالم |
| رحم کن رحم خداوند کہ از غایتِ غم | می رود از کفِ من دامنِ استقلالم |
| بطفیلِ شہِ کونین رسولِ عربی | آنکہ باشد بغدایش دل و جان و مالم |
| آنکہ وصفش شدہ بیرون ز حد و وہم و قیاس | زانکہ در مدحتِ او الکن و گنگ و لالم |
| وارہانم زغم و غصہ چنانم کہ بقہر | چہ رسد حالت زغم و گوشِ عدو را مالم |

نعت رسول صلعم،

| | |
|---|---|
| حبیبے راکہ احمد نام کردند، | شرابِ عشقِ او در جام کردند |
| کسے کو گشت زاں صہبا سیہ مست | مقامش برتر از اوہام کردند، |
| زگیسوہاے عنبر بوئے جانان | براے صیدِ دلہا دام کردند |
| سوادِ جانفزو زلیلۃ القدر | زچشمِ سرمہ سائش وام کردند |
| زجود حق مشو اے تحفہ نومید | کہ نامش مفضل و منعام کردند، |

رنگ تغزل:-

اے صبا راست بگو آن بت گلفام کجاست — آن پری چہرہ کہ سلمی بودش نام کجاست
آن چنان رفتہ ام از خویش بعشق آن ماہ — کہ نہ دانم کہ سحر ہست کجا شام کجاست
من بیاد رخ او سوختم و حیف کہ گاہ — او نہ پرسید کہ آن عاشق ناکام کجاست
وقف صد رنج و غمستم تا بوجود آمدہ ام — من نہ دانم چہ طرب باشد و آرام کجاست
ساقیا از مئے عشق صنم مدہوشیم — ما چہ دانیم کہ مینا ست کجا جام کجاست

ذرّہ از سادگی خویش درافتاد بہ بند
این نہ دانست کہ صیاد کجا دام کجاست

من عاشق روئے توام شیدائے گیسوئے توام — افتادہ در کوئے توام بنگر بسویم از کرم
دلدادہ و دیوانہ ام حسن ترا پروانہ ام — از خویشتم بیگانہ ام رحمی بحالم اے صنم
اے جان من جانان من اے نازنین نازک بدن — اے دلبر سیمیں ذقن از دوریت جان بر لبم
درعشق تو اے مہ لقا ہستم گرفتار بلا — رفت است خواب از دیدہ ہا ہمسایہ ہا از یاربم
اے من بلاگردان تو جان و دلم قربان تو — تا چند از ہجران تو باشم اسیر رنج و غم

جان در ہوایت باختم دل صید نازت ساختم
ہم شمع سان بگداختم از آتش حسنت صنم

بیا جانان بیا اے آنکہ جان من فدائے تو — بحال زار من بنگر کہ چونم در ہوائے تو
چہ خوش باشد اگر باشی تو اے جانان برائے من — زہے قسمت اگر من اے صنم باشم برائے تو
بگوشم این صدا می آید از ہمسایگان ہر دم — کہ اے ذرّہ بجان رستیم ما از ہائے ہائے تو
سرت گردم دمے شادم ز وصلت کن کہ من ہستم — اسیر دام زلفت بسمل تیغ ادائے تو؛

کہاں جاؤں کہوں کس سے جو کچھ دل پر گذرتا ہے  مگر پیش تو نالم اے صنم از جور ہاے تو

مضیٰ عمری و بعضی ما بقی فی فرقۃ سلمی

رضینا بالقضا یارب اگر ہست این رضاے تو

عالمے بہ تماشاے تو گرد آمدہ است  وہ چہ روے عجب قابل دیدن داری

ہیچگاہے نتوانی کہ روی از دل من  اے کہ از دیدۂ من قصد رمیدن داری

نغمۂ بے سر و سامانی خود شرح دہم  بحضور تو اگر تاب شنیدن داری

اے صبا گر گذری سوے صنم فاش بگو

عاشقے بر سر رہ گرم تپیدن داری

قطعات و رباعیات:-

اے گوہر درج خوبروئی زود آ  وے شمع شبستان نکوئی زود آ

جانم ز فراق تو رسیدست بلب  اے آنکہ مرا تو آرزوئی زود آ

---

بگوے دوست برد اضطراب دل ما را  کہ تا ز دور ببینم جمال سلمی را

نبتش بمن و باز دوریش عجب ست  نہ کرد ہیچ کسے حل مرایں معما را

---

ایں خانۂ دل کہ خانۂ بس عالی ست  اے عشق بیا کہ از برایت خالی ست

آب از چشم و کباب از سینہ بجوے  وز آہ ہوا کہ مثمر خوش حالی ست

---

من شیفتہ روے نکویت ہستم  دلدادۂ زلف مشکبویت ہستم

ہر چند بظاہر از تو دوری دارم  اما بخیال روبرویت ہستم

قطعات تاریخ:-

تاریخ تولد دختر محمد ابراہیم خان رامپوری،

خدا بخشید ابراہیم خان را — نکو دختر بوقت نیک مسعود،

سروشے ازپئے سال ولادت — نکو بخت و نکو طالع بفیروز، ۱۲۷۰

تاریخ ولادت عبد الرشید خان پسر نواب[1] عبد العزیز خان بریلوی،

حق بعبد العزیز خان بخشید، — پسر نیک صورت وسیرت،

ہاتفے گفت ازپئے تاریخ، — مہر اوج سعادت وعشرت، ۱۲۰۳

مفتی عنایت احمد صاحبؒ جب جزیرہ شور سے رہائی پاکر واپس آئے تو استاذ العلماء ان سے ملنے کاکوری تشریف لے گئے، اور وہاں یہ تاریخ پیش خدمت کی،

چون بفضل خالق ارض وسمار — اوستادم شد ز قید غم رہا،

بہر تاریخ خلاص آنجناب — بر نوشتم اتَّ استاذی بجا ۱۲۷۷

تاریخ وفات حافظ[2] عبد الرشید کولوی،

رفت عبد الرشید ازین عالم، — باد از حق ورا ہمیشہ خلد،

ہاتفے گفت سال رحلت او، — جائے عبد الرشید باد اخلد، ۱۲۷۷

تاریخ وفات حکیم احمد بخش بلگنوری،

---

[1] نواب عبد العزیز خان والی روہیلکھنڈ نواب حافظ الملک کے پوتے تھے، مفتی عنایت احمد صاحب کے قیام بریلی کے زمانہ میں ان کی شاگردی میں داخل ہوئے، استاذ العلماء سے اوسی زمانہ میں ملاقات اور دوستی ہوئی، نواب عبد العزیز خاں اردو کے شاعر بھی تھے، ان کا دیوان عزیزی طبع ہوچکا ہے، عبد الرشید خان نے (جن کی یہ تاریخ ولادت ہے) ۱۳۲۲ھ میں انتقال کیا، ملاحظہ ہو حیات حافظ رحمت خاں مطبوعہ بدایون صفحہ ۲۲۵،

[2] حافظ عبد الرشید کا کولوی سے کیا تعلق تھا، اسکا کچھ پتہ نہیں چلا،

چون حکیم حاذق احمد بخش نام | رخت بست زین جہان تنگنائے،
بہر تاریخ وفاتش ہاتفے | گفت وا ویلا دریغا ہائے ہائے
۱۳۰۱ء

مراثی:-

مرثیہ حکیم اکرام اللہ صاحب،

اے عم مکرمم کجائی، | پنہان ز نگاہ من چرائی،
آن صورت انور تو اے عم | یکدم نرود زچشم پرنم،
اے عم زغمت تو زار و نالم | بنگر کہ کجا رسید حالم
اے وائے زما چہان بریدی | در دہرہ تو خوابگہ گزیدی
از کلکتہ تا بدہرہ دون آہ، | صد مرحلہ ہست درمیان راہ
چون بہر زیارت تو آیم، | چون گام بسوے تو کشایم

ارضاک اللہ بالنعیم

والفضل الدائم الجسیم

## اردو کلام

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، آپ کا اصل میدان فارسی تھا، لیکن کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر اردو میں بھی فکر فرماتے تھے، اسی لئے اردو کا کلام مختصر ہے، تاہم جس قدر ہے، وہ لطف سے خالی نہیں، نمونے ملاحظہ ہون،

نعت رسول صلعم:-

ہو تیرا بھلا ساقی اک جام ہمیں بھر دے | یہ تجھ ہی سے ہو دیگا ہر کار سے دہر مرے

[1] حکیم صاحب موصوف استاذ العلماء کے حقیقی چچا تھے، دہرہ دون میں کسی انگریز کے ملازم تھے، وہین ۱۱ر جولائی ۱۸۸۸ء کو انتقال کیا۔

ہو دور پریشانی جاتی رہے حیرانی میری بھی طرف گر وہ رحمت کی نظر کردے

وہ سب سے بہادر ہے، جو شوقِ شہادت میں سر اپنا تہِ تیغِ ابروے بتاں دھر دے

کون اس سے عیاں تر ہے ہر جا وہی ظاہر ہے سب حال یہ کھل جائے اٹھ جائیں اگر پردے

یا ختمِ رسل رحمے کز جورِ فلک دارم ہم دیدہ پر از اشکے ہم سینہ پر از دردے

فرقت میں مدینہ کی اے لطف تڑپتا ہوں اک آن میں اڑ جاؤں خالق جو مجھے پر دے

رنگِ تغزل :-

کبھی ہم پر وہ مہرباں نہ ہوا کبھی دل اپنا شادماں نہ ہوا،

کس نے مجھ سے بدگماں ہو تم میں کبھی تم سے بدگماں نہ ہوا،

اندر اندر ہی سینہ کے دلِ زار جل گیا پر کبھی دھواں نہ ہوا،

عاشقی میں ہوا ہوں افسانہ ذکر میرا کہاں کہاں نہ ہوا،

فکر کیا کیا نہ کی چھپانے کی حالِ دل کا مگر نہاں نہ ہوا،

دیکھتا میری بے قراری کو آہ اس وقت وہ یہاں نہ ہوا،

یہی حسرت ہے مجکو اے ذرّہ کہ میرے گھر وہ میہماں نہ ہوا،

---

غمِ عشقِ بتاں ہے اور میں ہوں دلِ ناشادماں ہے اور میں ہوں

نہیں تھمتے شبِ فرقت میں آنسو یہ دریا سے رواں ہے اور میں ہوں

شبِ تارِ فراق و دل ربا میں، قلق ہے اور فغاں ہے اور میں ہوں

کہاں قسمت کہ پہونچوں اسکے در تک فراقِ جانِ جاں ہے اور میں ہوں

فلک سے کب توقع ہے وفا کی جفاے آسماں ہے اور میں ہوں

کوئی قصہ نہیں مجکو خوش آتا صنم کی داستاں ہے اور میں ہوں

چو دیدم آن چشم سرمہ گینش روان شدہ سیل خون ز دیدہ
سجن کی انکھوں نے مجکو مارا دہائی ساری خدائی کی ہے،

نہ نامہ سوے من فرستد نہ پرسد از من چہ حال دارد
کوئی یہ پیارے سے جاکے پوچھے کہ ایسی کیا میں برائی کی ہے[1]

نہ اہل عالم بحال زارم کسے ترحم نہ کرد با آن کہ
پھرا ہوں روتا گلی گلی میں نگر نگر میں دہائی کی ہے،

حدیث دلبر و دہر جا باستماعش شوم ہمہ گوش،
سنوں نہ کیونکر میں اس کی بتیاں کہ جنے من میں سمائی کی ہے

قطعات و رباعیات ،،۔

| | |
|---|---|
| مرے دل سے جاتی نہیں یاد تیری | خبر جلد لے آکے اے یار میری |
| مصیبت ہے اے یار تیری جدائی | مجھے کھائے جاتی ہیں راتیں اندھیری |

| | |
|---|---|
| پوچھتے ہو کیا ہو حال کیسا ہے، | صاف ظاہر ہے حال جیسا ہے، |
| چشم سے اشک ہیں رواں ہردم | لب پہ نالہ ہے، حال ایسا ہے، |

| | |
|---|---|
| اے گوہر درج خوبروئی | شمع کاشانۂ نکوئی |
| فرقت میں ترے نزار ہوں میں | بیخواب و بیقرار ہوں میں |
| ہوتی ہے بری وہ آشنائی | ہو جس سے ملی ہوئی جدائی |
| دل لگتا نہیں ہو گھر میں میرا | جنگل میں کرونگا جا بسیرا |

[1] یہ قطعہ بھی نو عمری کا معلوم ہوتا ہے، "میں نے برائی کی ہے" کے بجاے میں برائی کی ہے استعمال کیا، اس قسم کے محاورے قدیم اردو میں مستعمل تھے،

قطعات تاریخ :-

جب مفتی عنایت احمد صاحبؒ جزیرہ شور سے واپس ہوکر کاکوری تشریف لائے، تو استاذ العلماء کو اپنے استاد کی قدمبوسی کا اشتیاق پیدا ہوا، اور ذیل کی رباعی لکھکر ان کی خدمت میں بھیجی،

بہلاؤں کہاں تک دلِ ناشاد کو مین — کب تک کروں ضبط آہ و فریاد کو مین
انشاء اللہ ایک ہفتہ کے بعد، — آتا ہوں قدمبوسیٔ استاد کو مین
۱۲۷۷

تاریخ تولد فرزند،

ہوا پیدا جو یہ فرزند دلبند — خوشی کی پھر گئی ہر سو منادی
مجھے تھی فکر تاریخِ ولادت — کہو: خرم ہے ہاتف نے ندا دی
۱۲۹۲

تاریخ وفات مولانا عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی،

فاضلِ بے نظیر عبد الحیٔ — مہرِ اوجِ علا چراغِ ہند
ذات سے جن کی تھا یہ ہند کو فخر — عرشِ اعلیٰ پہ تھا دماغِ ہند
آہ دنیا سے کر گئے وہ سفر — چلی بادِ خزان ببا غِ ہند
تیرگی چھا گئی نگاہوں مین، — غم سے پر ہو گیا ایاغِ ہند
فکر تاریخ تھی کہ ہاتف نے — دی ندا بجھ گیا چراغِ ہند
۱۳۰۴

مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ تکمیل علوم کی تاریخ،

جلسۂ تکمیل میں طالبون کا ازدحام — دیکھ کہا عقل نے مدرسہ فیض عام
۱۳۱۰ھ

اپنے ہم زلف قاضی فضل علی کو برجستہ یہ مصرعہ خط میں لکھا، جو واقعہ ہونے کیساتھ تاریخ پر بھی مشتمل ہے،

خوب بارش ہوئی ہے اب کی سال
۱۲۷۱

# عربی کلام کانمونہ

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ عربی شاعری کی جانب آپ کا میلان نہ تھا، تاہم اس پر پوری قدرت تھی، نمونہ کے لئے مولوی جمیل الدین فرخ آبادی متخلص جمیلؒ کی تاریخ وفات پیش کیجاتی ہے،

علامہ العصر عارف الدھر ذو الفضل الکامل العظیم

اعنی شمس الھدی جمیلا مدّاح نبیّنا الکریم

انّ الرحمٰن قد توفاہ ، بالرفق النّاعم الجسیم

ارخت وفاتہ بقولی ، ارضاہ اللّٰہ بالنعیم

۱۲۷۶

---

# مذاہبِ اربعہ میں فطرت کا لگاؤ

از

جناب ہوش بلگرامی (حیدرآباد دکن)

یہ وہ دعوی ہے، جسے والی ایم، سی، اے (حیدرآباد دکن) کے ایک جلسہ میں بعض محترم اور قابل بزرگوں نے مذاہبِ عالم کے متعلق (غالباً اپنے روادارانہ نقطۂ نظر کا اظہار فرمانے کے لئے) پیش کیا ہو، اور اسی کوشش کی ہو کہ ان مذاہب اربعہ (برہمنزم، بودھ مت، عیسائیت اور اسلام) کے مابین (فاضل مقرر کی رائے میں) جو فطری یگانگت قائم ہے، اس سے ایسے دلوں کو روشناس کرایا جائے، جو ادیان وملل کے بنیادی اصول سے ناواقف ہوں،

مذہب کے بارہ میں ہر انسان کا نقطۂ نظر ہمیشہ سے جداگانہ رہا ہے، اور ہر شخص نے اپنی اپنی عقل کی رہبری میں مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، بااین ہمہ حقیقت اپنی جگہ ایک ہی رہی ہے، اور غالباً اسی کو حاصل کرنے کی کوششیں کیجا رہی ہیں، جو اسلئے اکثر ناکام اور ناتمام ثابت ہوئی ہیں، کہ کسی نے بھی اپنے اپنے ایقان وعقائد سے ہٹ کر کبھی غور کرنے کی زحمت نہیں کی ہے، اسلئے جو کچھ میں عرض کرونگا، وہ میرے اپنے خیالات ہیں جنھیں میں نے مذہب کے ہر زاویہ سے دور رہ کر صرف ایک انسان ہونے کی حیثیت سے سوچا اور سمجھا ہے،

مذاہب کا مسئلہ نازک بھی ہے، اور آسان بھی، لیکن جب کبھی فلسفیانہ نکتہ سرائیوں سے کام لیا گیا ہے تو مذہب کے عام فہم اصول بھی ایک چیستاں بنکر رہ گئے ہیں، ایسی چیستان جسے بوجھنے کے لئے

ذہنِ انسانی کو نہ جانے کن کن بھول بھلیون سے گذرنے کی ضرورت پیش آتی ہے،

سب جانتے اور مانتے ہین، کہ مذاہبِ عالم کی بنیاد نیکی و نیکو کرداری پر رکھی گئی ہے، لیکن یہ تعلق فطری آویزش کے لئے کیونکر کافی ہوسکتا ہے. جب کہ مذہب کا فرض صرف عمران و تمدن پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ مذہب کائنات یا تخلیقِ کائنات کے سلسلہ کی وہ کڑی ہے، جو بندہ کو خدا سے ملاتی، اس پر نیکیون کے دروازے کھولتی اور اس کے دل کی گندگیون کو دور کرتی ہے، اس لئے مذہب کا اصول اساسی اصل میں معرفت یزدانی ہے، جو صحتِ اخلاق کی ذمہ داری ہے تاکہ نفس کی پاکیزگی غالب ہو، اراد و نیں لطافت کا عنصر قوی ہو، اور روح میں بلندی کا احساس اور وہ پرواز پیدا ہو، جو اس آب و گل کی دنیا کو معرفتِ ربانی کی تجلی گاہ سے قریب تر کر دے،

خدا کی رحمت ہو ان پر جنھون نے ابن آدم کو جہل و باطل کی تاریکیوں سے نکالا جنھون نے گم کردہ راہ دنیا کو حقیقت و صداقت کا راستہ دکھایا، مذہب اگر نہ ہوتا، تو نیکی و نیکوکاری، اور راستی و راستبازی کی تعلیم کون دیتا، یہ مذہب ہی کا احساس ہے، جس نے انسان کی روح میں بے چینی پیدا کردی جس نے انسان کے دل میں تحقیق و جستجو کی آگ بھڑکا دی، یہ حقیقت ہے، کہ مذہب ہی نے سب سے پہلے اُس خدا کو پہچنوایا، جو مادی آنکھوں سے نظر تو نہیں آتا لیکن روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا جاتا ہے، جو رسالت کے پنہاں خد و خال سے نقاب اٹھاتا، اور جو صداقت کے راستہ میں بڑی سے بڑی قربانی کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے،

خلیل اللہ کا آتشِ نمرود سے کھیلنا، ذبیح اللہ کا قربانی کے لئے سر جھکا دینا، روح اللہ کی کا صیب کی سختیاں[1] اٹھانا، رسول اللہ کا توحید کے لئے دنیا بھر کا غم سہنا، خلیفۃ الرسول کا ابن ملجم کی پیاس بجھانا، اور سید الشہداء کا حق کے لئے جان دیدینا، دنیا کے حافظہ میں اب بھی باقی ہے، اور کیوں نہ

---

[1] معارف :- بقول نصاری

باقی ہو جب کہ یہ سب کچھ مذہب ہی کے احساس حقانیت کے مظاہر ہیں،

جان اس کائنات میں جیسی کچھ قیمتی شے ہے، اسکو جینے والوں سے پوچھئے، اس کی قربانی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اسکو وہی دے سکتا ہے، جس کے قلبی تاثرات کسی ایسی حقیقتِ پنہان سے آشنا ہوں جو جان سے زیادہ عزیز و برتر ہو، اسی کو جانتے ہوئے انھوں نے دنیا کی فانی عشرتوں کو ٹھکرا دیا، وہ اگر چاہتے، تو بحکم خدا آسمانوں کی بلندیاں ان کے قدموں پر جھک جاتیں، شجر و حجر ان کے اشاروں پر چلتے، دشت وجبل ان کی عظمت سے لرز جاتے، لیکن وہ تو زندگی کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے، ان کی دل کی آنکھیں اس ہستی واجب الوجود کی تجلیات سے سرشار تھیں، جو ایسی بے شمار کائنات کا تنہا خالق و مختار ہے،

غرض جب مذہب کی بنیاد خدا کی معرفت اور خدا و بندہ کے رشتہ کے مضبوط کرنے پر ٹھہری، تو پھر تمام مذاہب کو ایک سطح پر رکھنا، اور اس طرح ان پر غور کرنا کہ گویا وہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں شاید احقاق حق کے مشرب میں جائز نہ ہو، جب کہ یہ طے ہو چکا ہے کہ اس کائنات کا حکمراں اور خالق ایک ہی ہو سکتا ہے، اور وہ بسیط اور لامحدود ہے، تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ الوہیت کے اظہار میں کس مذہب نے کن دلائل سے کام لیا ہے، اور خدا کی واحدانیت اور یکتائی کی توجیہ کس طرح کی ہے، اور خداشناسی و خدارسی کے لئے کون سے ایسے ذرائع متعین کئے ہیں جنھیں عقل سلیم آسانی لیساتھ اور کسی حجت کے بغیر اختیار کر سکے، مذاہب کی حقانیت کو سمجھنے کا یہی ایک ذریعہ ہے، اور اسی سے ہم مختلف مذاہب کے مابین حق و باطل کا امتیاز کر سکتے ہیں،

ہستی باری تعالیٰ کا عقیدہ مذہب کا اولین عقیدہ ہے، اس میں دوسرے مذاہب نے کس قدر غلطیاں کی ہیں، اور اہلِ مذہب کے قدموں کو کیسی کیسی لغزشیں ہوئی ہیں، وہ اس سے ظاہر ہے، کہ کسی نے اینٹ و پتھر کو خدا سمجھا، کسی نے بارش، ہوا، آگ اور سورج کو اپنا معبود بنایا، کسی نے ذات ربانی سے جسمانی اور انسانی خواص منسوب کر دیئے، کسی نے باپ اور بیٹے کے رشتوں کا جوڑ لگا دیا، غرض یہ کہ

معرفت ناقص اور ایمان فاسد رہا،

یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکی ہے، کہ دنیا کا آخری مذہب اگر کوئی ہو سکتا ہے، تو وہ اسلام ہے، جو اپنی حقانیت اور خدا شناسی کے لحاظ سے خدا کا بالکل آخری پیغام ہے، اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کا سب سے آسان اور قابلِ عمل طریقہ ہے، اسلئے اسلام کے ان خدائی خصوصیات کی موجودگی میں دوسرے مذاہب کے اصول سے اس کا مقابلہ کچھ دل لگتی بات نہیں معلوم ہوتی، ان میں اور اس میں جو بنیادی فرق ہے، اسکو صرف حقائق آگاہ نظریں ہی دیکھ سکتی ہیں،

مذاہب کے درمیان اختلافات کی صحت و عدم صحت کو جانچنے کا اگر کوئی معیار ہے، تو وہ صرف مسئلہ توحید ہے، وحدانیت ہی پر ہم اس مسئلہ کا فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ کس مذہب کا درجہ کتنا بلند ہے، میری نظر میں فطری لگاؤ اگر کسی مذہب سے کسی مذہب کو ہو سکتا ہے، تو اس کی پہلی شرط وحدانیت ہے، اور وحدانیت ہی فطرتِ الٰہی ہے، آیئے، ہم ذرا دنیا کے ان مذاہب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں،

مجھے کسی خاص مذہب سے نہ کوئی پرخاش ہے، اور نہ میرے یہ خیالات تعصب و تنگ نظری پر مبنی ہیں، کیونکہ میری فطرت کی تشنگی تو ایک ایسے عالمگیر اخوت کے سرچشمہ کی متلاشی ہے، جو ساری کائنات کو ایک نقطہ پر جمع کرے، جہاں انسانیت کا احترام ساری بندشوں سے بلند اور برتر تسلیم کیا جائے اور میرے نزدیک یہ صلاحیت صرف اسلام میں ہے، جہاں نہ رنگ و نسل کا اختلاف ہے، اور نہ حالت و حیثیت کا امتیاز، اسکی یہ صلائے عام ساڑھے تیرہ سو سال سے بلا کسی وقفہ کے کائنات میں گونج رہی ہے،

ویدمت نے اپنی مذہبی تعلیمات کا خاکہ اس وقت کھینچا ہے، جب انسان نے تمدن کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کئے تھے، ظاہر ہے کہ اس زمانہ کا انسان رموز و اسرار الٰہی کو سمجھنے کی کیونکر اہلیت رکھ سکتا تھا، اور نہ اس کے دماغ میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی، کہ وہ عیب و صواب کو پہچان سکتا، برے بھلے

میں امتیاز کر سکتا، اس کی معصومانہ عقل نے فطرت کے مظاہر کو خدا سمجھ لیا، اور بجائے اس کے کہ رب الارباب کی عبادت کرتا، خاکی اور فانی موجودات کو معبود جاننے لگا، وہ تو مقلدانہ دماغ لیکر پیدا ہوا تھا، جس نے جو راستہ بتایا، اس پر بلا سوچے سمجھے چل کھڑا ہوا، اس کی عقل و فہم کے نزدیک کسی اور رب الارباب کا وجود اس وقت تھا ہی نہیں، اس کو یقین تھا کہ اسکی زندگی کا عروج و زوال اور فتح و شکست سب کچھ انھی مظاہر کے رحم و کرم اور قہر و غضب پر ہے،

اس کے بعد جب دنیا نے ایک اور کروٹ لی، اور تمدن کی ترقی کیساتھ ساتھ مذہبی رسوم کی ادائی میں طوالت اور پیچیدگی ہونے لگی، تو ان کو دور کرنیکی ذمہ داری ایک خاص گروہ کے سپرد کیگئی جو برہمن کہلائے، نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تقدس اس گروہ کی ذات میں ہمیشہ کے لئے منتقل ہو گیا، اور یہیں سے برہمنزم کی ابتدا ہوئی، غرض برہمن مت پر مختلف دور آتے رہے ہیں لیسے دور جو ایک دوسرے سے کوئی بنیادی تعلق نہ رکھتے تھے، میں اگر غلطی نہیں کرتا، تو عہدِ حاضر میں مورتی پوجا کی رسم اب سوائے ہندوستان کے اور کسی ملک میں نہیں پائی جاتی، اور یہ بھی اسی مت کی باقیات سے ہے، جہاں تک میں نے غور کیا ہے، فلسفۂ ویدانت میں وحدانیت بہ حیثیت ایک مرکزی عقیدہ کے شروع ہی سے موجود نہیں ہے، قدیم ہندو فلسفہ کا ایک شعبہ "سانکھیہ" تھا، جس میں تکوینِ عالم کے نظام سے بحث کی گئی ہے، جس میں یہ موجود ہے کہ مادہ ہی دنیا کی علت ہے، اور پرماتما یا ایشور کا کوئی وجود نہیں، اس فرقہ کے لوگ ۲۵ عناصر کے قائل ہیں، نویں صدی عیسوی میں شنکراچاریہ کے مت نے قدیم مت کی اصلاح میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے، انھوں نے برہم کی ہستی واحد کو لائقِ پرستش قرار دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کو بھی جائز رکھا، ہندو مذہب کا اساس اب ان تین کتابوں پر قائم کیا گیا ہے،

(۱) چاروں وید، (۲) گیتا، (۳) منوسمرتی یہ تینوں کتابیں تاریخی حیثیت سے تین مختلف دوروں سے تعلق رکھتی ہیں، اور یہ بہ سہ کتب قصے کہانیوں، فلسفۂ زندگی، اور قانونِ حیات کو اپنے اوراق میں

سمیٹے ہوئے ہیں، کہا جاتا ہو کہ ویدون نے انسانون کو کوئی ایسا تخیل بھی دیا ہے جو ان ظاہری دیوتاؤن سے بلند کسی واحد خالق کائنات کی ہستی سے متعلق ہے، ممکن ہے کہ یہ قول صداقت پر مبنی ہو، لیکن یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر عملی دنیا میں نہیں ملتی، رہ گیا بدھ مت سو وہ ایک "اہنسائی" مذہب ہے جس کے احکام عشرہ میں سے سب سے پہلا یہ تاکیدی حکم ملتا ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو، بودھ نے انسان کی زندگی کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کیا ہے، وہ دنیا کے دوسرے حکما اور بانیان مذاہب کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے، انھون نے یہ سمجھنے کی سرے سے کوئی کوشش ہی نہیں کی کہ انسان دنیا میں کیون پیدا ہوا ہے، اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، ان کے تمام گیان اور دھیان کا یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی فی نفسہ ایک مصیبت ہے، اس چکر سے نجات پانے کی کیا شکل ہے، اس کو بودھ نے صرف ایک لفظ "نروان" سے حل کیا ہے، اس عقیدہ میں کسی خالق اور مالک کائنات کا وجود شامل نہیں ہو، صرف اس تخیل میں تناسخ کا چکر ضرور ہے، گوتم بدھ کی مت کوئی مذہب نہ تھا، بلکہ ایک اخلاقی فلسفہ تھا، اس کے معتقدات کا سلسلہ کسی خالق کائنات سے نہ ملتا تھا، درحقیقت بودھ کے سلسلہ میں خدا کوئی چیز ہی نہ تھا، ان کے بعد بودھ کے پیروؤن نے خود بودھ کے وجود کو خدا مان لیا، اور عقیدہ یہ قرار پایا کہ بودھ ایک اوتار کی شکل میں بار بار پیدا ہوتا ہے، اور اہل دنیا کے لئے نروان کا راستہ کھولتا ہو،

انجیل کے متعلق مسلمانون کا ایمان ہے کہ وہ نزول کے وقت خدائی کتاب تھی، حضرت عیسیٰ کی پیغمبرانہ شخصیت بھی اُن کو تسلیم ہے، لیکن یہ کہے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتا، کہ توحید کے صحیح اصول کا فقدان یہان بھی ہے، توحید کسی نجات دہندہ بیٹے کے وجود اور کسی روح القدس کی شرکت عمل سے بے نیاز ہے، توحید تو وہ راز عرفان ہے، جو بجائے خود نجات دہندہ بھی ہے، تجلی ربانی بھی ہو اور معرفت الٰہی کا سیدھا راستہ بھی،

اسی لئے اسلام نام ہے صرف توحید کا، دعوت توحید کا اور دنیا کو معبودان باطل کی پرستش

سے چھڑانے اور ایک نقطۂ نظر پر جمع کر دینے کا جبھی تو اس کو تمام ادیان سابقہ کا نچوڑ کہا جاتا ہے، اور دنیا میں صرف یہی مذہب ہے جس میں حشو و زوائد کا نام نہیں ہے، اور اوہام و قیاسات سے اسے کوئی کام نہیں ہے، اور جو یہ دعوی کرنے میں اپنے حقائق کے اعتبار سے بالکل حق بجانب ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر تہذیب کی رہنمائی کے لئے خلق ہوا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر شخص اس پر آسانی سے عمل کر سکتا ہے، اور اس کی تعلیمات کو اختیار کر کے دنیا کے کاروباری ہجوم میں معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے،

اسلام کی تعلیم ترک دنیا کو برا سمجھتی، اور ایسی ریاضتوں کو غیر ضروری ٹھہراتی ہے جس کو کمزور انسان برداشت نہ کر سکے، نہ وہ کسی کی قربانی کو ذریعۂ نجات تسلیم کرتی ہے، نہ وہ بنی نوع انسان میں کسی اختلاف کو جائز سمجھتی ہے، وہ تو تمام انسانوں کو خدا کا بندہ سمجھنے کی توفیق دیتی ہے، اور تعصب و تنگ نظری کے تمام نظریوں کو انسانیت کی انتہائی توہین جانتی ہے، اور یہی اس کے اصلی جوہر ہیں،

اسلام نے کہیں بھی تجلیات الٰہی کو خدا کا اوتار یا نجات دہندہ ظاہر نہیں کیا، وہ تو پیغمبر ہوں یا امام، اصفیا ہوں یا اولیا سب کو خدا کا بندہ قرار دیتا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ خدا کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہو سکتا ہے تو وہ خدا کے بندہ ہی کا ہو سکتا ہے،

کاش انسان کو بندہ ہونا نصیب ہو جائے،!!"

غرض اسلام میں نہ کوئی خدا کا بیٹا (نجات دہندہ) ہے، نہ کوئی اوتار برگزیدہ کائنات ہے نہ کوئی ایسا خدا ہے، جو دنیا کی اصلاح کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف چولے بدلتا رہتا ہے نہ اسلام کا خدا کسی کا سہارا چاہتا ہے،

وہ خالق ہے اور مخلوق کی تمام صفات سے بلند اور منزہ، وہ واحد ہے، اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے، وہ واحد ہے اپنے افعال اور اعمال کے لحاظ سے، وہ واحد ہے اپنے وجود اور مقصود کے لحاظ سے،!

یہ ہے اسلام اور اس کی خصوصی تعلیم جس کا نہ دوسرے مذہب سے کوئی فطری لگاؤ ہو سکتا ہے اور نہ وہ اپنی تعلیمات کی ان بدیہیات کے لحاظ سے فطری کہلانے کے مستحق ہیں، اسی پر انسانیت کو صحیح معنوں میں زندہ رہنا چاہئے یہی عقل کا بھی اقتضا ہے اور یہی فہم کا بھی ارشاد،

میں نے مختصراً ان مذاہب اربعہ کا دھندلا سا خاکہ اسلئے پیش کیا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ کیا دنیا بغیر فطری مذہب کے صحیح معنون میں زندہ رہ سکتی ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا، کہ مذہب کو کن حقائق و معارف کا سرچشمہ ہونا چاہئے، اور عہد جدید میں جس مذہب کی پیروی انسان کے بڑھتے ہوئے ولولوں کا ساتھ دے سکتی ہے، وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے، اب اگر صرف وحدانیت کے معیار پر ان متذکرہ مذاہب کو جانچا جائے، جس کی نسبت بعض یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کیساتھ "فطری لگاؤ" رکھتے ہیں، تو ان مذاہب کے محولہ تاریخی واقعات لگاؤ پیدا کرنے سے ساکت پائے جاتے ہیں،

اصلی بحث تو یہاں ختم ہو جاتی ہے، مگر چونکہ عبادت مذہب کا رکن رکین ہے، اور نواب مرزا یار جنگ بہادر نے اس پر ایک ایسے انداز میں اظہار خیال فرمایا ہے جسے سمجھنا ضروری ہے، اسلئے چلتے چلتے چند سطرین اس پر بھی ملاحظہ فرما لیجئے، نواب صاحب کا خیال ہے کہ عبادت کے لئے کسی خاص طریقہ عبادت کی ضرورت نہیں ہے، مجھے نواب صاحب کی بلند نگاہی میں شک نہیں ہے، لیکن اس اکتشاف جدید کو سمجھنا میری محدود عقل سے باہر ہے، کیونکہ میں تو آجتک یہی سنتا آیا ہوں کہ جس مذہب نے آنکھ کھولی خواہ وہ باطل ہو یا کامل، خدا کی عبادت کا ایک مخصوص طریقہ اپنے ساتھ لایا جسے بانیان مذاہب نے اپنے عمل سے سمجھایا، اور بتایا، اسلئے ارکان عبادت سے انکار میرے لئے تو یقیناً ایک اکتشاف جدید کی حیثیت رکھتا ہے

بہر نوع اسقدر معلوم ہے کہ اس مادی دنیا میں بھی مختلف قوانین کی پابندی کئے بغیر زندگی کے دشوار گذار منازل کا طے کرنا دشوار ہے، اسی طرح روحانی عالم کے لئے بھی چند پابندیاں ضروری ہیں، جن کے بغیر قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ افعال صادر نہیں ہو سکتے، یہ تو علم النفس کا معمولی

مسئلہ ہے، کہ ہر کام کی تکمیل کے لئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہے جبتک وہ ماحول پیدا نہ کیا جائے، کامیابی نہیں ہو سکتی، اسلام نے بھی ارکانِ عبادت متعین کئے ہیں، اور جہاں تک میری نظر پہنچ سکی ہے یہ کوئی فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری نہیں ہے، عبادت میں قیام وقعود اور رکوع وسجود کی جو قید عائد کی گئی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو تو عرض والتجا، اور تذلل وعاجزی کی تصویر بن جائے، یہ جذبۂ عبودیت کے فطری طریقے ہیں جنھیں مرتب کرنے کی مصلحت یہ بھی ہے، کہ عبادت کے موقع پر یکسانیت کیساتھ خدا کی تحمید وتسبیح کیجا سکے، پھر یہ اعمال صرف انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہیں، بلکہ قرآن پاک میں بھی جابجا رکوع اور سجود کی ہدایت پائی جاتی ہے:-

یا ایھا الذین آمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا، جس شخص کا ایمان وایقان یہ ہو کہ قرآن مجید کلامِ ربانی ہے، وہ کسی طرح عبادت کے ان مقررہ طریقوں سے قطع نظر نہیں کر سکتا، فطرتِ الٰہی کے جو رموز عبادت کے ان قواعد وضوابط میں مرکوز ہیں، وہ ہم ایسے انسانوں کے فلسفہ کے دسترس سے بالاتر ہیں، اگر پوری تقریر ہمارے سامنے ہوتی، تو ہم اس سے زیادہ فاضل مقرر کا منشا، اور مفہوم سمجھ سکتے تھے، بہر نوع خدا کی موجودگی شرح سے بے نیاز اور مذہب کی حقانیت ثبوت سے مبرا ہے لیکن وہ مذہب جو تاریکیوں کو دور کر دے، جو اوہام کو مٹا دے اور جو حقیقت وصداقت کو ضمیرِ انسانی پر آشکارا کر دے، ایسا مذہب قدیم روایات کے سایہ میں نہیں ملتا، بلکہ آزادانہ غور وفکر سے حاصل ہو سکتا ہے، اس لحاظ سے حضرت بن. گان عالی کا یہ ارشاد حرز جان بنانے کے قابل ہے، کہ

"ایک طرف مسئلہ مذہب کو کماحقہ سمجھنا جیسا کچھ دشوار نظر آتا ہے، تو دوسری طرف یقینًا وہ بہت آسان ہو جاتا ہے، جبکہ تعصب کی عینک سے اس کے خط وخال نہ دیکھے جائیں، بلکہ عقل کی صحیح رہبری کی روشنی میں اس کی تہ کو معلوم کر لیا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کام ہر کس وناکس کا نہیں ہے، الا ما شاء اللہ،" (صبح دکن مورخہ ۱۵ رجمادی اول ۱۳۵۵ھ)

یہ مذاہب اربعہ کے متعلق وہ سطور اربعہ ہیں، جنکو وہی سمجھ سکتے ہیں، جن کی نظر میں اتنی بلندی ہو
اور جن کی فطرت ایسی عالی ہو، ایک طرف یہ سطریں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہم اس مجتہدانہ دماغ کی
پیداوار ہیں، جس نے صحیح عقل کی رہبری میں مذاہب عالم کو جانچا، اور سمجھا ہو اور اس پختہ کارانہ انداز
ین سمجھا ہو کہ دنیا کی کم سواد عقلیں اس گہرے نقش کو دھندلا بھی نہیں کر سکتیں اور دوسری طرف یہ ارشاد
ہے کہ اس بصیرت کا، جسے دنیا مدت ہوئی حافظوں سے محو کر چکی ہے، اس میں تعصب سے بچنے، اور
حقیقت کو مبصرانہ نظر سے دیکھنے کی ایک حکیمانہ ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ نباض فطرت دماغ سلطانی اس
سے واقف ہے، کہ زمانہ مذہب سے ناآشنا ہو چکا ہے، اس پر سلامت ذوق اور فطری استعداد کا بھی فقدان
ہو چکا ہے، اسلئے "اس مشکل" کا بھی اظہار فرما دیا گیا ہے، کہ

"یہ کام ہرکس وناکس کا نہیں ہے"

**معارف**:۔ حیدرآباد دکن کے نیگ مین کرسچین ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں ہمارے
محترم فاضل فلسفی بزرگ نواب سر امین جنگ بہادر نے "مذاہب اربعہ (یعنی برہمنیت، بودھ مت، عیسائیت
اور اسلام) میں فطرت کا لگاؤ" کے عنوان پر تقریر فرمائی تھی، جس سے غالبًا مقصود یہ ہوگا، کہ ان چاروں
مذہبوں کی متفقہ نظریوں کو بیان کیا جائے، ہمارے ادیب دوست جناب ہوش صاحب بلگرامی (نائب
معتمد افواج سرکار عالی) نے اس پر اس حیثیت سے تبصرہ کیا ہے، کہ اسلام کا نقطۂ نظر باقی ہر سہ مذاہب سے
بدرجہا بلند، بہتر اور کامل تر ہے، ہمارے خیال میں ان دونوں میں صداقت ہے، یعنی ان چاروں مذاہب
بلکہ دنیا کے سارے متمدن مذاہب میں کچھ اتحاد کے عناصر بھی ہیں، اور کچھ امتیاز کے بھی، چونکہ
نواب صاحب ممدوح کی ساری تقریر ہمارے سامنے نہیں اسلئے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا مقصد کیا
تھا، مگر بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ انھوں نے مذاہب اربعہ کے کسی متحدہ خیال پر گفتگو کی ہوگی، اور وہ صحیح
ہوگی، مگر ایسے موقعوں پر صلح پسند اشخاص سے ہمیشہ یہ غلطی ہو جاتی ہے، کہ وہ اتحادی نظریوں کے ساتھ

ساتھ اپنے امتیازی نظریون کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس سے اکثرون کو غلط فہمی ہو جاتی ہو،

نواب مرزا یار جنگ بہادر جن کی قانونی قابلیت کا اعتراف ہر شخص کو ہے، انکی نسبت جو خیال منسوب کیا گیا ہے، اگر وہ صحیح ہے قران کا مقصد یہ ہوگا، کہ ایک مذہب کے طریقۂ عبادت کو دوسرے مذہب کے طریقۂ عبادت پر عقلاً کوئی ترجیح نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ آریائی مذاہب کو چھوڑ کر جس میں خدائے واحد کی پرستش کا کوئی تخیل نہیں، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا طریقۂ عبادت بالکل یکسان ہے، اس وقت ان میں جو فرق ہے بھی وہ اسلئے ہو کہ یہودیت اور عیسائیت نے اپنے انبیا کے عملی طریقوں کو بھلا دیا ہے، یا بتدریج بمرور زمانہ اس میں ترمیم کر دی ہے،

اسلام میں دونون قسموں کی عبادتین مشروع ہیں، اس عبادت کی تعلیم بھی ہے جسمیں کسی طریقہ کی پابندی کی ضرورت نہیں، فرمایا:-

يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ (آل عمران - ۲۰) وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے، اور پہلو پر لیٹے یاد کرتے ہیں،

اور وہ عبادت بھی ہے جسکا ایک خاص طریقہ بھی مقرر کر دیا گیا ہو، جو ہمارے ہر سوچے ہوئے طریقِ عبادت سے زیادہ بہتر اور زیادہ مفید ہے، فرمایا:-

وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (بقرہ - ۴) اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا (حج) رکوع کرو، اور سجدہ کرو، اور عبادت کرو،

اسی لئے اسلام کا طریقِ عبادت دونون قسموں کو محیط ہے، اور اسلئے سب سے زیادہ کامل ہے، غیر مخصوص طریقۂ عبادت، ہر وقت، ہر موقع پر کسی پابندی کے بغیر انجام پاتا ہو، اور مخصوص طریقۂ عبادت خاص شرائط کیساتھ خاص اوقات میں فرض ہو،

"س"

# ڈچ جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی حالت

"ایک پرجوش مسلمان عالم و تاجر محمد اسمٰعیل گاجیہ صاحب جنھوں نے مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی ہے، جانسبرگ سے ایک مفصل خط ہم کو بھیجا ہے، جس کا حسب ذیل اقتباس ہندوستان کے مسلمانوں کی عبرت کے لئے مفید ہوگا"۔ "س"

یہاں جنوبی افریقہ میں جو ڈچ لوگوں کی عملداری میں ہے، ہندی قوم بھی آباد ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں قومیں ہیں، اب نئے ہندی کو یہاں داخلے کی اجازت نہیں، نیز قانون سکونت پذیری کی وجہ سے تقریباً تمام ہندی اپنی عورتیں اور بچے یہاں بلوا لینے پر مجبور ہوئے، اسوقت .. فی صدی ہندی نوآباد ہیں، اس دیس میں پیدا شدہ جوانوں کو ہندوستان سے کوئی نسبت نہیں ہے، اگر یوں کہا جائے کہ یہ اپنی اصل چھوڑ رہے ہیں، تو بالکل بجا ہے، اور مستقبل قریب میں یہیں کے ہو کر رہیں گے،

سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہاں کی گورنمنٹ نے ہمارے حقوق اور آزادی کو بالکل محدود کر دیا ہے، دوسرے الفاظ میں اگر یوں کہا جائے کہ ہماری آزادی سلب کر لی ہے تو زیادہ مناسب ہوگا،

یوروپین اور یہاں کے اصلی باشندے حبشی سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے، جسے کلرڈ (Coloured) سے موسوم کیا جاتا ہے، جو درجہ اس کلرڈ قوم کو دیا گیا ہے، وہی درجہ ہمارا شمار کیا جاتا ہے، پارلامنٹری قوانین میں ہمیں بھی لفظ کلرڈ ہی سے یاد کیا جاتا ہے، اگر ریل گاڑی میں سفر کیا جائے، تو ہمارے لئے یعنی کالی قوم کے لئے ایک کوچ مخصوص ہوگا، پوسٹ آفس (Post Office)

میں جہاں سے یورپین کو Serve ہوتا ہے، وہاں ہمیں اجازت نہ ہوگی، بلکہ ہم نان یورپین (Non Europeans) کے لئے ایک کونہ میں کوئی جگہ مخصوص کردی جاتی ہے، اسی طرح رہنے کے لئے ہمارے لئے محلے الگ ہوں گے، پبلک لائبریری میں جانے کا اور کتب بینی کا حق نہ ہوگا، ہوٹلوں اور سنیما میں ہم لوگوں کو جانے کی اجازت نہ ہوگی، مختصر یہ کہ ہمارا یہاں وہی درجہ ہے، جو ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاں اچھوت قوم کا درجہ ہے،

مگر اس بے بسی اور کس مپرسی کی حالت میں اگر کوئی فرقہ ہمارا ہمدرد نظر آتا ہے، تو وہ پادریوں کا فرقہ ہے،

یہاں کی تہذیب و تمدن مغربی تہذیب و تمدن ہے، ہمارے نوجوان اس سے بہت جلد مرعوب ہوجاتے ہیں، اس کی کورانہ تقلید اور نقالی کرتے رہتے ہیں، ان جوانوں کے دلوں سے حرارتِ اسلامی زائل ہوتی جاتی ہے، وہ اپنے آپ کو پورا مغربی دیکھنا چاہتے ہیں،

ہماری کچھ مسجدیں بھی ہیں، چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی ہیں، ان مدرسوں میں قرآن شریف پڑھایا جاتا ہے، اس کے بعد اردو کی کچھ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جس میں نماز روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کے مسائل ہوتے ہیں، خصوصاً حضرت مفتی ہند کی تالیف کردہ تعلیم الاسلام، بہشتی زیور، انجمن حمایت اسلام لاہور کی اردو کی پہلی دوسری کتابیں وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں، اور کبھی موقع مل گیا تو کوئی لڑکا فارسی کی بھی دو تین کتابیں دیکھ لیتا ہے، اب اس زمانہ میں جب یہ بچے مدرسے جاتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ان اسکولوں میں داخل کئے جاتے ہیں، جہاں انگریزی اور ڈچ پڑھائی جاتی ہے، چونکہ یہاں کا تمدن مغربی تمدن ہے، اسلئے انگریزی اسکولوں سے یہ بچے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن مدرسہ کی تعلیم رائگان جاتی ہے، یہاں تک کہ سارے مسائل پڑھ لینے کے بعد بھی وہ ٹھیک نماز کے ارکان سے واقف نہیں رہتے،

اس وقت عموماً بچے چھٹے کلاس (Standard VI) تک اسکولوں میں انگریزی

# تلخیص و تبصرہ

## رومن کیتھولک چرچ اور اسلام

اس عنوان سے لیوکولم (Leo Cullmann) کا ایک مضمون مسیحی رسالہ مسلم ورلڈ (جولائی ۱۹۲۶ء) میں شائع ہوا ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ رومن کیتھولک کلیسا کی تبلیغی سرگرمیاں مسلمانوں میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئیں، اور کن وجوہ سے ابتک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی، اس کے بعد وہ تجویزیں بیان کی گئی ہیں، جن سے آیندہ بہت کچھ توقعات ہیں، عیسائی مبلغین کے زیر اثر مسلمانوں میں جو اصلاحات دکھائی گئی ہیں، ان میں طلاقوں کی تخفیف کا ذکر مسلم ورلڈ ہی کے جریدہ مقالہ نگار سے ممکن تھا، مضمون کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

جنگ عظیم کے وقت سے رومن کیتھولک کلیسا کی تبلیغی سرگرمیاں زیادہ ہوگئی ہیں، یہ جوش پوپ بنیڈکٹ پانزدہم (Benedict XV) کے دور (۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۲ء) میں بھی زیادہ تھا، اور پھر اس سے زیادہ موجودہ پوپ پیس پانزدہم (Pius XI) کے زمانہ میں دیکھا جارہا ہے، ان تبلیغی سرگرمیوں میں یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اب مسلمانوں کی طرف بہ نسبت پہلے کے زیادہ توجہ کیجانے لگی ہے، موجودہ پوپ نے خصوصیت کیساتھ مسلمانوں کی طرف توجہ کی ہے، اور اسی غرض سے رومہ کے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ میں ایک شعبہ علوم اسلامیہ کا قائم کردیا گیا ہے، اس توجہ کا باعث محض جوش تبلیغ ہی نہیں، بلکہ اس میں جدید دنیاے اسلام کے ذہنی انقلاب کو بھی بہت کچھ

داخل ہو، رومن کلیسا ان جدید خیالات سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کر رہا ہو، جنھوں نے ملت اسلامیہ میں ایک حرکت پیدا کر دی ہے، اور ان بندوں کو توڑ دیا ہو جو ابتک دنیاے اسلام کو مسیحیت کے تبلیغی حملوں سے روکے ہوئے تھے،

تبلیغ کے دو طریقے استعمال ہوتے آئے ہیں، بلاواسطہ اور بالواسطہ، بلاواسطہ تبلیغ کا طریقہ یہ ہے کہ وعظ اور تقریر کے ذریعہ عیسائیت کی اشاعت کی جائے، یا سوال وجواب کے ذریعہ اس کی تعلیم دیجائے، برخلاف اس کے بالواسطہ تبلیغ میں اشاعت مذہب کے تمام دوسرے ذرائع شامل ہیں، مثلاً صدقہ وخیرات، دعا، بیماروں اور غریبوں کی خبرگیری، تعلیم، نمونۂ عمل، اور قبول عیسائیت میں تعصب نے جو رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں، اُن کو دور کرنا، اس وسیع طریقہ تبلیغ میں ہر وہ عیسائی حصہ لیتا ہے، جو دعا، نمونۂ عمل یا کسی دوسرے روحانی یا مادی ذریعہ سے لوگوں کو دائرۂ مسیحیت میں داخل کرنے کی کوشش کرتا ہو،

اسوقت مسلمانوں میں عیسائیت کی اشاعت کے لئے بلاواسطہ تبلیغ کا طریقہ شاید ہی کہیں موجود ہو، چند تجربہ کار پادریوں نے جو اس مسئلہ پر ماہرانہ رائے دے سکتے تھے، مسلمانوں میں بلاواسطہ تبلیغ کرنے کی مخالفت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسیحی مبلغین نے ہر جگہ بالواسطہ طریقہ کو استعمال کیا ہے، اور بیماروں اور غریبوں کی خبرگیری کرکے نیز انھیں خود ان کے مذہب کے امورِ خیر کی تلقین کرتے ہوئے، ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان تعصبات کی جو دیوار حائل ہے، وہ گرا دیجائے جن ملکوں میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے غیر مسیحی فرقے آباد ہیں، وہاں عیسائی مبلغین نے براہ راست مسلمانوں میں تبلیغ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اپنی توجہ غیر مسلموں پر مبذول رکھی ہے، اگرچہ ظاہر ہے کہ مبلغین کے رفاہ عام کے کاموں سے مسلمان بھی اکثر فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی لئے کسی نہ کسی حد تک ان کے زیر اثر رہتے ہیں،

تمام کیتھولک مشنوں کا مقصود کلیسا کا استحکام ہے، جس کا مدار قبول عیسائیت کی کثرت پر ہے،

لیکن اس نقطۂ نظر سے اُن مشنوں کے کارنامے شاندار نہیں جو مسلمانوں میں کام کرتے ہیں، فرائی ٹاگ ( FREITAG ) نے سچ کہا ہے کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی بہت کثرت سے ہے وہاں خود مسلمانوں میں مبلغین کے کارنامے بمنزلہ صفر کے ہیں، یا جیسا کہ چارلس ( CHARLES ) کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے قبولِ اسلام کے امکان پر جو اس قدر بحث و مباحثہ ہوتا آیا ہے، وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اب تک عیسائی مشن کو اسلام کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ بالواسطہ تبلیغ کے دوسرے نتائج کیا ہیں، تاہم اس طریق کار سے اسلام پر جو اثر بتدریج پڑ رہا ہے، اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے، جو اسلام کے تین بڑے مرکزوں شمالی اور شمالی مشرقی افریقہ، مغربی ایشیا اور ہندوستان سے متعلق ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

۱۹۲۳ء میں شمالی اور شمالی مشرقی افریقہ میں (۲۸۵) ابتدائی مدارس تھے، جن میں طلبہ کی تعداد (۱۴۰۴۰۷) تھی، (۱۰۳) ثانوی مدارس تھے، جن میں (۸۰۵۳) طلبہ تعلیم پاتے تھے، (۳۲) طبی مشنری تھے، (۱۴) ہسپتال تھے، جنمیں (۱۴۰۰) مریضوں کے قیام کا انتظام تھا، (۱۳۹) دواخانے تھے جہاں ایک سال میں (۲۹۴۴۶۰۰۷) آدمیوں کا علاج ہوتا تھا، (۷) برص وجذام کے شفاخانے تھے، جن میں مریضوں کی تعداد (۳۷۰) تھی، (۴۹) یتیم خانے تھے، جہاں (۳۶۴۴) بچے رہتے تھے، (۱۹) قیام گاہیں بوڑھوں کے لئے تھیں، جہاں (۲۴۷۱) آدمی اپنی زندگی کے آخری ایام گذار رہے تھے (۷) چھاپے خانے تھے، جہاں سے (۱۴) رسالے نکلتے تھے، اور ان کی اشاعت (۱۳۰۶۰) تھی، یہ اعداد افریقہ کے اس خطہ سے متعلق ہیں، جس میں مسلمانوں کی آبادی (۶۰) فی صدی ہے، اس میں سے بعض حصوں میں تو مسلمان نہایت کثرت سے آباد ہیں، مثلاً مراقش میں (۹۷) فی صدی اور مصر میں (۹۱) فی صدی، اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ جن کاموں کا ذکر اوپر ہوا، ان سے بہت زیادہ فائ

مسلمان ہی اٹھائیں گے،

مغربی ایشیا (ترکی، عراق، ایران، شام فلسطین اور عرب) میں بھی تبلیغی مشن کے رفاہی کارنامے کچھ کم شاندار نہیں، البتہ یہاں زور دوا خانوں پہ کم اور مدارس پر زیادہ ہے، اگرچہ یہاں کا کام زیادہ تر عیسائی فرقوں کی اصلاح حال پر مشتمل ہے تاہم اس کا اثر بعض مقامات پر مسلمانوں پر بھی بہت وسیع ہے، مثلاً شام میں ۱۹۲۵ء میں (۹۹۲) عیسائی مدارس تھے جن میں (۵۰،) کیتھولک تھے، تمام مدارس کے طلبہ کی مجموعی تعداد (۹۵۳۲۱۱) تھی، اور عیسائی مدارس کے طلبہ کی (۴۵۰۹۰)، پھر بھی شام میں مسلمانوں کی آبادی (۷۰) فی صدی تھی، اسی طرح بیروت کی سینٹ جوزف یونیورسٹی بھی جس میں مسلمان طلبہ کی تعداد اگرچہ کم ہے، کچھ نہ کچھ اثر ڈالتی ہے، وہاں سے تین عربی رسالے بھی نکلتے ہیں،

برما اور سیلون کو چھوڑ کر خاص ہندستان میں آخری اعداد و شمار کے مطابق (۱۲۱۰) مبلغین کام کر رہے تھے، ان میں (۱۱۱۳) غیر ملکی اور (۹۱۹) ملکی پادری تھے، (۲۸۲) غیر ملکی، اور (۲۶۲) ملکی برادرس (BROTHERS) اور (۸۴۲) غیر ملکی اور (۲۵۰۰) ملکی سسٹرس (SISTRESS) تھیں، طبی مشنریوں کی تعداد (۱۹۵) تھی، (۸۹۱۳) ابتدائی مدارس تھے، جن میں (۴۵۴۲۰۶) بچے تعلیم پاتے تھے، (۵۶۲) ثانوی مدارس تھے جن میں طلبہ کا شمار (۹۱۹۰۷) تھا، (۴۰) ہسپتال تھے، جن میں (۱۰۱۶) مریضوں کے قیام کا انتظام تھا، (۲۴۵) دوا خانے تھے، جہاں (۱۶۱۱۲۴۵) آدمیوں کو دوائیں دی گئی تھیں، (۸) برص و جذام کے شفا خانے تھے، جہاں (۵۰،) مریضوں کا علاج ہوتا تھا، (۲۷۳) یتیم خانے تھے، جن میں (۱۶۶۹۰) بچوں کی پرورش ہوتی تھی، بوڑھوں کے لئے (۹۴) قیام گاہیں تھیں، جہاں (۱۴۱۳) آدمی رہتے تھے، (۲۵) چھاپہ خانے تھے، جہاں سے (۶۹) رسالے نکلتے تھے، اور ان کی تعداد اشاعت (۹۰۵۰۵) تھی:

یہ اعداد و شمار شاندار ضرور ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کا تعلق ہے، ان

اعداد سے صحیح نتیجہ نکالنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ ستر لاکھ ہے، اس کا ۱/۵ حصہ عیسائی مشن کے چار حلقوں یعنی ڈھاکہ، چاٹگانگ، کرشن نگر اور لاہور میں آباد ہے، اوسطاً ایک لاکھ ستر ہزار کی آبادی پر ایک مشنری مقرر ہے، برخلاف اس کے ہندوستان کے جنوبی حصہ میں کیتھولک آبادی نسبتہً زیادہ ہے یعنی کوٹار، تو تی کورن، منگلور اور ویراپولی کے تبلیغی حلقوں میں اوسطاً تین ہزار نوسو کی آبادی میں ایک مشنری کام کرتا ہے، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم آبادی اور کیتھولک تبلیغ کے مرکز ایک دوسرے سے بہت دور دور واقع ہیں، یہی صورت انڈیا، کوچک اور عموماً ان دوسرے ممالک کی بھی ہے، جہاں مختلف فرقوں کی آبادیاں ملی جلی ہیں،

مسلمانوں کا ایک چوتھا بڑا مرکز جاوا ہے، اسکی حالت دوسرے اسلامی مرکزوں سے مختلف ہے، تمام اسلامی ممالک میں جاوا ہی وہ ملک ہے، جہاں مسلمان بکثرت عیسائی ہوئے ہیں، یہ کام تقریباً تمامتر اسکولوں کے ذریعہ ہوا ہے، اور اسّی فی صدی کیتھولک وہی لوگ ہیں، جو ابتداءً مسلمان اور مسیحی اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے، جاوا میں مشن کا کام ابھی نیا ہے، اور دراصل اسی صدی سے شروع کیا گیا ہے، تاہم ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۵ء تک دس ہزار مسلمان کیتھولک عیسائی بنائے جاچکے ہیں،

مندرجۂ بالا اعداد سے بالواسطہ تبلیغ کی سرگرمیاں کسی قدر معلوم ہوتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ حاصل کیا ہوا؟ اس باب میں اعداد وشمار کی جستجو کے معنی یہ ہیں، کہ تبلیغی کام کو مطلق سمجھا ہی نہیں گیا، اس تبلیغ کا مقصد صرف یہ رہا ہے، کہ زمین تیار کر دی جائے تاکہ تخم ریزی ہوسکے، اور تمام مبلغین متفق ہیں، کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں بالواسطہ طریق تبلیغ کامیاب ثابت ہوا ہے، خود مبلغین کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ زیادہ دوستی اور رواداری کا ہو گیا ہے، مسیحی اخلاق نے مسلمانوں کے اخلاق کو بلند کر دیا ہے، طلاقوں میں تخفیف کر دی ہے، اور زن وشو کے تعلقات کو بہتر بنا دیا ہے،

تاہم اب بھی بہت زیادہ کام باقی ہے،

لیکن عیسائیت کا روشن ترین کارنامہ وہ نہیں ہے، جو اب تک کیا جا چکا یا کیا جا رہا ہے، بلکہ وہ ہے، جو آیندہ ہوگا، مسیحی دنیا کا متفقہ مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے خاص طور پر مبلغین تیار کئے جائیں، پوپ پیئس یازدہم نے ۱۹۲۳ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا، کہ محض تبلیغی سرگرمی کافی نہیں، اور نہ کامیاب تبلیغ کے لئے صرف تجربہ کام دے سکتا ہے، قربانی اور محنت کا ثمرہ اگر حاصل کرنا ہے، تو اس کے نئے سائنس کی روشنی میں ایسے طریقوں کے دریافت کرنے کی ضرورت ہے، جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں،

اس بنا پر آیندہ اسی شخص کو مبلغ مقرر کیا جائے گا، جو مسلمانوں سے پوری طرح واقف ہو، اور جس کا دماغ ان تمام غلط فہمیوں سے خالی ہو، جو عام طور پر اسلام کے متعلق پھیلی ہوئی ہیں، اس مبلغ کے لئے یہ بھی ضروری ہے، کہ مسلمانوں کے معائب اور جو چیز اس سے زیادہ مشکل ہے یعنی ان کے محاسن سے بھی باخبر ہو، سائنٹفک طریقہ پر کام کرنے کی خواہش نے الفاظ سے گذر کر عملی شکل بھی اختیار کر لی ہے، چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر پیرس کے کیتھولک انسٹی ٹیوٹ نے ۲۷-۱۹۲۶ء میں اسلام پر مسلسل خطبات دلوائے تھے، اور ۱۹۳۳ء میں یوگوسلافیا کی ایک یونیورسٹی نے مسلمانوں میں تبلیغی مشن کے لئے ایک شعبہ اپنے ہاں قائم کیا تھا، علاوہ بریں روما کی گریگورین یونیورسٹی اور ببلیکل اور اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ میں تبلیغ کے سہ سالہ نصاب میں مندرجہ ذیل مضامین بھی شامل ہیں:-

اسلامی دینیات، متن قرآن مجید، اسلام افریقہ میں اور عربی، ترکی اور شامی زبانیں،

تبلیغی نظام کے دو جزو اور بھی ہیں، دعا اور درویشوں کے حلقے، دعا تبلیغ کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے، پادریوں کی مختلف جماعتوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے، اور اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک متبرک ہے، درویشوں

کے حلقون کی تجویز موجودہ پوپ کی پیش کردہ ہے، ان حلقون سے قرونِ وسطیٰ میں تبلیغ کو بہت تقویت پہنچی تھی، اور یورپ کی تہذیب بہت کچھ ان کی رہینِ منت ہے، اُمید ہے کہ مسلمانوں پر بھی ان حلقوں کا بہت مفید اثر پڑے گا، الجزائر میں پانچ پادریوں نے ایک چھوٹا سا حلقہ قائم کرکے اس تحریک کی ابتدا کر دی ہے،

"ع ز"

# امریکہ میں سرطان کے علاج کی تدبیرین

یوں تو کینسر یا سرطان کا مرض تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن امریکہ میں اسکی بڑی کثرت ہی، اور ہر سال تقریبًا ڈیڑھ لاکھ آدمی اس کے شکار ہوتے ہیں، ۱۹۰۰ء میں وہاں اس مرض کا نمبر اسباب موت میں چھٹا تھا، مگر اب دوسرا ہے، اور صرف امراض قلب ہی اس سے زیادہ ہیں، گذشتہ ستمبر میں ذرکا یونیورسٹی، امریکہ کے کینسر انسٹی ٹیوٹ میں انگلستان یورپ اور امریکہ کے ماہرین سرطان نے جمع ہو کر اس مرض سے مقابلہ کرنے کیلئے نقشۂ جنگ تیار کر لیا ہی، اس وقت تک سبکو یہ تسلیم ہے کہ سرطان کا اصلی سبب معلوم نہ ہوسکا اور نہ یقین کیساتھ یہ کہا جاسکتا ہی کہ یہ مرض موروثی ہی یا نہیں، علاوہ برین ابتک اسکا کوئی قطعی اور مجرب علاج بھی معلوم نہیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرطان کے علاج میں اب تک کوئی ترقی نہیں ہوئی، بعض اقسام کے سرطان، خصوصًا جلد، منہ اور سینہ کے موافق حالات میں علاج پذیر ہوتے ہین، اگر صحت کے بعد پانچ سال تک سرطان پھر نہ ابھرے تو ازالہ کو مستقل سمجھنا چاہئے، ۱۹۳۳ء میں امریکہ کے ان لوگون کا شمار کیا گیا تھا جنکو صحت کے بعد پانچ سال تک پھر شکایت نہیں ہوئی، انکی تعداد تقریبًا (۲۴۴۴۰) تھی،

سرطان کوئی متعدی مرض نہیں ہے، اور نہ وراثت سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ایک عالمگیر مرض ہے، اور نہ صرف انسان بلکہ حیوانات اور نباتات بھی اس سے محفوظ نہیں، اسکی شکایت زمانہ قبل تاریخ مین بھی تھی، قدیم مصریوں کو بھی اس کا تجربہ تھا، ہندوستان کی بعض قدیم ترین طبی کتابوں میں بھی اسکا ذکر ہے

اسلئے یہ خیال صحیح نہیں جیسا کہ عطائیون نے مشہور کر رکھا ہو کہ یہ مرض موجودہ زمانہ کی پیداوار ہو اور چیچک کے ٹیکہ سے یا ان چیزوں کے کھانے سے جو ٹن کے ڈبون میں بند رہتی ہین، یا الیونیم کے برتن میں کھانا پکانے سے پیدا ہوتا ہو،

سرطان کے علاج کے لئے سینکڑون دوائیں لوگوں میں مشہور ہین، چنانچہ حال میں نیویارک کے ایک متمول مریض نے جب ازالۂ مرض کے لئے انعام کا اعلان کیا، تو اُسے ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نسخے بتائے گئے ان سب میں کوئی نہ کوئی جزو مشترک تھا، لیکن کوئی نسخہ کارگر ثابت نہ ہوا، موجودہ تحقیق کی روسے اسکا علاج اگر کامیاب ہوسکتا ہو، تو صرف جراحی اور ریڈیم کی شعاعون سے، لیکن جراحی یا ریڈیم کوئی بھی کافی نہیں ہوسکتا جب تک کہ مرض شروع ہی میں نہ معلوم کر لیا جائے، اور اس کا علاج فوراً نہ شروع کر دیا جائے، چند دنوں کی تاخیر سے ہلاکت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، اس مرض میں خطرناک علامتیں یہ ہین،:- (۱) سینہ یا جسم کے کسی دوسرے حصہ میں کوئی دمبل خصوصاً وہ جو بڑھنے یا شکل تبدیل کرنے لگے، (۲) کوئی زخم خصوصاً چہرہ یا منہ کا جو مندمل نہ ہوتا ہو، (۳) جسم کے کسی حصہ سے خون کا غیر معمولی طور پر خارج ہونا، جن لوگوں کو ان میں سے کوئی شکایت بھی ہو، انھین چاہئے کہ فوراً کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرین،

یہ اب تک دریافت نہ ہو سکا کہ سرطان کی ابتدا کیسے ہوتی ہے، ہونٹ اور منہ کا سرطان دانتون کی خرابی اور تمباکو خصوصاً پائپ پینے سے ہو سکتا ہے، اگرچہ لاکھون ایسے ہیں، جن کے دانت خراب ہیں اور وہ تمباکو بھی پیتے ہیں، لیکن اس مرض سے محفوظ ہیں، پیٹ کا سرطان سب سے زیادہ پایا جاتا ہو، اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، کبھی بہت گرم گرم کھانا کھانے یا بہت جلد جلد کھانے سے بھی ہو جاتا ہو، اور کبھی پیٹ کے کسی زخم سے غفلت برتنا بھی اس کا سبب ہوتا ہے، بعض اوقات رنگ سازون کے سرطان جلد میں رنگ کے پیوست ہو جانے سے پیدا ہو جاتے ہین، کوئلہ کے ذرّون کے باعث کانون کے مزدورون میں پھیپھڑے کا سرطان ہو سکتا ہے،

(ل - ڈ) "ع:"

## عربی کی چند نادر کتابیں

پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے کتب خانہ میں چند قدیم اور نادر قلمی کتابیں حال میں دستیاب ہوئی ہیں ان میں امام غزالی کی احیاء العلوم کے دو نسخے جو چودھویں صدی عیسوی کے لکھے ہوئے ہیں، ڈاکٹر نبیہ فارس ان نسخوں کی تصحیح ناقدانہ طور پر کر رہے ہیں، کیونکہ یہ کتاب جدید طرز تنقید کے لحاظ سے کبھی مکمل طور پر اڈٹ نہیں کی گئی، علاوہ بریں وہ اس کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں کر رہے ہیں، کیونکہ اب تک کسی یوروپین زبان میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا، اور نادر کتابوں میں زکریا رازی (متوفی ۳۱۳ھ) کا ایک رسالہ بھی ہے جو طب پر ہے، اور ۱۲۸۲ء کا لکھا ہوا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس رسالہ کا یہی ایک نسخہ اب باقی رہ گیا ہے، رازی پہلا شخص تھا، جس نے خسرہ اور چیچک میں سائنٹفک طریقہ پر امتیاز قائم کیا؛ طب پر ایک دوسرا رسالہ بھی ملا ہے، جو ابن نفیس (متوفی سنہ ۱۲۸۸ء) کے اصل نسخہ سے ۱۲۹۳ء میں نقل کیا گیا ہے، اس میں پھیپھڑوں کے دوران خون پر مستقل بحث ہے، عام خیال یہ ہے کہ دوران خون کا یہ نظام اول اول اسپین کے ایک فاضل مائیکل سرویٹس (MICHAEL SERVETUS) نے دریافت کیا تھا، جو ابن نفیس سے تقریباً تین صدی بعد گذرا ہے، الفرغانی (متوفی سنہ ۸۶۱ء) کا ایک رسالہ ہیئت پر دستیاب ہوا ہے، جس کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں بار بار کیا جا چکا ہے، اور جس کی اشاعت یورپ میں ہیئت کے دوسرے رسالوں سے زیادہ ہوئی ہے، پروفیسر ہٹی (HITTI) پرنسٹن یونیورسٹی کا خیال ہے، کہ طب کے بعد غالباً ہیئت

بھی وہ مضمون ہے، جس پر قرون وسطیٰ کے عرب فاضلوں نے سب سے زیادہ لکھا ہے، ایک مخطوط اور بھی بہت اہم نکلا ہے، یہ دور اندازی، آتشبازی اور سرنگ بنانے کے فن پر ہے، اور عثمان المہتدی کی تصنیف ہے، جو بظاہر ایک ترک معلوم ہوتا ہے اور دریاے والگا پر قلعۂ بخار میں متعین تھا، یہ رسالہ ۱۵۵۳ء کا لکھا ہوا ہے اور (۱۰۹) صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بکثرت نقشے اور شکلیں دی ہوئی ہیں۔

# عربی صحافت

بیروت کی امریکن یونیورسٹی کی طرف سے اُن تمام عربی اخبارات و رسائل کی ایک فہرست شائع ہوئی ہے، جو ۲ دسمبر ۱۸۲۸ء کو التنبیہ (اسکندریہ) کی اشاعت سے لیکر ۱۹۲۹ء تک نہ صرف ان ملکوں میں جہاں عربی بولی جاتی ہے، بلکہ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں شائع ہوئے ہیں، ان اخبارات اور رسائل کے بانیوں کے نام اور ان کی اولین اشاعت کی تاریخیں بھی صحت کیساتھ درج کی گئی ہیں، مسلم ورلڈ کا نامہ نگار اس میں صرف اسقدر اضافہ اور کرتا ہو کہ لسان العرب دمشق سے منتقل ہونے کے بعد بغداد میں پہلی بار ۲۳ جون ۱۹۲۱ء کو نکلا تھا، اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے، کہ تعداد کے لحاظ سے مصر کا نمبر سب سے زیادہ ہے، جہاں عربی رسائل کی تعداد (۱۲۹۰) ہے، لیکن آبادی کے نقطۂ نظر سے لبنان بڑھا ہوا ہے، جہاں اوسطاً دو ہزار باشندوں کے لئے ایک رسالہ ہے، جب کہ مصر میں دس ہزار کے لئے ایک اور بعض دوسرے عربی ممالک میں چھ لاکھ کے لئے ایک ہی، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متعدد شہروں میں جو عرب سے دور واقع ہیں، مثلاً نیویارک جہاں سے (۵۲) رسالے نکلتے ہیں، ساں پالو (جنوبی امریکہ) جہاں سے (۹۴) اور بیونس ایریز (جنوبی امریکہ) جہاں سے (۲۹) رسالے نکلتے ہیں، عربی رسالوں کی اشاعت کہیں زیادہ ہے، بہ نسبت ان بہتیرے شہروں کے جو ایسے ملکوں میں واقع ہیں، جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے، مثلاً یروشلم، ٹریپولی، طنطہ، یافہ، الجزائر، اور بصرہ

اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے، کہ شام سے منتقل ہو کر لوگ کثرت شمالی اور جنوبی امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں،

## امریکہ کی سب سے قدیم یونیورسٹی

گذشتہ ستمبر میں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی نے اپنی سہ صد سالہ جوبلی کی تقریب نہایت شاندار طریقہ پر منائی، تمام دنیا کے فضلاء اس میں مدعو کئے گئے تھے، چنانچہ غیر ممالک کے نمایندوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی،

ہارورڈ (HARVARD) ریاستہائے متحدہ امریکہ کی پہلی یونیورسٹی ہے یہ ۱۶۳۶ء میں قائم ہوئی تھی یعنی حکومت ریاستہائے متحدہ سے بھی (۱۴۰) سال قبل، یہ امریکہ کی پہلی یونیورسٹی ہے جسکی ڈگریوں کو آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں نے ۱۹۰۵ء ہی میں اپنی ڈگریوں کے برابر تسلیم کر لیا، پہلی آنریری ڈگری جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے کسی صدر کو ملی، وہ اسی یونیورسٹی کی تھی، اور ۱۷۷۶ء میں جارج واشنگٹن کو دی گئی تھی، یہ پہلی امریکن یونیورسٹی ہے، جس کے فارغ التحصیل طلبہ نے ایک دوسری یعنی ییل (YALE) یونیورسٹی ۱۷۰۱ء میں قائم کی، تاریخ امریکہ کی تعلیم کی ابتدا بھی ۱۶۳۵ء میں سب سے پہلے اسی یونیورسٹی میں ہوئی، ۱۶۳۶ء میں ہارورڈ کالج کے لئے جو شروع میں پادریوں کی تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا تھا، حکومت کی طرف سے چار سو پونڈ منظور ہوئے تھے، اسی سرمایہ سے ایک سہ منزلہ عمارت بنادی گئی تھی، لیکن آج اس یونیورسٹی کی عمارتوں کی قیمت ڈھائی کروڑ ڈالر ہے، ۱۶۳۸ء میں پادری جان ہارورڈ (REW. JOHN HARVARD) نے جو انگلستان کا باشندہ اور شکسپیر کا دوست تھا، اپنی وفات کے وقت اپنا کتب خانہ اور نصف جائداد اس کالج کے نام لکھ دی، کتب خانہ چار سو جلدوں پر مشتمل تھا، اور نصف جائداد کی قیمت آٹھ سو پونڈ تھی، کالج اب تک بے نام تھا، اس وصیت نامہ

کے بعد اس کا نام ہارورڈ کالج رکھ دیا گیا،

طلبہ کی تعداد میں بہ نسبت پہلے کے زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے، سترہویں صدی میں ہر درجے میں تین سے لیکر نو لڑکے تک رہتے تھے ۱۶۴۲ء میں پہلے گریجویٹ کلاس میں صرف نو لڑکے تھے اب یونیورسٹی کے ابتدائی درجہ کا اوسط (۱۰۰۰) رہتا ہے ۱۹۳۶ء میں (۱۰۰۰) طلبہ وہاں سے گریجویٹ ہو کر نکلے ہیں، مصارف میں بھی ایسا ہی فرق ہوگیا ہے، سترہویں صدی میں ہارورڈ کا طالب علم پچاس ڈالر سالانہ میں کفایت شعاری کے ساتھ تعلیم اور خورونوش کے اخراجات پورے کر سکتا تھا اب نہایت کفایت شعاری سے رہنے پر بھی تیرہ سو ڈالر سالانہ سے کم کا خرچ نہیں ہے، اگر کلب اور سیر و تفریح کے مصارف بھی شامل کر لئے جائیں، تو چھ ہزار ڈالر سے زائد چاہئیں،

ہارورڈ یونیورسٹی کے زندہ فارغ التحصیل طلبہ کی تعداد اسوقت ستر ہزار سے کچھ اوپر ہی ہے

## سوویٹ روس کی آیندہ مردم شماری

۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء کو سوویٹ روس کی آیندہ مردم شماری ہونے والی ہے جس وسیع پیمانہ پر اسکی تیاریاں ہو رہی ہیں، اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے ہوگا:۔

اس مردم شماری میں بارہ لاکھ شمار کنندگان اور ایک لاکھ بیس ہزار حکام کام کریں گے، ایک ہزار ٹن سے زائد کاغذ کی ضرورت ہوگی جس پر پانچ کرور پچاس لاکھ مردم شماری کے فارم چھاپے جائیں گے، خاص مشینیں تیار کیجا رہی ہیں جن سے اعداد و شمار کئے جائیں گے، مردم شماری کے دفتر جابجا قائم کر دیئے گئے ہیں اور ملک کے بعض شمالی حصوں میں جو موسم سرما میں ناقابلِ گذر ہو جاتے ہیں مردم شماری کا کام شروع بھی کر دیا گیا ہے،

جنوری ۱۹۳۳ء میں سوویٹ روس کی آبادی (۱۶۵۷۷۱۴۰۰) تھی، امید کی جاتی ہے کہ آیندہ مردم شماری میں سترہ کرور تک پہونچ جائے گی،

"ع ز"

## دعا

از جناب اسد صاحب بی اے ملتانی،

اے دل تو ہی بتا کہ میں مانگوں خدا سے کیا  
ہوتا ہی ہے جہان میں میری رضا سے کیا،

ہے زیست اپنے بس میں نہ موت اختیار میں  
مطلب ہیں پھر اپنی فنا و بقا سے کیا،

طوفان کا زور و شور ہے دریا ہے موجزن  
آب و ہوا کو آز رہے ناخدا سے کیا،

وقت معینہ پہ خزاں آئے گی ضرور،  
ہوتا ہے عندلیب کے شور نوا سے کیا،

اس کے سوا کہ دل کا نکل جائے کچھ بخار  
ہوتا ہے غم نصیب کی آہ و بکا سے کیا

جو حلقۂ کمان قضا سے نکل چکا،  
رک جائے گا وہ تیر میری التجا سے کیا

وہ بھی تو اپنے کام میں مجبور محض ہیں،  
شکوہ کروں میں کارکنان قضا سے کیا

ہر بات سے وہ قادر مطلق ہے بے نیاز  
اسکو بھلا غرض ہے میرے دعا سے کیا

اٹھتے ہیں خود بخود مرے دست دعا اسد  
ہر چند سوچتا ہوں کہ ہوگا دعا سے کیا،

## سخن ماہر

از جناب ماہر القادری صاحب،

آرزو اک فریب باطل ہے،  
عشق ہی آپ اپنا حاصل ہے،

عیش وغم سے فراغ حاصل ہے | یہ خودی پوچھنے کے قابل ہے
مرحبا اے وفورِ ناکامی | تو مری کوششوں کا حاصل ہے
مختلف ہیں حیات کے پہلو | موت بھی اک اسی کی منزل ہے
عیش ہے وہم، رنج وغم ہے خیال | زیست کا ہر نظام باطل ہے
نبضِ امید چھٹ گئی شاید | آج دل کیوں سکوں پہ مائل ہے
درد میں کیوں سکون پاتا ہوں | زہر بھی کیا دوا میں شامل ہے
میں ہوں اور موجِ بحرِ غم تاہنر | غم کشتی نہ فکرِ ساحل ہے

## کیفِ تغزل

جناب مولوی محمد مبین صاحب کیفی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

تابہ دامن وسعتِ چاکِ گریباں کیجئے | بن پڑے تو ہوش میں وحشت کا ساماں کیجئے
چشمِ نظارہ کو خیرہ، دل کو حیراں کیجئے | آئیے کچھ ہمتِ دیدارِ جاناں کیجئے
کیجئے اجزائے ہستی کو پریشاں کیجئے | اور پھر ان کو غبارِ کوئے جاناں کیجئے
ہے یہی وسعت عدم کی، ہے یہی حدِ وجود | یا نہیں کر دیجئے یا لطفِ ہر آں کیجئے
ہے ادب کا ترک یہ ہنگامۂ بحثِ وجود | کھوئیے اپنے کو تو پھر اس کا ارماں کیجئے
جی میں ہے یوں آج سنئے نغمۂ سازِ حیات | دل کو مضرابِ سرِ تارِ رگِ جاں کیجئے
ہے جہاں میں سب سے آگے سرحدِ ادراکِ عشق | یعنی دل کو بے نیازِ کفر و ایماں کیجئے
اس کا جلوہ دیکھ کر اپنے کو بھولا آپ ہی | آہ کس کے سامنے دعوائے عرفاں کیجئے
لعل لب ہم رنگِ غنچہ، رنگِ رخ رنگِ بہار | آئیے نظارۂ فصلِ بہاراں کیجئے
گردشیں اب دہر کی کہتی ہیں کیفی کیا کہوں | زندگی بھر شکوۂ جورِ عزیزاں کیجئے

# باب التقریظ والانتقاد

## "اہلِ ہند کی زندگی اور حالات" (سنہ ۱۲۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک)

از جناب ڈاکٹر کنور محمد اشرف صاحب پی ایچ ڈی، ناشر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ صفحات [illegible] قیمت [illegible]

مسلمانوں کے عہد پر آج تک جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں، وہ بادشاہوں کی سیاسی جنگ اور خانگی خونریزی اور ان کے ملکی اداروں اور حکمت عملی سے متعلق ہیں، عوام کے خانگی معاشرتی، اجتماعی اور اقتصادی حالات کو ان میں بہت کم جگہ ملی ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ میں جب کوئی صاحبِ قلم ان گذشتہ تاریخوں کی مدد سے سیاسی اور جنگی واقعات کے علاوہ کچھ اور لکھنا چاہتا ہے، تو اس کا یہ کام نہ صرف مشکل اور صبر آزما بلکہ اکثر اوقات حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے، اس کتاب کے مؤلف نے اسی مشکل، صبر آزما اور حوصلہ شکن کام کو انجام دیا ہے، انھوں نے اپنی اس تالیف کے لئے اس عہد کی عام تاریخوں کے علاوہ ہر قسم کی نظم و نثر کتابیں پڑھیں، اور ان سے ذرہ ذرہ چن کر معلومات کا یہ ذخیرہ فراہم کیا ہے،

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے، پہلا سیاسی، دوسرا اقتصادی اور تیسرا معاشرتی حالات پر ہے، سیاسی حالات میں لڑائیوں اور مہموں کا تذکرہ نہیں، بلکہ "سلاطینِ دہلی کی حکومت اور اس کا ردِ عمل مسلمانوں کی معاشرت پر"، "سلطان خانگی زندگی میں" "سلطان پبلک زندگی میں" شاہی دربار کی تہذیب" طبقہ امراء" "مذہبی گروہ" جیسے عنوانات پر معلومات ہیں، اقتصادی حالات میں "دیہی زندگی"، "زمین کی پیداوار"، "دیہی صنعت" گھریلو صنعت" "دیہات کی اقتصادی زندگی کے معیار" پارچہ بافی" پتھر اور اینٹ کے کام" "کاغذ و شکر سازی" چرم سازی"

صنعتی کاموں کی نوعیت" پھر بیرونی، بحری اور بری تجارت، اور اس کے بعد مختلف معاشرتی جماعتوں کے معیار زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے، معاشرتی حالات کے سلسلہ میں یہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں، مشترکہ خاندان، عورتوں کی حیثیت، پردہ اور دونوں صنفوں کے معاشرتی ارتباط، خانگی واقعات، شادی" موت، ستی، جوہر، شہر کا نقشہ، شاہی مکانات کے حصے، فرنیچر، پوشاک اور کپڑے، سامان آرائش و زیورات، غذا، سامان، تفریح، فوجی وجسمانی کھیل، پولو، گھوڑدوڑ، شکار، گھریلو کھیل، ہندوؤں کے تہوار، مسلمانوں کے تہوار سلطنت کی تقریبات، ناچ گانا عام عادات و اطوار وغیرہ،

ان واقعات کی تفصیل میں مؤلف نے ہندو اور مسلمان دونوں کے حالات پر روشنی ڈالی ہے، موجودہ دور میں جب کوئی صاحب قلم اس قسم کی مساعی جمیلہ میں مصروف ہوتا ہے، تو قومی جذبہ سے متاثر ہو کر صرف اپنے ہم قوم کے حالات و واقعات کو روشن کرتا ہوا اور ہمسایہ قوموں کی تفصیلات کو نظرانداز کر دیتا ہے، لیکن مؤلف مذکور نے اپنی کتاب میں ہندو مسلمان دونوں کی معاشرت یکساں طور پر دکھائی ہے، اور پھر نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ واقعات پر جذبہ اور عصبیت کی لہریں کہیں موجزن نہیں، مؤلف نے صرف تفصیلات اور جزئیات لکھ دیتے ہیں، ان سے نتائج مرتب کرنا ناظرین پر چھوڑ دیا ہے،

اس سلسلہ میں مؤلف نے ایک موضوع کو کافی تشنہ چھوڑ دیا ہے، ہندو اور مسلمان دو مختلف تمدنوں کے علمبردار تھے، مگر دونوں کے ارتباط سے دونوں کی معاشرت، تہذیب اور مذہب میں اہم عناصر و اجزاء پیدا ہوتے گئے، لیکن اس انقلاب پر مؤلف کی نگاہیں دور تک نہیں پہنچ سکی ہیں، یہ موضوع زیر نظر کتاب کے لئے ہر لحاظ سے دلچسپ اہم اور مفید ہوتا،

مؤلف نے چونکہ ایک اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اسلئے اس کو اپنے فرض کے انجام دینے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لینا پڑا ہے، سیاسی واقعات کی تفصیلات سے جزئیات اور معاشرتی جزئیات سے تفصیلات پیدا کی ہیں، یہ تاریخی استنباط و استنتاج کا راستہ بے حد پرخطر ہے جزی

واقعات سے کلی نتیجہ نکالنے میں بسا اوقات ٹھوکریں لگتی ہیں، اس راہ میں مصنف کا اعتدال قابل داد ہے، مولف نے نہ صرف معاصر تاریخوں بلکہ نظموں، قصوں اور فقہ و قانون کی کتابوں سے بھی مدد لی ہے، فقہ، قانون اور قصوں سے تمدن، معاشرت اور طرز ماند و بود کے بہت سے مسائل و معلومات بڑی دقت نظر سے فراہم کئے ہیں،

مولف نے معلومات کا ایک گوشہ قصداً چھوڑ دیا ہے، یعنی صوفیائے کرام کی تصنیفات اور ملفوظات، حالانکہ ان کتابوں مثلاً حضرت فریدشکر گنج، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، اور حضرت مخدوم عبد الحق ردولوی وغیرہ کے ملفوظات میں معلومات کا وافر حصہ مل سکتا ہے، "ص ع"

---

# مختصر تاریخ ہند

از مولینا سید ابو ظفر صاحب ندوی

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولینا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں،

ضخامت:- ۲۰۰ صفحے، قیمت:- ۸؍

# مقالات شبلی جلد چہارم

مولینا کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ضخامت ۱۰۵ صفحے، قیمت:- ۱۲؍

"منیجر"

# مطبوعات جدیدہ

**منظر آئینہ و جواہر آئینہ**۔ مولفہ جناب محمد احمد صاحب بیخود موہانی، ایم اے پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ، تقطیع چھوٹی، ضخامت علی الترتیب ۶۵ و ۲۰۴ صفحات، کاغذ سپید، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۱ر و ۵ر، مصنف سے اوپر کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

کئی سال ہوئے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی لکھنؤ یونیورسٹی نے ہندوستانی زبان کی شاعری کی مدافعت میں "ہماری شاعری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں انعام کی مستحق قرار پائی، اور اس وقت وہ بی اے کے نصاب میں داخل ہے، اوپر کے دونوں رسالے اسی کتاب کی تنقید میں ہیں، ہماری نظر سے بھی یہ کتاب گذری ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب خامیوں سے پاک نہیں ہے خصوصاً بعض تاویلیں بہت دور از کار اور بعض تشریحیں محل نظر ہیں، مثالوں کے انتخاب میں زیادہ تلاش سے کام نہیں لیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود ہندوستانی شاعری کی مدافعت میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، ہم کو بیخود صاحب کی سخن فہمی اور ناقدانہ نگاہ سے انکار نہیں، لیکن ہم کو ان کے اصول تنقید سے اختلاف ہے، تنقید کے معنی یہ ہیں کہ اختصار اور تعین کے ساتھ اغلاط اور نقائص دکھا دیئے جائیں، اگر اشعار کا تجزیہ اور تحلیل کرکے اور خاص مقدمات قائم کرکے ان سے نتائج نکالے جائیں تو ہمارے خیال میں کوئی شعر تنقید سے نہیں بچ سکتا، کہ اس طرز تنقید میں بڑی وسعت ہے، اور ہر شخص کا ذوق و وجدان جدا جدا ہے، پھر جناب ناقد نے اصل شے یعنی رضوی صاحب کے نفس خیالات و آراء

پر بہت کم تنقید کی ہے، بلکہ زیادہ تر ان کی پیش کردہ مثالوں کی تشریح پر ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ رضوی صاحب کی پیش کردہ مثالوں سے بہتر اور واضح تر مثالیں مل جائیں، لیکن ان کو غلط کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، البتہ بعض مثالوں اور خصوصاً ان کی تشریحات سے ہم کو بھی اتفاق نہیں ہے، بہرحال اس تنقید سے یہ ایک بڑا فائدہ ہوا کہ جناب نجو جیسے ادیب کے قلم سے زبان و ادب کے متعلق بعض مفید ادبی معلومات کا ہماری زبان میں اضافہ ہوا،

**اسبابِ زوالِ امت،** مصنفہ امیر شکیب ارسلان، مترجمہ مولانا احسان سامی حقی یک، شائع کردہ سیرت کمیٹی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۷ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۳ جو لوگ زیادہ تعداد میں خریدنا چاہتے ہیں ان کو اسی روپیہ ہزار دس روپیہ سیکڑہ اور روپیہ میں آٹھ ملے گی، پتہ سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور،

یہ رسالہ دنیائے اسلام کے نامور صاحبِ قلم اور مخلص مسلمان امیر شکیب ارسلان کی تصنیف اور سیرت کمیٹی کے مفید نشریات کی ایک کڑی ہے، اسمیں فاضل مصنف نے عقل، مذہب، تاریخ اور روایات کی روشنی میں دکھایا ہے، کہ مسلمانوں کے زوال کے حقیقی اسباب جانی و مالی جہاد سے ان کی پہلو تہی، دین و وطن سے غداری، جہالت، کم علمی، اخلاقی زوال، بزدلی، الحاد و بے دینی، اور تنگ خیالی و قدامت پرستی ہیں، پھر اس عامیانہ اعتراض کی تردید میں کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب خود ان کی تہذیب ہے، دنیا پر اسلامی تہذیب کے برکات اور احسانات دکھائے ہیں، آخر میں علم و حکمت کی تحصیل کی ترغیب میں آیاتِ قرآن پیش کی گئی ہیں، ہر بحث شواہد سے مدلل ہے، یہ مفید رسالہ عوام سے زیادہ تعلیم یافتہ طبقہ کے پڑھنے کے لائق ہے،

**جدید خطباتِ جمعہ،** مرتبہ مولانا خطیب رازی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۲ ممبران کمیٹی سیرت کے لئے ۱ پتہ :- سیرت کمیٹی پٹی، ضلع لاہور،

آجکل خطبۂ جمعہ کا حقیقی مقصد بالکل فوت ہوگیا ہے اور اس کی جگہ محض رسمی خطبہ رہ گیا ہے، ہندوستان میں بارہا خطبات جمعہ کو با کار بنانے کی تحریک کی گئی لیکن مختلف اسباب کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکی، سیرت کمیٹی نے اس ضرورت کو محسوس کرکے ہندوستانی زبان میں فی الحال سات خطبات مرتب کرائے ہیں، پہلا خطبہ خطبات جمعہ کی اہمیت اور اس کے حقیقی اغراض و مقاصد کی تشریح میں ہے، دوسرا خدا کی توحید، تیسرا قرآن کی مظلومی، چوتھا تعلیم، پانچواں تبلیغ دین، چھٹا اسلامی برادری، ساتواں اسلام میں فرقہ بندی پر، ہر خطبہ کے مقصد کو نہایت اختصار اور خوبی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، ان کو عربی خطبہ کے قبل یا بعد پڑھنا عام مسلمانوں کے لئے مفید ہوگا،

**تحفۃ الاسلام لجمیع الاقوام**، شائع کردہ مولوی وحید الحسن صاحب صدیقی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت درج نہیں، پتہ وحید الحسن صاحب جنرل سکریٹری انجمن ہدایت الاسلام لکھنؤ۔

یہ وہ مضمون یا دعوت نامۂ اسلام ہے، جو لکھنؤ کی گذشتہ جلسہ مذاہب کی کانفرنس کے موقع پر دار المبلغین کی جانب سے اچھوت اقوام کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس میں اسلام کی ان خصوصیات اور تعلیمات کو جو عقلی حیثیت سے اسکی صداقت کا ثبوت، اخلاقی اور عملی حیثیت سے انسانوں کی دنیوی اور اخروی فلاح کی ضامن، اور حریت اور مساوات کے نقطۂ نظر سے قابل قبول ہو سکتی ہیں، آیات قرآنی سے دکھایا گیا ہے، اور اس کی تائید میں غیر مذاہب کے علماء کی شہادتیں بھی پیش کی گئی ہیں، زبان صاف سادہ اور انداز بیان سنجیدہ اور دلنشیں ہے، کسی مذہب پر کوئی حملہ نہیں ہے، یہ رسالہ غیر مسلموں خصوصاً پڑھے لکھے اچھوتوں میں تقسیم کرنے کے لائق ہے، لیکن تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور اسامہ بن زیدؓ کے قنوج آنے کی روایت بالکل مہمل ہے،

**اسلام اور اشتراکیت**، شائع کردہ خانبہادر محمد یوسف آنریری مجسٹریٹ دہلی

تقطیع اوسط، حجم ۱۴۴ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت نہایت معمولی خان بہادر صاحب سے بلاقیمت مل سکتی ہے،

یہ کتاب جیسا کہ اس کے سرورق سے واضح ہوتا ہے کسی عالم دین بزرگ کی تصنیف ہے جنھوں نے کسی مصلحت سے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہے، اس میں اشتراکیت کی مختصر تاریخ اور اسکے اصول ونظام کو واضح کرکے اسلام اور قرآنی تعلیمات سے ان کا تضاد اور ان کے ہولناک نتائج دکھائے گئے ہیں، پھر اس کے مقابلہ میں اشتراکیت اور اس کے بنیادی تخیل کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے،

**آشوب زمانہ** مصنفہ ایم اسلم صاحب تقطیع چھوٹی حجم ۰۰ صفحات، کاغذ سپید کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب بل روڈ لاہور،

یہ کتاب پنجاب کے مشہور افسانہ نگار ایم اسلم صاحب کی تازہ تالیف ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اسلم صاحب کو راوی کے کنارے "کسی کے نام کسی کے خط" کا ایک ٹکڑا بہتا ہوا ملتا ہے، شاعر تحریر کی دلکشی دیکھ کر صاحب تحریر سے خیالی مراسلت شروع کر دیتا ہے، آشوب زمانہ انہیں خطوط کا مجموعہ ہے، اس میں حسن وعشق کے نکات، مردوں اور عورتوں کی نفسیات، موجودہ تہذیب ومعاشرت اور رسوم کے بعض مضر پہلوؤں پر دلچسپ شاعرانہ تنقید کیگئی ہے، بیچ بیچ میں بعض تمثیلی افسانے بھی آگئے ہیں،

"م"

**کنز المحاورات فارسی** از مولینا شاہ محمد وارث امام صاحب قادری پھلواروی، شائع کردہ مجیب منزل پھلواری شریف ضخامت ۹۲ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ قیمت عہ،

طلبہ کی دشواریوں کا لحاظ کرکے جو کتابیں عام طور پر لکھی جاتی ہیں، ان میں یہ تالیف خصوصیت کیساتھ مفید معلوم ہوتی ہے، اس میں فارسی زبان کے تقریباً ڈھائی ہزار محاورات کا ترجمہ حروف تہجی کی ترتیب کیساتھ اردو اور انگریزی میں درج ہے، امید ہے کہ یہ کتاب اسکولوں اور کالجوں میں بہت مقبول ہوگی، طلبہ کے حلقہ کے باہر بھی اس سے بہت کچھ مدد ملسکتی ہے،

"ع ز"

دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۰



# معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

---

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

# دارالمصنفین کی تاریخی کتابیں

**تاریخ صقلیہ جلد اول** مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانچسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہو کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اسکی تاریخ مرتب کیگئی ہو، جن میں سے پہلی جلد اب شائع ہو گئی ہو جو سیاسی سرگزشت پر مشتمل ہو، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات سسلی اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا اسلامی حکومت کا قیام عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب جلا وطنی کی تفصیل مرقع دکھایا گیا ہو، ضخامت مجموعی ۴۰۰ صفحے کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت: للعصہ جلد دوم زیر طبع ہو، مرتبہ سید ریاست علی ندوی۔

**تاریخ فقہ اسلامی**، مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہو جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہو، حجم ۴۰۰ صفحے، قیمت للعصہ مترجمہ مولانا عبدالسلام ندوی،

**رقعات عالمگیر** اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اور رقعات زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں ایک جلد میں جمع کئے گئے ہیں اور ان سے علم و ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۲۹۴ صفحات، چھپائی لکھائی کاغذ بالخصوص ٹائیٹل نہایت دلفریب، قیمت: للعہ مرتبہ سید نجیب اشرف ایم اے ندوی

**مقدمہ رقعات عالمگیر** اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہو جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے طریقہ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں بالخصوص خود عالمگیر کے انشا اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے، لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ ضخامت ۶۰۰ صفحے، قیمت: عہ مصنفہ سید نجیب اشرف ایم اے، ندوی،

**الفاروق** یعنی حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور طرز حکومت صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر، مولانا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہو، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں ایڈیشن فروخت ہو رہے ہیں مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ ایڈیشن کی تلاش تھی مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا ایڈیشن تیار کرایا ہو، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائیٹل، ضخامت ۷۱۲ صفحے، قیمت: للعصہ

**خلفائے راشدین**، سیر الصحابہ کا حصہ اول، چاروں خلفاء کے ذاتی فضائل اور مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا مجموعہ ۴۰۰ صفحے، قیمت: ہے از مولانا حاجی معین الدین ندوی

(دارالمصنفین کی کتابوں کی مفصل فہرست دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ سے طلب کیجئے)

مسعود علی ندوی، منیجر دارالمصنفین، اعظم گڈھ

جلد ۳۸ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء | عدد ۶

## مضامین


| مضمون | مضمون نگار | صفحات |
|---|---|---|
| شذرات | سید سلیمان ندوی، | ۴۰۲-۴۰۴ |
| کتبخانۂ حمیدیہ | " | ۴۰۵-۴۱۱ |
| دیوان شمس تبریز اور مولانا ے روم، | جناب پروفیسر غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے، نظام کالج، حیدرآباد دکن، | ۴۱۲-۴۲۵ |
| کلام خواجہ سنائی غزنوی، | جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی | ۴۲۶-۴۲۸ |
| اسلام سوڈان میں، | مولوی محمد یوسف صاحب رفیق دار المصنفین، | ۴۲۹-۴۳۸ |
| عباسی دربار کے اثرات عربی ادب و ثقافت پر | جناب عبد القیوم صاحب ایم اے ریسرچ اسٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی، | ۴۳۹-۴۴۷ |
| کائنات بغیر خدا کے | "ع ز" | ۴۴۸-۴۵۲ |
| مدت حیات کی توسیع، | " | ۴۵۳-۴۵۵ |
| اخبار علمیہ | " | ۴۵۶-۴۵۹ |
| حمایت اسلام کا مطبوعہ قرآن پاک، | "س" | ۴۶۰-۴۶۳ |
| "نقش و نگار" | شاہ معین الدین احمد ندوی، | ۴۶۴-۴۷۵ |
| مطبوعات جدیدہ، | " | ۴۷۶-۴۸۰ |

## ایک نواب عالم کی وفات

ہندوستان کے اُن پرانے مسلمان خاندانون مین سے جو شرافتِ نسب کے ساتھ علم اور دولت دونون کے جامع ہین، اب خال خال گھرانے رہ گئے ہین، انہی مین سے ایک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم کا خاندان تھا، جن کے چھوٹے صاحبزادہ صفی الدولہ حسام الملک شمس العلما، نواب سید محمد علی حسن خان مرحوم نے ۱۵ نومبر ۱۹۳۶ء مطابق ۳۰ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ کی صبح کو اپنی کوٹھی بھوپال ہوس لال باغ لکھنؤ مین بہتر برس کی عمر مین وفات پائی، افسوس ہے کہ ایک پرانے خاندان کے فضل وکمال اور جاہ وجلال کی یادگار آج مٹ گئی،

---

مرحوم ان لوگون مین تھے جن کی آنکھون نے مسلمانون کے علمی و تعلیمی سیاسی و تمدنی انقلاب کے مناظر دیکھے، وہ پیدا تو ایک کنسرویٹو گھرانے مین ہوے، اور اسی ماحول مین تعلیم و تربیت پائی، لیکن فطرت کی طرف سے وہ ایک اثر پذیر اور حساس دل لائے تھے، باوجود اس کے کہ وہ بھوپال مین پیدا ہوئے جہان حد درجہ قدامت کی حکومت اور سطوت تھی، اور ممکن نہ تھا کہ نور محل مین نئی روشنی کی ایک کرن بھی پہنچ سکے، مگر استعداد طبع دیکھئے کہ خود بخود ادھر طبیعت کا میلان ہوا، سر سید کی جدید تعلیمی تحریک مین، اور پھر ندوۃ العلماء کی مذہبی تحریک مین شریک ہوے اور ہر قسم کی جانی و مالی خدمتین انجام دین، مدت تک ندوہ کے اعزازی ناظم رہے، دار المصنفین کے اساسی ارکان مین تھے، اور لکھنؤ کی ہر سنجیدہ تحریک مین انکا

نام سرفہرست رہتا تھا،

وہ عربی زبان کے عالم، فارسی زبان کے ماہر، اور اردو کے مشاق اہل قلم تھے۔ فارسی شعر و سخن اور محاورات پران کو عبور کامل حاصل تھا، فارسی کا مشکل سے کوئی اچھا شعر ہوگا جو اُن کو یاد نہ ہو، خود بھی فارسی میں اکثر اور اردو میں کمتر شعر کہتے تھے، انھوں نے اپنے والد ماجد کے زمانۂ عروج میں دنیا بھر کے مشرقی علمأ و فضلا کی صحبتیں اٹھائی تھیں، اور سوائے علمی و ادبی چرچوں کے اُن کے کانوں میں کوئی بات پڑی ہی نہ تھی، ان کے لئے ان کے والد نے ہر فن کے باکمال استاد مقرر کئے تھے، جنکے سایۂ تربیت میں وہ پلکر جوان ہوئے،

وہ ہماری زبان کے مصنف بھی تھے، متعدد مذہبی اور تاریخی کتابیں اُن کے قلم سے نکلیں، شعراء کے تذکرے ان کی جوانی کی یادگار ہیں، فطرۃ اسلام اور مآثر صدیقی ان کی بہترین کتابیں ہیں، آخر میں "مردم دیدہ" کے نام سے ان باکمالوں کے حالات لکھ رہے تھے جن سے ان کو ملنے کا اتفاق ہوا، اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں، ان میں بڑا حصہ شعراء کا تھا،

وہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے بے تکلف دوستوں میں تھے، اور ایک دوسرے کے سچے قدردان تھے، یہی وراثت منتقل ہوکر ہم تک پہنچی، موصوف کو ہم لوگوں سے اس درجہ محبت اور شفقت تھی جو خاندانی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی، اور اس کو اس وضعداری سے نباہا کہ تیس برس کے عرصہ میں ایک دفعہ بھی اس میں فرق نہ آیا، وہ مجسم اخلاق، حد درجہ پاک باطن اور نیک طینت تھے، شر و فساد سے طبعی نفور اور ہنگامہ آرائیوں سے کوسوں دور تھے، تمول کے باوجود خاکسار اور علم و فضل کے باوجود ملنسار تھے،

مذہبی خیالات میں گو وہ عقلیت کی طرف مائل تھے، لیکن اسی کے ساتھ مذہبی پابندی ان میں اتنی

سخت تھی کہ ان کی ایک نماز بھی ان کے مقررہ اوقات سے ٹلنے نہیں پاتی تھی، رسم و رواج و بدعات کا ان کے گھر میں نشان نہ تھا، اور رسا... میں وہ نہایت سخت تھے، ان کی محفل میں علم و فن، شعر و سخن اور قومی مسئلوں کے سوا کوئی اور مذکور نہ تھا، عربی کتابیں ان کو پڑھے ہوئے مدت ہو چکی تھی، اور پھر ان کا کوئی مشغلہ نہ رہا، تاہم جب ذکر آجاتا تو ان کو بھولے ہوئے خواب کی طرح بہت سی باتیں یاد آجاتی تھیں۔

---

نورمحل کے رہنے والے! تو بڑے باپ کا چشم و چراغ اور ایک پرانے خاندان کا چراغ سحر تھا، نومبر ۱۹۳۲ء کو تیرا آخری دیدار نصیب ہوا، خیال نہ تھا کہ علم و فضل کا یہ ٹمٹماتا ہوا دیا اتنا جلد بجھ جانے والا ہے، اب تو وہاں ہوگا جہاں خدا چاہے نور کے سوا ظلمت کا گذر نہیں، صفی الدولہ! حسام الملک! اب تو اس ملک میں ہے جہاں کسی کی دولت ہے اور نہ کسی کا ملک ہے، تیرے اعمال نیک کی دولت اور تیرے کار خیر کی ملکیت تیرے ساتھ ہے، دعا ہے کہ وہ شہنشاہ علی الاطلاق، اپنے ملک لازوال کی دولت جاوید سے تجھکو سرفراز فرمائے۔

---

## "سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں"

نشستے کہ بعد از جنگ یاد آید

۵ نومبر کی فلسطین کانفرنس دہلی میں ایک صاحب نے ۵۰ صفحوں کا ایک رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" کے مطلا عنوان سے مجلد میرے ہاتھ میں دیا، میں نے فرصت کے وقت میں اس کو بغور پڑھا، تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے بڑی محنت اٹھا کر میری پہلی بڑی تصنیف ارض القرآن سے لیکر عربوں کی جہازرانی" تک سے میری چند غلطیاں[1] فراہم کی ہیں، اور اس پر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور بعض دوسرے اکابر

---

[1] صاحب رسالہ نے لکھا ہو کہ انھوں نے مجھے ان اغلاط کی تصحیح کے لئے کئی خط لکھے مگر میں نے جواب نہیں دیا، یہ میرے علم میں قطعاً خلاف واقعہ ہے، قدیم زمانہ ہوا قرول باغ دہلی سے خطبات مدراس کی ایک مشتبہ عبارت کے متعلق وہی سوال آیا تھا جو اس رسالہ میں ہے، اور میں نے اسکا جواب دیدیا تھا

علماء سے مداحانہ تقریظیں لکھوائی ہیں، کتاب میں مجھ پر الزام لگایا گیا ہے کہ میری تصنیفات سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں،

---

مجھے اس رسالہ کو پڑھکر دو خوشیاں ہوئیں، ایک تو یہ کہ میری تصانیف کے ہزاروں اوراق میں بحمداللہ کہ قرآن پاک کی چند ہی غلطیاں ہیں، دوسری یہ کہ مصنف رسالہ اور ایک دو بریلویوں کو چھوڑ کر ان اکابر علماء نے انکو صرف "مسامحات" قرار دیا، تکفیر و الحاد کا فتویٰ نہیں دیا،

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

اور یہ مسامحات بھی بیشتر وہی ہیں جو جامعہ وغیرہ میں پہلے دکھائے جا چکے ہیں،

---

میں بھی اور دلی کے علماء اور ثقات بھی یہ خوب جانتے ہیں کہ ان اوراق کے اصلی مصنف کون ہیں؛

سر ایں رشتہ زجائیست کہ من میدانم

ان صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس فریب و سازش سے محافظینِ حدیث و سنت کو خود انہوں کے ہم مذ کے ہاتھوں سے قتل نہیں کرایا جا سکتا،

---

اتنی کاوشوں کے بعد بھی جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ میرے "گیارہ" اغلاط میں سے دو تو چھاپے کی غلطیاں ہیں، جنمیں سے ایک کا اعلان حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کی تنقید کے جواب میں دو سال ہوئے کہ اسی معارف میں کیا جا چکا ہے کہ میں نے قِطّ کا ترجمہ چھٹی نہیں بلکہ چنھی کیا ہے، اور دوسری یہ ہے کہ عربوں کی جہازرانی میں "ایک" کے بجائے "ہر ایک" پڑھئے جیسا کہ نفس آیت کے ترجمہ میں ہے، ارض القرآن میں ذو اور خطبات میں جس ایک اہم غلطی پر صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں، وہ معترض کی قلتِ تدبر کا نتیجہ ہیں،

بقیہ چھ غلطیاں یہ ہیں کہ مباحث برزخ میں اہل قرآن کے مقابلہ میں میں نے اقوال مفسرین سے الگ ان آیتوں کے محمل سمجھے ہیں یعنی جو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں وہ برزخ پر چسپاں کردی ہیں، اور جو پل صراط کے موقع پر لکھی جانی چاہئے تھی وہ بہشت کے موقع پر لکھدی ہے، اگر اقوال مفسرین سے اتنا بھی اختلاف الحاد ہے تو مفتی کو تنہا غریب سید سلیمان کے نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء کے الحاد کا فتوی دینا ہوگا،

---

مسئلہ عدم خلود نار پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی بنا پر اگر یہ ہنگامہ ہے تو پہلے یہ ہنگامہ بعض مشاہیر صحابہ رض بعض تابعین اور مفسرین کے اور خصوصیت سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف برپا کرنا چاہئے، حافظ ابن قیم نے حادی الارواح اور شفاء العلیل میں ۲۵ دلیلیں اس پر قائم کی ہیں، اور ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اہلسنت کے ایک گروہ کا یہ مسلک ہے، سید سلیمان کا سوائے اس کے کوئی قصور نہیں کہ اس نے حافظ ابن قیم کے خیالات کی ترجمانی اردو میں کردی ہے، جن لوگوں کو اس مسلک سے اختلاف ہے ان کو سید سلیمان کے بجائے بعض صحابہ، بعض تابعین، بعض مفسرین اور ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف زور آزمائی کرنی چاہئے،

---

بہرحال یہ سب تو غالب کے مقطع کی "سخن گسترانہ" باتیں تھیں، اب میں رسالہ کے اصلی و نقلی دونوں مصنفوں کو اگر وہ نیک نیت ہیں تو بشارت، اور اگر وہ اس سے محروم ہیں تو یہ پرحسرت پیام سناتا ہوں کہ ان قرآنی غلطیوں کی تصحیح کئی سال پہلے دوسرے اڈیشن میں کردی گئی ہے، اور کچھ کی اب کردی گئی ہے، اور پہلے اڈیشن کے موجودہ ذخیرہ میں بھی کردی گئی ہے، اور مسئلہ نار میں جمہور کا مسلک صاحب رسالہ سے زیادہ مدلل اس میں پہلے ہی اضافہ کردیا گیا ہے، واستغفر اللہ ربی من کل ذنب سوء عقیدۃ فی الدین،

---

[1] حسب روایات مفسرین، "س"

# مقالات

ایک زمانہ تھا کہ بھوپال مشرقی علوم وفنون کا مرکز تھا سیکڑوں علما اور فضلا رہتے، طلبہ کا ہجوم تھا، نوادر کتب کا ذخیرہ تھا، دنیاے اسلام سے ہر روز نادر اور قلمی کتابوں کے تحفے بھوپال میں پہنچتے تھے اگر اُسوقت کوئی ریاست کا پبلک کتبخانہ ہوتا، تو اسوقت وہ رامپور، ٹونک، اور حیدرآباد کی برابری کرتا مگر افسوس ہو کہ اُسوقت کے کتبخانے، امرار کی ذاتی ملکیت اور نشانِ امارت کے طور پر تقسیم ہو کر فنا ہوگئے، اور اب ان کا ایک نسخہ بھی بھوپال میں موجود نہیں۔

بھوپال کے امرار میں سے ایک نواب فوجدار محمد خان کی کتابیں بھوپال میں رہ گئیں، اور انکی یادگاریں کچھ باقی ہیں، غالب کے دیوان کا مکمل اردو نسخہ اسی کتبخانہ سے برآمد ہوا، ابن تیمیہ کی الرد علی المنطقیین کا نایاب نسخہ جو اب کتبخانۂ آصفیہ کا مایۂ نازش ہے، وہ بھوپال ہی کی ملکیت تھا، اور آ بھی بڑے بڑے کتب خانون میں بھوپال کی یادگارین ہیں گی جن کو تقدیر نے کہان سے کہان پہنچا دیا ہے،

ریاست بھوپال میں اصلاحات کا دور سرکار عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ کے عہد سے شروع ہوا انھی میں سے ایک پبلک کتب خانہ کا قیام ہے، جو سرکار مرحومہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ، اور والیِ حال نواب حمید اللہ خان بہادر کی طرف منسوب ہو کر حمیدیہ کہلاتا ہے، اسکی عمارت

شاہجہاں آباد کے خاتمہ پر ایک نہایت عمدہ پر فضا موقع پر ہے، عمارت وسیع بلند اور شاندار ہے، مقام بھی پرسکون اور مطالعہ کے لئے موزون ہے،

میری آمد و رفت بھوپال میں ۱۹۱۰ء سے ہے، اسوقت تو اسکے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، معلوم بھی نہیں کہ وہ اسوقت تھا بھی یا نہیں، مگر ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب مولینا شبلی مرحوم کی وفات کے بعد سرکار عالیہ مرحومہ کی طلبی پر حاضری ہوئی، تو اسوقت اس کتب خانہ کی حالت نہایت معمولی تھی، اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً جاتا ہی رہا، مگر دیکھا تو انگریزی کتابوں کی طرف توجہ زیادہ دیکھی، گوشہال صاحب ایک دیسی عیسائی اس کتب خانہ کے ناظم تھے، ظاہر ہے کہ ایک اسلامی اور مشرقی کتب خانہ کی خصوصیتوں اور ضرورتوں سے ان کو کیا واقفیت ہو گی، گو اس وقت بھی کہنے کو مشرقی صیغہ موجود تھا، الہ آباد کے مشہور مصنف مولوی عبد الرزاق صاحب یہیں بیٹھکر سرکار عالیہ مرحومہ کے اخیر زمانہ میں تاریخ اسلام کی تالیف و ترتیب میں مصروف رہتے تھے،

اُسوقت تک جو کچھ تھیں مطبوعہ کتابیں تھیں، قلمی کتابیں گویا نہیں تھیں، افسوس ہوتا تھا کہ ایک مشہور اسلامی ریاست جس کی نیک نامی کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے، وہ اس حیثیت سے اتنی تہی مایہ ہو،

سب سے اخیر دفعہ جولائی ۱۹۳۳ء میں کئی سال کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا، اعلیٰ حضرت سکندر صولت بہادر کی فرمانروائی کے عہد میں یہ دوسری بار بھوپال کی حاضری تھی، خیال آیا کہ اس علمی سیرگاہ کی پھر زیارت کر لی جائے،

اس دفعہ جو کتب خانہ گیا، تو وہاں کا رنگ بدلا پایا، کتابیں بھی زیادہ تھیں، اور سلیقہ سے تھیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ مشرقی صیغہ کو بھی مرتب اور پہلے سے زیادہ معمور پایا، قلمی کتابوں کا ذخیرہ بھی خاصہ دیکھا، بعض پرانے شاہی فرامین اور مغل شہزادیوں کی مشقی وصلیاں اور قطعات نظر آئے،

بابر کا فرمان۔ بابر کا وہ پرانا فرمان جسکو ۱۹۱۲ء میں دیکھ چکا تھا، اب بھی موجود تھا، یہ چھوٹی تقطیع کے معمولی کاغذ پر خط نستعلیق میں تحریر ہے، اس میں بابر نے ہمایوں کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے یہ نصیحت کی ہے، کہ وہ ہندوؤں کا دل اپنے ہاتھ میں لے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ گائے کی قربانی بند کر دے،

میں اس فرمان کو پہلے بھی جعلی سمجھا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہوں، اس پر چند سال کے عرصہ میں بہت سے ارباب تحقیق نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں، مسلمان فضلار نے مذہبی تعلق سے قطع نظر کر کے صرف علمی اور فنی حیثیت سے اسکو بالکل غیر معتبر ٹھہرایا ہے، ابھی ایک سال ہوا ہوگا، کہ بعض روزانہ انگریزی اخبارات میں وصیت نامہ کی روشنی میں مسلمان سلاطین ہند کی بے تعصبی کو بہت کچھ سراہا گیا تھا،

میرے قیاس میں یہ دستاویز مغل حکمرانوں کے اخیر عہد میں تصنیف ہوئی ہے، جب حکومت پر راجپوت راجاؤں کا اثر واقتدار کافی مضبوط تھا، اور اُن کے مشورہ سے بادشاہِ وقت کی طرف سے ایک فرمان اسی مضمون کا تمام ممالکِ محروسہ میں جاری ہوا تھا،

نورجہان کا نوشتہ۔ کتب خانہ میں دو نہایت نادر وصلیاں ہیں، یہ دونوں دو مشہور مغل بیگموں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، ایک نورجہان بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اور خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، عبارت حسب ذیل ہے،

باعثِ انبساطِ شہنشاہی،

بربیتِ مہ نور

از عل شہنشاہی معمور جہان باشد

وز نور جہانگیری پر نورجہان باشد

نمیقۂ نورجہان سنہ ۱۰۲۹

معلوم ہوتا ہے کہ نورجہان نے یہ وصلی لکھکر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی،

زیب النساء کا نوشتہ، عالمگیر اورنگ زیب کی فاضل بیٹی زیب النساء کے علمی کمالات کا ذکر تاریخ کے اوراق میں ہو گیا ہے، اس کے نام سے علماے وقت نے جو کتابیں تصنیف کی تھیں ان میں سے صرف ایک کا سراغ مل سکا ہے، باقی کے صرف نام ہی نام اب تک سنے ہیں،

بیگم کو خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا، چنانچہ نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، اور مورخین کے اس متفقہ بیان کی تصدیق کتبخانۂ حمیدیہ کی ایک وصلی سے ہوتی ہے، یہ وصلی بیگم نے عالمگیر کی خدمت میں اسوقت پیش کی تھی جب اس نے ۱۱۱۱ھ میں مرہٹوں کے دارالحکومت ستارہ کو فتح کیا تھا، اس وصلی میں ایک شعر ہے، جس میں ستارہ کی فتح کی ایک نہایت عمدہ تاریخ کہی گئی ہے،

از معجزۂ پیمبر شق القمر عیان شد
اعجاز خسروی بین شق ستارہ آمد

فتح ستارہ

زیب النساء

بیگم کے استاد ملا سعید اے اشرف عہد شاہجہانی کے مشہور خطاط آقا عبد الرشید دیلمی کے شاگرد تھے، شاید بیگم کو یہ فیض یہیں سے پہنچا ہو،

کتابیں، کتب خانہ کی قلمی فہرستیں موجود تھیں، سرسری نظر سے جو کتابیں یادداشت کے قابل نظر آئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱- اسناد عبداللہ بن سالم بصری، یہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شیخ ابو طاہر مدنی کے شیخ تھے، اور علوم حدیث میں یکتاے روزگار تھے ۱۱۳۴ھ میں وفات پائی، مصنف نے اس رسالہ میں اپنے اسانید یکجا کئے ہیں، رسالہ کی کتابت ۱۲۶۹ھ میں ہوئی ہے، اس رسالہ کو الامداد بمعرفة علو الاسناد شیخ سالم بن عبداللہ بن سالم بصری کی سے ملا کر دیکھنا چاہئے، شاید وہی ہو،

۲- العلل المتناهیه فی الاحادیث الواهیه، محدث ابن جوزی کی نہایت اہم

تصنیف ہے، اس میں ضعیف و موضوع احادیث پر تبصرہ کیا گیا ہے، نسخہ نیا ہے، ۱۲۹۹ھ میں نقل ہوا ہے،

۳- **تفسیر وجیز واحدی**، واحدی نیشاپوری المتوفی ۴۶۸ھ کی مختصر عربی تفسیر، مصنف کی بڑی اوسط اور چھوٹی تین تفسیریں بسیط، وسیط اور وجیز کے ناموں سے ہیں، یہ وجیز کا نسخہ ہے، اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، اس کتاب کا عمدہ نسخہ رام پور میں ہے، جو ۱۰۵۹ھ میں چھپا نیر واقع گجرات میں لکھا گیا ہے،

۴- **تیسیر البیان فی تفسیر احکام القرآن**، مصنف کا نام محمد بن علی بن ابراہیم یمنی ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ محمودیہ مدینہ منورہ میں نظر سے گذرا، دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے، تیسرا نسخہ یہاں نظر آیا ۸۰۵ھ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، بھوپال کا نسخہ ۱۰۱۵ھ کا ہے،

۵- **صحیح بخاری** جلد اول کا ایک نہایت عمدہ مطلا نسخہ جس پر اکبر بادشاہ اور محمد شاہ کی مہریں ثبت ہیں،

۶- **الدیباج علی مسلم بن الحجاج سیوطی**، صحیح مسلم کی شرح،

۷- **زرکشی**، بدرالدین زرکشی کی شرح بخاری جسکا نام التنقیح علی الجامع الصحیح ہے، اس کتاب کے اور بھی نسخے نظر سے گذرے ہیں، مگر یہ نسخہ زیادہ قدیم معلوم ہوا ۸۵۰ھ کی کتابت ہے، اور مصنف کی وفات ۷۹۴ھ میں ہوئی ہے،

۸- **کرمانی** شرح صحیح بخاری، کتاب کا اصلی نام الکواکب الدراری فی صحیح البخاری ہے، مصنف کا نام شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی المتوفی ۷۸۶ھ ہے، شرح کا ممتاز پہلو یہ ہے، کہ اسمیں احادیث کے لغت و نحو سے خاص طور سے بحث ہے، ۷۷۵ھ میں تکمیل کو پہنچی،

۹- **ابن ابی شیبہ**، اس کتاب کے متفرق اجزا مختلف کتب خانوں میں نظر آئے کامل کہیں نہیں دیکھی، یہاں بھی کامل نہیں، یہاں کے نسخہ پر نام مسند ابن ابی شیبہ لکھا ہے،

۱۰- **طبقات الفقہاء**، ابن کمال پاشا حنفی فقہاء کے حالات میں جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ایک اہم کتاب یہ ہے، مصنف کا نام شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا ہے، سلطان سلیم کے عہد میں مشہور ترکی عالم تھے، ۹۴۰ھ میں وفات پائی، کتاب گو مختصر ہے، مگر ابن قتلوبغا کی تاج التراجم کے بعد کے لئے یہ مفید ہے، اس کا کوئی اور نسخہ نظر سے نہیں گذرا،

۱۱- **فتاوی واقعات المفتیین**، مصنف کا نام عبد القادر بن یوسف،

۱۲- **فتاوی اکبر شاہی**، مصنف کا نام عتیق اللہ۔

۱۳- **ارشاد** شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف میں سے یہ رسالہ یہیں نظر آیا، یہ اصول حدیث میں ہے

۱۴- **عجائب البلدان**، فارسی،

۱۵- **تاریخ افغانی**، شیر شاہ سوری کے حالات میں عبد اللطیف بجاپوری کی تصنیف

۱۶- **تاریخ ناصر شاہی**، مانڈو (مالوہ) کے سلطان ناصر الدین خلجی کے حالات،

۱۷- **رقعات عالمگیری**، رقعات کا یہ نسخہ دوسرے نسخوں سے الگ معلوم ہوا، اسکے مرتب کا نام آل محمد صالح ہے، اس میں پہلا خط شاہ ایران کے نام ہے، عبارت یہ ہے:-

"نامۂ اورنگ زیب بہ اورنگ آرا سے ولایت طہران"

آغاز یہ ہے:

"حمدے کہ طائران ریاض ملکوت"

۱۸- **کلیات** انوری کا ایک عمدہ نسخہ مع غزلیات و رباعیات،

اور بھی کچھ نادر کتابیں ہوں گی، جو سرسری نظر میں رہ گئی ہوں گی۔

کتب خانۂ حمیدیہ کا موجودہ ذخیرہ بہرحال ترقی و تکمیل کا بہت زیادہ محتاج ہے، اس وقت بھی صرف بھوپال میں، اتنی کتابیں ہیں، جن کو ایک جگہ جمع ہی کر دیا جائے، تو بہت کافی

ہو سکتا ہے، وہاں کے ایک تاجر کتب قلمی کے پاس سیکڑوں کتابیں ہیں، اگر سال میں تین ہزار روپیہ بھی قلمی کتابوں کی خریداری پر صرف کیا جائے تو بھوپال کا کتب خانہ بھی چند برسوں میں دوسری ریاستوں کے کتب خانوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ گر ابھی تو جو کچھ ہے وہ آغاز ہے، اسلاف کا سرمایہ ہندوستان سے یورپ کو بہا جا رہا ہے، ہمارے امراء کی تھوڑی سی قدردانی کا ہاتھ اس سیلاب کو روک سکتا ہے، کیا سرکار بھوپال کی توجہ ادھر مبذول ہو سکتی ہے؟

## خطباتِ مدراس کا نیا ایڈیشن

خطباتِ مدراس کا مجموعہ جو سیرۃ نبوی کے تمام مباحث کا نچوڑ ہے، اور جو ہر طبقہ کے مسلمانوں میں یکساں ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے، اس کا تیسرا نیا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد چھپکر تیار ہے،

پہلا خطبہ، انسانیت کی تکمیل صرف انبیا کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے،

دوسرا خطبہ، عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت ہے،

تیسرا خطبہ، سیرتِ محمدی کا تاریخی پہلو،

چوتھا خطبہ، سیرتِ محمدی کا تکمیلی پہلو،

پانچواں خطبہ، سیرتِ محمدی کی جامعیت،

چھٹا خطبہ، سیرتِ محمدی کی عملیت،

ساتواں خطبہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کا پیغام،

آٹھواں خطبہ پیغامِ محمدی،

طلبہ کے مذاق کو دیکھ کر اسکی تقطیع ۲۲×۱۸ یعنی چھوٹی رکھی گئی، لکھائی چھپائی کاغذ بہتر،

ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت عہ

منیجر

# دیوانِ شمس تبریز از مولینا ے روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاد فارسی نظام کالج حیدرآباد

## ۱۲

توحید | دین کی اہم ترین نعمت توحید ہے، اسلام کا کمال بھی توحید ہی میں پوشیدہ ہے، لازماً اربابِ صفا اور مخلصین کا زیادہ تر زور اسی مسئلہ پر ہے، خالص عبدیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ شرک کے ظاہری و باطنی سارے اعتبارات دور نہ ہو جائیں، اور بندہ بادۂ وحدت سے سرشار نہ ہو، اسلئے قرآن مجید میں سورۂ توحید کا نام سورۂ اخلاص رکھا گیا ہے، کیونکہ وہ بندہ کے اندر خالص توحید پیدا کرتا ہے، اور شرک کے امراض کا شافی علاج ہے، توحید ہی مسلکِ ابراہیم کا طرۂ امتیاز ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ میں بنی نوع انسان کو حکم ہے، کہ مسلک و ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں،

مولینا ے روم کے دیوان میں عناصرِ تصوف میں سے عنصرِ توحید پر سب سے زیادہ زور ہے، اور یہی ان کے مسلک کی روح ہے، توحید کے معنی صرف خدا کو ایک ماننے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ ایک کے ہو رہنے، ایک کو محبوب، مقصود اور مطلوب بنانے اور ایک ہی کی رضا پر چلنے کے ہیں، مولینا نے اسکے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور اس باب میں ان کا جوش کامل طور پر ظاہر ہوا ہے، ع دیکھے گو یہ کیسے مجوب و ازوی تر بیں ماسوا کے دام سے رہائی کے طالب ہیں،

خلاصم دہ خلاصم دہ خلاصم     کہ سخت افتادہ ام در دامِ دیگر،

منزلِ مقصود حق ہے،

سوے مغرب نرویم و طرفِ مشرق نے     تا ابد گام زناں جانبِ خورشیدِ ازل

خوانده ایم انا الیه راجعون، تا بدانی که کجا ہا می رویم،

توحید کا آخری مرتبہ توحید ذاتی ہے، مولانا ذکر بھی خاص طور پر اسم ذات کا کرتے تھے،
معین الدین پروانہ نے سوال کیا کہ مختلف مشائخ مختلف اوراد واذکار کے پابند ہیں، حضرت
کا طریق ذکر کیا ہے، فرمایا،

ذکر ما اللہ اللہ است ازآنکہ ما، از الہ می آئیم و باز بالہ می رویم
(اسم ذات) (دیوان)

ع ما زادہ ذاتیم سوے ذات رویم،

ع برر فتن با وحید یاران صوات،

"حق تعالیٰ جمیع انبیاء و اولیاء را از اسم مخصوص تجلی فرمودہ است تجلی ما محمدیان
از اسم اللہ کہ جامع است تجلی فرمودہ است، من قل ہو اللہ احد را ورد زبان
می دارم"

آخری جملہ میں، رومی کے اس صوفی اعظم نے تصوف اور کتاب وسنت کا جو ربط ظاہر کیا
ہے، خاص طور پر غور و فکر کے قابل ہے، توحید کی جامعیت نسبت محمدی کے طفیل حاصل ہوئی جس کی تعلیم
کا حامل سورۂ اخلاص ہے،

صاحب مناقب[2] نے مولینا کی ایک دعا نقل کی ہے، جو توحید کے تمام اعتبارات کی جامع ہے،
توحید ذات اس میں غالب اور نمایاں ہے،

"اعددت لکل ہول لا الہ الا اللہ ولکل غم وھم ما شاء اللہ ولکل
نعمۃ الحمد للہ ولکل رخاء الشکر للہ ولکل اعجوبۃ سبحان اللہ ولکل
ذنب استغفر اللہ ولکل ضیق حسبی اللہ ولکل قضاء وقدر توکلت علی اللہ

---

[1] مناقب العارفین ص۱۹۹ مطبوعہ ستارۂ پریس آگرہ کتب خانہ حیدر آباد دکن، [2] مناقب العارفین ص۱۰۱،

ولکل مصیبۃ انا للہ وانا الیہ راجعون ولکل طاعۃ ومعصیۃ لاحول

ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم،

دیوان میں یہی نغمۂ توحید بطرز دیگر ہے، نفی و اثبات طریقِ سلوک ہے کلمۂ توحید میں لآ سے نفی

باطل اور اِلّا سے اثباتِ حق مقصود ہے، مولانا کی راہ یہی ہے،

لا ازاے جان راہ الا الداست     ماہم از لاتا بہ الا می رویم،

توحید وجودی مسئلۂ وحدت الوجود

وجود و قیام ذاتی رب العزت ہی کو حاصل ہے، اسی قیوم کی قیومیت سے محسوسات و عوالم امکانیہ قائم اور موجود ہیں، ہوالحی القیوم اگر ادھر سے فیضِ وجود نہ ہو تو سب عدم ہی عدم ہے، ع

تو خود دانی کہ من بے تو عدم باشم عدم باشم،

وجود کے چار اعتبار ہیں، اولیت آخریت ظاہریت اور باطنیت، یہ چاروں اعتبارات ذاتِ حق ہی کے ساتھ مختص ہیں، مخلوق معلوم حق ہے، جو اپنی ماہیت میں غیر ذاتِ حق ہے، یہی معنی ہیں تشبیہ مع التنزیہ کے، سبحان اللہ وما انا من المشرکین،

ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیئ علیم،

ھو الاول ھو الآخر ھو الظاھر ھو الباطن،

بجز یا ہو و یا من ہو، کسے دیگر نمی دانم،

دوئی از خود بدر کردم یکے دیدم دو عالم را     یکے جویم یکے دانم یکے بینم یکے خوانم،

توحید انیت "لا الہ الا انا" کا انکشاف توحید کی نازک ترین اور اہم ترین منزل ہے، سرفرازی اور کامیابی کا یہی مقام ہے، یافت حق میں حجاب اکبر یہی ہے، خود شناسی کا محل اور اہمیت یہیں ظاہر ہوتی ہے فیہ ما فیہ میں[۱]

---

۱؎ فیہ ما فیہ ملفوظات مولینا روم مطبع معارف اعظم گڈھ ص۲۱،

مولینا نے اسکی اہمیت پر بہت زور دیا ہے،

"آنچہ ہست و با او نزدیک تر از ہمہ آنست کہ آن خودی ذات او خود دانی داند ہمہ چیز ہا را بحل و حرمت حکم می کند کہ این جائز است و آن جائز نیست و این حلال است و آن حرام است خود را نمی داند کہ حلال است یا حرام است، او جائز است یا ناجائز است، پاک است یا ناپاک است، این تجویف و زردی و نقش و تدویر بر دی عارضی است کہ چون در آتش اندازی این ہمہ نماند ذاتی شود صافی ازین ہمہ"

آگے چل کر اس سے زیادہ وضاحت فرماتے ہیں، اور توحید انیت کے حصول کی راہ بتاتے ہیں،

"پیش او دو "انا" نمی گنجد، تو "انا" می گوئی و او "انا" یا تو بمیر پیش او یا او بمیرد پیش تو تا دوئی نماند اما آنکہ او بمیرد امکان ندارد، نہ در خارج و نہ در ذہن، کہ ہو الحی الذی لا یموت او را آن لطف ہست کہ اگر ممکن بودے برائے تو بمردے تا دوئی برخاستی اکنون چوں مردن او ممکن نیست تو بمیر تا او بر تو تجلی کند و دوئی برخیزد"[1]

دیوان میں فرماتے ہیں،

| | |
|---|---|
| غبارہاست درون تو از حجاب منی | ز تو بروں نہ شود آن غبار یکبار |
| گر تو فرعون منی از مصر این بیرون کنی | در درون خانہ بینی موسیٰ ہارون خویش |

جب یہ منزلیں طے ہو جاتی ہیں تو عینیت وجودی و غیریت ذاتی کے اسرار بے پردہ ہو جاتے ہیں، اور انسان کی جامعیت معلوم ہوتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے،

ما زندہ بنور کبریائیم، بیگانہ و سخت آشنائیم،

توحید ارادت | توحید صفاتی میں فنائے ارادت درجۂ کمال ہے، یہ مرتبہ اس طرح حاصل ہے، کہ بندہ

[1] فیہ ما فیہ ص۔

اپنی رضا کو رضائے الٰہی میں فنا کر دے،

مرا گر تو چنان داری چنینم　　　که باشم من چه باشد مهر و کینم

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کو بندے کی رضا محبوب ہو جاتی ہے، ولسوف یعطیك ربك فترضی کا راز یہی ہے، راضیۃ مرضیۃ میں اسی مقام کا اشارہ ہے، رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ سے مراد یہی توحید ارادی ہے،

چو در کشاکش احکام راضیت بینند　　　زر نجها برہانند و مرتضات کنند،

جبتک سالک کو ایمان وعمل میں مرضی حق کی پیروی مقصود نہ ہو، اس کی نیکوئی اور نکوکاری مقبول ومعتبر نہیں، اسکی سعی اور اسکا عمل خبط ہو جاتا ہے،

بخوے نیک اگر با جہاں بسازد کس　　　چوں خوے حق نشناسد نہ نیکوست بداست

حافظ نے کیا خوب فرمایا ہے،

از دل وجاں شرف صحبت جاناں غرض است　　　ہمہ اینست وگرنہ دل وجاں این ہمہ نیست

فیہ مافیہ میں اس اصول کے متعلق لکھا ہے،

ایشان می پندارند کہ عمل این ظاہر است اگر منافی آن صورت عمل بجائے آرد ہیچ او را سود ندارد

چون درو معنی صدق وایمان نیست،　　　(فیہ مافیہ ص ۸۲)

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم،

رہ گم نکنیم وپے ہر غول نپوئیم،　　　جز در عقب احمد مختار نہ گردیم،

(دیوان رومی)

اتباع رسالت، توحید ہی مسلک تصوف کا مطلوب اور مقصود ہے، لیکن توحید کی کنجی رسالت ہے، بادۂ حقیقت کے مشتاقوں کے لئے رسول ہی میخانۂ غیبی کا دروازہ کھولتے ہیں، معرفت الٰہی میں مشغول

رسول ہی کا علم اور عمل ہی علم حق رسول کو خدا سے ملتا ہے، اور رسول سے ساری مخلوق یہ فیض عظیم پاتی ہے، مولینا سے روم نے پیغام رسالت اور اتباع رسالت پر بیحد زور دیا ہے، مثنوی اور ملفوظات تو ان مسائل کی تصریح اور تشریح سے بھرے پڑے ہیں، دیوان میں بھی اس کا پورا حق ادا کیا ہے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں، کہ صوفی کو رسول سے تعلق نہیں، صوفی کا مسلک الگ ہوتا ہے، اسے تو کفر و ایمان کی تمیز ہی نہیں پیغمبر حق و باطل اور کفر و دین میں تمیز کرتے ہیں، وہ عارف روم کے ان اقوال کا بغور مطالعہ کریں تاکہ حقیقت روشن ہوجائے،

**علم حق وحی** انبیاے کرام اپنی طرف سے تعلیمات نہیں پیش کرتے، بلکہ خدا کی طرف سے جو کچھ ان پر وحی ہوتی ہے، اس علم حق کی تبلیغ کرتے ہیں،

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی،

چون پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم مست شدے وبخود گشتے سخن گفتے قال اللہ آخر از روے صورت زبان او میگفت اما او درمیان نبود گوینده درحقیقت حق بود ...... پس معلوم شد کہ او نمی گوید حق می گوید کہ وما ینطق عن الھوی[1]۔

زیں سبب قل گفتۂ دریا بود، ۔۔۔ گرچہ نطق احمدی گویا بود،

اسلئے جو ایمان اور عمل میں رسول کا متبع نہ ہو، وہ کبھی مقصود کو نہیں پہونچ سکتا، جو خدا کا محبوب بننا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو مقبول بارگاہ بنانا چاہتا ہے، اس پر اتباع رسالت فرض ہے، قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ صوفی وہ ہے جو کمال اخلاص و عرفان سے اتباع رسالت کی تکمیل کرے، سالک کو جو کچھ ملتا ہے، اسی طرح ملتا ہے، اور جو کچھ ملے گا، اسی راہ سے ملیگا، کیونکہ حضور خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم جملہ کمالات کے جامع ہیں، مولانا فرماتے ہیں،

---

[1] فیہ مافیہ ص۲۲۳ و ۲۴، [2] مناقب العارفین، ص۱۴۳

لطفِ قدرائے جملہ کمالاتِ خلق را، ۔ یک چیز کرد و داد بدو نام مصطفےٰ

مناقب میں مولانا نے فرمایا کہ،

"من جمیع وارثِ محمدی ام"[1]

مولیناے معنوی کے علم و عمل کی بنیاد سلطان اہلِ معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر ہے،

"اہلِ معنی را متابعتِ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم از جملہ واجبات است"[2]

مولینا کا فقر فقر محمدی ہے "فقر اشراقی نہیں" جسکو یہ دولت نصیب نہیں وہ احرار و ابرار کی جماعت ہی میں شامل نہیں ہوتا، مولینا فرماتے ہیں،

"ہر کرا لذتِ فقرِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم روی نمود حقا کہ از لذتِ دو جہانی و اغراض فانی اعراض کردہ و فارغ شدہ و در مسلک احرار و ابرار منخرط گشتہ"[3]

مولانا کا فقر و تصوف اشراقیین کی اشراقیت، ہندی جوگیوں کا جوگ یا عیسائی راہبوں کی رہبانیت نہیں، کیونکہ وہ مردِ حق اور متبعِ رسول ہیں، ان کے مسلک میں رہبانیت نہیں، بلکہ لا رھبانیۃ فی الاسلام ہے،

مسلک کی جامعیت۔ مولینا کا ارشاد ہے کہ "دین و دنیا یکے نمی شود، مگر مردانِ حق را"[4] فیہ ما فیہ میں بھی منشا ظاہر فرمایا ہے، اور یہی حدیث درج کی ہے، یہ مسلک نبوت کی خصوصیت ہے، کہ اس میں ظاہر و باطن کی جامعیت ہوتی ہے، اتباعِ نبوت کی وجہ سے مولینا میں بھی یہ جامعیت و حقیقت ہے، اس پر انکی زندگی بھی شاہد ہے، اور ان کے ملفوظات بھی، فیہ ما فیہ میں ہے،

"ما را ہمارا دل بخدمت بود، اما می خواستیم کہ بصورت شرف شویم، زیرا کہ صورت نیز اعتبار عظیم دارد، چہ جائے اعتبار خود، مشارکت با مغز ہمچنانکہ کار بے مغز نمی آید"

[1] مناقب العارفین ص ۱۴۱۔ [2] ایضاً ص ۲۳۶۔ [3] ایضاً ص ۔

بے پوست نیز ہم برنمی آید؛

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض متصوفین جو اپنے آپ کو ظاہر کا پابند نہیں سمجھتے، اور صرف اسے کمال باطن خیال کرتے ہیں، کہ وہ کس درجہ سچائی پر ہیں، یہ محض افترا اور خلاف جامعیت ہے، مولینا کے قول سے ظاہر ہے کہ کبھی انسان ظاہر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، جیسے جیسے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، ظاہر باطن دونوں کے اعتبار سے مراتب اور مدارج بڑھتے ہیں، اور یہی نبوت کا رنگ ہے، اکبر مرحوم نے سچ کہا ہے،

شریعت در محفل مصطفےٰ ۔۔۔ طریقت عروج دل مصطفےٰ،

شریعت میں ہے صورت فتح بدر ۔۔۔ طریقت میں ہے معنی شق صدر

شریعت میں ہے قیل و قال حبیب ۔۔۔ طریقت میں حسن و جمال حبیب،

نبوت کے اندر ہیں دونوں ہی رنگ ۔۔۔ عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ،

اب دیکھئے کہ دیوان سے جو مسلک مستنبط ہوتا ہے، اسے کس حد تک ان اعتبارات سے ربط ہے،

فرماتے ہیں کہ فقرا الی اللہ کا اقبال رحمۃ للعالمین ہی کے دم سے ہے، ع :-

از رحمۃ للعالمیں اقبال درویشان ببیں،

کیونکہ عاشقانِ الٰہی کے سردار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں،

چون مصطفےٰ است سرور سردار عاشقاں ۔۔۔ جملہ مطیع او شدہ چہ شاہ و چہ گدا،

اسلئے حکم ہوتا ہے کہ اگر فقر اختیار کرنا ہو، تو راہ نسبت پیغمبر اختیار کرنی چاہیے، ع

فقر بگزیں راہ رو کاں سنت پیغمبر است،

کفر کی سیاہی نور محمدی ہی سے دور ہوتی ہے،

جامہ سیاہ کرد کفر نور محمد رسید، طبل بقا کوفتند ملک مخلد رسید

رند پاکباز جب کبھی شراب حقیقت کا جام نوش فرماتے ہیں، تو وسیلہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا سہارا لیتے ہیں،

پاکانِ راہ فقر ز خمخانۂ الست جامے چو درکشند دم از مصطفیٰ زنند

رسالت کی پیروی ہی سے انسان صراط مستقیم پر رہتا ہے، دوسرے طریقے غولانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے سالک گمراہ ہوتا ہے،

رہ گم نہ کنیم و پے ہر غول نہ پوئیم جز در عقب احمد مختار نہ گردیم

کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے میخانۂ غیبی کا دروازہ کھولا ہے، ع

بکشاد محمد درِ مے خانۂ غیبی

مقصود اتباع نور محمدی ہی سے حاصل ہوتا ہے، ان کے آگے اپنے خیالات و خطرات کے اصنام توڑ دینے چاہئیں، ورنہ شرک فی الامر ہو جائے گا،

ما چند صنم پیش محمد بشکستیم تا در صنم دلبر و دلخواہ رسیدیم

فلک پیما و شب بیدار باشم طریق احمد مختار از اختر بگیرم،

مولینا کے سلسلۂ طریقت کے قافلہ سالار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں،

بخت جوان یار ما دادن جان کار ما قافلہ سالار ما فخر جہان مصطفیٰ،

لاتمونن الا وانتم مسلمون کی فضیلت انہی اصحاب کو حاصل ہوئی، جو اخلاق مصطفوی کو اپنا شعار بناتے ہیں،

وان کہ اخلاق مصطفیٰ جویند، چون ابوبکرؓ چون عمرؓ میرند،

دامنِ محمدی سے اپنے آپ کو حضرت بلالؓ کی طرح وابستہ کرنا چاہیئے،

ردائے احمد مختار بگیر اے عاشق صلائے عشق شنو ہر دمے ز ریح بلال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار سے جہل حقیقت اور کفر پیدا ہوتا ہے،

گر جاحد ایزدم جہولم، در منکر احمدم جہودم،

ترقی اس سنے کی جو بندۂ دین وکیش ہوا، کیونکہ تصوف عین منشائے شریعت کی حسن وکمال واخلاص کیساتھ تکمیل کا نام ہے،

اے خنک آنکہ پیش شد بندۂ دین وکیش شد موسی وقت خویش شد جانب طور میرؤ

پیر کی رہنمائی، علم وعمل کی ہر شاخ میں رہنمائی کی ضرورت ہے، ورنہ حیات علمی کی تعمیر ممکن نہیں اسی طرح دین میں بھی ہادی ورہنما کی ضرورت ہے، دین کے ظاہر وباطن دونوں پہلو ہیں، اسلئے کمال ایمان اور صاحب صفا بننے کے لئے ایسے آدمی کی صحبت اور ہدایت کی ضرورت ہے جس کا ظاہر وباطن آراستہ ہو، ایسے ہی شخص کو مرشد یا پیر کہتے ہیں، ہر اس انسان پر جو اخلاص اور صفا کا کمال حاصل کرنا چاہتا ہے، ایسے رہنما کی تلاش لازم ہے، وابتغوا الیہ الوسیلۃ کونوا مع الصادقین. واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ، (کہف)

سلوک الی اللہ کی اولین شرط یہی ہے کہ کوئی پیر حق پرست نصیب ہو، مولینا کا فرمان ہے،

"آدمی میباید کہ آن تمیز خود را عاری از غرضہا کند، ویارے کہ جوید، در دین کہ دین یار نشناسد"[1]

مناقب[2] میں مولانا کا قول درج ہے،

"بدانی کہ بے تربیت شیخ ہیچ تربیتے نیست وہر طاعت بے براست وبے نور" من لاشیخ لہ لادین لہ

ہیچ نکشد نفس را جز ظل پیر دامن آن نفس کش را سخت گیر.

---

[1] فیہ مافیہ صلا، [2] مناقب العارفین ص۱۵۱،

دیوان میں مولینا نے اس مسئلہ پر انہی خیالات کا اظہار کیا ہے،

بے دولت مخدومی شمس الحق تبریز نے ماہ توان دیدن نے بحر توان شد

شمس الحق تبریزی صد گونہ کند دل را گاہیش کند تیغش گاہیش سپر سازد

لیکن پیر کی صفت اور اس کا معیار یہ ہو کہ وہ ہم نفس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہو، اور انوار مصطفوی سے اسکا دل منور ہو،

رسد بفیض تجلی شمس تبریزی دلے کہ نور ز انوار مصطفیٰ دارد

شاہ شہ بخش جان مفخر تبریزیان آنکہ در اسرار عشق ہم نفس مصطفیٰ ست

در ہوائے شمس تبریزی ز ظلمت در گذر ناگہان سر برزنی در نور سبحان مجیب

علماے امت انبیا کے وارث ہوتے ہیں، بلکہ ان کی مثال انبیاے بنی اسرائیل کی سی ہے، اسلئے مولینا مرشد کو نبی وقت سے تعبیر فرماتے ہیں، حضرت شمس کے متعلق لکھا ہے،

یکشا وند خز ینہ ہمہ خلعت پوشید،

مصطفیٰ باز بیامد ہمہ ایمان آرید،

عشق پر مسلک کمال منحصر ہے، تقریر بالا سے یہ ظاہر ہے کہ مولینا کا تصوف ان کا فلسفۂ حیات اور انکا مسلک یہی ہے، کہ توحید کے مراتب بکمال حاصل کئے جائیں، اور حصول مقصد کی راہ یہی ہے کہ علماً اور عملاً رسول کی پوری پوری اتباع کیجائے، اپنے دین کو خدا کے لئے خالص کیا جائے، اپنے اندر کمال اخلاص اور تسلیم پیدا ہو، نماز و عبادت میں جس طرح اپنا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے، اسی طرح قلب بھی ہر وقت حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے،

ان کمالات کے حصول کے لئے ضروری ہو کہ ایک ایسے شخص کی ارادت اور صحبت اختیار کیجائے جو ان مراتب ایمانی کو حاصل کر چکا ہو، اور وہ انوار نبوت سے مستنیر ہو، لیکن مولینا کی نظر میں اصولاً

سلوک کی کوئی منزل بغیر درد و طلب، عشق و محبت، تڑپ اور بے چینی کے طے نہیں ہو سکتی، جبتک دل میں محبت کا بیج نہ ہو، ایمان کا درخت پھل نہیں لا سکتا، اخلاص و رضا کا سمندر کشتی عشق ہی کے ذریعہ پار کیا جاتا ہے، فیہ ما فیہ میں ارشاد ہوتا ہے،

"درد یست کہ آدمی را رہبر است، در ہر کارے کہ ہست تا او را درد آن کار و ہوس و عشق آن کار در درون نخیزد، او قصد آں کار نکند و آن کار بے درد او را میسر نشود خواہ دنیا و خواہ آخرت خواہ بازرگانی خواہ بادشاہی خواہ علم خواہ عمل'

دیوان میں بھی مولانا نے عشق کا یہی مقام قرار دیا ہے، اور اسکی ایسی ہی اہمیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں کہ عشق ہی باعث کائنات اور مقصود تخلیق ہے، ع

تخت از عشق او زادم آخر دل بدو دادم

عشق سے مقصود عبدیت اور بندگی ہے،

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی، کفر باشد پیش او جز بندگی،

عشق کی اہمیت،

جہان درخت عمل برگ و میوۂ عشق چو برگ و میوہ نہ باشد شجر چہ سود کند

عشق معراج است سوئے بام سلطان ازل از رخ عاشق فرد خوان قصۂ معراج را

زندگی کی آخری سانس بھی اسی عشق کے پیدا کرنے میں صرف ہونی چاہیے، ع

ترا اگر نفسے ماند غیر عشق مجوئے،

عشق ہی کا اندیشہ جہاد اکبر ہے، کیونکہ اس کی کشمکش اندیشۂ باطن کے ساتھ ہے، اس کا مقابلہ نفس کے ساتھ ہے، کیونکہ محبوب حقیقی کی محبت کو ماسوا کی محبت پر غالب کرنا پڑتا ہے، اور ہر فعل کو مرضی حق کے تابع کرنا پڑتا ہے، اسے نور الٰہی سے دیکھنا پڑتا ہے،

"چوں تمام اورا ایمان حقیقی باشد، او ہمہ فعل کند کہ حق خواہد" (فیہ ما فیہ ص۱۳۱)

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر یعنی با نفس مصاف کردن جہاد اکبر است،

(فیہ ما فیہ ص۱۴)

نتیجہ اور استقامت، | یہ راہ بڑی کٹھن ہے، اس کوچہ میں صرف پائے ثبات ہی کو اذن سیر ہے، اور وہی آستانہ جاناں تک پہنچ سکتا ہے، جو صاحب استقامت ہے، اسی راہ کے اختیار کرنے سے انسان اپنے شرف و عظمت کے اصلی مقام پر پہنچتا ہے، اسی طریق میں اس کا نشانہ خدا پر ہوتا ہے، خلافت الٰہیہ کی منزل تک اسے رہنمائی ہوتی ہے، اور جب اس نے اپنے آئینہ کو غیریت کے گرد و غبار سے صاف کیا ہے، تو ہمیشہ جمال الٰہی اس میں منعکس ہوتا ہے، (دیوان کے اشعار فیہ ما فیہ سے ملفوظات کی مطابقت کیساتھ درج کئے جاتے ہیں،)

"وجود آدمی اصطرلاب حق است، چوں اورا حق تعالیٰ بخود عالم و دانا و آشنا کردہ باشد

ان اصطرلاب وجود حق خود تجلی حق را و جمال بیچون را دمبدم و لمحہ بلمحہ می بیند و ہرگز آن جمال

ازین آئینہ خالی نباشد" (فیہ ما فیہ ص۱۳)

مومن کمال ایمان کے باعث آئینۂ مومن (اسم اللہ) بنجاتا ہے، مولینا کے متعلق افلاکی کا قول ہے، کہ

"در معنی المومن، مرأت المومن لطائف می فرمود گفت اللہ را یک نام مومن است و بندہ را

ہم مومن المومن مرأۃ المؤمن یعنی تجلی فہماد تنبہ یعنی در بندہ مومن اللہ مومن تجلی میکند تو اگر رویت اللہ

میخواہی، دراٰن مرات در انا جینی آنچہ بینی،

آہن من صیقل عشقش چو یافت آئینہ کرن رفت ازوسے آہنی

(مناقب العارفین ص۳۰۹)

نہ ز بویم نہ ز رنگم نہ ز جسمم نہ ز جانم عذر از تیر خدنگم کہ خدائیست کمانم

حق تعالیٰ انفس مومن کا خریدار ہوتا ہے، اس کی قیمت ذات اور صفات کے سارے فیوض ہیں، جسے جنت کہتے ہیں، جو ان برکات کے ظہور کا محل اور مقام رضا ہے "حق تعالیٰ ترا قیمت عظیم کردہ است۔ ومی فرماید کہ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ،

تو بہ قیمت ورائے دو جہانی، چہ کنم قدر خود نمی دانی،

(فیہ مافیہ ص۳۱)

نتیجہ سلوک بقاباللہ، عاشق ترک نفی خودی کر چکا ہے، اب ذات مطلق کی طرف سے اثبات دوام حاصل ہوگا، اسی کو بقا باللہ کہتے ہیں، یہی حاصل فنا ہے،

خیال ترک من ہر شب صفات ذات من گردد مرا نفی من در شدے ہمہ اثبات من گردد،

یہی حیات بعد الممات کا احسن ترین مرتبہ ہے، عارف عاشق اسی لئے موت سے بے خوف ہوتا ہے، کہ موت اس کے لئے راہ وصال اور رفع حجاب ہے، مولینا نے اس اصول اور اسی خیال کو ایک غزل میں تشریحاً بیان فرمایا ہے،

بروز مرگ چو تابوت من روان باشد گمان مبر کہ مرا میل این جہان باشد

جنازہ ام تو چو بینی مگو فراق فراق مرا وصال و ملاقات آن زمان باشد

فرو شدن چو بہ بینی برآمدن بنگر غروب شمس و قمر را چرا زیان باشد

کدام دلو فرو شد کہ زآب در نامد

زچاہ یوسف جان را چرا زیان باشد

الحمد للہ کفی والسلام علی من اتبع الھدیٰ،

# کلام خواجہ سنائی غزنویؒ

از

جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی

ستمبر سنہ حال کے معارف میں یہ مژدہ نظر سے گذرا کہ افغانستان کے ادیب فاضل سرور خان گویا نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک نہایت نادر و قدیم مجموعہ دریافت کیا ہے، اگرچہ معارف کے فاضل مدیر نے اس انکشاف پر خوش ہونے کا حق فضلاے ہندوستان کے لئے مخصوص فرما دیا ہو، تاہم ہمہ خرش نادانی شروانی بھی بیحد خوش ہوا، دو وجہ سے، اول ایک بیش بہا علمی سرمایہ کی یافت پر، دوم اپنے وطن کے اس فخر پر کہ وہاں وہ گوہر شاہوار تابان ہوا، جس سے ایران کا دامن خالی نکلا، ہرچند شروانی کے بزرگون کو نواح قندھار سے آئے ہوئے پانسو برس ہو چکے، تاہم بحمد اللہ حب وطن کی چنگاری ہنوز سینے میں زیر خاکستر دہ رہی ہے، فرط فخر میں جب بے مایہ شروانی نے اپنی گدڑی کو ٹٹولا تو الحمد للہ چند لعل بے بہا اس میں سے بھی نکلے، معارف پرور قلوب کی ضیافت کے لئے ذیل میں انکے جوہر نمایاں کرتا ہون، یقیناً مدیر معارف کی صحت یابی کی نذر تصور فرمائی جائے،

حبیب گنج کے کتبخانے میں چھ نسخے کلام سنائی کے ہین، دو مطبوعہ، چار قلمی،

مطبوعہ میں :-

۱- پہلا نسخہ مثنوی حدیقہ سنائی کا ہے، جو ۱۳۰۳ء میں مطبع نولکشور میں چھپا تھا، اس میں خاص بات وہ دیباچۂ نثر ہے، جو خود سنائی نے حدیقہ پر لکھا تھا، مطبع نے اسکو شارح حدیقہ و مثنوی

معنوی خواجہ عبد اللطیف عباسی کی شرح سے نقل کرکے فیض عام کر دیا ہے، دوسری خاص بات یہ ہے کہ خواجہ موصوف کی شرح حدیقہ مسمّیٰ بہ لطائف الحدائق حاشیہ پر چڑھا دی ہے، شارح عباسی نے شرح کے مقدمے میں نسخہ حدیقہ کے اہتمام تصحیح کی تشریح کرتے ہوئے، اُس نسخہ کا ذکر کیا ہے جو دور اکبری کے امیر عزیز خان کوکتاش نے حکیم سنائی کے مزار سے حاصل کیا تھا، اور جو عہد مصنف کے قریب ہی زمانہ میں لکھا گیا تھا، مطبوعہ نسخہ جلی قلم خوشخط ہے،

۲- دوسرا نسخہ مطبوعہ وہ ہے جو نواب علاء الدین خاں علائی مرحوم والی لوہارو نے اپنے مطبع فخر المطابع واقع لوہارو میں چھپوایا تھا، خود تصحیح کی تھی، خود شرح بھی لکھی تھی، جس کا نام ہے لطف طریقہ بر حدیقہ، جو حاشیے پر چڑھی ہوئی ہے، یہ سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں لکھی گئی، ایک خاص بات اس نسخے کا یہ ہے کہ علائی مرحوم کی طرف سے قاضی حسام الدین سکندرآبادی کو ہدیۃً بھیجا گیا تھا، یہ نسخہ صرف مقصد اول تک چھپا ہے،

قلمی چار نسخوں میں،

۳- ایک نسخہ مثنوی حدیقہ کا ہے، یہ نسخہ سنہ ۱۰۳۲ھ کا لکھا ہوا ہے، مقابلہ شدہ ہے،

۴- دوسرا قلمی مجموعہ قصائد وغیرہ کا ہے، جو بلحاظ خط و کاغذ نوادر میں سے ہے، سنہ ۸۵۰ھ میں امام علی کرمانی نے لکھا تھا، پورے ساڑھے چار سو برس گذر جانے پر بھی کاغذ کی آب و تاب اور مضبوطی قابل دید ہے، اس میں پانسو چونتیس صفحے ہیں، ان میں سے ۵۰۴ صفحوں پر قصائد و غزلیات ہیں ۱۶ صفحے ہجویات کے ہیں، ہجو کے بعد مرثیے ہیں، مرثیوں کے بعد مقطعات، مقطعات کے بعد رباعیات رباعی میں یہ بات قابل لحاظ ہے، کہ ردیف و قافیہ چاروں مصرعوں میں یکساں ہے، رباعیات پر نسخہ ختم ہو جاتا ہے،

۵- تیسرا قلمی مجموعہ جسکا حجم چھ سو چھ صفحات کا ہے، سنہ ۱۰۱۲ھ میں بمقام آگرہ لکھا گیا،

کاتب کا نام نہیں،

اس مجموعے میں اول قصائد ہیں، جو حمد، نعت، الزہد والحکمۃ اور مدح میں ہیں، قصائد کے بعد غزلیات ہیں (جو ردیف وار مرتب نہیں) غزلیات کے بعد معمیات، ہجویات، قطعات و رباعیات ہیں، اس حصے کا نام الحدائق فی الخلائق ہے، دوسرا حصہ جو مستقل رسالے کی شکل میں ہے المسمیٰ بہ "کارنامہ از بلخ بہ غزنیں فرستادہ"، تیسرا حصہ مثنوی مسمی بہ سنائی آباد و حدیقۃ الحدیقہ، چوتھا حصہ مثنوی کنوز الرموز، اس مثنوی سے پہلے ایک قصیدہ شیخ الاسلام محمد بن منصور کی مدح میں ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کے بعض حصے اول و آخر سے کم ہیں، اسلئے کہ اسکی ابتدا اگرچہ بسم اللہ سے ہے، تاہم شروع کا عنوان ہے "قسم دوم در توحید رب العالمین جل جلالہ" آخری حصے کا عنوان ہے "قسم دہم مثنویات اول کنوز الرموز، سیر العباد الی المعاد و مراتب حال انسانی" آخر کی دو مثنویاں مجموعۂ ہذا میں نہیں ہیں، صرف کنوز الرموز ہے،

۶- چوتھا قلمی حصہ "مکاتیب سنائی" کا ہے، تقطیع چھوٹی، خوشخط نسخ، ۲۰ خط ہیں، ایک خواجہ احمد بن مسعود کے نام جن کی فرمائش سے حکیم سنائی نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا، ایک خط خواجہ قوام الدین وزیر عراق کے نام ہے، ایک حکیم عمر خیام کے نام، باقی علیٰ ہذا القیاس، حکیم عمر خیام کے القاب میں فرید الزمانی فریع الدہر لکھا ہے، درمیان خط میں ایک جگہ پیشوائے حکیمان کے لفظ سے خطاب کیا ہے، مکاتیب کی تحریر کا سنہ اور کاتب کا نام درج نہیں، خط اور کاغذ کے انداز سے نسخہ قدیم معلوم ہوتا ہے،

---

# اسلام[1] سوڈان میں

مترجمہ

مولوی محمد یوسف صاحب فاضل دار السلام عمرآباد (مدراس) رفیق دار المصنفین،

اسلام کا مولد و منشا ایشیا ہے، اور سوڈان افریقہ کا ایک ٹکڑا ہے، جو نیل کی وادی سے ملا ہوا ہے، پھر اسلام سوڈان کے دور دراز علاقہ میں کب اور کیسے پہنچ گیا، اور وہاں کی اجتماعی زندگی پر اسکا کیا اثر پڑا،

انگریزی مصری سوڈان افریقہ کا وہ علاقہ ہے، جو شمال وجنوب میں وادی حلفا کے شمالی شہر فرس اور وکٹوریا، اور نیانزا کی جھیلوں کے مابین اور مشرق ومغرب میں بحر احمر کے ساحل اور سلطنت ودامی کے درمیان واقع ہے،

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ علاقہ حبشہ زیریں کی سلطنت میں شامل تھا، جو قدیم مصری، ایرانی، یونانی اور رومی سلطنتوں کے معاصر تھی، اسکے دو پائے تخت تھے، ایک شہر نبتہ جو نیل کے پورب چوتھی آبشار کے قریب برکل پہاڑ کے کنارے پر واقع ہے، دوسرا شہر مروی جو موجودہ زمانہ کے حلۃ البجراویہ کے قریب شمالی شہر شندی سے تقریباً پچاس کیلومیٹر دور واقع ہے، حبشہ کی یہ سلطنت رومی سلطنت کے آخری زمانہ یعنی ۶۴۰ء تک قائم رہی جس کے بعد اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

۱۔ مملکت نوبہ، جو نیل کے کنارے پہلی آبشار اور حبشہ کے درمیان واقع تھی،

۲۔ مملکت بجہ جو مشرقی صحرا میں قائم تھی،

قدیم مصریوں کی طرح ان دونوں مملکتوں کا مذہب بھی بت پرستی تھا، جب ۵۴۳ء کے قریب

[1] ترجمہ از الفتح مصر مورخہ ۱۸ رجمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ

مصر میں نصرانیت کا ظہور ہوا تو اسکندریہ کے نصرانی داعی مسیحیت کی تبلیغ کی غرض سے نوبہ کے علاقوں میں پہنچے، اور وہاں کے باشندوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور مذہب عیسوی کے قبول کرنے کی دعوت دی، چنانچہ تمام نوبیوں نے اس دعوت پر لبیک کہا، اور بت پرستی کے بجائے دین عیسوی کو اپنا مذہب قرار دیا،

اس کے بعد نوبہ میں نصرانیوں کی دو سلطنتیں ہوگئیں، ایک نوبۂ زیریں جو پہلے اور چوتھی آبشار کے درمیان واقع تھی، اس کا پایۂ تخت دنقلا العجوز تھا، جو نیل کے پورب موجودہ دار الحکومت دنقلا کے جنوب میں واقع ہے، دوسری نوبۂ بالا جس کو مورخین اسلام مملکت علوہ اور سوڈانی مملکت فنج کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو چھٹی آبشار اور شہر سنار کے درمیان پھیلی ہوئی تھی، اس کا پایۂ تخت شہر سوبہ تھا، جو نیل ازرق کے دائیں کنارے شہر خرطوم سے تقریباً ۲۴ کیلومیٹر دور جنوب میں واقع تھا،

مسلمانوں نے ۲۰ھ مطابق ۶۴۰ء میں مصر کو فتح کیا، اسکے بعد ہی سے مشرقی صحرا کی مملکت بجہ کے باشندوں کے ساتھ عربوں کا میل جول شروع ہوگیا، انھوں نے ان کو اسلام کی تعلیم دینی شروع کی، چنانچہ وہاں کے باشندوں نے اسلام تو قبول کرلیا، مگر ان میں ضعیف الاعتقادی اب تک موجود تھی، جیسا کہ آگے آئے گا،

فتح مصر کے بعد سے مسلمان عرب نوبہ کی دونوں سلطنتوں میں بھی آنے جانے اور وہاں کے لوگوں کو بتدریج اسلام میں داخل کرنے لگے تھے، یہانتک کہ ۲۱ھ میں مسلمانوں کو ایک چھوٹی سی جبری لڑائی لڑنی پڑی، اس میں عرب بری طرح مجروح ہوئے، اور آنکھیں ضائع کرکے لوٹے، کیونکہ نوبہ کے باشندے بہت اچھے تیرانداز تھے، چنانچہ مسلمانوں نے ان کا نام ہی رماۃ الحدق یعنی "آنکھوں پر تیر چلانے والے" رکھ دیا تھا،

لڑائی کے اس برے نتیجہ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو بہت ہی برانگیختہ کردیا، انھوں نے

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی سرکردگی میں نوبہ زیرین کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بیس ہزار کا ایک لشکر روانہ کیا، ایک زمانہ تک یہ لشکر وہاں پڑا رہا، آخر حضرت عمرو بن العاصؓ کی طلبی پر نوبہ کی مملکت سے یہ صلح کرکے واپس چلا آیا کہ وہ سالانہ مصر کے والی کو ایک مقرر رقم بھیجا کرے گی،

اس کے بعد حضرت عمر بن الخطابؓ کی شہادت اور حضرت عثمانؓ کی خلافت اور حضرت عمروؓ ابن العاص کی معزولی، اور ان کی جگہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی تولیت مصر کا واقعہ پیش آیا، نوبہ نے فوراً صلح توڑ دی، اور نوبیوں کی ایک جماعت نے صعید مصر پر تاخت و تاراج کی، اسلئے عبداللہ ابن سعد بن ابی سرح نے دوسری مرتبہ ان سے جنگ کرنے کا عزم کر لیا، اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ یعنی ۳۱ھ میں ایک عظیم الشان لشکر کیساتھ دنقلا العجوز کا سخت محاصرہ کرلیا، اور منجنیق کے ذریعہ ان پر پتھر پھینکنا شروع کیا، اہل نوبہ منجنیق چلانا نہیں جانتے تھے، جب ان کا کلیسا ان پتھروں سے تباہ ہونے لگا، تو وہ ڈر گئے، ان کے سردار قلیدرون نے صلح کی درخواست کی، اور خود عاجزی اور مسکنت کیساتھ عبداللہ بن سعد کے سامنے حاضر ہوا، انھوں نے اسکی بڑی تعظیم و تکریم کی، اور اس کے مرتبہ کو بلند کیا، اور سالانہ تین سو ساٹھ غلاموں کی ادائگی پر اس سے صلح کر لی، اور اس سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ سالانہ اناج بھیجا کریں گے، کیونکہ قلیدرون نے ان سے اپنے ملک میں اناج کی قلت کی شکایت کی تھی، عبداللہ بن سعد نے جو صلح کی تھی وہ حسب ذیل ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"امیر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی طرف سے نوبہ کے سردار اور اس کی مملکت کے تمام باشندوں کے لئے یہ عہد ہے کہ جس کی تعمیل اسوان سے لیکر ارض علوہ تک نوبہ کے ہر چھوٹے اور بڑے آدمی پر فرض ہے، عبداللہ بن سعد نے تمھارے لئے امان، اور تمھارے اور مسلمانوں اور اہل ذمہ کے درمیان صدقہ جاریہ مقرر کیا ہے، اسے نوبہ کے باشندو! تم

اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امان میں ہو، ہم اسوقت تک تم سے جنگ نہین
کریں گے مگر جب تک تم ہمارے اور اپنے درمیان کی ان شرطوں پر قائم رہوگے، کہ تم ہمارے
شہروں میں داخل ہوگے، مگر اقامت نہیں اختیار کروگے، جو مسلمان یا معاہد تمہارے شہروں
میں داخل ہوگا، ان کے واپس ہونے تک تم ان کی حفاظت کروگے، ہر اُس غلام کو جو
مسلمانوں کے پاس سے بھاگ کر تمہارے پاس آئے، اسکو مملکت اسلام کی طرف لوٹا دوگے،
اس کی سرپرستی یا چاپلوسی قبول نہ کروگے، اور نہ اس مسلمان کو منع کروگے، جو غلام کو گرفتار
کرنے کے لئے تمہارے شہروں میں گیا ہے، تم پر اس مسجد کی حفاظت لازمی ہے، جس کو
مسلمانوں نے تمہارے شہر میں تعمیر کیا ہے، اور کسی نماز پڑھنے والے کو اس مسجد سے نہ روکوگے
اور تم پر اس مسجد کی تزیین وتکریم بھی ضروری ہے، تم پر واجب ہے کہ سالانہ تین سو ساٹھ
غلام جو اوسط درجہ کے ہوں ان میں کسی قسم کا عیب نہ ہو، مرد و عورت دونوں ہوں،
بالکل بوڑھے یا بچے نہ ہوں، اسوان کے والی کو بھیجا کرو، ارض علوہ سے اسوان تک
کے کسی مسلمان پر یہ ضروری نہیں کہ تمہارے دشمن کو دفع کرے، اگر تم نے کسی مسلمان کو
پناہ دی یا کسی مسلمان اور معاہد کو قتل کیا، یا کسی مسجد سے تعرض کیا، جس کو مسلمانوں نے تمہارے
شہر میں تعمیر کیا ہے، یا تین سو ساٹھ غلاموں کے روانہ کرنے میں کچھ کمی کی، تو اس سے یہ صلح
و امان بالکل بری ہے، ہم نے اور تم نے اس پر یکسان عہد کیا ہے، یہانتک کہ اللہ تعالیٰ
ہمارے درمیان فیصلہ کرے، اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے، اسی پر خدا کا عہد اور
میثاق ہے، اس کا اور اس کے رسول کا ذمہ ہے، اور ہمارے لئے تم پر مسیحؑ حواری
اور تمہارے دین وملت کے بزرگوں کا ذمہ ہے، اور اس پر ہمارے اور تمہارے
درمیان اللہ تعالیٰ گواہ ہے، عمر بن شرحبیل نے رمضان ۳۱ھ میں اسکو لکھا"

اس جزیہ کا نام جو نوبہ کی حکومت سالانہ ادا کرتی تھی، "بقط" تھا، یہ بقط ہمیشہ وصول ہوتا رہا، یہانتک کہ تمام نوبہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوگیا، "بقط" کی یہ مقدار بیت المال کے لئے تھی، اسکے علاوہ امیر مصر کے لئے چالیس غلام، والی اسوان کے لئے جو بقط وصول کرتا تھا بیس، اسوان کے حاکم کے لئے جو بقط کی وصولی کے وقت حاضر ہوتا تھا پانچ اور اسوان کے بارہ انصاف پسند گواہون کے لئے جو حاکم کے ساتھ آتے تھے، ہر ایک کو ایک غلام کے حساب سے بارہ غلام مقرر تھے، اس جگہ کا نام جہان بقط لیا جاتا تھا "قصر" تھا، جو اسوان سے چھ میل دور تھا،

یہ جو کچھ تھا، نوبہ زیرین کے متعلق تھا، لیکن نوبۂ بالا جو مورخین اسلام کے نزدیک مملکت علوہ اور سوڈانیون کے نزدیک مملکت فنج کہلاتی تھی، طلوع اسلام کے زمانہ ہی سے عربون کی ہجرت گاہ بنی ہوئی تھی، ہجرت کا راستہ اکثر مصر سے ہوتا تھا، اور سمندر سے بہت کم، اسکے اسباب اجتماعی تھے، جیسے حکام کے ظلم سے فرار ہونا، یا رزق کی طلب میں نکلنا، یا سیاسی و دینی حقوق کی پامالی کی وجہ سے ہجرت کرنا، ان کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا یعنی قول و عمل سے اسلام کی تبلیغ کا جذبہ،

جب والی مصر اور نوبہ زیرین کے درمیان اتحاد ہوگیا، تو ہجرت کے لئے جگہ نکل آئی، اور عرب کثرت سے سوڈان کی طرف ہجرت کرنے لگے، عربی قبائل میں جن قبیلون نے بہت زیادہ تعداد میں ہجرت کی وہ جہینہ اور بنو عباس تھے، نوبی عنصر پر عربی عنصر کے غالب ہوجانے کے باوجود سارے شہر شاہ فنج ہی کے فرمانبردار رہے، یہان تک کہ سنار کے زنگیون نے بغاوت کی، اور عربون کو ساتھ لیکر فنج کے شہرون پر حملہ کیا، اور بے دریغ ان کا خون بہایا، اور مملکت علوہ کے پایۂ تخت سوبہ کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ سوڈان میں وہ ضرب المثل بن گیا، پھر انھون نے مملکت فنج کے دوسرے پایۂ تخت شہر قری پر چڑھائی کی، اور وہان کے بادشاہ کو قتل کرکے شہر پر قبضہ کرلیا، اور سنار میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی، عربون نے بھی شیخ کے لقب سے ایک شخص کو اپنا سردار مقرر کیا، اور شہر

قری کو اپنا مرکز قرار دیا، اس طرح سے اسلام نوبہ کے زیرین اور بالا دونوں حصوں میں پھیل گیا، اور نیل کے اطراف پہلی آبشار سے لیسٹر فازوغلی کی پہاڑیوں تک اور نیل الازرق وارض جزیرہ کا پورا ٹکڑا خالص اسلامی بنگیا،

۱۷۰۰ھ مطابق ۱۳۱۰ء تک اسلام نے نوبۂ زیرین کے پورے ٹکڑے کو گھیر لیا، اور ہم کو معلوم ہے، کہ وہاں ۲۱ھ میں اسلام داخل ہوا تھا، اور پورے نوبہ بالا کو ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۵ء میں اسلام نے اپنا حلقہ بگوش کر لیا،

حبشۂ زیریں کی دوسری مملکت جو بجہ کے نام سے مشہور تھی، اور جس کے متعلق ہم نے پہلے اشارہ کیا تھا، کہ وہاں اسلام ان عربوں کے ساتھ داخل ہوا تھا، جو ۲۱ھ کی فتح مصر کے بعد وہاں آنے جانے لگے تھے، اور اہل بجہ کیساتھ عربوں کا میل جول شروع ہوا تھا، یہ مملکت اسلام کے پہلے صابی تھی، اسکے باشندے بت پرست تھے، ان میں کے ہر ایک قبیلہ کا ایک کاہن ہوتا تھا، جس کے لئے چمڑے کا ایک خیمہ بنا دیا جاتا تھا، اور یہی خیمہ ان کا معبد بھی تھا، جب کبھی اس کاہن سے ایسے امر کے متعلق جس میں غیب کی بات معلوم کرنی ہوتی، خبر دریافت کیجاتی، تو وہ تنہا پیٹھ کی طرف سے خیمہ میں داخل ہوجاتا، پھر ایسی حالت میں باہر آتا، کہ اس پر ہذیان واضطراب یا صرع کی سی کیفیت طاری رہتی، اور وہ لوگوں سے کہتا کہ شیطان نے تم کو سلام کہا ہے، اور ایسا اور ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، وہ لوگ اس کو سچ جانکر اس پر عمل کرتے تھے،

۳۱ھ میں جب عبد اللہ بن سعد نوبہ کی لڑائی سے واپس آئے، تو بجہ کی ایک جماعت جو ضعیف الاعتقادی کیساتھ شرف اسلام سے مشرف ہوئی تھی، ان کے پاس آئی، اور ان سے اپنی اور اپنے ملک کی پوری حالت بیان کی مگر عبد اللہ نے کچھ توجہ نہ کی، اور نہ ان سے کوئی صلح کی، ان کو انکی حالت پر چھوڑ دیا، اس حالت میں کہ ان کا ایمان کمزور تھا، اور اسلام ان کے دلوں کی تہ تک نہیں پہنچا تھا، انھوں

نے کسی لشکر کے دباؤ سے اسلام نہیں قبول کیا تھا، بلکہ اجتماعی یا قومی رغبتوں سے اسلام کو مان لیا تھا، انکے نام بالکل ملے جلے تھے، ان کا تدین محدود اور ضعیف تھا، یہانتک کہ پہلی صدی ہجری کے اخیر میں عبداللہ ابن حجاب سلولی نے ان سے ان شرطوں پر صلح کر لی، کہ وہ ہر سال تین سو اونٹ دیا کریں گے، سواحل مصر میں تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوں گے، وہاں اقامت نہیں اختیار کریں گے، کسی مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کریں گے، اگر کسی کو قتل کیا، تو پھر ان کے لئے کوئی عہد نہ ہوگا، نیز مسلمانوں کے بھاگے ہوئے غلاموں کو پناہ نہیں دیں گے، اور جب ان کے شہروں میں فرار شدہ غلام آئیں گے، تو اُن کو واپس کر دیں گے، اور ان کا ایک وکیل سواحل مصر میں مسلمانوں کے پاس بطور رہن کے رہا کرے گا:

لیکن بجہ کی مملکت اس صلح پر قائم نہ رہی، بلکہ مسلمانوں کو اذیت پہنچانے لگی، اس زمانہ میں اسوان کے والی عراق سے مقرر کئے جاتے تھے، اسلئے اسوان کے والی نے خلیفہ مامون عباسی کو تمام حالات سے مطلع کیا، اس نے ۲۱۶ھ میں عبداللہ بن جہم کو اس سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا، عبداللہ نے اس کے ساتھ بہت سی خونریز لڑائیاں لڑیں، یہانتک کہ وہ صلح کی طالب ہوئی، چنانچہ کنون بن عبدالعزیز نے بجہ کے سردار اور عبداللہ کے درمیان ایک طویل صلح نامہ لکھا، جس کے ذریعہ سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی پوری بندش کی گئی، اور یہ ثابت کیا گیا کہ اسکی پوری مملکت یعنی اسوان لیکر دھلک و باضع تک جو کچھ ہے، وہ خلیفہ مامون کی ملکیت ہے، اور اس کی رعایا امیرالمومنین کی غلام ہے، مگر وہ پہلے کے مانند اب بھی بجہ کا سردار اس شرط بھی رہے گا، کہ وہ سالانہ سو اونٹ یا تین سو دینار مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کرے، نیز امیرالمومنین اور اسکے والیوں کو اس کی مملکت پر تصرف کرنے کا پورا اختیار ہوگا، اور جو شخص نبی کریم صلعم، قرآن مجید اور مذہب اسلام کی شان میں گستاخی کرے گا، اہل حرب کے مانند اس کا خون بھی حلال ہوگا، ان کے علاوہ اور بھی

شرائط تھے، جن کی وجہ سے وہاں سلطانِ اسلام کا اقتدار بڑھ گیا،

۲۳۲ھ تک بجہ کی مملکت اس صلح پر قائم رہی، اس کے بعد وہاں کے باشندوں نے اس عہد کو توڑ دیا، اور سواحلِ مصر پر حملہ کرکے وہاں کے چند مسلمانوں کو قتل کر دیا، یہ خلیفہ متوکل کا زمانہ تھا، جب اسکو عہد کے توڑنے کی اطلاع ہوئی، تو اس نے ارکانِ دولت سے مشورہ لیا، لیکن راستہ کی مشکلات کی وجہ کوئی فوج نہ بھیج سکا، اس سے بجہ والون کی ہمت اور بڑھ گئی، اور ان میں سرکشی یہانتک بڑھی کہ صعید مصر کے باشندے ان سے خوف کھانے لگے،

یہ دیکھکر متوکل نے محمد بن عبد اللہ القمی کو اسوان کا والی بنا کر بھیجا، اور اقفرا، اسنا اور ارمنت کے مواضع اسکی ماتحتی میں دیے، اور اسے حکم دیا کہ بجہ کے ساتھ جنگ کرے، اور عاملِ مصر عنبسہ بن اسحاق کو لکھا، کہ لشکر وغیرہ سے اس کی مدد کرے، چنانچہ محمد بن عبد اللہ القمی نے تیس ہزار سوار اور پیادوں کے ساتھ بجہ کی طرف کوچ کیا، اور سات کشتیاں جو آٹا، زیتون، کھجور اور جو سے بھری ہوئی تھیں، بحر قلزم کے ذریعہ مملکت بجہ کے ساحل پر روانہ کین، اور ان کو ہدایت کر دی، کہ وہ سمندر سے ہوکر لشکر سے آملیں، اس لڑائی میں مسلمانون نے بڑی ثابت قدمی دکھائی، اور انھوں نے بجہ والوں کی ایک کثیر تعداد کو قتل کیا، یہان تک کہ اون کے سردار علی بابا نے امان طلب کی،

۲۴۱ھ میں یہ معرکہ پیش آیا تھا، اس کے بعد سے مملکت بجہ میں ہمیشہ کے لئے سکون ہوگیا، اور مسلمانون نے ہر طرف پھیل کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، یہانتک کہ نوبہ و بجہ کی دونوں مملکتیں خالص اسلامی بن گئیں، اور مشرقی جہت میں سواکن سے لیکر مصوع تک اور نیل ابیض کا پورا علاقہ مشرف باسلام ہوگیا،

اس طرح سے پورا وہ علاقہ جو مشرق و مغرب میں سواحلِ بحر احمر اور نیل ابیض کے

درمیان اور شمال وجنوب میں نیلی آبشار اور فازوغلی کی پہاڑیوں کے درمیان پھیلا ہوا تھا، نورِ اسلام سے منور ہو گیا،

اس پر میں اتنا زیادہ کرنا چاہتا ہون کہ شمالی افریقیہ کے بربری مسلمانون کے ساتھ عرب بھی دارا لغور پہنچے، اور انھوں نے وہاں کے لوگون کو مذہب اسلام کی تعلیم دینی شروع کی جس کی وجہ سے ایک دوسرا اسلامی ٹکڑا نکل آیا، جو پہلے اسلامی ٹکڑے سے کردفان میں مل جاتا ہے، اسکی وجہ سے وادی نطرون سے لیکر بحر الغزال تک کا پورا ٹکڑا بھی اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا، آج پورے سوڈان میں کوئی علاقہ ایسا باقی نہیں ہے، جہاں اسلام پھیل نہ گیا ہو، یہانتک کہ بحر الغزال اعالی نیل یعنی فاشودہ (یہ دونون گذشتہ سال ایک دوسرے میں ملا دئے گئے جس کی وجہ سے ایک ہی کمشنری ہو گئی، جو آج کمشنری استوائیہ کے نام سے مشہور رہے) اور کردفان کے بعض حصے جو ابتک بت پرستی میں مبتلا تھے، ان میں بھی مسلمان تاجرون کی کوشش سے اسلام پھیل گیا ہے، حالانکہ یہ کام علماے اسلام کی طرف سے ہونا چاہئے تھا، جن پران عیسائیوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی اشاعت واجب تھی، جو تعلیم اور شفاخانون کے نشر و اشاعت سے دین مسیحی کو ہر جگہ پھیلا رہے ہیں، سوڈانی مسلمان سپاہیون نے بھی جو اپنی مدتِ ملازمت ختم کر کے وطن واپس ہوئے تھے، اسلام کی اشاعت میں تاجرونکی بہت کچھ مدد کی ہے،

یہانتک کہ صرف اس کا بیان تھا کہ اسلام سوڈان میں کیونکر داخل ہوا، لیکن وہاں کی اجتماعی زندگی پر اس کا اثر تو اس نے وہاں بھی اپنا اتنا ہی اچھا اثر ڈالا جتنا کہ اس نے دوسرے ملکون پر کیا تھا، کیونکہ اسلام عدل، صدق، اخلاص، مساوات اور ایک مجموعی عبارت میں فطرت اور ذوقِ سلیم کا دین ہے، پس اجتماعی زندگی کی پاکیزگی اور قربانی وایثار کرنے میں غالباً سوڈانی دوسری قوموں سے زیادہ فطرت کے قریب ہیں، ایک سوڈانی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لئے محبت کرنے والا اور مخلص مددگار

ہوتا ہے، وہ اپنے معاملات اور لین دین میں سچا اور اچھی نیت والا ہوتا ہے،

دنیا کی دوسری قوموں سے سوڈان کی علٰحدگی نے اسکو اب تک تمام برائیوں سے بچائے رکھا اب جب کہ دوسری قومون کیساتھ ربط وضبط اور مواصلات میں آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں میں نہیں جانتا کہ آیندہ اس کا کیا حال ہوگا، سوڈانی مسلمانوں کا تمدن بھی عجیب وغریب ہے، شروع ہی سے سوڈانی مسلمان ایک ہی طرح پر زندگی بسر کرتا ہے، اور ایک ہی طرح فکر کرتا ہے معلوم نہیں، کہ اس کے بعد اسکی اسلامی حالت کیا ہو گی،

میں چاہتا تھا کہ سوڈان کی مذہبی زندگی پر پوری طرح بحث کرون، کیونکہ مجھے نظر آتا ہے، کہ اس میں ایسے قوی اسباب موجود ہیں، جو سوڈانیون کو تنظیم پر برانگیختہ کر سکتے ہیں، سوڈانی قوم ایک چٹان ہے، جس پر تنظیم کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، میں اس جگہ کے اجتماع نقیضین پر تعجب کرتا ہون لیکن تعجب کیوں ہو، اگر ہم کتاب اللہ اور سنت رسول کی روشنی میں سوڈانیوں کی زندگی پر غور کرینگے تو معلوم ہوگا، کہ ان کی زندگی بالکل مذہبی ہے، اور مذہبی استقلال ان میں اب تک موجود ہے، اسکے آثار مصر میں بھی پائے جاتے ہیں، جو اسلام کی ہدایت وعرفان کے پھیلنے کی جگہ ہے، اسلئے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں، کہ سوڈان نے اسلام کی دولت سے بہت اچھا حصہ پایا ہے،

# عربوں کی جہازرانی

# عباسی دربار کے اثرات

## عربی ادب و ثقافت پر

از جناب عبدالقیوم صاحب ایم اے ریسرچ اسٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی،

بنی امیہ کے زوال کے بعد تاریخِ اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، نئی ثقافت کی بنیاد رکھی گئی، نئے تمدن و معاشرت کو جو عربی تمدن سے مختلف تھا، قبول کیا گیا، اور نئے نئے خیالات نے عقائد و ادب میں جگہ حاصل کی، نئے علوم اور نئے عہد سے عباسیوں کے دربار میں جنم لے کر پروان چڑھے،

بعض لوگ تعصب یا محدود مطالعہ کی وجہ سے بنو امیہ کو اس بنا پر برا کہتے ہیں، کہ انھوں نے کوئی ٹھوس علمی خدمت انجام نہیں دی، اور ان پر تنگ خیالی کا الزام عائد کرتے ہیں، کہ حریت فکر کا کوئی نتیجہ ان کے عہد میں بر روے کار نہیں آیا، یہ لوگ دونوں کے زمانۂ حکومت کے فرق کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اگر بنی امیہ کو بھی اتنی طویل حکومت کا موقع ملا ہوتا، تو وہ یقیناً بنو عباس سے کہیں زیادہ خادم دین وعلم ثابت ہوتے، بنو امیہ کی علم پروری اور حریتِ فکر کے نتائج دیکھنے کے لئے اندلس کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے، کہ کس سرعت اور برق رفتاری کے ساتھ میدانِ علم و عقل میں وہ سب سے آگے بڑھ گئے،

**چند خصائص** یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مختلف قوموں اور ملکوں کے خاص خاص امتیازات ہوتے ہیں، جو انھیں رنگ، نسل، لسانی اور جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ فکر و تدبر، طرز بود و ماند، عقل و دانش اور علم و عمل میں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں، اور یہ چیزیں اقوام کے ملکی و طبعی حالات، تاریخی روایات

حکمران افراد کی ذہنیت و سلوک مصلحین اور قائدین کے طرز عمل، اور سیاسی اور معاشرتی نظام سے اثر پذیر ہوتی ہیں،

جب مختلف قومیں ایک حکمران کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں، تو مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر ایک شاندار تمدنی نتیجہ پیدا ہونا لازمی امر ہو، عباسیوں کی سلطنت سندھ سے لیکر تونس، مراکش اور الجزائر تک کے وسیع رقبہ پر محیط تھی، جس میں مختلف قومیں آباد تھیں، جنکے خصائص جدا جدا تھے، انکے تمام خصائل عباسی معاشرت سیاست عقائد اور علوم و آداب پر بہت حد تک اثر انداز ہوئے۔

پھر ان مختلف اقوام کے ازدواج، اختلاط اور امتزاج سے ایک ایسی نسل پیدا ہوئی، جو قومیت اور خون کے اعتبار سے مختلف قوموں کے اوصاف کی حامل تھی،

اس سلسلے میں یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا، کہ حرم میں آزاد اور شریف النسل عورتوں کیساتھ ساتھ لونڈیوں کا رواج بھی تھا، اس رواج کو اس لئے زیادہ مقبولیت ہوئی، کہ شریف عورتوں کے مقابلہ میں لونڈیوں کا رکھنا بہت زیادہ آسان تھا،

اس اختلاط کا اثر محض نسلی امتزاج تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ شعر و سخن، علم و ادب، اور سیاست و معاشرت وغیرہ کوئی شعبہ اس سے محفوظ نہ رہ سکا، عربی شاعروں نے فارسی تغزل کا رنگ اڑایا، جاہلی شاعری میں شراب اور محبوبہ کا ذکر ہے، مگر عباسیوں کے عہد میں فارسی اثر نے اس میں جو آب و رنگ پیدا کر دیا، وہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں مفقود نظر آتا ہے، اسی طرح فارسی شعراء نے عربی اسلوب اور قافیہ کو اپنا لیا، نثر میں حکمی سے یونان اور فارس کے مقولے بکثرت جمع ہوگئے،

مذہبی حلقے بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے، یہودیوں، عیسائیوں، زردشتیوں، اور مجوسیوں وغیرہ کے اجتماع و اختلاط نے عقائد میں جدتیں پیدا کیں، علمائے اسلام نے ان کی روک کے لئے علم کلام پیدا کیا، استدلال کو نئے سانچے میں ڈھالا، اور مناظروں اور مباحثوں نے نیا رنگ اختیار کیا،

**فارسی ثقافت** عباسی تہذیب میں بہت سی ثقافتیں کارفرما تھیں، ان میں ایرانی، یونانی اور ہندی قابلِ ذکر ہیں، ان مختلف اقوام کے جذبات و خیالات، مختلف علمی استعدادوں اور قابلیتوں، مختلف زبانوں اور ان کے محاوروں سے عربی ادب اور ثقافت میں نمایاں انقلابات پیدا کئے، فارسی ثقافت خصوصیت کے ساتھ سب ثقافتوں سے زیادہ اثر انداز ہوئی، یہانتک کہ اموی عہد کو عربی حکومت سے اور عباسی عہد کو فارسی حکومت سے تعبیر کیا جانے لگا،

**وزارت** فارسی تہذیب و ثقافت پر پہلا اثر یہ ہوا کہ عباسی دربار میں ایک نئے عہدے کی بنیاد رکھی گئی، اس سے پہلے عربی تہذیب و تمدن اس عہدے سے بالکل ناآشنا تھا، عرب اس لفظ سے واقف تو تھے، اور اس کو اپنے کلام میں استعمال بھی کرتے تھے، مگر ان خاص معنوں میں یہ چیز عربوں کے ہاں مفقود تھی، عباسیوں کے عہد میں یہ لفظ اپنے خاص اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا، اور عہدۂ وزارت اپنے خاص فرائض و حقوق کیساتھ معرضِ وجود میں آیا،

اس عہدے کے متعلق یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اکثر وزراء عجمی منتخب ہوئے،

وزیروں کے مختلف فرائض اور ذمہ داریاں تھیں، بعد میں ہر شعبہ کے لئے علیحدہ علیحدہ وزیر مقرر ہونے لگے،

وزیر کے لئے ضروری تھا، کہ وہ بہترین ادیب ہو، نظم و نسق کی قابلیت رکھتا ہو، فہم رسا کیساتھ وسیع معلومات رکھتا ہو، اسکے علاوہ وزیر کو ایک کاتب یعنی سکریٹری بھی ملتا تھا، اس سے کاتبوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی، جو بڑے صاحبِ قلم ثابت ہوئے، کاتب بھی اکثر و بیشتر عجمیوں ہی سے پیدا ہوئے،

اس جماعت نے علم و ادب پر بھی تسلط جما لیا، اور اپنے فارسی علوم و فنون کو عربی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا،

یہاں اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کہ اس دور میں بہت سی کتابیں کاتبوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے لکھی گئیں، جو "ادب الکاتب" اور "ادب الکتاب" کے ناموں سے مشہور ہوئیں، علماء کے اس گروہ نے فارسی علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے میں بڑی سرگرمی کا اظہار کیا، فارسی حکماء کے اقوال، فارسی ادب کی کتابیں وغیرہ، ہر دلچسپ ادب کو عربی میں منتقل کرنے کی کوشش کی،

بغداد کے دارالخلافہ بنتے ہی وہ فارسی تہذیب و تمدن کا مرکز قرار پاگیا، خلفائے عباسیہ نے عجمی خواتین کو اپنے حرم میں لیا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عباسیوں کے رجحانات فارسیوں کی طرف مائل ہوگئے،

اس عہد میں بہت سے فارسی الفاظ عربی میں مستعمل ہونے لگے، عجمیوں نے عربوں کو نزاکتِ خیال بخشی،

ایرانی قدیم زمانہ سے شراب و کباب اور نغمۂ و سرود کی جانب بہت مائل تھے، بلکہ یہ چیزیں ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھیں، اسلئے انھوں نے ان چیزوں کو عربی اشعار و کلام میں پیش کیا، شعرائے جاہلیت کے کلام میں بھی شراب و عشق کا ذکر ہے، مگر طرفہ اور امرؤالقیس، اور ابو نواس، صریع الغوانی، اور بشار کی لطافتِ بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے،

اسی طرح عباسیوں کے قبل کے عربی شعراء نے بھی زہد و تقشف اور زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے، مگر جو شے ابوالعتاہیہ نے پیش کی وہ کچھ اور ہی حیثیت رکھتی ہے،

عربی ادب میں بھی حیوانات اور حشرات کی زبانی حکایات و اقوال موجود تھے، مگر اس دور میں تراجم کی وجہ سے بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا، ان میں کلیلہ و دمنہ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے،

عربی ادب پر فارسی اثر کا ذکر علامہ ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمہ میں بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں، کہ اسلامی علوم کے حامل قطع نظر اس سے کہ وہ علوم شرعی ہوں یا عقلی، اکثر و بیشتر عجمی ہیں، اگر بعض نسبت کے لحاظ سے عربی ہیں تو زبان تربیت اور اساتذہ کے اعتبار سے عجمی،

**ہندوستانی ثقافت،** ہندوستانیوں اور عربوں کے تعلقات ظہورِ اسلام کے بہت پہلے سے چلے آتے ہیں، اسلام کے سرزمین ہند پر قدم رکھنے سے بہت پہلے عربوں اور ہندوستانیوں میں تجارتی تعلقات قائم تھے، چنانچہ عربی لٹریچر میں "ہند" کا لفظ مختلف صورتوں اور شکلوں میں ملتا ہے،

جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، اور مسلمانوں نے اسلام کا جھنڈا سرزمین فارس پر لہرایا، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہندوستان کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل کرنے کے لئے امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے ایک تحقیقاتی وفد ہندوستان بھیجا، یہاں اس امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانے کے وسائل آمد و رفت کے پیش نظر یہ پہلا اسلامی وفد جو علمی تحقیقات کے لئے ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا، اپنی تحقیقات کو سندھ کے علاقہ کران تک محدود رکھنے پر مجبور ہوا، بہت ممکن ہے کہ وسائل آمد و رفت کی تکالیف کے ساتھ اس وقت کی ملکی و سیاسی مصلحتیں اور ہندوستانی حکام کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں بھی اس وفد کے آگے بڑھنے سے مانع ہوئی ہوں، بہر حال اس وفد نے اپنی تحقیقات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خلیفہ کے سامنے پیش کیا،

> "ملک میں پانی کی قلت ہے، پھلوں میں ردی قسم کی کھجور پیدا ہوتی ہے، چور اور ڈاکو بڑے دلیر ہیں، راہزنوں کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک قلیل جماعت اس ملک میں داخل ہو تو ڈاکو انھیں لوٹ لیں، اور پیداوار کی قلت کا یہ حال ہے، کہ اگر مسافر کثیر تعداد میں کاروان در کاروان اس ملک میں داخل ہوں" تو بھوکوں مر جائیں"

اس کے بعد بنو امیہ کے عہدِ حکومت میں حجاج کے حکم سے جواں سال محمد بن قاسم ثقفی نے ساحل کراچی کے بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے روکنے کے لئے ہندوستان پر لشکرکشی کی، اور ملتان تک فاتحانہ چلا آیا،

یہ واقعات ہندوستان اور عرب کے درمیان بہت سے خوش آیند نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئے، عباسیوں کے عہد میں اسلامی مقبوضات کابل و کشمیر تک پھیل گئے،

ان فتوحات کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوگیا خصوصاً سندھ اور اس کے قرب و جوار میں اسلامی دعوت کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی،

قبولِ اسلام کے ساتھ یہ لوگ علم دوست بھی بن گئے، اور علمی خدمت کے سلسلہ میں اپنی ناقابلِ فراموش یادگاریں چھوڑ گئے، جو اب تک کتابوں میں موجود ہیں،

عربی علم و ادب کی تاریخ کا طالب علم ابو عطا سندھی کے اشعار سے بے خبر نہیں ہوسکتا، علم لغت میں سندھی علماء نے کافی شہرت حاصل کی، عربی لغت ابن الاعرابی کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی، شاید یہ سنکر تعجب ہوگا، کہ عربی لغت کا یہ مایۂ ناز عالم بھی ایک سندھی غلام ابوزید کا لختِ جگر تھا، اسی طرح علم حدیث میں بھی سندھیوں کے کارہائے نمایاں نظر آتے ہیں، حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں بہت سے سندھی محدثین کے حالات قلمبند کئے ہیں،

ہندوستانی عہد قدیم سے دنیا کی مشہور اور مہذب اقوام میں شمار کئے جاتے تھے، اور انکی تہذیب کو چین، روم، فارس، اور یونانی تہذیب کے برابر درجہ حاصل تھا، صنعت و حرفت، علم و فن خصوصاً طب، نجوم اور ریاضیات میں ہندوستان کی بڑی شہرت تھی، ہندی فلسفے اور الٰہیات کو بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، علوم و فنون کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کھیل بھی بہت مشہور تھے، فلسفیانہ اور حکیمانہ اقوال ہندوستانی ادب میں بکثرت پائے جاتے ہیں،

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہندوستانی فلسفۂ الٰہیات کا تعلق صرف نظریات اور عقلیات تک محدود تھا، عملیات اور محسوسات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا،

ہندوستانیوں کے عقائد میں جو شے مسلمانوں کے لئے تعجب کا باعث ہوئی، وہ عقیدۂ تناسخ تھا،

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ مسلمانوں نے ہمیشہ علم دوستی، بلکہ علم پروری کا ثبوت دیا، کسی قوم کے علم کی تحصیل میں کبھی کوئی عار نہیں کیا، جس قوم اور جس ملک سے جو چیز اچھی ملی، اسے صرف قبول ہی نہیں کیا، بلکہ اسکو ترقی کے آخری زینے تک پہنچا دیا،

ریاضی انھوں نے ہندوستانیوں سے حاصل کی، پھر اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ خود دنیا کے استاد کہلائے، عباسی عہد میں متعدد کتابیں ہندی سے عربی میں منتقل کی گئیں،

عباسیوں نے ہندوستانی حکما، اور اطبا کو اپنے دربار میں عزت و احترام کی جگہ دی، اور انعام و اکرام سے نوازا،

عباسیوں کے عہد میں ذوقِ علم بہت ترقی کر چکا تھا، تمام مشہور اور مفید کتابیں عربی میں منتقل ہو رہی تھیں، ہندی ادب کی بہترین کتابیں جو فارسی میں ترجمہ ہو چکی تھیں، عباسیوں کے عہد میں فارسی سے عربی میں منتقل کی گئیں،

ان اثرات کے علاوہ باہمی اختلاط اور میل جول سے عربی زبان میں بھی اضافہ ہوا، بہت سے ہندی الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے لگے، بالخصوص دواؤں، درختوں، پھولوں اور جانوروں کے نام،

ہندوستانی خیالات بھی عربی ادب پر اثر انداز ہوئے، ہندی کی قصہ اور کہانیوں کی کتابوں کے عربی میں منتقل ہونے سے ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا،

اس موقع پر یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کہ شطرنج بھی عباسی دربار میں ہندوستانی ثقافت

کی یادگار تھی، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ کھیل عربوں نے فارسیوں سے سیکھا یا براہ راست ہندوستانیوں سے، مگر اس میں کلام نہیں، کہ یہ کھیل ہندوستانی دماغ کی پیداوار ہے،

یونانی ثقافت | یونان قدیم زمانہ سے ایک متمدن ملک تھا، اور اسے بجا طور پر اپنے علوم و فنون اور ثقافت پر ناز رہا، یونان علم و دانش اور عقل و فکر کے میدان میں تمام ممالک و اقوام سے سبقت لے گیا، یونانیوں نے طب، فلسفہ و حکمت، ادب، تاریخ، ریاضیات، سیاسیات اور فنون لطیفہ وغیرہ کا دنیا کو ایک مدت تک سبق دیا،

یونانی ثقافت کے تین بڑے مرکز عربی ثقافت و ادب پر زیادہ اثر انداز ہوئے، اسلئے ان اسکولوں یا مرکزوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے،

جُنڈیسابور | جندیسابور طب یونانی کا بہت بڑا مرکز تھا، اسلام سے پہلے اور بعد دونوں زمانوں میں اس نے بڑے بڑے مشاہیر اطبا پیدا کئے، یہانتک کہا جاتا ہے، کہ عرب جاہلی کا مشہور طبیب حارث ابن کلدہ ثقفی بھی اسی اسکول کا سند یافتہ تھا، اور اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ عباسی دربار کے اکثر و بیشتر اطبا، اسی اسکول کے تعلیم یافتہ تھے،

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک بہت بڑا ہسپتال بھی اس اسکول سے ملحق تھا، جہاں عملی تعلیم دیجاتی تھی، اسکے معلمین اور شیوخ میں ہندوستانی اہلِ فن بھی نظر آتے ہیں،

حَرّان | ریاضیات اور بالخصوص علم ہیئت کا مرکز تھا،

اسکندریہ | ادب اور فلسفہ کا مرکز تھا، یونانی فلسفہ کی نشر و اشاعت میں جسقدر اسکندریہ کو دخل ہے کسی اور اسکول یا مرکز کو نہیں، بہت سی کتب فلسفہ عربی زبان میں منتقل کی گئیں،[1]

---

[1] اس اسکول کا اثر اموی عہد میں بھی نظر آتا ہو، خالد بن یزید بن معاویہ کے حکم سے چند ایک کتابیں عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عہدِ خلافت میں بھی اسکندری طبیب ابن ابجر کا پتہ چلتا ہے،

عباسی عہد میں مترجمین کی ایک بہت بڑی جماعت نظر آتی ہی، جو مختلف علوم کی کتابین عربی میں ترجمہ کرتی تھی، فلسفہ، منطق، طب، ہیئت، معاشرت و تمدن غرض ہر علم کی کتابون کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا،

تراجم کا لازمی نتیجہ یہ ہوا، کہ مسلمانوں نے ان علوم کا گہرا مطالعہ کیا، یونانی ثقافت سے دلچسپی پیدا ہوگئی، مسلمان یونانیوں کے علوم، عقائد اور خیالات سے آگاہ ہوئے، یونانیوں کے طرزِ بیان، اسلوب تکلم اور طریق استدلال سے واقفیت حاصل ہوئی،

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان علوم کو عربی میں منتقل کرکے زمانے کے دستبرد سے محفوظ کر دیا، اپنے علم کلام کو تریا و منضبوط کیا، یونانی حکما، و فلاسفہ کے طرز و اسلوب کو بقدر ضرورت اپنا لیا،

یونانی ثقافت اسلامی فلسفہ اور تصوف پر بھی اثر انداز ہوئی، مگر اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کہ یونانی علوم ہمیشہ ثانوی حیثیت رکھتے تھے، مسلمانون نے ان علوم کو اپنی کتابون میں صرف اسی قدر جگہ دی، جسقدر کہ ان کی افادیت کا تعلق تھا، غیر ضروری اور لاطائل مباحث کو نظر انداز کر دیا، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یونانی حکما کے اکثر نظریات کی تردید کی، اور اس پر مستقل کتابین لکھین،

---

# المامون

یعنی خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہدِ سلطنت کے حالات، مولینا شبلی مرحوم کی یہ پہلی تصنیف ہی، جس میں ممدوح نے تاریخِ اسلام کے پرفخر عہد کے سیاسی، علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی حالات قلمبند کئے ہیں، جن سے دولتِ عباسیہ کے عروج و کمال کے زمانہ کا مرقع آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہی، اب تک اس کے بازاری نسخے عام طریقے سے فروخت ہوتے تھے، اب مطبع معارف نے خاص اہتمام سے طبع کرا کے شائع کیا ہی، کاغذ، لکھائی چھپائی بہترین ہی، ضخامت ۴۴۲ صفحے، قیمت باختلاف کاغذ عار، عہر

"منیجر"

# تلخیص و تبصرہ

## کائنات بغیر خدا کے

مندرجۂ بالا عنوان سے ڈاکٹر سنڈرلینڈ (Dr. J. T. Sunderland) کا ایک مقالہ ہفتہ وار ٹروتھ، لاہور (۱۰ ر نومبر ۱۹۳۲ء) میں نقل ہوا ہے، ناظرین معارف کے لئے اس کا خلاصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے، الحاد کی بے باکی پر مغرب کے ایک فاضل کے یہ خیالات ہمارے ملک کے "روشن خیالوں" کے لئے قابلِ عبرت ہیں:۔

الحاد کے اثرات برے ہوتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں، کہ تمام ملحدین برے لوگ ہیں، برعکس اس کے ہر سمجھدار اور انصاف پسند آدمی تسلیم کرے گا، کہ ملحدین میں بہتیرے بلند اخلاق کے بھی ہیں، جو تقریباً ہر نیک مقصد کی ترقی میں خلوص کیساتھ کوشاں رہتے ہیں، مثلاً اب سے دو پشت پہلے غلامی کے انسداد کے لئے جو تحریک اٹھائی گئی تھی، اس میں ممتاز ملحدین بھی شریک تھے، ایسے ہی بعد کی تحریکوں میں بھی جو عورتوں کی ترقی، قید خانوں کی اصلاح، اور جنگ کے انسداد کے لئے شروع کی گئیں، ملحدین کی شرکت نمایان رہی،

لیکن ان تحریکوں میں اکثریت ملحدین کی نہ تھی، بلکہ ہمیشہ ان لوگون کی تھی، جو خدا کے قائل تھے، اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں، کہ جن ملحدوں نے ان نیک تحریکوں میں حصہ لیا، انھوں نے ہمیشہ یا عموماً اپنے الحاد کی وجہ سے ایسا کیا، جو لوگ خدا کے قائل ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ خدا کا

انکار خواہ وہ کسی شکل میں ہو بہت سی حیثیتوں سے برا ہے، ان میں سے زیادہ اہم حیثیتیں حسب ذیل ہیں:

الحاد کائنات کو بیحد پست کر دیتا ہے، ٹامس ہکسلے، (Thomas Huxley) نے جو ڈارون (Darwin) کا ممتاز ہمعصر تھا، مادہ پرست (ملحد) کی کائنات کی تعریف یوں کی ہے:-

"دونا بینا بچوں یعنی مادہ اور قوت کا بنایا ہوا ایک مٹی کا سنبوسہ" یہ طنز ضرور ہے، لیکن کسی شخص نے اس سے زیادہ صداقت کے ساتھ مادہ پرست کی دنیا کی تعریف نہیں کی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ جو کائنات عقل یا مقصد سے خالی ہوگی، وہ ایک نہایت درجہ پست اور حقیر چیز ہوگی، ایسی کائنات میں نہ کوئی قانون ہوگا، نہ ترتیب کیونکہ یہ چیزیں صرف عقل سے پیدا ہوتی ہیں، اس میں نہ زندگی کو پیدا کرنے کی قوت ہوگی اور نہ اس کے اندر زندگی قائم رہ سکیگی،

الحاد انسان کو بھی انتہائی پستی اور ذلت تک پہنچا دیتا ہے، جو انسان خدا کا قائل ہے، اس کے مرتبہ اور قدر کی انتہا نہیں، وہ ایک غیر محدود مقصد کا نتیجہ ہے، وہ کائنات کے وسیع ارتقائی نظام کی بلند ترین کڑی ہے، بقول قدیم عبرانی شاعر کے "وہ خدا سے کچھ ہی نیچے ہے" برخلاف اسکے ملحد کی حیثیت کسقدر مختلف ہے! اس کا وجود محض اتفاق کی بنا پر ہے، اس کی ذات کسی مقصد کی نمایندگی نہیں کرتی، اسکی ہستی کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ بیجان مادہ اور اندھی قوت کی پیداوار ہے،

اگر دنیا کے سائنسدان بالآخر اس بات کے قائل ہو جائیں کہ کائنات عقل اور مقصد کی کارفرمائی سے خالی ہے یعنی اس کی ہر چیز اتفاقی اور بغیر مدعا کے ہے، تو اس کا اثر ان پر کیا پڑے گا؟ کیا اس عقیدہ کا اثر صد درجہ تباہ کن ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ کیا سمجھدار لوگ زیادہ دنوں تک ان چیزوں کی تفتیش و تحقیق میں مصروف رہیں گے، جن کے متعلق وہ یقین کر چکے ہیں، کہ اتفاق اور انتشار محض سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں؟

تمام پیغمبروں نے خدا اور انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے، جو لوگ خدا کے قائل ہیں

ان کا عقیدہ ہے کہ تمام بہترین مذاہب کی تعلیم یہی ہے، لیکن کیا ملحدین بھی خدا اور نوعِ انسانی کی محبت کے قائل ہیں، ملحدین میں جو بہترین دل و دماغ کے لوگ ہیں، وہ بھی اس تعلیم کے نصف سے زیادہ نہ بڑھ سکے، ان کی نظر فطرتِ انسانی کے صرف ناسوتی پہلو تک پہنچ کر رک گئی، وہ اس کے ملکوتی پہلو سے یا تو انکار کرتے ہیں، یا اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے،

اگر دنیا کا بڑا حصہ کبھی یہ عقیدہ رکھنے لگے، کہ انسان ایک روحانی اور ربانی فطرت کے حامل ہونے کے بجائے جس کا تعلق خالقِ کائنات سے ہے، محض ایک اتفاقی چیز ہے، اور صرف ایک ایسا حیوان ہے، جو غیر معمولی طور پر ذہین واقع ہوا ہے، تو اس عقیدہ کے نتائج کیا ہوں گے؟ کیا نوعِ انسانی کا اپنی قدر و قیمت سے متعلق اس درجہ پست اور حقیر اندازہ نہایت اہم نتائج سے خالی رہ سکتا ہے؟ کیا اس عقیدہ سے تمام انسانی ترقی، عمرانی، تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی حقیقۃً رک نہ جائیگی؟ کیا لوگ ترقی اور تمام بلند چیزوں میں دلچسپی لینا موقوف نہ کر دیں گے؟ کیا لوگوں کی سیرت سے سرگرمی اور اخلاق کا عنصر زائل نہ ہوتا جائے گا، اور وہ روز بروز اس خیال کے پیرو نہ ہوتے جائیں گے، کہ ہمیں کھا پی کر زندگی گذار دینی چاہئے، کیونکہ کل مر ہی جانا ہے؟

جو لوگ وجود باری تعالیٰ کے قائل ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کا اعتقاد دنیا کے لئے بہترین بشارت ہے، یہ ایک حقیقی بشارت ہے، کیونکہ جو چیزیں انسان کے نزدیک سب سے زیادہ قدر و قیمت کی ہو سکتی ہے، ان سب کے لئے ایجابی حیثیت رکھتی ہے، مثلاً (۱) خدا کا اعتقاد ایک ایسا مذہب ہے، جس کے بنیادی عنصر دو ہیں، خدا سے محبت اور نوعِ انسانی سے محبت، بہ الفاظِ دیگر یہ ربوبیتِ الٰہی اور اخوتِ انسانی کا مذہب ہے، (۲) یہ ایک ایسا مذہب ہے، جس کا مقصد ایک عالمگیر تحریک میں دنیا کے تمام نیک آدمیوں کو اس غرض سے شریک کر دینا ہے، کہ دنیا اور نسلِ انسانی کی اصلاح و ترقی کا ربانی نظام روز بروز زیادہ قوت کے ساتھ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا جائے،

اس کے بالکل برعکس الحاد کی حالت ہے، جو اپنے اندر کوئی بشارت نہیں رکھتا، بلکہ وہ تمام تر نفی والکار پر مبنی ہے، یہ صحیح ہے، کہ اس میں اکثر اہم ایجابی پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں، لیکن وہ باہر سے لاکر شامل کئے گئے ہیں، الحاد کے اندر خود کوئی ایجابی پہلو نہیں ہے، اسکی تمام فطرت ہی انکار سے پر ہے، الحاد کے بنیادی انکار چھ ہیں:- (۱) خدا کے وجود سے انکار، (۲) روحِ انسانی کے وجود سے انکار (۳) حیاتِ ابدی سے انکار، (۴) کائنات میں کسی ایسی عقل کے وجود سے انکار، جو انسان کی عقل سے زیادہ بلند ہو (۵) کائنات میں کسی مقصد کے وجود سے انکار (۶) روحانی دنیا کی حقیقت سے انکار،

جیسا کہ پہلے تسلیم کیا جا چکا ہے، الحاد کا ایک پہلو قابلِ ستائش ہے یعنی بہترین خارجی چیزوں سے اس کا تعلق، مثلاً اہم اجتماعی اصلاحات، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، لیکن بعض اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آیا الحاد کے انکار کی وجہ سے ان اصلاحات پر تو کوئی مضر اثر نہیں پڑتا،

الحاد کی ایک سطحی قسم بھی ہے جسے اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں، وہ وجود خداوندی کو ایک قدیم اور فرسودہ وہم پرستی سے تعبیر کرکے اُسے ترک کردینے پر فخر کرتا ہے، لیکن ملحدین میں جو لوگ اہلِ عقل اور صاحبِ فکر ہیں، انہیں خوب معلوم ہے کہ انکا الحاد دنیا کے تلخ تجربات کا مقابلہ کرنے کے لئے کسقدر کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہے،

ہر شخص جانتا ہے کہ سمندر میں کسی بڑے جہاز پر سفر کرنا اس حال میں کہ جہاز اپنی پوری رفتار کیساتھ جا رہا ہو، اور اس پر کوئی قائد یا کپتان نہ ہو، کس درجہ خطرناک ہے، لیکن کیا اس کرۂ ارض کے جہاز پر جو غیر معلوم فضار میں سمندر کے جہازوں سے ہزارہا ہزار گنا زیادہ سرعت کیساتھ جا رہا ہے سفر کرنا کچھ کم خطرناک ہوگا، اگر ہمکو معلوم ہوجائے کہ اس جہاز پر نہ کوئی کپتان ہے، نہ قائد، اور نہ کوئی ایسی عقل جو ہماری راستہ اور انجام کی رہنمائی کر رہی ہو، ٹھیک یہی حالت تمام نسلِ انسانی کی ہوگی اگر خدا کے وجود کا انکار کردیا جائے،

گذشتہ صدی کے نصف آخر میں پروفیسر کنگ فورڈ کلیفرڈ (Kingford clifford)

اور پروفیسر جارج رومانیز (George Romanes) انگلستان کے ممتاز ترین سائنسدانون میں تھے، یہ دونوں مادیت کے قوی اثرات سے جو مسئلۂ ارتقار کی اشاعت کے بعد کچھ دنوں تک پھیلے ہوئے تھے، خدا کے منکر ہوگئے، لیکن دونوں کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہو کہ کبھی کبھی وہ ایمان کے مقابلہ میں الحاد کی تلگینی بری طرح محسوس کرتے تھے، پروفیسر کلیفرڈ کے ایک مقالہ کا مندرجۂ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:۔ "اس میں شبہہ نہیں کہ جو لوگ وجود باری تعالیٰ کے قائل ہیں، ان کے لئے یہ عقیدہ تسکین وتسلی کا باعث ہو، اور اس سے محروم ہوجانا نہایت ہی تکلیف دہ ہے، اس میں کم از کم ہمارے زمانہ کے اُن بہت سے آدمیون کو شبہہ نہیں ہوسکتا، جو یا تو اسوقت بھی اس عقیدہ کے قائل ہیں، یا بچپن میں اسے حاصل کرنیکے بعد ایسے رنج وتکلیف کیساتھ اُسے چھوڑ چکے ہیں، جو صرف پیدائشی مذہب کے ترک کرنے سے محسوس ہوسکتی ہو، ہم نے موسم بہار کے آفتاب کو ایک خالی آسمان پر طلوع ہوکر ایک بے روح دنیا کو روشن کرتے ہوئے دیکھا ہی اور ہم نے انتہائی تنہائی کی حالت میں یہ بھی محسوس کیا ہو کہ وہ رفیق اعلیٰ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا،"

اس سے زیادہ غمناک پروفیسر رومانیز کے وہ الفاظ ہیں، جو انھون نے اپنی مشہور کتاب فزیکس ([illegible]) کے آخر میں لکھے ہیں، یہ کتاب الحاد کی مدافعت میں ایک نہایت زبردست تصنیف خیال کی جاتی ہو، وہ لکھتے ہین:۔ "مجھے اس امر کا اقرار کرنے میں شرم نہیں کہ عملی طور پر یوں خدا کا انکار کردینے سے کائنات کے حسن وخوبی کی روح جاتی رہی، اور اگرچہ اب سے اس تعلیم کی قوت کہ "جبتک دن ہے کام کرلینا چاہئے" بلاشبہہ ان الفاظ کے حد درجہ شدید معنی کی وجہ سے کہ "رات آرہی ہو، جب کہ کوئی شخص کام نہ کرسکے گا" اور زیادہ بڑھ جائیگی، تاہم جب بعض اوقات میں بالکل لابدی طور پر غور کرتا ہون، کہ اُس مذہب (عقیدہ خداوندی) کی مقدس عظمت جو کبھی میرا تھا، اور وجود کے وحشت انگیز راز کے درمیان جسے میں اب دیکھ رہا ہوں کسقدر ہیبت ناک فرق ہے، تو میرے لئے ناممکن ہوجاتا ہو کہ شدید ترین تکلیف جسکی میری فطرت اہل ہو، محسوس نہ کرون،"

"(ع ز"

# مدتِ حیات کی توسیع،

سنڈے اسٹیٹسمین مورخہ ۵ ار نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک دلچسپ مضمون اس موضوع پر شائع ہوا ہے جسکا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

یہ صحیح ہے، کہ غدود کے ذریعہ جسم میں از سرِ نو شباب کی لہر دوڑائی جاسکتی ہے، لیکن حیاتِ ابدی کا حصول اس صورت سے بھی ممکن نہیں، تجربہ ثابت کرچکا ہے کہ جو شباب غدود کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے، اس کا زوال بھی نہایت سریع ہوتا ہے، جدید ترین تحقیق یہ ہے، کہ مدتِ حیات کا تعلق غدود سے نہیں بلکہ دماغ سے ہے، معمولی قد کے انسانی دماغ میں چودہ ارب اکائیاں ( [illegible] ) ہوتی ہیں، اور وہ جسم کے تمام دوسرے خلیوں ( Cells ) سے اس بات میں مختلف ہوتی ہیں، کہ ضعیف ہوجانے کے بعد اپنے اندر پھر پہلی سی قوت پیدا نہیں کرسکتیں، ہماری ہڈیوں، پٹھوں، اور خون کی قوت برابر خرچ ہوتی رہتی ہے، اور پھر پیدا ہوتی رہتی ہو، لیکن دماغ کی قوت زائل ہونے کے بعد دوبارہ لوٹ نہیں سکتی، یہی وجہ ہے کہ غدود کی مدد سے جسم کا اعادۂ شباب تو ہوسکتا ہے، لیکن دماغ کی وہ قوت جو ایک حد تک پہنچ کر کم ہونے لگتی ہے، پھر واپس نہیں ہوتی، چونکہ دماغ کی قوت از سرِ نو پیدا نہیں ہوتی، اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی عمر وہی ہوتی ہے، جو اس کے دماغ کی عمر ہے، اور جب دماغ اپنا سرمایہ ختم کرکے فنا ہوجاتا ہو، تو انسان کا مرجانا بھی ضروری ہوجاتا ہو،

انسانی دماغ وزن اور قوت میں عمر کے بیسویں سال سے چالیسویں سال تک بڑھتا رہتا ہے، عورت کا دماغ بیس اور تیس سال کی عمر کے درمیان پختہ ہوتا ہے، اور مرد کا تیس اور چالیس سال کے درمیان، اور یہ پختگی دس بیس، اور کبھی کبھی تیس سال تک قائم رہتی ہے، علمائے سائنس

یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، کہ انسانی دماغ بہترین حالات میں زیادہ سے زیادہ کتنے دنوں زندہ رہ سکتا ہے، کیونکہ یہی مدت انسانی زندگی کی بھی قرار دیجائے گی، چنانچہ جن لوگوں نے غیر معمولی طور پر طویل عمروں میں وفات پائی ہے، ان کے حالات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جا رہا ہے، کہ ان میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے رہے ہوں گے، جو اپنی فطری زندگی کے آخری لمحات تک زندہ رہ کر بغیر کسی مرض کے مرے ہوں گے، پروفیسر پیکاک (PEACOCK) کی رائے ہے، کہ نہ صرف انسان بلکہ کسی حیوان کی عمر بھی ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں، لیکن دوسرے سائنسدانوں کے نزدیک ڈھائی سو برس کا تخمینہ زیادہ صحیح ہے، اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے چند مثالیں بھی فراہم کی ہیں، کارڈوا (جنوبی امریکہ) میں لوئسا ٹرکزو (LOUISA TRUXO) نامی ایک عورت نے ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا، اور اس وقت اس کی عمر (۱۷۵) بتائی گئی، شہر کی کونسل نے اس بیان پر یقین نہ کرکے سرکاری طور پر تفتیش و تحقیق شروع کی اور بالآخر اس نتیجہ پر پہونچی کہ متوفیہ کی عمر دراصل (۱۷۵) ہی سال تھی، ۱۷۲۴ء میں ہنگری کا ایک کسان جس کا نام زارٹن پٹراش (Zarton Petratsch) تھا، سرکاری دفتر کے اندراجات کے مطابق (۱۸۵) سال کی عمر میں مرا، پھر ایک انگریز ٹامس کارن (Thomas Carn) نے جو شاہ رچرڈ ثانی کے عہد (۱۳۷۷ء تا ۱۳۹۹ء) میں پیدا ہوا تھا، (۲۰۷) سال کی عمر پاکر ملکہ الزبتھ کے عہد (۱۵۵۸ء تا ۱۶۰۳ء) میں وفات پائی، ان سب سے بڑھ کر لی چینگ ینگ (Li Ching-Yueng) چین کا فرتوت اعظم ہے، جو دنیا میں سب سے زیادہ معمر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ شخص اب سے (۱۵۲) سال پہلے سو برس کی عمر تک پہونچ چکا تھا، کیونکہ اس کے خاندانی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۱۸۲۷ء میں حکومت چین نے باضابطہ طور پر اس کی عمر سو برس تسلیم کر لی تھی،

ان مثالون کو دیکھتے ہوئے علماے سائنس کا خیال ہے، کہ انسانی عمر کی زیادہ سے زیادہ مدت ڈھائی سو سال قرار دی جاسکتی ہے، لیکن اب وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کہ آیا اس مدت میں توسیع ممکن ہے یا نہیں، یہ صحیح ہو کہ آج کل عمرین ڈھائی سو برس کی نہیں ہوتین، لیکن اوسط عمر میں برابر ترقی ہوتی جاتی ہو، ۱۸۷۰ء میں انسانی عمر کا اوسط صرف (۳۴) سال تھا، ۱۸۸۰ء میں (۴۰) سال ہو گیا اور ۱۹۱۰ء میں (۴۸) سال تک پہنچ گیا، علمائے حیاتیات کی رائے ہو کہ اگر اسی حساب سے یہ اوسط ترقی کرتا گیا، تو ایک وقت آئیگا جب یہ ۲۵۰ سال تک پہنچ جائے گا،

سائنسدانون کے سامنے اسوقت ایک دلچسپ سوال یہ ہے:- چونکہ انسانی دماغ کا اعادۂ شباب ممکن نہیں، نیز چونکہ دماغ گھڑی کی "کمانی" کے مثل ہے، جو لازمی طور پر کھلتی جائیگی، یہانتک بالآخر اس کا کھلنا موقوف ہو جائے گا، اسلئے کیا یہ ممکن ہے، کہ اس "کمانی" کے کھلنے کی رفتار سست کر دیجائے، تاکہ "انسانی گھڑی" زیادہ دنون تک چل سکے،؟

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جو حیوان جس قدر سست زندگی بسر کرتا ہے اسی قدر زیادہ مدت تک زندہ رہتا ہے، مثلاً بڑے کچھوے کی عمر جو تمام حیوانون میں غالباً سب سے زیادہ سست جانور ہے (۱۵۰) برس ہوتی ہے، یہی عمر کارپ (Carp) نامی ایک خاص قسم کی مچھلی کی بھی ہوتی ہے، جو اپنی زندگی کا بہت کچھ حصہ بے حس و حرکت گذار دیتی ہے، سفید سر کے گدھ کی عمر بھی جو بہت سست رفتار پرند ہے، اوسطاً (۱۱۸) سال ہوتی ہے، لیکن برخلاف اس کے ایسے جانور بھی ہیں، جو نہایت چست اور تیز رفتار ہیں، لیکن پھر بھی ان کی عمرین بہت طویل ہوتی ہیں، مثلاً گھڑیال، کوّا، اور سامن مچھلی، ان میں سے ہر ایک کی عمر سو برس ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ رفتارِ حیات اور مدتِ حیات کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہین،

"ع ز"

## بائبل کی تصحیح

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے بائبل کا وہ نسخہ جو رومن کیتھولک چرچ کا مستند اور باضابطہ نسخہ ہے ۱۷۴۹ء کے بعد پہلی بار نظر ثانی اور تصحیح کے بعد مرتب کیا جا رہا ہے، مدیروں کو توقع ہے کہ دو تین سال کے اندر عہد نامۂ جدید (New Testament) کی تصحیح مکمل ہو جائیگی، اسکے بعد عہد نامۂ عتیق (Old Testament) کا کام شروع ہوگا، جو نسخہ اسوقت رائج ہے، اسکو اسان تر بنانے کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی، کیونکہ اسکی زبان نہایت قدیم اور موجودہ نسل کے لئے بہت کچھ ناقابلِ فہم تھی، چنانچہ اس پر نظر ثانی کا فیصلہ امریکن کیتھولک چرچ کے سالانہ اجلاس مین نومبر ۱۹۳۵ء میں کر لیا گیا تھا، اس کے بعد بیس مستند علماء کی ایک مجلس نظر ثانی کے لئے مقرر کر دی گئی اور اس مجلس نے نہایت خاموشی کیساتھ وہ کام شروع کر دیا جو گذشتہ دو صدیوں کے اندر کیتھولک بائبل سے متعلق سب سے زیادہ انقلاب انگیز کام ہے، کام کی رفتار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اکتوبر ۱۹۳۶ء تک عہد نامۂ جدید کے تقریبًا نصف حصہ کا مسودہ اولی مرتب ہو چکا ہے، نظر ثانی اور تصحیح میں قدیم اور متروک الفاظ کے بجائے جدید الفاظ لائے گئے ہیں، لیکن مجلس مذکور اس بات پر خاص طور سے زور دے رہی ہے، کہ بائبل کی زبان کی قدیم شان ضرور باقی رکھی جائے، اور عام بول چال کی زبان داخل کر کے اسکی ادبی شان کو ضائع نہ کیا جائے،

رومن کیتھولک چرچ کی پہلی باضابطہ بائبل ولگیٹ (Vulgate) کے نام سے مشہور ہے، یہ لاطینی زبان میں ہے، اسے پانچویں صدی عیسوی میں سینٹ جیروم (St. Jerome) نے اصل عبرانی اور یونانی مخطوطات سے لاطینی میں ترجمہ کیا تھا، یہ نسخہ نہایت مقبول ہوا لیکن ۱۴۵۶ء تک جب کہ گوٹن برگ (Gutenberg) نے اسے پہلی بار چھاپ کر شائع کیا، اس کے نسخے صرف قلمی تھے جنھیں راہب برسوں کی سخت محنت کے بعد تیار کرتے تھے، پندرہویں صدی میں چھاپہ کی ایجاد کے بعد اس کی بہت سی نقلیں شائع ہو کر تمام یورپ میں پھیل گئیں لیکن چونکہ ان نقلوں میں بہت کچھ تحریفیں ہو گئی تھیں، اسلئے سولہویں صدی میں مجلس ٹرنٹ (Council of Trent) نے صرف ولگیٹ کو رومن چرچ کی باضابطہ اور مستند بائبل قرار دیکر تمام دوسرے نسخوں کا استعمال روک دیا لیکن ولگیٹ میں بھی شروع کے کاتبوں نے بہتیری تحریفیں کر دی تھیں، اور اصل متن میں بہت سی نئی چیزیں داخل کر دی تھیں اسلئے رومن چرچ کو اس نسخہ کی تصحیح بھی متعدد بار کرنی پڑی،

اگرچہ دوسری زبانوں میں اسکے ترجمے ہو چکے تھے لیکن انگریزی زبان میں کوئی ایسا ترجمہ جو کیتھولک چرچ کے نزدیک قابل قبول ہو، ۱۵۸۲ء تک شائع نہیں ہوا، ۱۵۸۲ء میں ولگیٹ کے عہد نامۂ جدید کا پہلا مستند انگریزی ترجمہ رائمس (Rheims) سے شائع ہوا جو فرانس میں واقع ہے، اور پھر ۱۶۰۹ء میں فرانس ہی کے ایک دوسرے مقام دوئے (Douai) سے عہد نامۂ عتیق کا ترجمہ نکلا، اسوقت کیتھولک چرچ میں جو انگریزی بائبل رائج ہے، وہ انہی دو نسخوں پر مشتمل ہے، تاہم نظر ثانی کی ضرورت سے یہ بائبل بھی محفوظ نہ رہ سکی، اور ۱۷۴۹ء میں کلیسا کے حکم سے پہلی بار اسکی تصحیح کی گئی، اب تقریباً دو سو برس کے بعد امریکن کیتھولک چرچ نے نظر ثانی کی ضرورت پھر محسوس کی ہے، معلوم نہیں اس صحیفۂ آسمانی کی قطع و برید کا سلسلہ کب ختم ہوگا،

# سنہ ۸۱۱۳ء کے لئے سنہ ۱۹۳۶ء کی تہذیب کے نمونے،

قدیم مصریوں نے اپنی تقویم سنہ ۴۲۴۱ قبل مسیح سے شروع کی تھی، جب کہ شعری یمانی (Sirius)
جو تمام ستاروں سے زیادہ روشن ہے، آفتاب کے ساتھ طلوع ہوا تھا، عہد تاریخی کی ابتدا اسی سنہ
سے ہوتی ہو جس پر (۶۱۷۷) سال گذر چکے ہیں، اس زمانہ کے لوگوں کے حالات معلوم کرنے کا جو شوق
ماہرین اثریات کو آجکل ہے، اس پر قیاس کرکے امریکہ کے ایک فاضل ڈاکٹر جیکبس (T. J. Jacobs)
نے موجودہ تہذیب و تمدن کو ان لوگوں کے لئے محفوظ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، جو اب سے (۶۱۷۷)
برس بعد یعنی سنہ ۸۱۱۳ء میں ہوں گے، چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک دلچسپ تجویز شائع
کی ہے، اور اس پر عملدرآمد شروع بھی ہو گیا ہے، اوگلتھورپ یونیورسٹی (Oglethorpe)
نے متصل، جس کے صدر ڈاکٹر موصوف ہیں، پہاڑ کھود کر ایک تہ خانہ تعمیر کیا جا رہا ہے، جس میں سلیٹ
کی استرکاری کی جائے گی، اس کا منہ پتھر سے بند کرکے فولاد کی ایک تختی لگا دی جائے گی، جس پر
یہ عبارت کندہ ہوگی "آیندہ نسلوں سے درخواست کی جاتی ہے، کہ اس تہ خانہ کو سنہ ۸۱۱۳ء
تک بند رہنے دیں"، یہ تہ خانہ حکومت ریاستہائے متحدہ اور اس کے جانشینوں کی امانت میں
دے دیا جائے گا، اس میں ڈاکٹر جیکبس موجودہ تہذیب و تمدن کے مختلف شعبوں کے نمونے
محفوظ کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ جو لوگ اب سے (۶۱۷۷) برس بعد آئیں، ان کو سنہ ۱۹۳۶ء کے طرز
معاشرت سے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچ سکے، چنانچہ اس تہ خانے میں فونوگراف کے ریکارڈ وہاں
اور ناطق تصویروں کے ذریعہ اس دور کی بڑی بڑی شخصیتوں مثلاً پریزیڈنٹ روزولٹ، مسولینی،
ہٹلر، اسٹالن وغیرہ کی تقریریں محفوظ کر دی جائیں گی، اور سنیما کے پردوں پر سنہ ۱۹۳۶ء کے تمدن
کی بہتیری چیزیں سنہ ۸۱۱۳ء کے ماہرین اثریات کے لئے چھوڑ دی جائیں گی، لیکن چونکہ موجودہ تمدن

کی تمام چیزوں کو اس تہ خانہ میں جمع کر دینا ممکن نہیں ہے، اسلئے ڈاکٹر موصوف زیادہ تر انسائیکلو پیڈیا، ڈکشنری فوٹوگراف، نقشوں اور خاکوں کے ذریعہ ان چیزوں کو محفوظ کریں گے چنانچہ وہ ناشروں سے درخواست کرنے والے ہیں کہ اخباروں رسالوں، اور کتابوں کے ایسے ایڈیشن تیار کریں جن پر امتداد زمانہ کا کوئی اثر نہ پڑسکے کارخانوں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے مصنوعات کے چھوٹے چھوٹے نمونے پیش کریں، سائنسدانوں سے دریافت کیا جائے گا کہ یہ چیزیں (۶۱) صدیوں تک کیونکر خشکی، تری، گرد، اور دوسری خرابیوں سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں، اشیاء کے انتخاب کے لئے ججوں کی ایک کمیٹی مقرر ہوگی،

## انڈے کی عمر

بعض ڈچ سائنسدانوں نے ایک ایسا طریقہ دریافت کر لیا ہے، جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انڈا کتنے دنوں کا ہے، وہ طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو الٹراوایولٹ روشنی (Ultra-violet Rays) کے سامنے رکھئے، اگر انڈا تازہ ہے، تو اس سے سرخ روشنی نکلے گی، اگر بالکل تازہ نہیں ہے، تو اس کی روشنی کسی قدر نیلگوں ہوں گی، انڈا جس قدر پرانا ہوگا، اسی قدر نیلگوں رنگ زیادہ گہرا ہوگا،

## باتیں کرنیوالی گھڑی

امریکہ کی وسٹرن یونین ٹیلی گراف کمپنی نے ایک ایسی گھڑی بنائی ہے، جو باتیں کرتی ہے، اس کی شکل بھی انسان کے چہرہ سے مشابہ ہے، ہر پندرہ منٹ کے بعد یہ وقت بتاتی ہے، اور اس کے بعد فوراً کسی تجارتی مال کا اشتہار دیتی ہے، کمپنی مذکور ایک گھڑی ایسی بھی تیار کر رہی ہے، جو گانا گائے گی، یہ گھڑیاں فن اشتہار کا تازہ ترین نمونہ ہیں،

"ع ز"

## حمایت اسلام کا مطبوعہ قرآن پاک

پتہ:- حمایتِ اسلام لاہور، قیمت باختلاف کاغذ صرف؟

مسلمانوں نے اپنی آسمانی کتاب کی جو لفظی و معنوی حفاظت کی، اور جس طرح اس کی ظاہری و باطنی آرایش وزیبایش کی کوشش کی۔ اور اسکی صحت کا اہتمام کیا، وہ کتب عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے، ان کی اسی حفاظت اور اہتمامِ صحت کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے، کہ قرآنِ پاک ہر قسم کی تحریف و تغیر سے پاک رہا جس پر مسلمانوں کو بجا طور سے فخر ہے، مسلمان جب تک مسلمان تھے، اور ان کی سلطنتیں اسلامی سلطنتیں تھیں، قرآن پاک کی بصحت اشاعت کا کام اسلامی حکومتوں کا فرض تھا، اسی لئے اسلام کے سب سے پہلے خلیفہ نے اسکو اسی غرض سے کتاب کی صورت میں محفوظ کیا، اور تیسرے خلیفہ نے اس مدنی اصل کی صحیح نقلیں دور دراز اسلامی ملکوں میں بھیجیں،

یہ تو اس عہد کی باتیں ہیں جب چھاپہ کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا، جب چھاپہ کا فن نکلا، اور کتابیں اس میں چھپنے لگیں، تو اسوقت قسطنطنیہ میں عثمانی خلافت قائم تھی، اوس نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور صحیح قرآن کی اشاعت کا فرض انجام دیا، نظارت معارف کی ماتحتی میں بڑے بڑے قاریوں اور حافظوں کی نگرانی اور تصحیح میں قرآن پاک چھاپے جاتے تھے، اور شائع کئے جاتے تھے، اونہی اشاعتوں میں سے حافظ عثمان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کا نسخہ مشہور زمانہ ہے، اور اس کے بعد حاجی شکر زادہ کا لکھا ہوا

قرآن ہے، جو ۱۲۴۶ھ میں سلطان محمود کے زمانہ میں چھپ کر وقفِ عام ہوا،

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ پر اسلامی امور و مناصب کی کس مپرسی کا عالم کسی سے چھپا نہیں، انہی میں سے صحیح قرآن کی طبع و اشاعت کا مسئلہ بھی ہے، مصر کی حکومت مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہے، کہ اس نے سب سے پہلے اس فرض کا بوجھ اپنے ناتوان کندھے پر اٹھایا، اور تقریباً دس بارہ برس ہوئے کہ علما و قرا کی ایک منتخب جماعت کی نگرانی میں بڑے اہتمام اور صحت کیساتھ قرآن پاک شائع کیا،

شاید پانچ برس ہوئے کہ مصر کے اسی نسخہ کو سامنے رکھکر افغانستان کی حکومت نے اپنے سرکاری مطبع میں قرآن پاک کے ایک نئے اڈیشن کا کام شروع کیا، ۱۹۳۳ء میں جب میں کابل گیا تھا، تو سرکاری مطبع میں اس قرآن کی صحت و طباعت کا کام مجھے دکھایا گیا تھا، اسوقت تک ایک ہی دو پارے چھپے تھے، اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر شائع ہوگیا ہے،

یہ داستان تو اسلام کے آزاد ملکوں کی تھی، ہندوستان میں یہ ہوا کہ شروع شروع میں جبتک مطبعوں کی تصحیح کا اہتمام علماء کے ہاتھوں میں رہا، قرآن پاک کے بعض اچھے نسخے پرانے نظامی اور مصطفائی سے چھپ کر شائع ہوئے، گو وہ طباعت کے لحاظ سے کچھ اچھے نہ تھے، مگر صحیح تھے، لیکن جب سے تجارتی مطبع قائم ہوئے، اور تصحیح کا کام جاہلوں کے ہاتھوں میں آیا، قرآن پاک کا صحیح نسخہ ملنا تقریباً محال ہوگیا تھا، انتہا یہ ہے کہ وہ نامسلم بھی جو ایمان کی دولت سے محروم تھے، اسکو اپنے تجارتی مطبعوں میں چھپوا چھپوا کر دنیا کی دولت کمانے لگے، ان کے ہاتھوں اس کتاب پاک کی ظاہری و باطنی پاکی کا جو ستیاناس ہوا، وہ اہلِ خیر سے پوشیدہ نہیں،

اس خرابی کو محسوس سب کر رہے تھے، لیکن اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، ایسی حالت میں لاہور کی انجمن حمایتِ اسلام آگے بڑھی، اور اس نے چند سال کی محنت اور ہزاروں روپیے کے صرف سے ایک عکسی قرآن پاک کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور آخر ہندوستان میں

ایک غریب انجمن نے وہ کام کر دکھایا، جس کو دوسرے اسلامی ملکوں میں حکومتوں اور بادشاہوں نے انجام دیا، اس حسن خدمت پر انجمن کو جسقدر مبارکباد دیجائے وہ کم ہے،

انجمن کے اس مطبوعہ عکسی قرآن کا اہتمام ۱۳۴۹ھ سے شروع ہوا، ۱۳۵۲ھ میں چھپ کر پورا ہوا، یہ ظاہری و باطنی اور صوری و معنوی ہر قسم کی خوبیوں سے ممتاز ہے، متوسط تقطیع کے ۲۰۰ صفحوں پر تمام ہوا، اس کا خط نسخ لدھیانہ کے مشہور منشی محمد قاسم مرحوم اور اُن کے صاحبزادہ منشی محمد شفیع صاحب کا لکھا ہوا ہے، یہ خط نہایت ہی شیریں اور اعلیٰ ہے، چھپائی کا یہ اہتمام ہے کہ پورے قرآن پاک کے ایک حرف میں بھی چھپائی کا داغ دھبہ نہیں، زیر زبر پیش اس طرح لگائے گئے ہیں، کہ اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پائیں تاکہ مبتدی اور کم سواد بھی غلط نہ پڑھ سکیں، ہر صفحہ کی جدول خوبصورت نقاشی سے آراستہ ہے، کاغذ سپید، اچھا اور مضبوط ہے، ہر حرف دیکھنے میں موتی اور ہر سطر موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی ہے، طباعت میں فوٹولیتھو طریق استعمال کیا گیا ہے،

کتاب کی صحت کا یہ اہتمام ہے کہ انجمن کا اشتہار ہے، کہ غلطی نکالنے والوں کو فی غلطی ایک اشرفی انعام دیا جائے گا،

ان ظاہری اور معنوی خوبیوں کے علاوہ اس کے شروع میں رموز اوقاف پر ایک باب ہے، جس سے قرآن پڑھنے والوں کو آیات کے وقف وجواز و رخصت کی علامتوں کی تشریح ملے گی، جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں،

ان سب کے بعد اس نسخہ کی سب سے اہم خصوصیت دس فہرستوں کا اضافہ ہے،

۱۔ پہلی فہرست قرآن پاک کی منزلوں کی ہے، اُن لوگوں کے لئے جو قرآن پاک کو ایک ہفتہ یعنی سات دنوں میں تمام کرنا چاہتے ہیں، قاریوں نے سات مساوی حصوں میں قرآن پاک کو تقسیم کر دیا ہے، اس فہرست میں ہر منزل کے آغاز و اختتام کا نشان بقید صفحہ دیا گیا ہے،

۲- دوسری فہرست اجزار (پاروں) کی ہے، جو لوگ ایک مہینہ یعنی تیس۳۰ دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہتے ہیں، وہ قرآن کو برابر کے تیس۳۰ پاروں میں بانٹتے ہیں، اس فہرست میں ہر پارہ کے شروع اور آخر کے صفحات بتائے گئے ہیں،

۳- قرآن پاک کی اصلی تقسیم سورتوں کی ہے، تیسری فہرست سورتوں کی بحوالہ صفحات بہ ترتیب قرآن ہے

۴- چوتھی فہرست ان سورتوں کی بہ ترتیب نزول ہے،

۵- پانچویں فہرست انہی سورتوں کی بہ ترتیب حروف تہجی ہے، تاکہ سورتوں کا حوالہ آسانی کر ہر شخص کو مل سکے،

۶- چھٹی فہرست ہر سورہ کے رکوعوں کی ہے، یہ رکوع جن کو ہندوستان میں رکوع کہتے ہیں، اصل میں عشرات ہیں، اور اسی لئے اس کا مخفف نشان قرآن پاک کے حاشیہ پر ع بنایا جاتا ہے، یہ کم و بیش دس دس آیتوں کے ایسے ٹکڑے ہیں، جن میں مضمون کا کوئی حصہ کسی نوع کا ختم ہوتا ہے، اسکو انگریزی اصطلاح میں پیراگراف سمجھنا چاہیے، یہ حصے اس لئے قائم کئے گئے ہیں، تاکہ قاری کسی سورہ کو مناسب حصوں میں بانٹ کر یاد کر سکیں، اور نمازی نماز میں اُن کو پڑھ سکیں،

اس کے بعد ساتویں فہرست زاید الف کی، آٹھویں متقدمین کے اور نویں متاخرین کے معانقوں کی ہے، اور دسویں تلاوت کے سجدوں کی ہے، اور خاتمہ میں بیان اوقاف کا ایک مختصر عربی و اردو باب شامل ہے،

ایک اور خوبی اس نسخہ کی یہ ہے کہ اس میں ہر سورت کی آیتوں پر نمبر لگا دیئے گئے ہیں، تاکہ ہر آیت کا حوالہ آسانی سے نکالا جا سکے،

امید ہو کہ مسلمان اس نادر نسخہ کی کما حقہ قدر کریں گے، اور اس کو جلد از جلد خرید کر اپنے کو اور انجمن کو دونوں کو فائدہ پہنچائیں گے، "س"

# "نقش و نگار"

از شاہ معین الدین احمد ندوی،

پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت :- غیر مجلد بہ، مجلد عار

جناب جوش ملیح آبادی دور حاضر کے معروف شعرا میں ہیں، ان کے کلام کا پہلا مجموعہ آج سے پندرہ سولہ برس پہلے "روح ادب" کے نام سے شائع ہوا تھا، حال میں مکتبہ جامعہ ملیہ نے دوسرا مجموعہ "نقش و نگار" کے نام سے آراستہ کیا ہے، جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے، ابتدا میں مشہور افسانہ نگار ل احمد صاحب کا مقدمہ ہے، جس میں جوش صاحب کے خاندانی حالات، انکی سرگذشت اور شاعری پر تبصرہ ہے، اسکے بعد اصل دیوان ہے، جو کلام کی نوعی تقسیم کے اعتبار سے پانچ حصوں پر منقسم ہے،

پہلا حصہ "نگار خانہ"، اس میں شبابیات کے مختلف موثر مناظر، اور ان کے کوائف کے متعلق نظمیں ہیں، مثلاً "جوانی کی آمد آمد"، "یار پری چہرہ"، "نیچی نگاہیں"، "جوانی کا تقاضا"، اور "جشن بہار" وغیرہ، دوسرا حصہ خمریات کا ہے، اسکی جنس اسکے نام سے ظاہر ہے، تیسرا حصہ "تاثرات" اس میں ان مختلف النوع تاثرات کے متعلق نظمیں ہیں جن سے شاعر مختلف حالات میں اثر پذیر ہوا، اس لئے شبابیات کے ساتھ دوسرے موثر منظومات، مثلاً "مفلسوں کی عید"، "غریب الوطن کا پیام"، اور "وطن کی یاد" وغیرہ ہیں، چوتھا حصہ "مطالعہ و نظر"، اس میں وہ قطعات ہیں جن میں کسی شاعرانہ تصور، جذباتی تخیل یا اخلاقی اور حکیمانہ خیال کا اظہار کیا گیا ہے، پانچواں "نشیب"، اس میں مختلف شاعرانہ تصورات، عاشقانہ خیالات اور احوال و کوائف پر نظمیں ہیں،

جوشؔ کی شاعری اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے منفرد شان رکھتی ہے، وہ اس دور کے ان شعراء میں ہیں جنکی شاعری ایک خاص رنگ رکھتی ہے جسے اصطلاحی معنون میں نہ تغزل ہی کہا جا سکتا ہے، اور نہ خالص نظم، لیکن وہ غزل سے زیادہ شوخ اور نظم سے زیادہ مربوط و مسلسل اور ان دونوں کے اصطلاحی مفہوم سے وسیع تر ہے، اسکو خارجی کیفیات کی مصوری یا آج کل کی زبان میں "شبابیات" سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان کی پوری شاعری اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے،

ان کی شاعری میں شوخی و رنگین بیانی کی بے اعتدالی کے باوجود شاعری کے تمام اجزاء و عناصر پائے جاتے ہیں، جو طبائع متغزلانہ شوخی اور بانکپن کو پسند نہیں کرتے، اور صرف مجرد عن المادہ حقائق پر سر دھنتے ہیں، اور اسی کو معیار کی بلندی اور حسن مذاق سمجھتے ہیں، ان کے لئے تو شاید یہ رنگ زیادہ خوش آیند نہیں ہو سکتا، لیکن متغزلانہ شوخیوں کو رخسار شاعری کا غازہ سمجھنے والوں کے نزدیک شاعری یہی ہے، لیکن کبھی کبھی ان کی شوخی اعتدال سے بڑھ کر مذموم حد تک پہنچ جاتی ہے،

پہلی خصوصیت۔ | جوشؔ کی شاعری میں چند خصوصیتیں ایسی ہیں جنھیں انکا طغرائے امتیاز کہنا چاہئے، ان میں سب سے نمایاں انکی شوخی و رنگین بیانی ہے، ان کی شاعری سراپا رنگ و بو ہے، ان کا ہر تخیل اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، حتی کہ وہ مرثیہ بھی غزل کے رنگ میں کہتے ہیں، اور نالہ بھی ترانہ کی لے میں کرتے ہیں، چونکہ ان کی پوری شاعری اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے، اسلئے اسکے مخصوص نمونے کی پیش کرنیکی ضرورت نہیں، آیندہ مختلف نمونوں سے اس کا اندازہ ہوگا،

دوسری خصوصیت نظم مسلسل، | دوسری خصوصیت نظم مسلسل ہے، اردو شاعری پر نئی جماعت کا یہ بڑا اعتراض تھا، کہ اس کا دامان تنگ نظم مسلسل سے بالکل خالی ہے، جوشؔ کی شاعری نے اس اعتراض کو دور کر دیا، ان کا پورا دیوان نظم مسلسل ہے، اس لئے کسی خاص نظم کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس دور میں جوشؔ اور سیماب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم کو مستقل موضوع سخن بنایا، اور ہر صنف اور ہر رنگ میں اس کثرت کے

ساتھ نظمیں لکھیں کہ ان سے پورا دیوان مرتب ہوگیا،

**تیسری خصوصیت محاکات یا منظر کشی،** اس کا یہ نتیجہ ہے کہ محاکات، منظر کشی اور مصوری کے جتنے بہتر نمونے جوش کے کلام میں ملتے ہیں، اس کی مثال دوسرے شعرا کے یہاں نہیں مل سکتی، اسلئے کہ منظر کشی اور مصوری کی جتنی وسعت مسلسل نظم میں ہے، وہ فردِ اشعار اور قطعات میں ممکن نہیں، وہ نہ صرف مناظر اور سراپا کے مصور ہیں، بلکہ جذبات کی مصوری میں بھی انکو دسترس حاصل ہے، مناظر کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں، گنگا کے گھاٹ پر:-

بڑھائے سرخیِ عارض ہوائے صحرا سے  نہایا کون چلا آرہا ہے گنگا سے،
سرادلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے  دبائے دانتوں میں آنچل بدن چرائے ہوئے
لبوں پہ مہرِ خموشی خمو شیوں میں خطاب  کمر میں لوچ، جبیں پر دمک، نظر میں شراب
شراب ناب لئے نرگسی کٹوروں میں،  لہو چمن کا رواں سرخ سرخ ڈوروں میں
دراز زلف میں جادو سیاہ آنکھ میں رَس  نسیمِ صبحِ بہارِ حسن ہلالِ شامِ اودھ

جمنا کے کنارے:-

اک قصر قریب رودِ جمنا،  لہروں کو بنا رہا ہے بینا،
اس قصر کے بام پر کھلے سر،  اک زہرہ جبین و ماہ پیکر،
نوخیز و حسین بلند و بالا،  اوڑھے ہوئے سرمئی دوشالا
افسون بہ نگاہ زلف بر دوش  غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش
فردوس کے در کھلے ہوئے باز  ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگین کلائیوں کو جوڑے  چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے،
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے  قرآن ہے کہ رحل پر دھرا ہے

نیچی نگاہیں:-

آہ یہ نیچی نگاہیں اے نگار شرمگیں، عشق اس کا فرحیا کی تاب لا سکتا نہیں
سُرخ آنچل کا ڈھلک جانا وہ سر سے بار بار دونوں ہاتھوں کو چھپا لینا وہ منہ بے اختیار
عارض گلرنگ پر یہ پھول سا کھلتا ہوا یہ تبسم جو طلوع صبح سے ملتا ہوا
گفتگو یہ سر جھکا کے شرمگیں انداز سے یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے

حسن بیمار:-

کیا غضب ہے حسن کے بیمار ہونے کی ادا جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا
انکسار حسن پلکوں کے جھپکنے میں نہاں نیم وا بیمار آنکھوں سے مروت کی عیاں
چوڑیاں ڈھیلی کلائی پر کنگن ہاتھ پہ ہات لب پہ خشکی رخ پہ سوندھا پن نظر میں التفات
ہلکی ہلکی جھلکیاں رخسار پر یوں نور کی جیسے گل پر صبح کاذب کی سہانی چاندنی
ایسے اضمحلال پر دنیا کی برنائی نثار ایسی بیماری پہ اعجاز مسیحائی نثار

چوتھی خصوصیت، خمریات

بادۂ احمر کا رنگ و ذائقہ ایسا دلکش اور پر کیف ہوتا ہے، کہ زاہد شعرا تک کا دامن اسکے چھینٹوں سے محفوظ نہیں، کچھ نہیں تو بالکل ہی ذکر سے لذت گیر ہو لیتے ہیں، اسی لئے کسی شاعر کا کلام اس رنگین ذکر سے خالی نہیں، کچھ نہیں تو کلام کی خوش منظری کے لئے اسکے چھینٹے ہی دیدیتے ہیں، جوش اولاً شاعر پھر صاحب حال اسلئے ان کے یہاں اس سیال احمر کی نہریں رواں ہیں، اور یہ شے ان کے کلام کے خصوصیات میں سے ہو گئی ہے، اور چونکہ وہ صاحب حال ہیں، اس لئے ان کی گفتگو اس کے ظاہری رنگ و بو تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ اس کے ناقابل بیان احوال و کوائف بلکہ مقامات تک کی تصویر دکھا دیتے ہیں، اس نوع کی نظمیں بڑی مست اور پر لطف ہیں، خصوصاً چند جرعے میں سرخوشی، مستی، سرمستی اور بے خودی وغیرہ کے جو مدارج و کوائف دکھائے گئے ہیں، وہ صرف

صاحبِ حال ہی دکھا سکتا تھا، افسوس ہے کہ خمریات کی تمام نظمیں نہایت طویل ہیں، اسلئے ہم اُن کو نقل نہیں کرسکتے، صرف چند جرعون کے چند قطرات پیش کرتے ہیں، پہلے جرعے کا اثر:-

کوئی کروٹ سی دل میں لے رہا ہے　　لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے،
یہ کس کی سن رہی ہے روح آہٹ　　رگوں میں ہر موجے کی سنسناہٹ
چمکتی ہیں فضا میں بجلیاں سی　　لچکتی ہے رگ و پے میں کمان سی

دوسرے جرعے کا اثر:-

رگ و پے میں ہے غلطاں نوجوانی　　ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
گھٹا سی اک سنہری چھا رہی ہے،　　پھریری پر پھریری آ رہی ہے،
کبھی ظلمت کبھی انوارِ مہتاب،　　خدا معلوم بیداری ہے یا خواب

تیسرے جرعے کا اثر:-

ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے　　سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے،
ابلتی ہے شرابِ ارغوانی　　برستا ہے مزے لے لے کے پانی
سرِ میخانہ روحیں آ رہی ہیں،　　نگاہیں رام رس ٹپکا رہی ہیں
فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں،　　بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں

چوتھے جرعے کا اثر:-

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری　　ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
زمیں اسوقت اک وہم و گماں ہے　　مرے شہپر کے نیچے آسماں ہے
نہ دل کو امتیازِ این و آں ہے،
نہ خود پر بندہ ہونے کا گماں ہے،

پانچویں جرعے کا اثر :۔

تعال اللہ شکست خود نمائی ، بھرا ہے خاک میں زور خدائی ،
فلک پر نشہ سا چھایا ہوا ہے ، زمیں کو حال سا آیا ہوا ہے ،
ملک حسرت سے منہ کھولے ہوئے ہے زمیں اڑنے کو پر تولے ہوئے ہے
فرشتے ہر طرف منڈلا رہے ہیں پیامی آ رہے ہیں جا رہے ہیں
نظر میں صورتیں سی پھر رہی ہیں فضائیں اٹھ رہی ہیں گر رہی ہیں ،
اگر چاہوں تو دنیا کو ہلا دوں زمیں کیا آسمانوں کو نچا دوں

فلک کیا عرش کو بھی مست کر دوں
خودی کیسی خدا کو مست کر دوں

مذاق کے اعتبار سے شاعری کا رنگ ، | جوش کسی خاص رنگِ شاعری کے متبع نہیں ہیں ، بلکہ انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی ہے ، اسلئے کسی خاص رنگ و مذاق کی شاعری سے انکا موازنہ صحیح نہیں ، مگر پھر بھی وہ نواحِ لکھنو کے رہنے والے ہیں ، اور اسی ماحول میں انکی نشو و نما ہوئی ہے ، اسلئے زبان و بیان اور جذبات کی ترجمانی میں لکھنو کا اثر غالب ہے تاہم بڑی حد تک ان کا کلام لفظی رنگا رنگی سے پاک ہے ، لکھنو کے اثرات کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں ،

اے زہرہ جبینوں کے لئے پیکِ مسرت پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے ،
اے تجھکو ملے عمر مری شام بلا کی یہ زلفِ رسا تا بکمر کس کے لئے ہے ،
اے قامت بالا و بلند اے قد موزوں یہ سرو یہ شاخِ گلِ تر کس کے لئے ہے ،
اے حسن رخ روشن و اے جلوۂ کاکل یہ ہوش ربا شام و سحر کس کے لئے ہے

---

آ رہی ہے باغ سے مالن وہ اٹھلاتی ہوئی مسکرانے میں لبوں سے پھول برساتی ہوئی

پاؤں رکھتی ناز سے شبنم کے قطروں کی طرح / سبزۂ خوابیدۂ گلشن کو جگاتی ہوئی
بچھ گئی خود اپنے ہی سے کرتی ہوئی مستانہ وار / ہر قدم پر کاکلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
ہائے کیا گوری کلائی میں ہے لچکا دلفریب / ہائے کیا چاندی کی ہیکل ہر ستم ڈھاتی ہوئی

***

کیوں صبح یوں عرق میں نہائے ہوئے ہو تم / شاید کسی خلش سے جگائے ہوئے ہو تم
ابھا ہوا ہے کرب سے یہ رشتۂ نفس / گو دیکھنے میں زلف بنائے ہوئے ہو تم
شاید یہ اہتمام ہوا خفائے راز کا / بھولیوں سے آنکھ چرائے ہوئے ہو تم
خود کو لئے ہوئے ہو مگر کہہ رہی ہیں طرہ / سینے میں ایک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

**المیہ رنگ** اگرچہ جناب جوش محض نشاطی شاعر ہیں، اور ان کی ہر لے سے نشاط ہی کا نغمہ نکلتا ہے، لیکن ایک شاعر کا دل یکسر درد و الم کی لذت سے خالی نہیں ہو سکتا، اس لئے جناب جوش کی شاعری اس ضرب گرانمایہ سے بالکل تہی مایہ نہیں، لیکن المیہ رنگ ان کیفیتوں سے آگے نہیں بڑھتا،

نقش خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز / بیدرد میں نے تجھکو بھلایا نہیں ہنوز
یادش بخیر جس پہ تری تھی کبھی نظر / وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز
وہ سر جو تیری راہگذر میں تھا سجدہ ریز / میں نے کسی قدم پہ جھکایا نہیں ہنوز
محراب جاں میں تونے جلایا تھا خود جسے / سینے میں وہ چراغ بجھایا نہیں ہنوز
دنیا نے تجھکو خواب گراں سے جگا دیا / لیکن مجھے کسی نے جگایا نہیں ہنوز
بیہوش ہو کے جلد تجھے ہوش آگیا / میں بدنصیب ہوش میں آیا نہیں ہنوز

***

چمٹ گئی جب آپ ہی اودی گھٹا چھائی تو کیا / تربت یاراں کے سبزے پہ لہرائی تو کیا
جب ضرورت ہی رہی باقی نہ جی ورنگ کی / کوئلیں کوکیں تو کیا ساون کی رت آئی تو کیا
ہو چکی ذوق تبسم ہی سے جب بیگانگی / اب چمن افروز پھولوں کو ہنسی آئی تو کیا

غنچۂ عہدِ طرب ہی مل چکا جب خاک میں، خاکِ گلشن اب گلِ تر بن کے اترائی تو کیا،
آنسوؤں میں بہ گئیں جب خون کی جولانیاں جنگلوں کی چھاؤں میں برسات اٹھلائی تو کیا

اب خانۂ امید میں ظلمت بھی نور ہے، تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجئے،
دیکھے ہوئے ہوں کتنے بہار و خزاں کے رنگ اب خارزارِ دل کو گلستاں نہ کیجئے،
چھایا ہوا ہے مطلعِ امید پر غبار اب کاکلوں کو رُخ پہ پریشاں نہ کیجئے،
اقرارِ اولیں کا جنازہ ہے دوش پر اب تازہ رسمِ کہنۂ پیماں نہ کیجئے،
جس دل پہ ناز تھا وہی باقی نہیں رہا اب زندگی سے مجھ کو پشیماں نہ کیجئے

زبان پر قدرت، جوش کو زبان پر غیر معمولی قدرت ہے، وہ جس رنگ اور جس نوع کی زبان چاہتے ہیں بے تکلف استعمال کرتے ہیں، اور جس مفہوم کو جس رنگ میں چاہتے ہیں، ادا کرتے ہیں، ان کا کلام ہمہ رنگی کے باوجود مختلف النوع ہے، اور ہر نوع کے لئے انھوں نے ٹھیک اسکے مطابق زبان استعمال کی ہے، اسی لئے ہر رنگ کی زبان کے نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں، وہ الفاظ سے ہر منظر، ہر کیفیت اور ہر مفہوم کی صحیح تصویر کھینچ دیتے ہیں، ان کی قادر الکلامی کے ثبوت میں ان کی نظم "کوہستانِ دکن کی عورت" پیش کیجاتی ہے، اس نظم میں انھوں نے کوہستانی عورت کے طغیانِ شباب اور اس کی سنگلاخیت کو اس طرح دکھایا ہے، کہ اسکی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، یہ نظم طویل ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ ابلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں
یہ سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل اتنی بے پایاں صلابت پھر بھی ہر نقشہ سجل
چال جیسے تند چیتے، تیوریاں جیسے غزال عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں بے مثال
عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کا خواب پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز زہریلا شباب
جسم ہیں کچھ اسقدر ٹھوس الحفیظ والاماں لیجئے چٹکی تو جھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی نپی سی کلائیاں　　آہن و فولاد کے پٹھے سلاخوں کی رگیں،

ان نباتِ کوہ کی کڑیل جوانی الاماں،　　پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

اس سنگلاخ کوہستان کے بعد ذرا ان پھولوں کی نزاکت دیکھیے،

یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں نازپرور پھول　　شگفتہ پھول جواں پھول غنچہ پیکر پھول

ہوائے ناز سے چٹکے ہوئے لبِ غنچے،　　شمیم زلف سے مہکے ہوئے معطر پھول

شعاعِ حُسن سے دہکے ہوئے خنک شعلے　　لبِ نگار کے چومے ہوئے سخنور پھول

نسیمِ کاکلِ شبگوں سے پرفشاں گلِ برگ　　فروغِ نرگسِ شیریں سے خواب آور پھول

ارم سے آئی ہوئی حرفِ آرزو کلیاں　　خدائے ناز کے بھیجے ہوئے پیمبر پھول

فارسی آمیز زبان، | وہ ایسی زبان بھی اسی شیرینی کے ساتھ لکھتے ہیں، کہ سراسر قند پارسی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے: فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے نمونے تو ان کی تمام نظمیں ہیں، بعض بعض نظموں میں تو مشکل سے دو چار الفاظ ہندوستانی زبان کے نکل سکتے ہیں،

زاہد فریب گل رُخ کافر دہ از فرنگان　　سیمیں بدن پری رُخ نوخیز حشر ساماں

خوش چشم و خوبصورت خوش وضع ماہ پیکر　　نازک بدن شکر لب شیریں ادا فسوں گر

کافور اشگفتہ گل پیرہن سمن بو　　سرو چمن سہی قد، رنگیں جمال خوش رو

ابرو ہلال مے گوں جاں بخش روح پرور　　نسریں بدن پری رخ سیمیں عذار دلبر

غارتگرِ تحمل دلسوز دشمنِ جاں،　　پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں،

گلشن فروغ کمسن مخمور ماہ پارا،　　"دلبر کہ در کفِ او موم است سنگ خارا"

سادہ زبان، | اگرچہ ان کی زبان پر فارسیت غالب ہے، پھر بھی وہ سادہ زبان پر بھی قادر ہیں، چنانچہ بعض نظمیں انکی ایسی بھی ہیں، جن میں مشکل سے دو چار فارسی الفاظ مل سکتے ہیں،

یہ کون اٹھا ہے شرماتا رین کا جاگا نیند کا ماتا،
نیند کا ماتا دھوم مچاتا، انگڑائیاں لیتا بل کھاتا،
یہ کون اٹھا ہے شرماتا،

رخ پر سرخی آنکھ میں جادو بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو نیچی نظریں بکھرے گیسو،
یہ کون اٹھا ہے شرماتا،

نیند کی لہریں گنگا جمنی جلد کے نیچے ہلکی ہلکی،
آنچل ڈھلکا مسکی ساڑی بکی مہندی دھندلی بیندی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

**جوش کی خامیاں،** جوش کی قادرالکلامی اور فطری شعریت کے باوجود ان کی شاعری اسقام اور خامیوں سے یکسر خالی نہیں ہے، اگرچہ ان کا کلام گلہائے رنگیں کا ایک خوشرنگ گلدستہ ہے، لیکن ان کے تغزلِ خیالات میں لطافت اور پاکیزگی کی بڑی کمی ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ اسی عالم آب و گل کی باتیں کرتے ہیں، اور درحقیقت یہی شاعری ہے، ہم خود مجرد عن المادہ تصورات کو شاعری نہیں سمجھتے لیکن اسے ماننے کے بعد بھی اسی عالم میں بعض مقامات اور کوائف ایسے ہیں، جہاں انسان عشق کی مادی رنگینیوں سے جھٹک کر اور الگ ہو کر اسی کے لطیف نشہ سے روحانی کیف و سرور حاصل کرتا ہے، کیا جوش صاحب کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا، اس کمی کی وجہ سے ایک صاحبِ ذوق طبقہ کو انکی شاعری میں اپنی تشفی کا بہت کم سامان ملتا ہے، ان کی شاعری خوش رنگ و خوش منظر ہے لیکن پُر تاثیر نہیں،

دوسری خامی انداز بیان کی ہے، وہ زبان پر پوری قدرت کے باوجود کہیں کہیں بے محل الفاظ اور بے جوڑ ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں، مثلاً لبِ دریا ایک محل کی تعریف میں ع لہروں کو نہاتا

ہے بنیا"، لہروں کو بینائی سے کیا تعلق، اگر بینا کا مفہوم یہ ہے، کہ موجوں میں مقابل کی چیزوں کا عکس پڑتا ہے، اس لئے گویا وہ اسکو دیکھتی ہیں، تو یہ مفہوم بینا سے ادا نہیں ہوتا،

اور یوں کہ قریب لب ذرا سا — عارض میں پڑا ہوا ہے حلقہ،
اس حلقۂ دلنشین کے اندر — غلطیدہ ہیں ناز کے سمندر،

ناز کا تعلق اعضا، وجوارح کے حرکات اور نطق سے ہے، حلقۂ عارض کو ناز سے کوئی علاقہ نہیں، پھر "ناز کے غلطیدہ سمندر" بھی درست نہیں،

ع:۔ کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا، نرمی آنچل کی کوئی صفت نہیں ہے، ہاں کپڑے کی ہو سکتی ہے، مگر دونوں کے مفہوم جداگانہ ہیں،

جلا ہوتی رہی پردے ہی میں زلف پریشان پر — زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسار تابان پر

اس شعر میں چند در چند خامیاں ہیں، اولاً زمرد کے ورق نہیں ہوتے، دوسرے زلف کی تشبیہ زمرد سے دینا صحیح نہیں، کہ دونوں رنگوں میں کوئی مناسبت نہیں، زمرد سے امردوں کی سبزہ رخی کی تشبیہ البتہ دیجاتی ہے، لیکن اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو رخسار تابان پر زمرد کے ورق چڑھنے کے کوئی معنی نہیں، یہ تشبیہ بھی امردون کی سبزہ رخی کی تشبیہ کے التباس کا نتیجہ ہے،

ع:۔ یون ہر اک روشن نمی سی چشم سحر انداز میں، روشن نمی بے جوڑ سی ترکیب ہے ع منہ ڈھانپنے لگتا ہے بافراط ندامت، فرط کے بجائے افراط درست نہیں ہے ع، اسکے لفظوں سے ہے بچپن کا تلاطم آشکار، بچپن کی شرارتوں کے لئے تلاطم صحیح نہیں ہے، ع، شب کو اکثر کھو کھلی تاریکیاں میدان میں، کھوکھلی تاریکیاں بالکل بے معنی اور غیر مانوس ترکیب ہے، ع نظر میں مضمحل ہیں جھلکیں اگلے زمانہ کی چتونوں کے اضمحلال کے کیا معنی ع، تاروں [illegible] کشمکش میں جب چاندنی ہو چمکی، تاروں کی کشمکش میں چاندنی چمکنے [illegible] کا کیا مطلب ہے، بلکہ چاند کی روشنی [illegible] تاروں کی چمک مدھم پڑ جاتی ہے،

ع ۱۔ جلوؤں کی ہے چھوٹ خار و خس پر، جلوؤں کی چھوٹ کے کیا معنی، اگر اس کا مقصد ان کے ظہور کی کثرت یا فراوانی ہے، تو جلوؤں کی لطافت "چھوٹ" کی کثافت کی متحمل نہیں ہو سکتی،

آنچل سنبھالنے میں یوں بل سی کھا رہی ہے ۔۔۔ گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے،

آنچل سنبھالنے میں بل کھانے کی کیفیت کی تشبیہ انگڑائی سے بالکل غلط ہے، اس لئے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں،

کسے معلوم تھا اک روز ہوگی سرگرانی بھی ۔۔۔ دبے پاؤں چلی آتی ہے تیزی سے جوانی بھی

اس شعر میں پاؤں کا صحیح تلفظ ادا نہیں ہوتا، پھر "دبے پاؤں" اور "تیزی" میں تضاد ہے،

شعلے وہ سرخ سرخ دلوں میں تلے ہوئے ۔۔۔ وہ سرخیوں میں نرم تبسم گھلے ہوئے،

اس شعر کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے،

دیوان کے تھوڑے سے حصے پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ خامیاں دل میں کھٹکتی ہیں، اگر استیعاب کے ساتھ پورا دیوان تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو اور بھی خامیاں نکلیں گی، لیکن ان سے جوش کے شاعرانہ کمال پر حرف نہیں آتا، اسلئے ان کے کمالات کے مقابلہ میں یہ فروگذاشت بہت خفیف ہے، اس کے اظہار کا مقصد یہ ہے، کہ ان کے جیسے قادر الکلام کے کلام میں یہ خفیف فروگذاشتیں بھی کھٹکتی ہیں،

## گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اسکی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعرا کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعرا کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جسمیں آبِ حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت للعہ

"منیجر"

**میری کہانی** (دو جلد) مصنفہ پنڈت جواہر لال نہرو تقطیع چھوٹی ضخامت ایکہزار صفحات سے کچھ زیادہ کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت للعہ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے گذشتہ ایام اسیری (۱۹۳۴ء ۱۹۳۵ء) میں جیل کی خاموش اور پرسکون زندگی میں اپنی سوانحمری انگریزی میں لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب مکتبہ جامعہ ملیہ نے اس ضروری اور اہم کتاب کا ہندوستانی ترجمہ شائع کیا ہے، جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، پنڈت جی کی زندگی کا بڑا حصہ سیاسی میدان میں گذرا ہے، اس لئے ان کی سوانح عمری گویا ہندوستانی سیاست کی سرگذشت ہے، چنانچہ چند ابتدائی ابواب کے بعد ہی جس میں ان کے خاندانی اور تعلیم وغیرہ کے حالات ہیں، انکی سیاسی زندگی کے حالات شروع ہوجاتے ہیں جس میں رولٹ ایکٹ کے نفاذ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک کی ہندوستان کی سولہ سالہ سیاسی جدوجہد، اسکے مدوجزر اور انقلابات وحوادث کی اجمالی سرگذشت ہے، اس میں واقعات ماضی کے علاوہ سیاسیات کے تمام متعلقہ مسائل، پنڈت جی کے خیالات وعقائد، جیل کی زندگی اور سفر یورپ کے حالات مختلف سیاسی مسائل اور طبقات پر ان کی رائیں اور تنقیدیں اور اس قبیل کے بہت سے اہم مسائل زیر بحث آگئے ہیں، اس سلسلہ میں حکومت، عمال حکومت، سیاسی جماعتوں اور اشخاص پر ان کی سنجیدہ اور بعض ظریفانہ تنقیدیں خصوصیت کیساتھ نہایت دلچسپ ہیں، جنکی توقع ایک سیاسی قلم سے کم ہوسکتی تھی، ان خالص سیاسی مسائل کے علاوہ ہندوستانی زندگی اور معاشرت کے اور بہت سے پہلوؤں پر پنڈت جی کے افکار وخیالات ملتے ہیں، پوری

کتاب بے باک صداقت کا نمونہ ہے، ممکن ہے کہ ان کے تمام خیالات ہر جماعت کے لئے قابلِ قبول نہ ہوں لیکن ان کی صداقت میں کوئی کلام نہیں، ان کی صداقت کا یہ ادنیٰ نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد اور گاندھی جی پر بھی جنکو وہ والد سے زیادہ محترم سمجھتے ہیں، بے لاگ تنقید میں باک نہیں کیا ہے، ان مسائل کے علاوہ پنڈت جی کی سیرت کا مطالعہ اس کتاب کا ایک دلچسپ باب ہے، جس میں انکی اعلیٰ سیرت انکی بلند نظری، عالی ظرفی، شرافت نفس، سادگی، جفاکشی، ضبطِ نفس، شاعر مزاجی، ظرافت، زندہ دلی اور شریفانہ بھولے پن کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے، پنڈت جی نے اس کتاب میں ایک موقع پر اپنے متعلق یہ ظریفانہ جملہ لکھا ہے کہ مجھ پر سلم و تعصب کا اتہام کبھی نہیں لگایا گیا، لیکن اس کتاب کی ہر سطر اسکی تردید کر رہی ہے، انھوں نے تحریر کی دلکشی سے اس خشک کتاب میں افسانے کا لطف پیدا کر دیا ہے، اور مترجم کی شگفتہ نگاری اور شوخی قلم نے نقل کو اصل کے برابر کر دیا،

**غالب**، مؤلفہ جناب مولوی غلام رسول صاحب مہر، مدیر روزنامہ انقلاب تقطیع بڑی، حجم ۳۷۹ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، غالباً دفتر انقلاب لاہور سے ملے گی،

ہماری بزم و دانش کے اربابِ کمال میں مرزا غالب کو جو حسنِ قبول حاصل ہوا، وہ اُس دور کے کسی صاحبِ کمال کے حصہ میں نہ آیا ہوگا، ان کی ذات ادیبوں کا موضوع بحث بن گئی ہے، اور ان کی مختلف حیثیات پر اب تک تحریر، تقریر اور تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری ہے، ان کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، ان سب میں مذکور الصدر کتاب ایک انوکھی کوشش، اور ہمارے ادب میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے، اس میں خود غالب کی فارسی اور اردو نظم و نثر سے ان کی پوری سوانح عمری مرتب کی گئی ہے، اس اہتمام سے اگرچہ مرزا غالب کی سوانح کے ماخذ بہت محدود ہو جاتے ہیں، پھر بھی اتنے محدود اوراق سے ریزہ چینی کر کے مستقل سوانح عمری مرتب کر دینا بڑی دیدہ ریزی

کام تھا، جس کا درجہ تزک سے کم نہیں، عموماً اس قسم کی کوششیں سرسری اور تشنہ ہوتی ہیں، لیکن اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ وہ مرزا غالب کی زندگی کے جملہ اہم اور ضروری واقعات پر حاوی ہے، اور ان کے نسب، خاندان، پیدائش، طفولیت، تعلیم، شادی، خانگی زندگی، اعزہ و احباب، متوسلین، دہلی کی سکونت، مکان، کلکتہ، رام پور، اور میرٹھ کے سفر، پنشن کے مقدمے کی تفصیلی روداد، اسیری، مجمد حسین، مدح گوئی، صلہ یابی، حالاتِ غدر، خانگی پریشانیاں، عوارض، بیماریاں، وفات، اخلاق و عادات اور تصانیف وغیرہ، ان کی زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں کے متعلق مفصل حالات ہیں، ان ذاتی حالات کے علاوہ بہت سے ضمنی واقعات بھی آگئے ہیں، مصنف نے جا بجا یادگارِ غالب کے بیانات سے اختلاف کیا ہے، جو غالب ہی کی تحریروں پر مبنی ہیں، بعض پیچیدہ مسائل کو جو غالب کی مختلف تحریروں سے پیدا ہوتے ہیں، خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے، غالب کی تصانیف پر تفصیلی تبصرہ خصوصیت کیساتھ مفید اور پراز معلومات ہے، غالب کی تحریروں کے علاوہ بعض بعض مقاموں پر سرکاری دستاویزوں اور بعض مستند زبانی روایات سے بھی مدد لی گئی ہے، غرض یہ مستند سوانح عمری ہندوستانی زبان میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، ہم مہر صاحب کو ان کی کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں، ہم کو معلوم نہ تھا کہ یہ نام کے مہر صاحب علم و ادب کے مہر تاباں بھی ہیں،

**گلستانِ امجد**، (ترجمہ گلستان سعدی) مترجمہ حکیم الشعرا سید امجد حسین صاحب امجد، حیدر آبادی تقطیع اوسط ضخامت، ۲۲۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت نفیس و دیدہ زیب، قیمت ے ر، پتہ، مستعد پورہ کا نذی گوڑہ مکان نمبر ۹ ۳۶۹ عاد پریس، چھتہ بازار حیدر آباد دکن،

فارسی زبان کی کتابوں میں گلستان سعدی کو دنیا میں جو شہرت و مقبولیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، شاید ہی دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی ہو، جس میں اس کا ترجمہ موجود نہ ہو،

ہندوستانی میں بھی اس کے متعدد ترجمے ہوئے، لیکن وہ محض طلبہ کے استفادہ کیلئے کئے گئے تھے، اسلئے اول مع متن کے نہیں سب لکھتی ہیں، جن میں گلستان فصاحت کا قائم رکھنا تو کجا، ان کا سمجھنا بھی مشکل ہی، حکیم الشعراء امجد صاحب نے جن کو خدا نے زبان کی ساحری کیساتھ قلم کی فسوں کاری بھی عطا کی ہے، اس کمی کو اس خوبی اور کمال کے ساتھ پورا کیا ہے، کہ گلستاں کو اسکو سارے رنگ و بو کے ساتھ ہندوستانی زبان میں ڈھال دیا ہے، وہی چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، وہی فصاحت و بلاغت ہے، وہی روانی ہے، وہی حلاوت و شیرینی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ موتی ہیں کہ ڈھلکتے جاتے ہیں، قند و نبات کی ڈلیاں ہیں، کہ کام و دہن کو حلاوت بخشتی ہین، سب بڑا کمال یہ ہے کہ گلستاں کی نظم کے منثور ترجمہ کے بعد اسکے ہم معنی یا اس سے ملتی جلتی ہوئی اپنی نظم بھی اس طرح کھپ دی ہے، کہ معلوم ہوتا ہے، کہ حریر و پرنیان میں موتی ٹکے ہین،

**سخنستان**، مرتبہ پنڈت رام گوپال صاحب مصر، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت نفیس و نظر فریب، جلد خوبصورت بچکدار، قیمت عام لوگوں کے لئے ۱۲؍ شعراء کے لئے ۸؍ پتہ پنڈت رام گوپال صاحب مصر ڈپٹی کلکٹر بلیا یوپی،

پنڈت رام گوپال مصر ڈپٹی کلکٹر کے قیام گورکھپور کے زمانہ ۱۹۳۲ء میں ان کے اہتمام میں وہاں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا، سخنستان اسی مشاعرہ کی غزلوں کا گلدستہ ہے، ابتدا میں پنڈت رام گوپال صاحب کے قلم سے مشاعرہ کی مختصر روئداد ہے، اس کے بعد ۳۰ شعراء کی غزلیں، ان کے مختصر حالات اور بعض کے فوٹو ہیں، چونکہ پنڈت جی خود ایک با مذاق شاعر ہیں، اس لئے اس گلدستہ کے آراستہ کرنے میں انھون نے بڑے حسن مذاق سے کام لیا ہے، اور اسکو کلام کی رنگا رنگی کے ساتھ ظاہری نفاست اور پاکیزگی کا مرقع بنا دیا ہے،

**نسیم عرفان**، مصنفہ مولانا عبد القدیر صاحب حسرت صدر شعبۂ دینیات کلیہ جامعہ

عثمانیہ تقطیع چھوٹی، حجم ۶۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مذکور نہیں پتہ:-

سید مظہر علی شوکت، محلہ کاب گنج، عقب، ڈیوڑھی، غالب جنگ، مکان نمبر ۴۴ و مکتبہ

ابراہیمیہ عابد روڈ حیدر آباد دکن،

**نسیم عرفان** مولانا عبد القدیر صاحب حسرت کے کلام کا اسم بامسمی مجموعہ ہے، اس مختصر دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصائد، مسدس، رباعیات، ٹھمریاں ہر قسم کے نمونے ہیں، اور کوئی لطف سے خالی نہیں، غزلوں کا ظاہری رنگ عاشقانہ ہے، لیکن رنگ حقیقت میں ڈوبا ہوا، نعتیہ ٹھمریاں خصوصیت کے ساتھ زیادہ پر کیف ہیں،

**ابصار العینین فی شہادت الحسین** } مولفہ مولانا لطیف الدین صاحب مدرس مدرسہ نظامیہ فرنگی محل، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۴ صفحات، کاغذ کتابت طباعت معمولی، قیمت ۵؍ پتہ سلیم الدین احمد صاحب احاطہ خانساماں، متصل باغ مولوی انوار صاحب لکھنؤ،

شیعہ سنی مناظروں نے اب یہانتک نوبت پہنچا دی ہے، کہ بعض سنی بھی شیعوں کی تحریروں سے مشتعل ہو کر ان کی تقلید میں بسا اوقات اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں، اور یزید کی خلافت کے اثبات اور حضرت امام حسینؓ کے جہاد اور آپکی کی شہادت پر بحث شروع کر دیتے ہیں، ابصار العینین میں مذہب اور عقائد کی روشنی میں اس قسم کے خیالات کی تردید کی گئی ہے، گو ہم کو اسکی تمام تفصیلات سے اتفاق نہیں ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں ہے، کہ خلافت نیابت نبوی اور اقامت دین کا منصب جلیل ہے، اس لحاظ سے یزید کی حکومت قطعی خلافت نہ تھی، یہ اور بات ہے کہ اس عہد کے علما ر نے اسلامی مصالح اور مسلمانوں کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے اس کو خلافت کا محض نام دیدیا تھا،

(م)

# دارالمصنفین کی جدید فہرست

## اور

## کتابوں کی قیمتوں میں غیر معمولی تخفیف

سنہ ۱۹۳۵ء سے ہم نے دارالمصنفین کی تمام مطبوعات کی قیمتوں میں غیر معمولی کمی کردی ہے، مکتبۂ دارالمصنفین کی نئی فہرست مرتب ہوکر شائع ہوگئی ہے، امید ہے کہ جو لوگ اس وقت تک دارالمصنفین کی تصنیفات سے محروم تھے وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائینگے، فہرست طلب کرنے پر مفت روانہ کیجائے گی۔

قیمتوں کی اس تخفیف میں دارالمصنفین کے دو اہم سلسلۂ کتب سیرۃ النبی اور سیر الصحابہ کے مکمل سٹ کی قیمتوں میں غیر معمولی رعایت رکھی گئی ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی تمام جلدوں کی مجموعی رعایتی قیمت اٹھارہ روپیے ہوتی ہے، اس کا مکمل سٹ صرف پندرہ روپیے میں دیا جاتا ہے۔

سیر الصحابہؓ کی تمام جلدوں کی مجموعی قیمت ۲۶ عہ ہے لیکن اسکا مکمل سٹ صرف بیس روپیے میں دیا جائیگا لیکن واضح رہے کہ سٹ کی یہ رعایتی قیمت صرف انہی لوگوں کے لئے ہے، جو دارالمصنفین سے براہ راست کتابیں خریدیں۔

تاجر صاحبان کو سٹ کی رعایتی قیمت پر کمیشن نہیں دیا جا سکتا، کمیشن کی رعایت بہر صورت جلدوں کی انفرادی قیمتوں پر ہوگی۔

مسعود علی ندوی　　منیجر دارالمصنفین　　اعظم گڈھ

(مطبع معارف میں محمد آویس وارثی نے چھاپ کر شائع کیا)